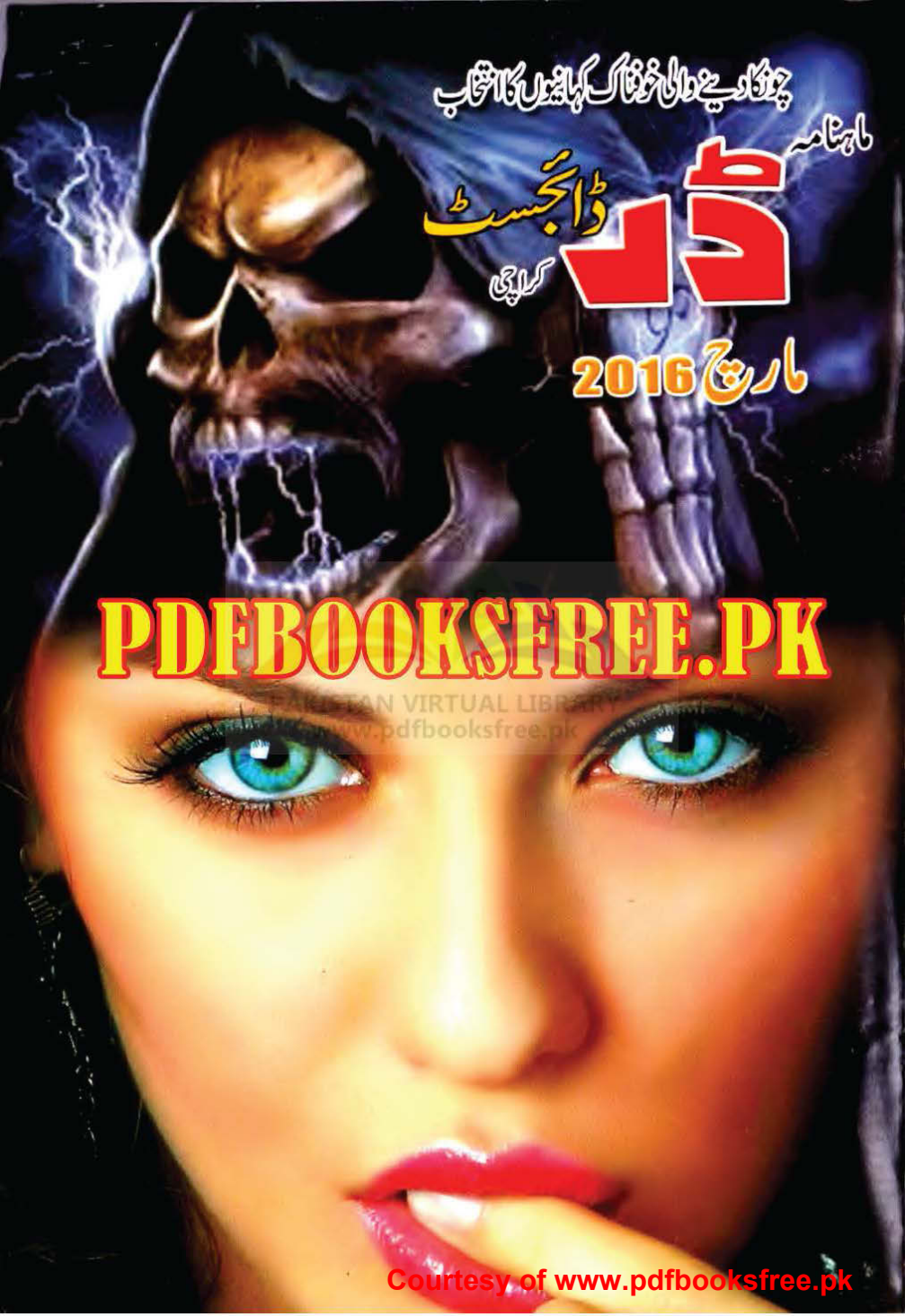

PDFBOOKSFREE.PK
PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk
Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

چونکا دینے والی خوفناک کہانیوں کا انتخاب

ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ کراچی

جلد نمبر 17 شمارہ نمبر 6 مارچ 2016ء

ای میل ایڈریس: Dardigest01@gmail.com

مینجنگ ایڈیٹر خالد علی

چیف ایڈیٹر آصف حسن

ایڈیٹر شاہد علی

سب ایڈیٹر محمد ذیشان

قیمت -/60 روپے

سالانہ قیمت -/1080 روپے

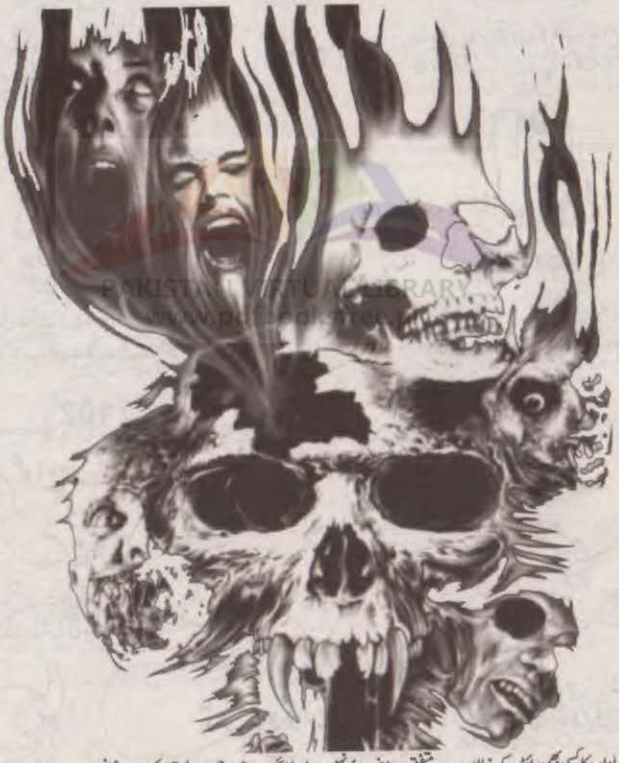

ادارہ کا کسی بھی رائٹر کے خیالات سے متفق ہونا ضروری نہیں۔ ڈر ڈائجسٹ میں چھپنے والی تمام کہانیاں فرضی ہوتی ہیں کسی کی ذات یا شخصیت سے مماثلت اتفاقیہ ہوسکتی ہے

تمام اشتہارات نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ ادارہ اس معاملے میں کسی بھی طرح ذمے دار نہ ہوگا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

16 دلدل — عمران قریشی
یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ عورت، ناقص العقل ہوتی ہے، حقیقت پر مبنی خوبصورت کہانی

37 راکھ — ساحل دعا بخاری
محبت کے متلاشی جب محبوب سے بچھڑ جاتے ہیں تو دل کا کیا حال ہوتا ہے، کہانی پڑھ کر دیکھیں

43 پریمی — رضوان علی سومرو
ایک روح کی چاہت خلوص اور والہانہ پیار ومحبت کہانی پڑھنے والوں کو دنگ کر دے گی

56 رولوکا — اے وحید
وہ واقعی پراسرار قوتوں کا مالک تھا، اس کی جادوئی کرشمہ سازیاں آپ کو دنگ کر دیں گی

79 بھٹکتی آتما — حافظ محمد بلال اسلم
دولت کی طاقت میں اندھا ہونے والوں کے لئے عبرتناک واذیت ناک دل برداشتہ کہانی

91 لال جوڑا — سنبل عروج طہٰ
کیا یہ حقیقت ہے کہ مرنے والے کو زیادہ یاد کیا جائے تو یاد کرنے والے کو مرنے والا اپنے ساتھ لے جاتا ہے

102 فرعون کے سپاہی — ضرغام محمود
کیا ایسا ممکن ہے کوئی پلک جھپکتے ہی ہزاروں سال گزرے زمانے میں پہنچ جائے، کہانی پڑھ کر دیکھیں

110 حقیقی رنگ — مریم فاطمہ
خراماں خراماں دل و دماغ پر فرحت بخشتی چاہت وخلوص کی خوبصورت انمٹ کہانی

117 نادیدہ قوت — طارق محمود
کہنے والے کہتے ہیں کہ اللہ مہربان اور بندہ پہلوان، اسی کو احاطہ کرتی ایک دلچسپ کہانی

ایڈیٹر و پبلشر [illegible] نے سٹی پریس تالپور روڈ کراچی سے چھپوا کر شائع کیا

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

126 دشمن روحیں — ایم اے راحت
ڈر کے لبادے میں پوشیدہ ذہن سے محو نہ ہونے والی رائٹر کے زور قلم سے لکھی شاہکار کہانی

152 لیپ ٹاپ کا راز — اقصیٰ پیا سحر
دلوں کو گدگداتی ہوئی عجیب کہانی جو کہ پڑھنے والوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دے گی

163 عجیب کہانی — رضوان قیوم
کہتے ہیں کہ جادو اور عمل ناقابل یقین شکتی شالی ہوتا ہے، ثبوت کہانی میں موجود ہے

173 اندھیرے کی آواز — ایس امتیاز احمد
تاریکی کے ایک باسی کی کہانی جو کہ روشنی کا سامنا کرتے ہوئے گھبراتا تھا، پراسرار کہانی

181 ناگ راجہ — محمد خالد شاہان لوہار
ایک موذی کی خوفناک وحشت ناک، اچھوتی انوکھی اور ناقابل فراموش دل دہلاتی حیرتناک کہانی

189 ہم آہنگی — ناصر محمود فرہاد
کیا بے جا مداخلت انسان کو خود سر یا منہ پھٹ بنا دیتا ہے، اس کا فیصلہ تو کہانی پڑھ کر ہی ہوگا

196 ضدی ناگن — ملک این اے کاوش
خودغرضی، اور مطلب پرستی کی ناقابل یقین دل و دماغ کو تھرا دینے والی خونی کہانی

220 قوس قزح — ادارہ
قارئین کے بھیجے گئے اشعار جنہیں قارئین بڑے ذوق وشوق سے پڑھتے ہیں......

226 کٹھن راستہ — شہزادہ چاندزیب عباسی
دماغ پر سکتہ طاری کرتی اور خوف کے شکنجے میں جکڑتی انسانی عقل میں نہ آنے والی خونی کہانی

خط وکتابت کا پتہ: ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ نورانی آرکیڈ نیو اردو بازار کراچی: 32744391

PVL
PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

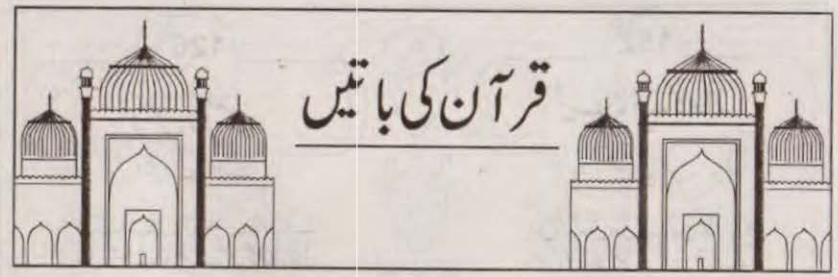

قرآن کی باتیں

☆ اورتم جہاں سے نکلو مسجد محترم کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرو اور مسلمانو تم جہاں ہوا کرو اسی مسجد کی طرف رخ کیا کرو، یہ تاکید اس لئے کی گئی ہے کہ لوگ تم کو کسی طرح کا الزام نہ دے سکیں مگران میں سے جو ظالم ہیں وہ الزام دیں تو دیں، سوان سے مت ڈرنا اور مجھی سے ڈرتے رہنا۔ اور یہ بھی مقصود ہے کہ میں تم کو اپنی تمام نعمتیں بخشوں اور یہ بھی کہ تم راہ راست پر چلو۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 150)

☆ مسلمان عورتیں اور مومن مرد اور مومن عورتیں اور فرمانبردار مرد اور فرمانبردار عورتیں اور راستباز مرد اور راستباز عورتیں اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں اور عاجزی کرنے والے مرد اور عاجزی کرنے والی عورتیں اور خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں اور روزے رکھنے والے مرد اور روزے رکھنے والی عورتیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں اور اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے مرد اور کثرت سے یاد کرنے والی عورتیں کچھ شک نہیں کہ ان کے لئے اللہ نے بخشش اور اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔ (سورۃ احزاب 33 آیت 35)

☆ اے محمد لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں کس طرح مال خرچ کریں۔ کہہ دو کہ جو چاہو خرچ کرو، لیکن جو مال خرچ کرنا چاہو وہ درجہ بدرجہ اہل استحقاق یعنی ماں باپ کو اور قریب کے رشتہ داروں کو اور یتیموں کو اور محتاجوں کو اور مسافروں کو سب کو دو، اور جو بھلائی تم کرو گے اللہ اس کو جانتا ہے۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 215)

☆ بھلا جو مومن ہو وہ اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو نافرمان ہو دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ (سورۃ سجدہ 32 آیت 18)

☆ آج تمہارے لئے سب پاکیزہ چیزیں حلال کر دی گئیں اور اہل کتاب کا کھانا بھی تم کو حلال ہے اور تمہارا کھانا ان کو حلال ہے۔ اور پاک دامن مومن عورتیں اور پاک دامن اہل کتاب عورتیں بھی حلال ہیں جبکہ ان کا مہر دے دو۔ اور ان سے عفت قائم رکھنی مقصود ہو نہ کھلی بدکاری کرنی اور نہ چھپی دوستی کرنی اور جو شخص ایمان کا منکر ہوا اس کے عمل ضائع ہو گئے اور وہ آخرت میں نقصان پانے والوں میں ہوگا۔ (سورۃ مائدہ 5 آیت 5)

☆ جو لوگ مومن یعنی مسلمان ہیں اور جو یہودی ہیں اور ستارہ پرست اور عیسائی اور مجوسی اور مشرک اللہ ان سب میں قیامت کے دن فیصلہ کر دے گا۔ بے شک اللہ ہر چیز سے باخبر ہے۔ (سورۃ حج 22 آیت 17)

☆ عیسیٰ کا حال اللہ کے نزدیک آدم کا سا ہے کہ اس نے پہلے مٹی سے ان کا قالب بنایا پھر فرمایا کہ انسان ہو جا تو وہ انسان ہو گئے۔ (سورۃ آل عمران 3 آیت 59)

(کتاب کا نام "قرآن مجید کے روشن موتی" بشکریہ شمع بک ایجنسی کراچی)

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

خطوط

ایس حبیب خان کراچی سے، السلام علیکم! امید ہے ادارے والے، ڈر کے تمام پڑھنے والے اور تمام رائٹرز اللہ کے فضل سے خیریت سے ہوں گے، فروری کا میگزین ہاتھ میں آیا سرورق پسند آیا، خطوط کی محفل میں محترمہ طاہرہ آصف کا خط پڑھا، طاہرہ صاحبہ آپ کے لئے دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت کاملہ عطا کرے اور آپ کے ہر معاملے میں آسانی فرمائے۔ (آمین) فلک زاہد، سید عبادت کاظمی، طارق محمود، عامر زمان عامر، محمد اسحاق انجم، ساحل ابرو سمیت ان تمام لوگوں کا تہہ دل سے شکریہ جنہوں نے میری تحریر کو پسند کیا۔ اب آتے ہیں اس مرتبہ کی تحریروں کی طرف سلسلہ وار کہانیوں میں "دشمن روحیں" ایم اے راحت اور "ضدی ناگن" ملک این اے کاوش دونوں بہترین انداز سے شروع کی گئی ہیں اور امید ہے کہ آگے بھی ایسی ہی رہیں گی، دیگر میں "ان دیکھا" "بدروح کا انجام" "تلاش" اور "عاشق روح" پسند آئیں، فلک زاہد کے لئے یہ کہنا چاہوں گی کہ وہ ڈر میں خوب صورت اضافہ ہیں۔ اس کے علاوہ اپنے موسٹ فیورٹ رائٹر ایس امتیاز احمد کے بارے میں کہنا چاہوں گی کہ ان کے بغیر ڈر ادھورا ہے۔ نئی کہانی "دبال" حاضر خدمت ہے اور امید ہے کہ شامل اشاعت کر کے شکریہ کا موقع دیں گے۔

☆☆ ایس حبیب صاحب: نئی کہانی بھیجنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے بہت بہت شکریہ، انٹرویوز کا سلسلہ جلد شروع ہوگا، کچھ میٹرز جمع ہو جائیں تو اس معاملے میں رائٹرز سست روی سے کام لے رہے ہیں، آپ کی کہانی لیٹ موصول ہوئی، جس کی وجہ سے شامل اشاعت نہ ہو سکی، اس کے لئے معذرت، دو چھوٹی کہانیاں پلیز ارسال کر دیں تاکہ کنفیو ہو جائیں۔ امید ہے غور کریں گی۔ Thanks۔

ثوبیہ شہزادی کھڈیاں خاص سے، آداب! امید ہے سارا اسٹاف بخیریت ہوگا! خوفناک نمبر ڈر ڈائجسٹ فروری 2016ء ملا، دشمن روحیں، ضدی ناگن اور رواو کا تین سلسلے وار کہانیاں پڑھنے کو ملیں۔ تینوں ہی اپنی اپنی جگہ پر خوبصورت اور چونکا دینے والی معیاری تحریریں تھیں۔ اس کے علاوہ فلک زاہد کی عاشق روح، تلاش، محسن عزیز کی روشن مستقبل واقعی جس کا کوئی نہیں اس کا اللہ ہوتا ہے۔ بہت اچھی کہانی ہے۔ پراسرار آئینہ، روح کا انتقام اور بدروح کا انجام، بھٹکتی روح، روح کی آمد، دشمن روحیں، غیبی وجود ایسے لگا کہ جیسے شمارہ میں سب روحیں ہی آ گئی ہیں! گوشت، کالا کفن، ان دیکھا، بے گھر اور نوے کروڑ بھی اچھی تحریر ہے۔ خطوط میں ہمارا خط بھی شامل اور آپ نے وعدہ کیا ہے کہ آئندہ ماہ ہماری کہانی چھپ جائے گی، ہم انتظار کریں گے، شاعری بھی اچھی ہے، سب لکھنے والوں کو خلوص دل سے سلام! کہانی کا وعدہ، انتظار رہے گا۔

☆☆ ثوبیہ صاحبہ: خلوص نامہ اور کہانیوں کی تعریف ارسال کرنے کے لئے ڈھیروں شکریہ، کہانی شائع کرنے کا وعدہ یاد ہے، بہت جلد شامل اشاعت ہوگی، آئندہ ماہ بھی خلوص نامہ کا شدت سے انتظار رہے گا۔ شکریہ۔

نسرین رانا کراچی سے، میں خیریت سے ہوں امید ہے ادارے کا پورا اسٹاف خیریت سے ہوگا۔ میں ڈر ڈائجسٹ میں پہلے بھی لکھ چکی ہوں، ایک کہانی کا نام "وہ کون تھی" شائع ہوئی تھی۔ ڈر ڈائجسٹ مجھے بہت پسند ہے، اسی لئے دوبارہ کہانیاں لکھی ہیں اور ارسال کر رہی ہوں اور مجھے یقین ہے کہ حوصلہ افزائی کی جائے گی۔ میں دوسرے ڈائجسٹ میں بھی لکھتی ہوں۔ کہانیوں کے متعلق بتایئے گا کہ کب شائع ہوں گی، ایک بات اور رمضان اور عیدالاضحیٰ کے حوالے سے بھی کہانیاں لکھی پڑی ہیں، میں بعد میں ارسال کر دوں گی۔

☆☆ نسرین صاحبہ: آپ کی کہانیاں موصول ہو چکی ہیں۔ ابھی پڑھی نہیں اور امید ہے کہ اچھی ہوں گی، اپریل کے شمارے میں کوئی بھی ایک کہانی ضرور شائع ہوگی، لیکن ہاں! تجزیہ ارسال کرنا بھولئے گا نہیں! Thanks۔

انعم شہزادی گجرات سے، السلام علیکم! تمام قلم کار، اسٹاف ڈر، امید کرتی ہوں کہ سب خیر و عافیت سے ہوں گے۔ بھائی خالد شاہان کو سلام، کیسے ہو بھیا جی، لو جی یہ کیا بات ہوئی لیڈر آف شاہین گروپ محمد ندیم عباس میواتی صاحب تک ڈر کی محفل میں ابھی تک نہیں آئے پھر بھی انہیں اپنی ہر کہانی میں کردار دیا جا رہا ہے، تو کیا ہم کچھ نہیں لگتے، باوجود کہ شاہین گروپ کی کوئین ہوں تو مجھے کیوں اگنور کیا جا رہا ہے؟ میں ناراض ہوں، اسٹوری بہت پسند آئی، قسط وار کب آئے گی؟ ننھی منی شہزادیاں نشا اینڈ صائمہ کیسی ہو؟

ایک خط سے ہی بس ہوگئی کیا؟ لو میں آ گئی، پیا سحر آپ نے مجھے یاد کیا؛ بہت خوشی ہوئی، شکریہ میں اپنے شہر گجرات کا نام روشن کرنے میں ہر دم حاضر..... بھائی ابو ہریرہ بلوچ کیسے ہو؟ اسٹوری بہت اچھی تھی، ویری گڈ، آپی عطیہ زہرہ میرے تبصرے کو پسند کرنے کا شکریہ، اقرا تبسم، ثوبیہ اچھے تبصرے، باقی سب بھی اچھا لکھ رہے ہیں، ذرا جلدی میں ہوں پھر بات ہوگی تب تک تمام شاہین گروپ و دوست احباب کو سلام اور خود دعاؤں کی محتاج۔

☆☆انعم صاحبہ: ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ پر اور تمام اہل قلم اور شاہین گروپ پر اپنا فضل و کرم کرے اور قلمی خوشیوں سے نوازے، امید ہے آپ کی باتوں پر شاہین گروپ غور کرے گا، مگر آئندہ بھی خلوص بھرا خط لکھنا بھولئے گا مت۔

مریم فاطمہ کراچی سے، السلام علیکم! فروری 2016ء کا شمارہ پڑھ کر دل خوش ہوگیا، ساری کہانیاں بہت ہی اچھی تھیں، خاص کر مجھے فلک زاہد صاحبہ کی ''عاشق روح'' بے حد پسند آئی، ماننا پڑے گا کہ اس بار کا خوفناک نمبر Hit رہا۔ ایڈیٹر صاحب میں آپ کی بے حد شکر گزار ہوں کہ آپ نے میری کہانی ''خونی ایکسیڈنٹ'' کو خوفناک نمبر میں جگہ دی۔ یقین کیجئے میں خوشی سے جھوم رہی تھی، اپنی کہانی رسالے میں دیکھ کر، آپ نے اس کی نوک پلک سنوار کر اس کو چار نہیں بلکہ آٹھ چاند لگا دیئے۔ لیکن پھر بھی فلک زاہد صاحبہ کی کہانی میری کہانی سے زیادہ اچھی تھی۔ ان کو میں مبارکباد پیش کرتی ہوں اور باقی تمام رائٹرز کو بھی اتنی اچھی کہانیاں لکھنے پر مبارکباد۔ اور آخر میں ایک گزارش ہے کہ کیا میری کہانی ''مصورہ'' ''آسیبی اسکول'' ''مقدس گڑیا'' شائع ہو جائے گی۔ پلیز شائع کر دیجئے گا۔ میں انتظار میں ہوں۔ خدا کرے ڈرڈائجسٹ مزید مزید ترقی کرتا چلا جائے۔ آمین۔

☆☆مریم صاحبہ: آپ کی کہانیاں شائع ہو رہی ہیں۔ آپ اپنی کوشش جاری رکھیں، ویسے بائر کالونی کی جگہ کوئی اور کہانی ارسال کریں اور ہاں آئندہ ماہ بھی خلوص رائے کا انتظار رہے گا۔

محمد اسحاق انجم قصور سے، السلام علیکم، شمارہ فروری 2016ء ڈرڈائجسٹ خوب صورت سرورق کے ساتھ ہمارے ہاتھوں میں ہے، عاشق روح اچھی تحریر رہی۔ روشن مستقبل محسن عزیز حلیم کی تحریر بھی خوب رہی، اچھا لکھنا شروع کر دیا ہے، ''تعارف کنندہ کو وہ بھول گئے ہیں!'' ہماری صحت کی خرابی نے ہم کو کنگن پور سے دور کر دیا ہے، ایس امتیاز احمد صاحب پر اسرار آئینہ لے کر آئے، پسند آئی، مدثر بخاری روح کا انتقام اور سید عبادت کاظمی بدروح کا انجام لائے، بھٹکتی روح، روح کی آمد، بے گھر، غیبی وجود، ان دیکھا، کالا کفن سب کہانیاں اچھی ہیں، ضدی ناگن، دشمن روحیں اور رولو کا اپنی مثال آپ ہیں! خطوط کی محفل میں شامل اشاعت رکھنے کا شکریہ! خطوط کی محفل میں ہر پل اضافہ ''ڈر ڈائجسٹ'' کی کامیابی ہے! خدا محنت کا پھل ضرور دیتا ہے! ''ڈرڈائجسٹ'' اپنی عمر کے سترہ سال گزار چکا ہے اور اب اٹھارہ کی جانب جاری ہے! اللہ اسے مزید ترقی دے۔

☆☆اسحاق صاحب: ہماری اور قارئین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو کلی صحت عطا کرے اور آپ پر ہر پل اپنا فضل و کرم رکھے اور تمام قلمی خوشیوں سے نوازے، آئندہ بھی خط کا انتظار رہے گا۔

طارق محمود کامرہ سے، السلام علیکم! فروری کا ماہنامہ ڈر 21 جنوری کو بذریعہ ڈاک موصول ہوا، جس کے لئے بہت بہت شکریہ، سرورق زبردست ہے۔ قرآن کی باتیں دل پر اثر کرنے والی اور اس کے بعد قارئین کی محفل سے لطف اندوز ہوئے، کہانیوں کی طرف بڑھے تو فلک زاہد صاحبہ ''عاشق روح'' کے ساتھ حاضر تھیں۔ جوں جوں بڑھتے ہوئے آگے بڑھے تو کہانی میں دم آتا گیا، ''بدروح کا انجام'' کو سید عبادت نے اچھی طرح سے پیش کرنے کی کوشش کی جو کہ کسی حد تک کامیاب رہی۔ احسان سحر کی ''تلاش'' اپنے موضوع کے لحاظ سے اچھی کہانی تھی اور ''رولو کا'' تو واقعی ایک زبردست اسٹوری ہے۔ محسن عزیز کی ''روشن مستقبل'' اچھی تحریر تھی۔ اقصیٰ پیا سحر کی ''رات کے مسافر'' نے پڑھتے ہوئے جیسے جکڑ لیا، ویلڈن جی ''پراسرار آئینہ'' ایس امتیاز صاحب کی دلچسپ اور پر سرار کہانی آخر تک کہانی میں سسپنس و تجسس رہا۔ ایم اے راحت صاحب پرانے اور بہت اچھے رائٹر ہیں۔ ''دشمن روحیں'' کے سحر سے نکلے تو مدثر بخاری کی ''روح کا انتقام'' سامنے آ گئی جو کہ چھوٹی لیکن اچھی کہانی تھی۔ گلاب خان سولنگی ''شیطانی مخلوق'' اچھی کہانی اور ''خونی ایکسیڈنٹ'' مریم فاطمہ کی اچھی کاوش تھی۔ ''ضدی ناگن'' ملک این اے کاوش اچھی جا رہی ہے، اس کے بعد قاسم رحمان کی ''کالا کفن'' ناصر محمود کی ''ان دیکھا'' شکیل نیازی کی ''گوشت'' ایم نادر شاہ ''بھٹکتی روح'' احرام زہل حسین کی ''بے گھر'' چھوٹی چھوٹی اچھی اچھی کہانیوں کی سیڑھی پہ چڑھتے ہوئے قاسم رضا کی ''نوے کروڑ'' پہ پہنچے۔ ان کے درمیان میری بھی ایک چھوٹی سی کہانی تھی۔ ''روح کی آمد'' دیورز کو

کیسی لگی، ان کے خطوط پڑھ کر ہی پتا چلے گا، آخری کہانی ''غیبی وجود'' سیدہ صابر مین کی تحریر بھی اچھی تھی۔ اک کہانی مزید ارسال خدمت ہے۔ امید ہے پسند آئے گی، اس کے ساتھ ہی دل کی گہرائیوں سے طاہرہ آصف کے لئے صحت و تندرستی کی دعا۔

☆☆طارق صاحب: خلوص دل سے کہانیوں کی تعریف کے لئے Thanks۔ کہانی شامل اشاعت ہے، امید ہے آئندہ ماہ بھی تجزیہ بھیجنا بھولیں گے نہیں۔

احسان الحق اسلام آباد سے، السلام علیکم! محترم ایڈیٹر صاحبان ڈرڈائجسٹ، اللہ تعالیٰ سے دلی دعا ہے کہ آپ سب خیر و عافیت سے ہوں، خاکسار نے زندگی بھر کبھی تبصرہ لکھنے کی جسارت نہیں کی۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ چھوٹا منہ اور بڑی بات کے مصداق کبھی قلم نے اس رخ پر جنبش نہیں کی۔ لیکن زندگی میں پہلی مرتبہ ایک ایسی کہانی گناہ گار کی نظروں کے سامنے سے گزری ہے جس کی اگر مداح سرائی داد و تحسین بھرے خوب صورت الفاظ میں نہ کی جائے تو نہ صرف رائٹر کی محنت اور قلمی طاقت کو فراموش کرنے کے مترادف ہوگا بلکہ میرے جیسے لکھاری کے لئے یہ خیانت ممکن نہیں۔ جی ہاں! یہ نام ہے ڈر میں شائع ہونے والی دو قسطوں پر مبنی طویل کہانی ''نوے کروڑ'' کی جسے چنیوٹ سے محترم قاسم رضا صاحب نے ہم سب کے لئے لکھا۔ میں یہ تو نہیں جانتا کہ ہم میں سے اس کہانی کو کتنے قارئین نے پڑھا ہوگا لیکن میں نے پہلے ہی پانچ جملوں کے بعد مکمل کہانی پڑھ کر جب دم لیا تو مجھے احساس ہوا کہ میں واقعی میں ڈر کی سرزمین پر کھڑا ہوں، لمحہ لمحہ تجسس و خوف کے پیراہن سے سجی یہ کہانی واقعی میں خوفناک ادب کی عکاس کہانی ہے۔ بہر کیف میری جانب سے تخیلاتی خوفناک ادب میں اپنی کہانی کے ذریعے ایک یادگار اور بہترین اضافہ کرنے پر قاسم رضا صاحب کو دلی مبارکباد قبول ہو اور اللہ کرے کہ آپ یونہی دل لبھا لینے والا تخیلاتی خوفناک ادب تحریر کرتے رہیں۔ آمین۔ سلسلہ وار کہانیاں اس لئے نہیں پڑھ سکا کیونکہ اس میں شروع سے پڑھنے کا ہی لطف ہوتا ہے۔ لیکن ایم اے راحت صاحب کی کہانی سے آغاز کیا ہے۔ بات وہیں پر آ جاتی ہے کہ چھوٹا منہ بڑی بات، آپ تعریف کے ہی قابل ہیں اور ہم کیا تعریف کریں۔ خوفناک اور پر تجسس تخیلاتی ادب کے تقاضوں کو پورا کرتی ہوئی اس مرتبہ کی اچھی کہانیاں تلاش، روح کا انتقام، خونی ایکسیڈنٹ، گوشت، بے گھر اور غیبی وجود ہیں۔ ان متذکرہ کہانیوں کے مصنفین کو میں دلی مبارکباد دیتا ہوں اور دلی دعا دیتا ہوں کہ اللہ پاک سب کے قلم میں وہ روپیدا فرمادیں جو ڈرڈائجسٹ کی سربلندی اور ترقی کا ایندھن ثابت ہو۔ والسلام مخلص و خیر اندیش۔

☆☆احسان الحق صاحب: ڈرڈائجسٹ میں موسٹ ویلکم، بہت بہت شکریہ کہ آپ نے قلبی لگاؤ سے کہانیوں کی تعریف کی اور اپنی کہانیاں ڈرڈائجسٹ کے لئے بھیجی ہیں، آپ کی ایک کہانی کمپوز ہو چکی ہے، اس شمارے میں شامل اشاعت نہ ہو سکی، اس کے لئے معذرت، نوے کروڑ واقعی اچھی کہانی تھی، اور ویسے بھی ہر شمارے میں چاہے چھوٹی یا بڑی کہانی ایسی ہوتی ہے جو دل کو جھنجھوڑ دیتی ہے، امید ہے آپ ہر ماہ قلبی لگاؤ کا اظہار کر کے شکریہ کا موقع دیتے رہیں گے، آپ کی کہانی اگلے شمارے میں ضرور شائع ہوگی۔

ایس امتیاز احمد کراچی سے، السلام علیکم! امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا، ماہ رواں کا شمارہ سامنے ہے، دلفریب ٹائٹل کے ساتھ تمام تر سلسلے خوب رہے۔ آرٹیکلز لگانے کا شکریہ، میٹرز آپ کے پاس ہیں۔ اور امید ہے قریبی اشاعت میں جگہ دیں گے۔ تمام اسٹاف اور ''ڈرڈائجسٹ'' کے تمام خوب صورت لکھنے والے رائٹرز اور تمام خوب صورت پڑھنے والے ویورز کو دعا سلام، اپنا خیال رکھئے گا۔

☆☆امتیاز صاحب: اس ماہ بھی تجزیہ ارسال کرنا آپ بھول گئے، آئندہ ماہ نہ بھولئے گا شکریہ۔

ظہور احمد صائم لاہور سے، فروری کا شمارہ سرد موسم کی تمام حشر سامانیوں کے ہمراہ موصول ہوا۔ قرآن کی باتوں سے فیض یاب ہوتے ہوئے خطوط کی محفل میں داخل ہوئے، تو گویا دل روشن ہو گیا، کیونکہ محفل ساتھیوں سے جگمگا رہی تھی، مگر پہلا تبصرہ پڑھتے ہی اداسی نے گھیر لیا۔ طاہرہ آصف صاحبہ اللہ آپ کو صحت کاملہ عطا فرمائیں تا کہ آپ دوبارہ ڈر میں بھرپور حاضری دے سکیں، اپنا خیال رکھئے گا، رابعہ عباس آپ کو سالگرہ مبارک ہو۔ ہم آپ کے حق میں دعا گو ہیں۔ دیگر دوستوں میں عبادت بھائی کو بھی سالگرہ مبارک ہو۔ خوش رہیں بھائی جی، دیگر ساتھیوں کے تبصرے بھی عمدہ تھے۔ ثوبیہ شہزادی صاحبہ، ڈر کے دفتر میں ردی کی ٹوکری موجود ہے۔ مگر یہ ذرا جدید قسم کی ٹوکری ہے اس لئے نظر نہیں آتی، اب بڑھتے ہیں غزلوں کی طرف چوہدری قمر صاحب کی غزل ہمارے خیالات کی ترجمانی کر رہی تھی، کیونکہ آج کل شاعر حضرات بس یار دوستوں کی محفل تک محدود ہو کر رہ گئے کیونکہ ادب کی قدر اور عزت ختم ہوتی

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

جارہی ہے۔ ہماری غزل آپ نے شائع کردی، شکریہ، بہرحال شمارہ مجموعی طور پر اچھا تا دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ڈر ڈائجسٹ کو مزید کامیابیاں عطا کرے، زندگی رہی تو اگلے ماہ حاضر ہوں گے تمام دوستوں کو سلام دعا۔

☆☆ ظہور صاحب: ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو خوش وخرم رکھے، اور ہر جائز مقصد میں کامیاب وکامران کرے۔ آئندہ ماہ بھی خلوص نامہ کا انتظار رہے گا۔ Thanks۔

ریحان علی منڈی بہاؤالدین سے، السلام علیکم! ڈر ڈائجسٹ میں پہلی بار حاضر ہورہا ہوں، بہت ہی پیارا ڈائجسٹ ہے، جس کی تحریر نہ صرف چونکا دینے والی بلکہ رونگٹے کھڑے کردینے والی ہوتی ہے۔ کوشش کررہا ہوں کہ میں بھی کچھ لکھوں لیکن اتنے بڑے رائٹرز کے درمیان..... ہمت جواب دے جاتی ہے۔ اس وقت بھی ڈائجسٹ میرے ہاتھوں میں ہے۔ سب کہانیاں لاجواب ہیں۔ خاص کر ملک این اے کاوش صاحب کی صدی ناگن تو سپرہٹ کہانی جارہی ہے۔ یہ میرا فیورٹ ٹاپک ہے۔ بہت اچھی کہانی ہے۔ میری طرف سے مبارکباد قبول کیجئے۔ اس کے علاوہ ایم اے راحت صاحب اور اے وحید صاحب بھی بہت پیارا لکھ رہے ہیں۔ ہر کہانی اپنی جگہ منفرد ہے، دعائے خیر کے ساتھ انشاء اللہ بہت جلد دوبارہ حاضر ہوں گا، کوشش کروں گا کہ کوئی نہ کوئی تحریر بھی لے کر۔ والسلام۔

☆☆ ریحان صاحب: ڈر ڈائجسٹ میں خوش آمدید، خط لکھنے، کہانیوں کی تعریف اور آئندہ ماہ بھی خط لکھنے اور رائے کے لئے ڈھیروں شکریہ قبول کریں۔

محمد سفیان اسلم دریا خان سے، سب سے پہلے میں آپ کو یہ بتانا چاہوں گا کہ ڈر کے احوال میں میری آمد پہلی بار ہے، ڈر ڈائجسٹ میرا بہترین رسالہ ہے اور میں ہر ماہ باقاعدگی سے خریدتا ہوں مگر لکھنے کا اتفاق پہلی بار ہوا، بھلا ہو میرے دوست سجاد کا جس نے میری حوصلہ افزائی کی، جس کی وجہ سے میں نے اپنی ایک کہانی آپ لوگوں کو بھیجی ہے، جس کا عنوان ''پری زاد کا قیدی'' ہے میں آپ لوگوں سے التجا کرتا ہوں کہ میری کہانی کو شائع کر کے میری حوصلہ افزائی کریں، دراصل مجھے لکھنے کا اتنا تجربہ نہیں ہے۔ اس لئے اگر کوئی کمی یا غلطی ہو تو اس کو درست فرما کر میری کہانی پلیز شائع کردیں۔ اگر آپ اس کو شائع کریں گے تو میری حوصلہ افزائی ہوگی، اب تو ہر ماہ باقاعدگی سے ڈر میں حاضری ہوگی، انشاء اللہ اگلے ماہ ملاقات ہوگی، اب اجازت دیں۔ خدا حافظ۔

☆☆ سفیان صاحب: ڈر ڈائجسٹ میں خوش آمدید، کہانی ابھی پڑھی نہیں، اچھی ہوئی تو ضرور شائع ہوگی، اگر کہانی لکھتے رہیں گے تو ضرور لکھاری بن جائیں گے، آئندہ ماہ بھی خط ضرور بھیجئے گا، شکریہ۔

ریاض حسین قمر منگلا ڈیم سے، مدیر محترم سلام شوق! امید ہے آپ مع اپنے مختی عملہ کے خیر خیریت سے ہوں گے۔ ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ کا فروری 2016ء کا شمارہ پیش نظر ہے۔ ٹائٹل کو دیکھ کر خوف کی ایک لہر سی جسم میں پھیلتی محسوس ہوئی۔ سب سے پہلے قرآن کی باتیں پڑھ کر اپنے ایمان کو تازہ کیا اور روح کو آسودگی بخشی، یہ اتنا پیارا سیکشن ہے اور جی کرتا ہے کہ یہ ایک صفحہ کے بجائے دو صفحات کا ہوجائے تاکہ زیادہ سے زیادہ راہنمائی حاصل کی جاسکے اور جریدہ پر اللہ تعالیٰ کی رحمت دوگنی ہوجائے۔ خطوط کی دنیا میں داخل ہوئے تو محترمہ طاہرہ آصف کی طبیعت کی خرابی کی خبر ملی، میری دعا ہے کہ رب کریم انہیں جلد صحت کاملہ عطا فرمائیں۔ آمین۔ خطوط کے سیکشن میں شامل تمام خطوط اپنی اپنی جگہ خوب ہیں۔ سب قارئین کے تبصرے اپنی اپنی جگہ خوب ہیں۔ کہانیوں میں فلک زاہد صاحبہ کی عاشق روح بہت اچھی لگی، ایس امتیاز احمد کی پراسرار آئینہ نے بہت متاثر کیا۔ محترمہ مریم فاطمہ کی خونی ایکسیڈنٹ اور محمد قاسم رحمان کی کالا کفن بھی اپنی جگہ خوب تھیں۔ غزلوں میں حکیم خان حکیم، محمد اسلم جاوید، فریدہ خانم، چوہدری قمر جہاں، ساحل ابڑو، ظہور احمد صائم، عرفان محمود، اور اولیس نور کا کلام بہت پسند آیا، باقی کہانیوں کے انتخاب میں بھی آپ نے بڑی ذمہ داری سے کام لیا ہے۔ میری دعا ہے کہ خداوند قدوس اس جریدے کو دن دگنی اور رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔ آمین۔

☆☆ ریاض صاحب: آپ کا خلوص نامہ پڑھ کر اچھا لگتا ہے، اور قوی امید ہے کہ آئندہ ماہ بھی پرخلوص تجزیہ اور قلبی لگاؤ کے ساتھ خط ضرور ارسال کریں گے۔

وقار علی شمس کراچی سے، السلام علیکم! خداوند کریم سے دعا ہے ایک قیدی کی، کہ رب العزت اپنے فضل وکرم سے ڈر سے منسلک تمام تر افراد کو خوش وخرم رکھے، ڈر کو ہر موڑ پر کامیابی عطا فرمائے، جناب ڈر کی محفل میں پہلی بار شریک ہورہا ہوں، بے گناہ ہونے کے باوجود سینٹرل جیل کراچی میں قید وبند کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوں، ڈر سے منسلک تمام افراد سے میری جلد رہائی کے لئے

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

درخواست ہے۔ مجھے قید میں بارہ سال چار ماہ ہوچکے ہیں۔ تنہائی کے اس مشکل وقت میں ڈر جیسا دوست ملا بہت بہت خوشی ہوئی، شمارہ نومبر سے دوستی کا آغاز ہوا، خطوط پڑھے تو آنکھیں کھل گئیں کہ لوگوں سے رائٹرز سے اور سچے چاہنے والوں سے رابطے کا بہترین طریقہ ہی نہیں بلکہ ان سے قربت بھی حاصل ہے ڈر کو، لاکھوں دعائیں ڈر کو جو نئے ٹیلنٹ کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ تمام کہانیاں بہت اچھی لگیں، خاص طور پر خوشبو اور کمرہ نمبر 78 اور رولوکا، ابھی شمارہ جنوری پڑھ رہا ہوں، چند کہانیاں ہی باقی رہ گئی ہیں بہت دلچسپ ہیں لکھنے کا تو بہت شوق ہے مگر..... !لاکھوں دعاؤں کے ساتھ دعاؤں کی درخواست۔

☆☆ وقار صاحب: ہماری اور قارئین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی غلطیوں، کوتاہیوں کو جو کہ دانستہ اور نادانستہ ہوئیں، انہیں معاف کرکے آپ کو آزادی دے، آپ بھی صدق دل سے دعا کریں کیونکہ اللہ توبہ قبول کرتا ہے اور اپنا فضل وکرم کرتا ہے، خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے شکریہ اور ڈر ڈائجسٹ میں خوش آمدید۔

محمد اسلم جاوید فیصل آباد سے، السلام علیکم! خیر وعافیت اور نیک دعاؤں کے ساتھ حاضر ہوں، آج جب کام سے فارغ ہوا تو سوچا شہر چلتے ہیں، شدید سردی تھی، دور دور تک دھوپ کا نشان نہ تھا، پیدل ہی بک اسٹال پر پہنچا، بے شمار پرچوں میں ڈر ڈائجسٹ کا خوفناک نمبر پھولوں کی طرح مہکتا ہوا نظر آیا، جسے دیکھ کے دل کو بڑی خوشی ہوئی، سرورق بڑے کمال کا تھا۔ اندر جھانکا تو رنگ برنگی تحریروں سے ملاقات ہوگئی، اس کے تمام سلسلے انگوٹھی میں نگینے کی طرح فٹ تھے، غزل اور خط شائع کرنے کا بہت بہت شکریہ اس بار پرچہ جلد ہی ملا، یہ مارکیٹ میں ایک معیاری ڈائجسٹ ہے، میں اس کا بہت پرانا قاری ہوں، خدا آپ کو نیک مقصد میں کامیابی سے ہمکنار کرے، جب یہ تحریر لکھ رہا ہوں تو باہر دھند کے بادل چھائے ہوئے ہیں، اشعار، غزلیں اور کہانیاں خوب تھیں۔

☆☆ اسلم صاحب: آپ جس خلوص چاہت اور قلبی لگاؤ سے خط لکھتے ہیں تو دل بہت خوش ہوتا ہے، اخلاق انسانیت اور حقوق العباد سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں، دنیا میں سب کچھ یہیں رہ جائے گا، جب لاد چلے گا بنجارا، یہ اخلاق اور خلوص ہی تو ہے کہ ہم سب ایک دوسرے کو یاد رکھتے ہیں اور خط کے ذریعہ ملاقات ہوتی ہے، کیوں ٹھیک ہے ناں۔

خضر حیات روڈہ تھل سے، السلام علیکم! فروری کا شمارہ خوفناک نمبر اچھلتا، کودتا اور مسکراتا 22 جنوری کو ایک خوب صورت اور دلکش سرورق کے ساتھ مل گیا، شمارہ بہت اچھا اور عمدہ تھا۔ سب سے پہلے تو میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے میری تحریروں کو شمارے میں جگہ دی اور ابو ہریرہ بلوچ کی بات کو سچ ثابت کردکھایا۔ شمارے میں جتنی کہانیاں شامل تھیں۔ سب بہت اچھی عمدہ اور زبردست تھیں اور خوفناکی سے بھرپور تھیں، کس کس کہانی کا نام لوں، سب کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ دعا ہے ڈر دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کرے۔ آمین۔

☆☆ خضر صاحب: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے ڈھیروں شکریہ، ابو ہریرہ ویسے بھی اچھے دل ودماغ کے مالک ہیں۔ اب تو خوش ہیں ناں، مارچ کے شمارے میں بھی آپ کی نمائندگی ہوگئی ہے۔

محسن عزیز حلیم کوٹھا کلاں سے، السلام علیکم! فروری کا ڈر 21 تاریخ کو ٹھینگ موڑ سے خریدا، ڈر کھلتے دل اور لرزتے ہاتھوں سے جب اوپن کیا تو جیسے میرے چودہ طبق روشن ہوگئے، اپنی کہانی دیکھ کر Realy بہت خوشی ہوئی، ڈر اپنے چاہنے والوں کو کبھی مایوس نہیں کرتا، سب سے پہلے قرآن کی باتیں پڑھیں، جن پر عمل کرکے ہی ہم اپنی دنیا اور آخرت سنوار سکتے ہیں۔ خطوط کی محفل میں سبھی کے خطوط اچھے تھے، خضر حیات ویلکم، کہانیوں کی محفل میں خونی ایکسیڈنٹ مریم فاطمہ میری طرح آپ کو بھی محنت کی ضرورت ہے۔ عاشق روح فلک زاہد نے اس بار کچھ زیادہ ہی محنت کرڈالی، ویری بیسٹ، نوے کروڑ قاسم رضا کہانیوں پر مشتمل کہانی پہلا حصہ بھی بیسٹ تھا اور دوسرا حصہ بھی ویلڈن قاسم رضا صاحب، کالا کفن محمد قاسم رحمان چھوٹی کہانی تھی لیکن اچھی کہانی تھی، ان دیکھا ناصر محمود فرہاد کی منفرد اچھی کہانی تھی، گوشت شکیل نیازی مختصر کہانی اچھی تھی، ویسے آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے، رات کے مسافر اقصیٰ پیاسحر، ویری نائس..... تلاش احسان سحر کی بھی اچھی کہانی تھی..... ضدی ناگن قسط وار کہانی بہت خوب چل رہی ہے، دشمن روحیں ایم اے راحت پہلی قسط تو بہت خوب رہی، خیر آگے پتہ چلے گا۔ بھٹکتی روح، غیبی وجود، روح کی آمد، شیطانی مخلوق، بدروح کا انجام، روح کا انتقام یہ سب بہت اچھی کہانیاں تھیں، جو دل سے محنت کریں گے، بلاشبہ ڈر ڈائجسٹ ایک ترقی یافتہ ڈائجسٹ ہے اور تمام قارئین کرام دل سے محنت کررہے ہیں۔ میری طرف سے علی حسنین بھٹی ملک نوید شوکت کو بہت بہت سلام اور آخر میں اس دعا کے ساتھ اجازت

چاہوں گا کہ ڈر ڈائجسٹ ہمیشہ ترقی کرتا رہے۔

☆☆ محسن عزیز صاحب: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے شکریہ، یہ حقیقت ہے کہ محنت رنگ لاتی ہے تو نئی نئی کہانیوں کے لئے آپ بھی محنت کریں اور دامن میں خوشیاں سمیٹیں، کیوں ٹھیک ہے ناں۔

محمد آصف شہزاد الہ آبادی ٹھینگ موڑ سے، السلام علیکم! امید ہے کہ ڈر کی پوری ٹیم بمعہ آپ کے ٹھیک ٹھاک اور مزاج بخیریت ہوں گے، طویل غیر حاضری کے بعد آپ کی محفل میں پھر سے اپنی کرسی سنبھالنے لگا ہوں، غیر حاضری کی وجہ مصروفیت تھی جی اور کچھ نہیں، ڈر سے پیار کا تعلق پرانا ہے جو کہ اس طرح جاری رہا کہ کوئی ماہ ایسا نہ تھا کہ جس ماہ ڈر کی اسٹڈی نہ کی ہو، ایک عدد غزل اور قطعہ آپ کی خدمت میں پیش ہے، نزدیکی شمارہ میں شائع کر کے بندے کو مشکور فرمائیں، ڈر ڈائجسٹ بلندیوں پر جا رہا ہے، دعا ہے کہ اللہ ڈر کو مزید ترقی اور بلندی عطا کرے۔

☆☆ آصف صاحب: بہت بہت شکریہ کہ ایک طویل عرصہ بعد بھی آپ نے ڈر کو یاد کیا، اس کے لئے شکریہ، آئندہ ماہ بھی اپنی تحریر بھیجنا بھولئے گا نہیں۔ Thanks۔

سید عبادت کاظمی ڈیرہ اسماعیل خان سے، السلام علیکم! 23 جنوری کو ڈاک کے ذریعے اعزازی شمارہ موصول ہوا، بہت خوشی ہوئی، اپنی کہانی دیکھ کر بہت اچھا لگا، بہت شکریہ قاسم رحمان کی کالا کفن زبردست تھی تو رات کے مسافر پیا سحر کے قلم کا جادو تھا، نوے کروڑ اچھا اختتام ہوا، ضدی ناگن، غیبی وجود، بھٹکتی روح، بے گھر، خونی ایکسیڈنٹ، گوشت اور تلاش اچھی کہانی تھی، ایم اے راحت کی نئی کہانی بھی اچھی لگی، غزل اور کہانی بھیج رہا ہوں، حوصلہ افزائی کی امید ہے۔

☆☆ عبادت صاحب: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے شکریہ، ارے بھئی چار صفحے کی کہانی اسال کردی، یہ تو ڈر کے دو صفحات بھی نہیں بنیں گے، ذرا غور کریں۔

محمد ابو ھریرہ بہاولنگر سے، السلام علیکم! فروری 2016ء کا شمارہ 26 کو موصول ہوا، خوفناک نمبر ٹائٹل پر بوسیدہ کھوپڑی سے دل گھبرایا تو فی الفور صفحہ پلٹ کر خطوط کی محفل میں جا پہنچا، سب نے خوب لکھا...... محترمہ طاہرہ آصف صاحبہ ویلکم بیک ان ڈر...... آپ کی صحت یابی کے لئے دعا گو ہوں...... جناب اسد اللہ بھٹی، عامر زمان عامر، طارق محمود، محمد اسحاق انجم، ساحل ابڑو ان سب کا تہہ دل سے مشکور ہوں، آپ نے میری کہانی کو پسند کیا۔ پھر کہانیو کی جانب گئے تو جناب احسان سحر کی تحریر تلاش پڑھی، عمدہ اسٹوری تھی مبارکباد، قاسم رحمان صاحب کالا کفن لئے محفل میں نظر آئے، منفرد اچھوتی تحریر میں این اے کاوش ضدی ناگن، مریم فاطمہ خونی ایکسیڈنٹ، مدثر بخاری روح کا انتقام، ایم نادر شاہ بھٹکتی روح جناب ویلکم اب مستقل رہنا اور خط لکھنا مت بھولنا، خالد شاہان صاحب کی اسٹوری کو مس کیا...... ایم اے راحت اے وحید صاحب بھی عمدہ لکھ رہے ہیں۔ امید ہے اگلے ماہ میری کہانی بھی نظر آئے گی۔

☆☆ ابو ہریرہ صاحب: خلوص نامہ ارسال کرنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے شکریہ، آپ کی کہانی اگلے ماہ شامل اشاعت ہوگی اور آئندہ ماہ بھی تجزیہ کا خیال رکھے گا۔

ندیم عباس میواتی چوکی سے، السلام علیکم! فروری کا شمارہ پرکشش ٹائٹل کے ساتھ موصول ہوا، خطوط کی محفل میں اپنا تبصرہ پا کر اطمینان ہوا کہ میری حاضری ہو چکی ہے، محترمہ آپی طاہرہ آصف اللہ تعالیٰ آپ کو صحت کاملہ نصیب فرمائے، ہمہ تن دعا گو ہوں۔ بھائی خالد شاہان کوئی قسط وار اسٹوری لائیں۔ ضرغام محمود اینڈ مدثر بخاری کیسے ہیں آپ؟ رابعہ عباس، اسد اللہ بھٹی، سید عبادت کاظمی کو بہت بہت ہیپی برتھ ڈے وش کردیا۔ عامر زما عامر، طارق محمود، ساحل ابڑو، ریاض حسین قمر، ظہور احمد، ثوبیہ شہزادی، عرفان محمود...... جاوید اسلم، محمد ابو ہریرہ بلوچ، مریم شاہ بخاری کے اچھے تبصرے تھے ویلڈن...... کہانیوں کی تعریف سے ننھے منھے رائٹرز نادر شاہ کی اسٹوری بھٹکتی روح اچھی تھی، ویلڈن، احسان سحر کی تلاش زبردست رہی مبارکباد، قاسم رحمان کالا کفن عمدہ لکھا، ضدی ناگن، دشمن روحیں، خونی ایکسیڈنٹ، غیبی وجود، رولوکا، نوے کروڑ بھی زبردست رہیں...... زندگی نے مہلت دی تو اگلے ماہ پھر حاضری ہوگی، سب کو ڈھیروں سلام اینڈ خدا حافظ۔

☆☆ ندیم صاحب: حسب وعدہ اگلے ماہ بھی خط لکھنا بھولئے گا نہیں، اللہ تعالیٰ ہمت و حوصلہ دے تاکہ آپ ہر ماہ اپنی تحریر بھیجتے رہیں۔

Thanks۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

محمد عثمان رضا اوکاڑہ سے، السلام علیکم! میں نے بہت سے ڈائجسٹ پڑھے مگر دل کو تسلی نہ ہوئی پھر ایک دن میری ملاقات ابو ہریرہ بلوچ سے ہوئی، وہ بھی بک اسٹال پر موجود تھے، میں نے انہیں اپنی دادرسی سنائی تو انہوں نے مجھے ڈر ڈائجسٹ پڑھنے کو کہا، میں نے ڈر لیا جوں جوں پڑھتا گیا میری پیاس بجھتی گئی...... بہت ہی اچھا لگا، میں نے آج تک کبھی کچھ لکھا نہیں، مگر شوق بہت ہے، اسی شوق کی تکمیل کی خاطر لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں، اگر میری حوصلہ افزائی کی گئی تو مزید لکھنے کی کوشش کروں گا، ڈر کے تمام سلسلے بہت ہی اچھے ہیں، خاص کر بھائی خالد شاہان کی اسٹوری بہت پسند آتی ہے۔ میں بھی آپ کے شاہین گروپ میں شامل ہونا چاہتا ہوں، جس کی دھوم مختلف ڈائجسٹ میں دیکھ چکا ہوں، امید کرتا ہوں بندہ ناچیز کو ضرور جگہ ملے گی۔

☆☆ عثمان صاحب: ڈر ڈائجسٹ میں موسٹ ویلکم، چلئے حوصلہ افزائی ہوگئی، اب حسب وعدہ خط لکھنا بھولئے گا نہیں، خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے Thanks۔

محمد قاسم رحمان ہری پور سے، السلام علیکم! فروری کا ڈر 21 جنوری کو بذریعہ ڈاک موصول ہوا جس کے لئے میں ادارہ ڈر ڈائجسٹ کا دل کی گہرائیوں سے ممنون ہوں۔ قرآن کی باتیں پڑھ کر ایمان تازہ ہوگیا، اس کے بعد خطوط کی محفل میں جھانکا، نئے آنے والے لوگوں کی آمد اس بات کی دلیل ہے کہ ڈر دن دگنی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے، سب سے پہلے اپنے پیارے سویٹ سے دوست عبادت کاظمی کی بدروح کا انجام پڑھی۔ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ یہ عبادت کاظمی کی پہلی کہانی ہے۔ ضدی ناگن کی دوسری قسط زبردست رہی۔ علاوہ ازیں پیا سحر، احسان سحر، نادر شاہ کی تحاریر نے بہت متاثر کیا۔ دشمن روحیں کی پہلی سط بھی زبردست تھی۔ کالا کفن کی اشاعت کے لئے ممنون ہوں، اپنی دیگر تحاریر اسپیشلی ڈائن کی سرگوشی کے جلوہ افروز ہونے کا شدت سے منتظر ہوں۔ اب اجازت۔

☆☆ محمد قاسم صاحب: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے ویری ویری تھینکس، گھبرائیں نہیں، آپ کی کہانیاں بھی شائع ہو رہی ہیں اور ہوتی رہیں گی، آپ اپنی محنت جاری رکھیں۔ شکریہ۔

اسد اللہ بھٹی بھکر سے، سلام مسنون! فروری 2016ء کا شمارہ ہاتھوں میں جگمگا رہا ہے۔ ٹائٹل ڈر کے مطابق تھا۔ قرآن کی باتوں سے دل کو سکون پہنچا، آگے بڑھے تو سب سے زیادہ بہترین اسٹوری تھی۔ دشمن روحیں جس کو پڑھنے کے بعد روحیں اپنے گرد منڈلاتے ہوئے نظر آئیں۔ دوسرے نمبر پر اسٹوری جو مجھے اچھی لگی وہ تھی احسان سحر کی تلاش قسط وار اسٹوری ضدی ناگن ویری گڈ میری دعا ہے کہ رائٹر کو اللہ تعالیٰ اور بھی زور قلم عطا فرمائے، تیسرے نمبر پر آنے والی دہشت ناک تحریر نوے کروڑ قاسم رحمان کی تو بس بات کیا تھی۔ باقی سب کہانیاں زبردست تھیں۔ اب اگلے ماہ تک کے لئے اجازت دیں۔ زندگی رہی تو ملاقات باقی!

☆☆ اسد صاحب: قلبی لگاؤ سے خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے شکریہ، امید ہے اگلے ماہ بھی خط بھیج کر شکریہ کا موقع ضرور دیں گے۔

سید عباس حیدر بخاری کامرہ کلاں اٹک سے، السلام علیکم! امید ہے محفل ڈر سے وابستہ تمام لوگ خیر و عافیت سے ہوں گے، مزید دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ سب پر اپنا فضل و کرم جاری رکھیں۔ آمین۔ فرسٹ ٹائم خط لکھ رہا ہوں، جبکہ گزشتہ کئی سالوں سے ڈر کو متواتر پڑھ رہا ہوں، سب لکھنے والے اچھے جا رہے ہیں اور کہانیوں میں محنت نظر آ رہی ہے، اپنی دو نظمیں ارسال کر رہا ہوں، امید ہے باقی نئے لکھنے والوں کی طرح مجھ پر بھی توجہ دیں گے۔ اس دعا کے ساتھ اجازت چاہوں گا کہ...... اللہ پاک سب کو جسمانی و روحانی بیماریوں سے شفا عطا فرمائے اور ہم سب کو ایک دوسرے کے کام آنے کی توفیق عطا کرے۔

☆☆ عباس صاحب: چلئے حوصلہ افزائی ہوگئی اور اب امید ہے کہ آپ بھی حسب وعدہ ہر ماہ خط بھیجا کریں گے۔

اویس نور گڈانی میر پور ماتھیلو سے، ڈر ڈائجسٹ کی پوری ٹیم اور تمام قارئین احباب کو محبت بھرا اسلام قبول ہو، ڈر ڈائجسٹ میں پہلی دفعہ اپنی شاعری دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی، جس کو میں بیان نہیں کر سکتا۔ ''ڈر'' میں میری شاعری کو شائع کرنے پر میں ''ڈر ڈائجسٹ'' کی پوری ٹیم کا بے حد ممنون ہوں، بہت شکریہ، کہانیوں کی بات کی جائے تو ''تلاش'' نمبر ون پر تھی۔ عاشق روح اور بے گھر بھی لاجواب کہانیاں تھیں۔ بہرحال پورا شمارہ زبردست رہا، سب نے بہت اچھا لکھا۔ میری دعا ہے کہ ڈر ڈائجسٹ مزید ترقی کرے۔

☆☆ اویس صاحب: جس طرح آپ کو ڈر میں اپنی شاعری دیکھ کر خوشی ہوئی، اسی طرح مجھے بھی آپ کا خط دیکھ کر خوشی ہوئی اور قوی امید ہے کہ ہر ماہ خوش کرتے رہیں گے خط بھیج کر۔

☆☆

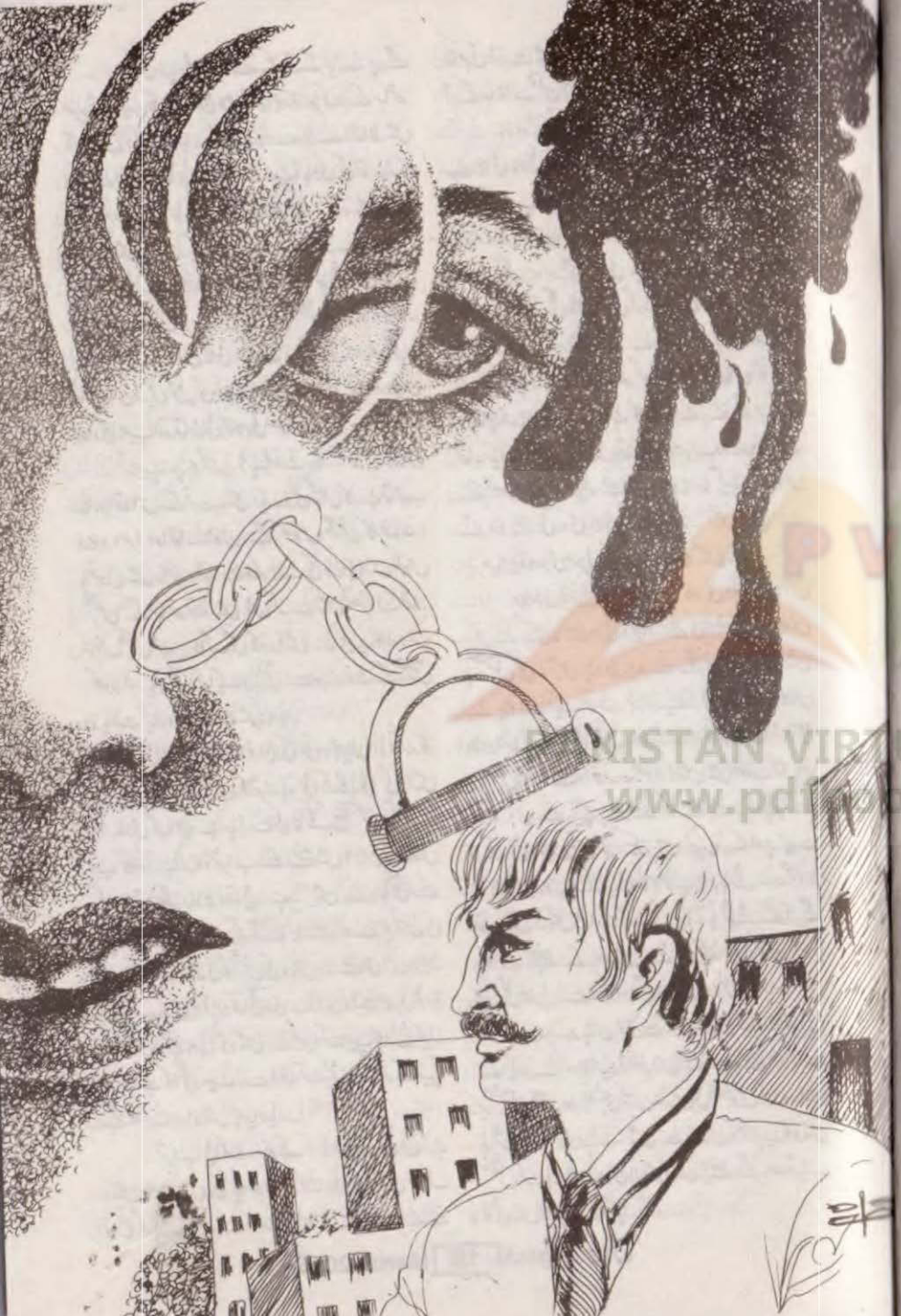

دلدل

عمران قریشی-کوئٹہ

یہ قدرت کا اٹل قانون ہے کہ کوئی بھی مجرم جرم کرکے ہمیشہ کے لئے چھپ نہیں سکتا، ایک نہ ایک دن وہ قانون کے ناقابل برداشت شکنجے میں آ ہی جاتا ہے اور اس کا اصل ثبوت اس کہانی میں پوشیدہ ہے، پڑھ کر دیکھیں۔

یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ عورت ناقص العقل ہوتی ہے، حقیقت پر مبنی خوبصورت کہانی.....

میں نے فورڈ برانکو کو دائیں ہاتھ کی طرف جاتی ہوئی سڑک پر موڑ دیا۔ یہ سڑک آگے جا کر ایک مختصر ٹاؤن پر اختتام پذیر ہو جاتی تھی۔ وسیع و عریض ریگستان کا یہ پہلا ٹاؤن تھا جس کی مختصر آبادی ڈھائی ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔ مکانات کی تعداد ڈیڑھ سو سے کچھ کم تھی۔ اس کے باوجود بھی آپ اسے ترقی یافتہ ریاست کہہ سکتے ہیں۔ یہاں اشیائے خورد و نوش کے وسیع و عریض اسٹوروں کے علاوہ ہائی اسکول کی عمارت بھی موجود تھی۔ میں نے جب اپنی شکاری جیپ کو ٹاؤن کی طرف جانے والی سڑک کی جانب موڑا۔ تو دن کے بارہ بجنے والے تھے۔ سورج سوا نیزے کے قریب چمک رہا تھا۔ اور گرمی کا یہ عالم پایا جاتا تھا کہ پسینے کی بدولت میرے تمام کپڑے گیلے ہونے لگے تھے۔ فورڈ برانکو ایک شکاری جیپ ہونے کی بدولت جدید تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے بنائی گئی تھی۔ لیکن چند روز قبل گاڑی کا ائیر کنڈیشن خراب ہو گیا تھا۔ وقت کی کمی کی بدولت میں اسے ٹھیک نہیں کروا سکا تھا۔ اب مجھے شدت کے ساتھ اپنی غفلت کا احساس ہو رہا تھا لیکن اگر یہ احساس قبل از وقت ہو جاتا تو بہتر ہوتا۔

سڑک پر گاڑیوں کی آمد و رفت نہ ہونے کے برابر تھی اور جو چند گاڑیاں رواں دواں تھیں ان کی رفتار آندھی طوفان سے کم نہیں تھی جیپ میں لگا ہوا وائرلیس آن تھا۔ اور اس پر موسم کی رپورٹ کی تفصیل بیان کی جا رہی تھی جس کے مطابق موجودہ دن سال کے گرم ترین دن کی حیثیت رکھتا تھا۔ پچاس ڈگری سینٹی گریڈ بارہ بجے کے قریب ریکارڈ کیا گیا تھا جبکہ ابھی تک نصف دن باقی تھا۔ میں نے ماتھے سے نیچے گرتے ہوئے پسینے کو شرٹ کی آستین کے ساتھ پونچھا۔ پھر ساتھ والی سیٹ پر رکھی ہوئی رابن ہڈ کی بوتل اٹھائی۔ اور ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھالتے ہوئے شراب کا لمبا گھونٹ بھرنے کے بعد بوتل کو واپس سیٹ پر رکھ دیا۔

ٹاؤن کی حدود شروع ہونے لگی تھی جھلسا دینے والی گرمی کے درمیان اکا دکا مکانات دکھائی دینے لگے۔ پیدل چلنے والے راہگیر بھی کم و بیش دکھائی دے جاتے تھے ان میں سے زیادہ تر رنگ برنگی چھتریاں تھامے ہوئے تھے۔ جو چند چھتریوں کے بغیر تھے وہ کاؤبوائے ہیٹ سر پر رکھے ہوئے تھے ٹاؤن کا پولیس ڈپارٹمنٹ ٹاؤن سے باہر بنایا گیا تھا۔ اس کی نامکمل عمارت سامنے سے گزری تب میں نے اچٹتی ہوئی نگاہ اس پر ڈالنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ یکمشت پیچھے ہوتی چلی گئی۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

پولیس ڈپارٹمنٹ سے کچھ آگے جانے پر مجھے سرخ وسفید رنگ کا وسیع وعریض بورڈ سڑک کے ساتھ آویزاں دکھائی دیا۔ جس پر بڑے بڑے الفاظ میں ہیڈے ٹاؤن کا نام اور اس کے نیچے آبادی کی شمار بندی کے ہندسے چند لمحات کے لئے دکھائی دیئے۔ پھر اوجھل ہوگئے میں نے بریک پر پاؤں رکھتے ہوئے جیپ کی رفتار کو نارمل کیا۔ پھر داہنی ہاتھ کی طرف جاتی ہوئی سڑک پر موڑ دیا۔ یہاں قریب ہی ٹاؤن کا مختصر بازار موجود تھا۔ یہاں خلاف معمول کافی حد تک ریل پیل موجود تھی۔ لیکن اس ریل پیل کی وجہ ٹاؤن کے بازار کے درمیان بھاری جیپ اور تماشائی ہجوم کی صورت میں موجود تھی۔

جیپ پر پولیس ڈپارٹمنٹ کا مخصوص نشان بنا ہوا تھا اس کے قریب ہی ایک زخمی شخص کا بے ترتیب وجود دھرا ہوا تھا۔ ٹاؤن کے مخصوص چینل کا نمائندہ ہاتھوں میں مائک تھامے سارجنٹ کی وردی میں ملبوس شخص کے ساتھ تو تو میں میں کرنے میں مصروف تھا۔ سڑک مکمل طور پر بلاک تھی مجبوراً میں نے جیپ کا دروازہ کھولا اور باہر نکل کر ایک رہائشی سے وجہ حادثہ کے متعلق دریافت کیا وہ غصیلے لہجے میں بولا۔

''قانون نے قانون کی ہی دھجیاں اڑا کر رکھ دی ہیں بوڑھے شخص کو شراب پی کر گاڑی کی ایسی ٹکر ماری کہ اس بے چارے کی ٹانگ چیتھ کر رہ گئی ہے اب بضد ہے کہ وہ شراب کے نشے میں ڈرائیونگ نہیں کر رہا تھا بلکہ حادثہ اتفاقیہ ہے۔'' میں نے رہائشی کے چپ ہونے کے بعد کچھ آگے بڑھتے ہوئے پولیس کی جیپ میں جھانکنے کی کوشش کی وہاں سامنے ہی اس برانڈ کی شراب والی بوتل دکھائی دی۔ جو اس وقت میری فورڈ برانکو میں رکھی ہوئی تھی میں نے گھبرا کر جیپ کا رخ کیا۔ اور شراب کو اگلی سیٹ سے اٹھا کر ڈیش بورڈ کے نیچے بنے ہوئے دراز میں چھپا دیا۔

شراب پی کر ڈرائیونگ کرنا خلاف قانون ہے۔ میں ہمیشہ اس کی پاسداری کرتا ہوں۔ لیکن خلاف توقع گرمی نے میرے اوسان خطا کر کے رکھ دیئے تھے ہجوم کی شدت میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ میرے لئے آگے جانا اب ممکن نہیں رہا تھا۔

بازار کے ساتھ بنی ہوئی ایک مختصر گلی پچھواڑے سے ہوتی ہوئی رہائشی علاقہ جات کا رخ کرتی تھی۔ میں نے جیپ کو اسٹارٹ کرتے ہوئے اس گلی میں موڑ دیا۔ وہ سنسان پڑی تھی۔ اگر سامنے سے کوئی موٹر سائیکل سوار بھی میری جانب رخ کرتا تب ہم دونوں اس تنگ گلی میں پھنس کر رہ جاتے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا اور میں باآسانی گلی سے نکل کر رہائشی علاقے میں داخل ہوگیا۔ مجھے کچھ گھوم کر اس مکان کا رخ کرنا پڑا۔ جو اسٹیٹ ایجنٹ کا میرے لئے تجویز کردہ تھا۔ یہ دو منزلوں پر مشتمل تھا۔ لیکن صرف دو بندوں کے لئے مخصوص تھا۔ نچلے حصے میں چھوٹا سا گیراج اور اس کے سامنے ٹی وی لاؤنج بنا ہوا تھا۔ جس میں سے سیڑھیاں دوسری منزل کی طرف جاتی تھیں۔

دوسری منزل پر مختصر خواب گاہ بنی ہوئی تھی اس کمرے کے سامنے والی دیوار شیشے کی مضبوط کھڑکیوں پر مشتمل تھی۔ جس پر دبیز پردے لگے ہوئے تھے، میں نے پردے ایک طرف ہٹا دیئے۔ سامنے مختصر ٹیرس بنا ہوا تھا۔ جس کی ایک دیوار سے کچھ ہٹ کر وسیع وعریض جھولا لگا ہوا تھا۔ یہ جھولا زمین میں نصب نہیں تھا۔ بلکہ اس کے نیچے پہیے لگے ہوئے تھے۔ آپ اسے ڈیکوریشن پیس بھی کہہ سکتے ہیں ٹیرس کے اوپر چھت موجود تھی۔ اس لئے یہ جھولا دھوپ اور بارش سے محفوظ تھا۔ میں واپس خواب گاہ میں چلا آیا شیشے کے آگے پردے کھینچنے کے بعد میں نے ایئر کنڈیشن آن کر دیا اور نچلی منزل سے ہوتا ہوا گیراج میں داخل ہوگیا۔

میرے پاس نہایت مختصر سامان تھا۔ کاغذوں کے پلندے اور ٹائپ رائٹر اس کے علاوہ چند ملبوسات پر مشتمل ایک عدد اٹیچی کیس اور میری مخصوص کردہ رابن ہڈ شراب کا کریٹ..... میں نے سامان کو خواب گاہ میں منتقل کر دیا۔ پھر ٹی وی لاؤنج میں بیٹھنے کے بعد شراب نوشی میں مصروف ہوگیا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

میں ایک ابھرتا ہوا نوجوان رائٹر تھا۔ دو تین کتابوں کی اشاعت نے مجھے زمین سے آسمان پر لا بیٹھایا تھا۔ اچھی خاصی رائلٹی اور یکدم کی شہرت نے مجھے کچھ پریشان بھی کر دیا تھا پبلیشروں کی ایک بھیڑ تھی۔ جو میرے ساتھ طویل معاہدے کرنے کے لئے تیار بیٹھی تھی۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ میں سب معاہدے وقتی شہرت کو ملحوظ رکھتے ہوئے ترتیب دیئے جا رہے تھے۔ اگر میں سوچ سمجھ کر قدم نہ اٹھاتا۔ تو جتنی جلدی منظر عام پر نمودار ہوا تھا۔ اس سے کم وقت مجھے گمنامی کی اتھاہ گہرائیوں میں گم ہوتے ہوئے لگتا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے اگلا پروجیکٹ سائن کرنے میں تین ماہ کا عرصہ لگا دیا تھا۔ اب ایک مضبوط پلیٹ فارم یونیک پبلیشرز کی صورت میں میری پشت پناہی کر رہا تھا اور میں اپنے اس انتخاب سے مطمئن تھا میری ہیڈے ٹاؤن میں آمد یونیک پبلشرز سے معاہدے کی مرہون منت تھی۔

مجھے ہزار صفحات پر مشتمل ایک ایسے مسودے پر کام کرنا تھا۔ جس کا تھیم نفسیاتی مریضوں پر مشتمل ایک ایسی آبادی سے تعلق رکھتا تھا۔ جو ایک ہی خاندان پر مشتمل تھا اور وہ تمام کا تمام خاندان نفسیات کی الجھی ہوئی ڈوریوں میں گم شدہ تھا مجھے تحریر کی تکمیل کے لئے تین ماہ کا عرصہ درکار تھا۔ مواد پبلشرز کی طرف سے دستیاب ہوگیا تھا۔ اور کاغذی کارروائیوں کی شروعات کے لئے ہیڈے ٹاؤن کا یہ گھر یونیک پبلشرز کی جانب سے ہائر کردہ تھا۔ وقت کی کمی کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے ایک ٹائپسٹ لڑکی کو بھی میری تصنیفی خدمات کے لئے مقرر کر دیا گیا تھا۔ جس کی پیشگی معاوضہ پبلشرز کی طرف سے ادا ہو چکا تھا۔

گیٹ پر لگی ہوئی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے باہر نکل کر دروازہ کھولا۔ بیس سے پچیس سال کے درمیان قدم رکھتی ہوئی ایک سادہ چہرے والی لڑکی سائیکل کو ہاتھ میں تھامے میری منتظر تھی۔ میں نے استفہامیہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے آنے کی وجہ دریافت کی۔ تب وہ سرگوشی بھرے لہجے میں بولی۔

''مجھے یونیک پبلشرز کی جانب سے بھیجا گیا ہے۔ اور میں ٹائپ رائٹر کی ڈپلومہ ہولڈر ہوں۔''

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اسے اندر آنے کے لئے کہا۔ وہ خاموشی کے ساتھ اندر چلی آئی اس کے براؤنش بال پسینے سے تر چھوٹے چھوٹے سانپوں کی صورت میں ماتھے کے ساتھ چسپاں تھے۔ وہ انہیں پی کیپ میں چھپانے کی ناکام کوششیں کر رہی تھی۔ لیکن اس کے باوجود بھی مقصد میں ناکام دکھائی دیتی تھی۔ پی کیپ میں سے اس کی مختصر پونی باہر لٹک رہی تھی جسے وہ وقفے وقفے سے جھٹک کر اس کی موجودگی کا احساس نمایاں کرتی تھی۔ اس نے سائیکل کو میری فورڈ برانکو کے قریب کھڑا کیا اور میرے ہمراہ ٹی وی لاؤنج میں چلی آئی۔ وہاں اے سی آن تھا۔ میں نے ایک طرف رکھے ہوئے فریج میں سے شراب کی دو بوتلیں باہر نکالیں۔ اور انہیں میز پر رکھنے کے بعد لڑکی کو صوفے پر بیٹھنے کے لئے کہا۔

وہ خاموشی کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس نے دونوں ہاتھ گود میں رکھے ہوئے تھے۔ وہ کسی معصوم گڑیا کی مانند دکھائی دیتی تھی میں نے مشروب کی بوتل کو اس کے سامنے رکھتے ہوئے پوچھا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''

وہ دوبارہ سرگوشی بھرے لہجے میں بولی۔ ''میگی۔''

میں نے سر اثبات میں ہلاتے ہوئے کہا۔

''میگی تمہیں پبلشرز کی جانب سے یقیناً معاوضہ موصول ہو چکا ہوگا۔ اس میں کمی وبیشی تمہاری صلاحیتوں پر منحصر ہے۔ میرے پاس وقت نہایت کم ہے۔ اس لئے مجھے کم وبیش تمہاری صلاحیتوں پر ہی انحصار کرنا ہوگا۔ یہ کوئی عام پروجیکٹ نہیں ہے تم اسے میگا پروجیکٹ کہہ سکتی ہو۔ اگر تمہاری جانب سے مجھے امید افزا صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ تو تم یقین جانو کہ میں پبلشرز سے تمہاری سفارش کے علاوہ تمہیں اپنی جانب سے بھی معقول انعام واکرام سے نوازنے کی کوشش کروں گا۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

''اس کی مجھے ضرورت نہیں ہے۔ جو معاوضہ مجھے پبلشرز کی جانب سے موصول ہوا ہے وہ میری

توقعات سے کچھ زیادہ ہے۔ رہی صلاحیتوں کی بات..... تو اس کے لئے مجھے یقین ہے کہ میرا پیراگون کمپنی کا سرٹیفکیٹ مددگار ثابت ہوگا۔" اس نے سیدھے ہاتھ میں موجود مختصر بیگ کو کھولا اور اندر سے پلاسٹک میں بند سرٹیفکیٹ نکال کر میرے سامنے میز پر رکھ دیا۔

میں نے سرٹیفکیٹ دوبارہ اس کے ہاتھوں میں تھما دیا اور کہا۔

"مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہاری قابلیت کا اندازہ کام کے بعد ہوگا۔ جس کے لئے آج کا تمام دن موجود ہے۔ کام کے اوقات شام پانچ بجے سے سات کے درمیان ہوں گے۔ اس دوران تمہیں میرے تحریر کردہ مسودے کو کاغذ پر ٹائپ کرنا ہوگا۔ اگر پروف ریڈنگ بھی کرسکو تو اس کا معاوضہ علیحدہ دیا جائے گا۔"

میگی نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

"میں پہلے ہی بتا چکی ہوں کہ مجھے مزید معاوضے کی ضرورت نہیں ہے۔ پروف ریڈنگ کا کام میں بہ احسن وخوبی کرسکتی ہوں۔"

میں نے پہلی دفعہ مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں نے اپنی زندگی میں پہلی اور شاید آخری لڑکی تمہاری صورت میں دیکھ رہا ہوں جسے مزید معاوضے سے چڑ ہے۔ اس کی وجہ دریافت کرسکتا ہوں۔"

اس نے سر پر موجود کیپ کو اتار کر میز پر رکھ دیا پھر مشروب کی بوتل کا مختصر گھونٹ بھرنے کے بعد بولی۔

"میرے آگے پیچھے میری تنہائیوں کے علاوہ اور کوئی موجود نہیں ہے۔ صبح کے وقت اسکول میں ٹیچنگ کرتی ہوں۔ اور شام کو مختصر کام..... مہینے کا اتنا کما لیتی ہوں جو میری ضروریات سے بہت زیادہ ہوتا ہے اس لئے مزید کی ضرورت نہیں۔"

اس کے لب ولہجے میں کچھ ایسی بات موجود تھی۔ جو اس کی بے بسی اور غم زدہ دل کی عکاسی کرتی تھی۔ میں نے پوچھا۔

"شادی شدہ ہو؟" اس نے اثبات میں سر ہلایا اور بولی۔

"گزشتہ سال ہوئی تھی لیکن چند عرصے میں ہی ناکام ہونے کے بعد ختم ہوگئی۔" اس نے اپنے بیگ میں ہاتھ ڈالا اور ایک مختصر سا ڈبہ باہر نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔ اور بولی۔

"اس میں چکن سوپ موجود ہے۔ میں نے آپ کے لئے بنایا ہے۔ اگر آپ کو کھانے کی حاجت محسوس ہو رہی ہو تو میں وہ بھی تیار کرسکتی ہوں۔"

میں نے ممنونانہ نگاہوں کے ساتھ اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"تکلیف دہی کی معافی چاہتا ہوں۔ لیکن اگر ایسا کردو تو میں نہایت ممنون ہوں گا۔"

اس نے جواب نہیں دیا اور خاموشی کے ساتھ اٹھ کر کچن کی طرف چلی گئی۔ بھولی بھالی سی ٹاؤن کی وہ لڑکی مجھے مختصر سی ملاقات کے دوران اچھی لگنے لگی تھی۔ میں نے سر کو جھٹکا اور خاموشی کے ساتھ سوپ پینے لگا۔

پھر یہ روز کا معمول بنتا چلا گیا۔ وہ شام کو پانچ بجے میرے اسٹڈی روم میں داخل ہوتی۔ میں اور میرا مسودہ دونوں اس کے منتظر ہوتے۔ وہ خاموشی کے ساتھ مسودے کو ٹائپ کرتی۔ اور اپنے ہمراہ لایا ہوا کھانا ٹیرس میں رکھے ہوئے ٹیبل پر لگا دیتی۔ ہم دونوں خاموشی کے ساتھ رات کا کھانا تناول کرتے۔ اس دوران ہمارے درمیان کچھ بات چیت بھی ہوتی جو سراسر کام سے متعلق ہوتی پھر وہ برتن سمیٹنے کے بعد خاموشی کے ساتھ اپنی سائیکل پر بیٹھ کر رخصت ہوجاتی۔

ٹی وی لاؤنج میں ٹی وی کے علاوہ ریڈیو بھی رکھا ہوا تھا۔ میں کچھ دیر اپنے مخصوص چینل پر گانے سننے کے بعد اگلے دن کے لائحہ عمل کو دماغ میں ترتیب دینے کی کوشش کرتا تھا۔

میری مخصوص شراب کا کوٹا تقریباً ختم ہونے والا تھا مصروفیت کا یہ عالم تھا کہ شراب لانے کے لئے مجھے باہر نکلنے کا وقت دستیاب نہیں ہو رہا تھا ہیڈے ٹاؤن کا بازار سر شام بند ہوجاتا تھا اور میگی کی رفاقت کے دوران

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

باہر جانا میرے لئے ممکن نہیں تھا۔

یہ شاید پیر کے دن کی بات ہے گزرنے والے دن کے دوران، میں مسودے پر زیادہ کام نہیں کرسکا۔ میگی کی آمد کے بعد میں نے ٹائپنگ کا کام ملتوی کردیا۔ اس نے حیرت بھری نگاہوں سے اپنی مختصر پونی کو مخصوص انداز میں جھٹکتے ہوئے وجہ دریافت کی۔ تب میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو رات کے کھانے پر میں تمہیں مدعو کرنا چاہتا ہوں۔ کچھ فراغت کے لمحات یادگار بن جائیں گے۔ اور کچھ گزشتہ ہفتے کی تھکن اس بہانے کم ہوجائے گی۔" اس نے کچھ جواب نہیں دیا اور ہم دونوں فوراً برانکو کی طرف چل دیئے۔

آج صبح ہی سے آسمان گہرے بادلوں کے گھیرے میں تھا۔ جس بھی زیادہ تھی لیکن شام کے قریب ٹھنڈی ہوا چلنے لگی ہیڈے ٹاؤن کا دن چاہے جتنا بھی گرم اور حبس آلود ہو شام نہایت دلفریب اور ٹھنڈی ہوتی تھی ٹاؤن سے باہر ایک ہموار ٹیلے پر بیرل ریسٹورنٹ کی عمارت بنی ہوئی تھی۔ یہاں کی خاصیت یہ تھی کہ ٹیلے کے گرد لگی ہوئی ریلنگ سے وسیع وعریض ریگستان کے علاوہ غروب آفتاب کا منظر مکمل شان وشوکت سے دکھائی دیتا تھا۔ سر شام ٹھنڈی ہوا چلنے لگتی تھی۔ اس لئے کرسیوں اور میزوں کو ٹیلے کے چاروں طرف لگا دیا جاتا تھا۔

میں نے ریلنگ کے ساتھ لگی ہوئی الگ تھلگ میز کا انتخاب کیا اور کھانے کا آرڈر دے دیا۔ وہ میرے سامنے والی کرسی پر خاموش بیٹھی تھی۔ اس کی نگاہیں ڈوبتے ہوئے سورج پر مرتکز تھیں اور وہ گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ میں نے خاموشی کو توڑنے کے لئے پوچھا۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" وہ خوابیدہ لہجے میں بولی۔

"بیرل ریسٹورنٹ اس کا پسندیدہ ریسٹورنٹ تھا۔ شادی کے بعد ہم کئی دفعہ یہاں آئے وہ ہمیشہ کثرت شراب نوشی کی بدولت آخری لمحوں میں توڑ پھوڑ اور دھینگا مستی کا باعث بنتا تھا مجھے اس کے ہمراہ یہاں آنا اچھا نہیں لگتا تھا، لیکن وہ ہمیشہ مہینے کی شروعات کے دوران یہی کرتا تھا۔ ان دنوں میں اس کے پاس ڈالروں کی کثرت ہوتی تھی۔ وہ انہیں برباد کرتا تھا۔"

میں نے پوچھا۔ "اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو کیا میں وہ وجہ دریافت کرسکتا ہوں جس کی وجہ سے تم دونوں کے درمیان طلاق ہوئی۔"

وہ زخم خوردہ لہجے میں بولی۔ "طلاق نہیں ہوئی۔ صرف نفرت کی ایک دیوار ہے۔ جو ہمارے درمیان قائم ہے۔ شاید چھ مہینے سے زیادہ کا عرصہ ہوا ہماری ملاقات کو..... وہ ملاقات بھی بے معنی تھی۔ اس کا کچھ مقصد نہیں تھا سوائے ڈرانے دھمکانے اور یہ بتانے کا کہ وہ مجھے طلاق نہیں دے گا اور مجھے تمام عمر تنہائی کی زندگی بسر کرنا ہوگی۔"

ویٹر نے کھانا سرو کرنا شروع کردیا۔ سورج مکمل طور پر غروب ہوگیا تھا اور ملگجی اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ ریسٹورنٹ کے مخصوص ایریئے کی لائٹوں کو آن کردیا گیا تھا اب ریگستان کا منظر گم شدہ تھا لیکن میزوں کے گرد بیٹھے ہیڈے ٹاؤن کے رہائشیوں اور انہیں سرو کرتے ہوئے ویٹروں کو باخوبی دیکھا جاسکتا تھا۔ میں نے چکن ٹکوں کی پلیٹ میگی کے آگے رکھتے ہوئے پوچھا۔

"تم نے عدالت سے رجوع نہیں کیا؟"

وہ تلخ لہجے میں بولی۔ "قانون اس کا خریدکردہ ہے۔ وہ سب اس کے آگے مجبور ولاچار ہیں۔ وہاں دھکے کھانے سے بہتر ہے۔ کہ میں تمام زندگی تنہائی کے عالم میں گزار دوں۔ شادی کے فوراً بعد مجھے اس بات کا احساس ہوگیا تھا۔ کہ وہ اپنی بات منوانے کا گر جانتا تھا اس نے مجھ پر ظلم کی انتہا کردی۔ لیکن میں خاموش رہی۔ اور تمام زندگی خاموش رہتی۔ اگر وہ میری ماں کو تشدد کا نشانہ نہ بناتا۔ تشدد کا نشانہ بنانا بھی علیحدہ بات ہے اس نے تو اسے بے دردی کے ساتھ قتل کردیا۔"

میرے ہاتھوں سے چمچ نیچے گرتے گرتے بچا۔ میگی کے چہرے پر کرب کے تاثرات ابھرنے لگے، ہاتھوں کی مٹھیاں بھنچ گئیں اور ہونٹ غصے کی شدت سے کپکپانے لگے۔ اس نے میری آنکھوں کے سامنے

ایئر کنڈیشن کے سسٹم میں کچھ ردوبدل کی تھی جس کی وجہ سے اس کے کمرے کا ایئر کنڈیشن دھماکے کے ساتھ پھٹ گیا اور وہ جل کر راکھ ہوگئی۔

میرے پوچھنے پر اس نے نہایت ڈھٹائی کے ساتھ قتل کرنے کا اقرار کرلیا۔ وہاں کوئی بھی ایسا ثبوت دستیاب نہیں تھا جسے بنیاد بنا کر میں اس کے خلاف مقدمہ دائر کرسکتی۔ اس لئے خاموش ہوکر بیٹھی رہی۔ اس کے ہمراہ رہنا ممکن نہیں تھا اس لئے میں علیحدہ ہوگئی۔ وہ آج بھی ہمارے آبائی مکان میں رہ رہا ہے۔ لیکن مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ میں اس کے خلاف کچھ کارروائی کرسکوں۔'' میگی خاموش ہوگئی۔

میں نے اسے دلاسہ دیا اور اس معاملے میں عملی قدم اٹھانے کا وعدہ کیا۔ میکسیکو میں میری واقفیت انتہائی درجے کی تھی ہیڈے ٹاؤن کی بات علیحدہ تھی یہاں مجھے کوئی نہیں جانتا تھا ہم نے خاموشی کے ساتھ کھانا کھایا۔ اور ریسٹورنٹ سے باہر چلے آئے۔ میں نے میگی کو اس کے ایک کمرے پر مشتمل گھر میں چھوڑا۔ اور فورڈ برانکو کو اس راستے پر ڈال دیا جو ٹاؤن کے بازار کی طرف جاتا تھا۔ میرے پاس شراب کا ذخیرہ ختم ہوگیا تھا اور میں لگے ہاتھوں یہ کام کرکے گھر جانا چاہتا تھا۔

ہیڈے ٹاؤن کا بازار سرِشام بند ہوجاتا تھا۔ لیکن شراب ڈیلررات دس بجے تک بازار میں دستیاب ہوتے تھے۔ اس محدود بازار میں ان کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ شاید گنتی کی تین دکانیں تھیں جن پر ٹاؤن کا انحصار تھا۔ ان میں سے دو بند ہوچکی تھیں ایک کھلی تھی۔ لیکن اس کی بوڑھی مالکہ اسے بند کرنے کی تیاریوں میں مصروف تھی۔ میں نے جب فورڈ برانکو اس کی دکان کے سامنے روکی تب اس نے ناگوار نگاہوں کے ساتھ میری جانب دیکھتے ہوئے اپنا پوپلا منہ کھول کر چلاتے ہوئے کہا۔

''دکان بند ہوچکی ہے۔ اب صبح سے پہلے تمہیں شراب دستیاب نہیں ہوسکتی۔'' میں دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔ پھر خوش آمدانہ لہجے میں ہمکلام ہوا۔

''مجھے اس کی اشد ضرورت ہے اگر نہ ملی تو بے تحاشا نقصان ہوگا۔'' اس نے جھنجھلائے ہوئے لہجے میں میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''اگر اتنی ہی طلب تھی تو سرِشام آکر لے جاتے۔ یہ آنے کا مناسب وقت نہیں ہے۔''

میں نے بہانہ بناتے ہوئے جواب دیا۔

''طبیعت کی ناسازی کی بدولت ایسا نہیں کرپایا۔ ورنہ عام دنوں میں کوٹا ختم ہوجانے سے قبل ہی بندوبست کرلیتا ہوں۔'' بوڑھی عورت غصیلے لہجے میں مجھے دروازے کی طرف دھکیلتے ہوئے بولی۔

''میں کیش باکس مقفل کرچکی ہوں اور اسے دوبارہ کھولنا اب ممکن نہیں ہے۔ تم صبح آجانا۔''

مجھے اس سے اس بدتمیزی کی توقع نہیں تھی۔ لیکن احتجاج کرنا بھی اختیار سے باہر تھا۔ ہیڈے ٹاؤن کی وہ واحد دکان تھی جہاں سے اس وقت شراب کا ملنا ممکن تھا۔ اس لئے میں نے اس کی بدمزاجی کو فراموش کرتے ہوئے جیب میں سے بٹوہ باہر نکالا اور نوٹوں کی گڈی باہر نکال کر کاؤنٹر پر رکھ دی۔ بوڑھی عورت کی نگاہیں نوٹوں کی گڈی پر چپک کر رہ گئیں۔ پھر وہ تلخ لہجے میں بولی۔

''کون سا برانڈ چاہئے؟''

''رابن ہڈ.....'' میں نے مختصر جواب دیا۔

چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد وہ بولی۔

''میرے پاس اس کی محدود مقدار موجود ہے۔ میں قیمت کے علاوہ پچاس ڈالر اوپر لوں گی۔ اگر منظور ہو تو ہاں کردو۔ بصورت دیگر تمہیں صبح تک انتظار کرنا ہوگا۔'' مجھے اس کی کاروباری ذہنیت پر غصہ تو بہت آیا لیکن اپنی مجبوری کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے حامی بھر کر رقم کاؤنٹر پر رکھ دی۔ اس نے ایک جانب رکھا ہوا شراب کا کریٹ اٹھایا اور مجھے تھما کر رقم کیش باکس میں رکھنے لگی۔ میں جھنجھلائے ہوئے قدموں کے ساتھ دکان سے باہر نکل آیا۔ اس چند منٹوں کی بک بک نے میرے دماغ کی چولیں ہلا کر رکھ دی تھیں انہیں دوبارہ اپنی جگہ لانے کے لئے میں نے شراب کے کریٹ کو کھولا اور ایک بوتل باہر نکال کر بے تحاشہ اسے حلق میں انڈیلنے لگا۔

بوڑھی عورت دکان کے شٹر کو بند کرکے اسے تالا لگانے میں مصروف تھی۔ میں نے زیرلب اسے چند گالیوں سے نوازا اور تمام بوتل، خالی کرکے ڈیش بورڈ کے اوپر رکھ دی۔ میری دماغی حالت بہتر ہونے لگی لیکن شراب کا نشہ حواسوں پر طاری ہونے لگا۔

بوڑھی عورت نے شٹر کو تالا لگانے کے بعد ایک جانب رکھی ہوئی سائیکل کو ہاتھوں میں تھاما پھر اپنی سرخ رنگ کی ہاف بازوؤں والی جیکٹ، کو درست کرتے ہوئے اس کی ٹوپی کو سر پر اوڑھ لیا۔ اور میری گاڑی کے سامنے سے گزر کر دوسری طرف بنی ہوئی گلی میں داخل ہوگئی۔ ہلکی ہلکی بارش کا آغاز ہوگیا تھا اس ریگستانی علاقے میں یہ بارش کسی نعمت سے کم کا درجہ نہیں رکھتی تھی۔ ٹاؤن والوں کو اس نعمت سے استفادہ حاصل کرنے کا بہت کم اتفاق ہوتا تھا میں نے کریٹ میں سے دوسری بوتل باہر نکالی اور اس کا ڈھکنا کھولنے کے بعد چسکیاں لینی شروع کردیں بارش کی شدت میں اضافہ ہونے لگا۔ میں نے فورڈ برانکو کو اسٹارٹ کیا اور اپنے الٹے ہاتھ کی طرف جاتی ہوئی سڑک پر موڑ دیا۔

مجھے رہ رہ کر شراب فروش عورت پر غصہ آرہا تھا اس نے موقع کا ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی میں اس پر کلیم بھی کرسکتا تھا لیکن لاحاصل مجھے ناکامی کا ہی سامنا کرنا پڑتا اس ٹاؤن میں مجھے قانون کی بالادستی نہ ہونے کے برابر دکھائی دیتی تھی، شراب نے کام شروع کردیا اور میرا جسم جیپ کے جھٹکوں کے ساتھ جھولنے لگا۔ حواس معطل ہوتے چلے گئے۔

کتنی مضحکہ خیز بات تھی میں خود قانون توڑنے کے بعد قانون کی چیرہ دستیوں کے متعلق سوچ رہا تھا جیپ ڈیوس روڈ میں داخل ہوگئی روڈ سنسان پڑا تھا سیدھے ہاتھ کی طرف ٹیلی فون بوتھ سانتا کلاز کی مانند کھڑا تھا اس کا سرخ سفید رنگ اسے آسمانی فرشتے سے مشابہت دیتا تھا۔

بوڑھی شراب فروش عورت نے بھی سرخ وسفید رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے اسٹیئرنگ پر میرا ہاتھ بہک گیا اور گاڑی نے طوفانی رفتار کے ساتھ ٹیلی فون بوتھ کا رخ کیا۔ پھر اس کے پرخچے اڑا کر رکھ دیئے، میں نے پھرتی کے ساتھ اسٹیئرنگ کو سیدھا کیا گاڑی دوبارہ فٹ پاتھ سے ہوتی ہوئی سڑک پر آگئی میں نے قہقہہ لگاتے ہوئے گندی گالی سے شراب فروش عورت کو نوازا پھر ایکسیلیٹر پر دوبارہ دباؤ بڑھانا شروع کردیا۔

گاڑی ایک دفعہ پھر رفتار پکڑنی شروع کی اس کے بہترین شاک جیپ کی اوپری سطح کو جھٹکوں سے محفوظ رکھے ہوئے تھے۔

اچانک ہی مجھے سڑک کے درمیان میں وہ بوڑھی عورت سرخ جیکٹ میں ملبوس جاتی ہوئی دکھائی دی۔ اس کے قدموں میں لڑکھڑاہٹ تھی۔ شاید وہ شراب کے نشے میں دھت تھی۔ میری بند ہوتی ہوئی آنکھوں میں نفرت کی لہر دوڑنے لگی میں نے اسٹیئرنگ پر اپنی گرفت کو مضبوط کیا پھر گاڑی کا رخ لڑکھڑاتی ہوئی عورت کے ناتواں جسم کی طرف کردیا، بارش کی شدت میں بھی فورڈ برانکو کی رفتار کی مناسبت سے اضافہ ہورہا تھا۔ میں نے اگلے شیشے کا وائپر آن کردیا۔

دھندلاتا ہوا منظر واضح ہونے لگا اور پھر شراب فروش عورت کا وجود تیزی کے ساتھ قریب آتا چلا گیا یکلخت مجھے احساس ہوا کہ وہ وجود عورت کا نہیں تھا بلکہ اس کی لمبی اور سفید داڑھی اس بات کی گواہی دے رہی تھی کہ وہ کوئی بوڑھا مرد ہے۔

میں نے گھبرا کر بریک پر پاؤں رکھ دیا ماحول جیپ کے پہیوں کی چرچراہٹ سے گونج اٹھا۔ لیکن اتنی سی دیر میں وہ وجود گاڑی کے فرنٹ بونٹ سے پوری طاقت کے ساتھ ٹکرا کر اچھلا جیپ کو زبردست جھٹکا لگا۔ اور وہ اپنی جگہ پر گھوم کر رہ گئی۔

میں نے پھرتی کے ساتھ جیپ کا دروازہ کھولا اور باہر نکل کر حالات کا جائزہ لینے لگا مجھ سے چند گز کے فاصلے پر وہ بدنصیب شخص گوشت کے لوتھڑوں کی حالت میں دم توڑ رہا تھا۔ اور میری جیپ کے ٹائر مکمل طور پر خون میں لت پت تھے گوشت کے تڑپتے ہوئے

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

لوتھڑے سے لے کر میری ساکت کھڑی جیپ تک خون کی دبیز لکیر واضح تھی۔

میرے ہاتھوں میں موجود شراب کی بوتل دھماکے کے ساتھ زمین پر گری۔ میں نے چونکتے ہوئے بوتل کی کرچیوں کی طرف دیکھا بارش کی ٹھنڈی بوندوں نے میرے معطل ہوتے ہوئے حواسوں کو یکجا کیا اور گاڑی میں بیٹھ کر اسے گھر کی طرف بھگانا شروع کر دیا، گاڑی کے ٹائر خون سے بھرے ہوئے تھے انہیں جلد از جلد صاف کرنا ضروری تھا جو بھی ہوا تھا وہ نادانستگی کے عالم میں ہوا تھا، میں اسے کچلنا نہیں چاہتا تھا۔

مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ شراب فروش عورت نہیں ہے اس کے مغالطے میں ناحق میرے ہاتھ خون سے رنگ گئے تھے گھر میں داخل ہونے کے بعد میں نے ڈیٹرجنٹ ملے پانی کے ساتھ ٹائروں کو اچھی طرح دھویا پھر صحن کو صاف کرنے کے بعد ٹی وی لاؤنج میں آ کر بیٹھ گیا میرا نشہ اڑن چھو ہو چکا تھا۔ اور اب میں اپنے ہوش وحواس میں تھا۔

میں نے آگے بڑھ کر ریڈیو کا بٹن آن کیا اور سوئی کو ایڈجسٹ کرنے لگا مختلف میوزک چینلوں کی بھرمار تھی لیکن ایک لوکل چینل کرائم سے بھرپور خبروں کے لئے مختص تھا۔ میں نے فریکونسی والی سوئی کو وہاں ایڈجسٹ کر دیا اناؤنسر نہایت نرم گرم آواز میں ہمکلام تھا۔

''ہیڈے ٹاؤن کا موجودہ دن سال کا گرم ترین دن ثابت ہوا۔ کاروبار زندگی آدھے دن تک مفلوج رہنے کے بعد سرِشام بیدار ہوئی گھروں میں مقید لوگوں نے ضروریات زندگی کی خرید وفروخت کے لئے ٹاؤن کا رخ کیا خریداری کے ان اوقات کے دوران لوگوں کا ہجوم غیر اشیاء خورد ونوش کی دکانوں پر دکھائی دیا لیکن سات بجے کے بعد خاموشی طاری ہوتی چلی گئی۔''

میں نے زیرلب گالی دیتے ہوئے فریکونسی بدل دی کہ ایم چینل پر گزرے ہوئے دن کی مصروفیات بیان کی جارہی تھیں جاہل چینل والے ..... میں نے سوئی کو جھنجھلاہٹ کے عالم میں دائیں جانب گھمانا شروع کر دیا اس دفعہ مجھے کامیابی حاصل ہوئی ایک چینل پر حادثے کی باریکیوں سے ہیڈے ٹاؤن کے مختصر رہائشیوں کو مطلع کیا جارہا تھا۔ میں نے سوئی کو ایڈجسٹ کرنے کے بعد کان اناؤنسر کی آواز پر لگا دیئے۔ وہ کہہ رہی تھی۔

''سامعین..... میں اس حادثے کی رپورٹ سے دوبارہ آپ کو آگاہ کرتی ہوں کہ چند لمحات پہلے ڈیوس روڈ نمبر پینسٹھ کے قریب یہ اندوہناک واقعہ وقوع پذیر ہوا ہے حادثے میں ہیڈے ٹاؤن کے میئر ٹونی ہیکسن کے بوڑھے باپ کو جن کا دماغی توازن برقرار نہیں تھا انہیں بے دردی کے ساتھ ہلاک کر دیا گیا ہے پولیس کی نفری ڈیوس روڈ پہنچ گئی ہے میئر ٹونی ہیکسن کی عدم موجودگی کے باوجود بھی پولیس کے اہلکار نہایت مستعد دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے کہنے کے مطابق اگلے چوبیس گھنٹوں کے دوران مجرم کی گرفتاری ممکن بنانے کی حتی الوسع کوشش کی جائے گی، یاد رہے ٹونی ہیکسن کی آمد بھی چوبیس گھنٹوں کے دوران متوقع ہے ہمارے رپورٹر کے مزید کہنے کے مطابق جائے وقوعہ کے قریب شراب کی بوتل کی کرچیوں پر مبنی کچھ ٹکڑے ایسے دستیاب ہوئے ہیں جن کا برانڈ کم نایاب ہونے کی بدولت اکثر اوقات عدم دستیابی کا موجب بنا رہتا ہے ٹاؤن میں ایسے دکان دار کے متعلق معلوم کرنا مشکل نہیں جن کے پاس اس شراب کا ذخیرہ حادثے والے دن دستیاب تھا۔'' اناؤنسر کی آواز آنا چند لمحوں کے لئے بند ہوگئی۔ پھر دوبارہ پرجوش انداز میں سنائی دی۔

''سامعین..... ایک حالیہ ثبوت کے متعلق معلومات آپ کو باہم پہنچانے کا سبب بننے والی ہوں ہمارے رپورٹر کو داد ضرور دیجیے گا۔ اس ثبوت کی نشان دہی کا سبب وہی بنا ہے اسکے کہنے کے مطابق لاش کو کچلنے والی گاڑی کے ٹائروں پر ایک مخصوص کمپنی کا مونوگرام پایا گیا ہے اور یہ مونوگرام فورڈ کمپنی پر مشتمل ہے میں دوبارہ دوہرائے دیتی ہوں مونوگرام فورڈ کمپنی کے مختصر الفاظ پر مشتمل ہے۔ گاڑی کے ٹائروں کے نشانات حالیہ ہونے والی بارش کی بدولت غیر واضح ہیں لیکن جائے

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

اچھی اور معیاری کتب کے لئے

دعا بک کارنر

جہاں پر افسانے، شاعری، ناول، بچوں کی کہانیاں، SMS بکس، سیرت، پکوان کی کتابیں، اسلامی بکس، میگزین، ڈائجسٹ، رسالے، ڈکشنریاں، نعت، اور بہت سے مختلف موضوعات پر مبنی کتابیں دستیاب ہیں۔

تمام کتابیں مناسب قیمت پر دستیاب ہیں۔

گلی نمبر 5 منشی محلہ امین پور بازار
فیصل آباد

PH:041-2640013

وقوعہ کے قریب کچھ دور تک خون سے بھرپور ان نشانات پر کمپنی کا مونوگرام صاف، پڑھا جاسکتا ہے۔ یہ نشانات مدہم ہونے کے باوجود بھی مجرم کی نشاندہی کا سبب بن سکتے ہیں اگر طوفانی بارش ان نشانات کو تلف کرنے کا باعث نہ بنتی۔ تو اب تک پولیس مجرم تک پہنچ چکی ہوتی۔''

میں نے گھبرا کر ریڈیو کا بٹن آف کردیا۔ اور اٹھ کر گاڑی کی طرف چلا آیا۔ گاڑی کے ٹائروں پر واقعی مونوگرام کھدا ہوا تھا۔ ٹائر دھلنے کے بعد اور بھی واضح دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے گیٹ کھولا۔ اور ریت سے بھرپور سڑک کا معائنہ شروع کیا۔ گیٹ کے قریب جیپ کے ٹائروں کے منہدم ہوتے نشانات موجود تھے۔ لیکن سڑک پر برستی ہوئی بارش کی بدولت باقی نشانات صاف ہوچکے تھے۔ میں نے صحن میں ایک طرف رکھے ہوئے جھاڑو کو اٹھایا اور گیٹ کے قریب موجود نشانات کو صاف کرنے لگا۔ بارش رک گئی تھی اور آسمان کھلنے لگا تھا نشانات صاف کرنے کے بعد میں نے دوبارہ ٹی وی لاؤنج کا رخ کیا اور شراب پیتے ہوئے دل میں پکا تہیہ کرلیا کہ اگلے دن ہیڈے ٹاؤن کو چھوڑ کر شہر جانے کی کوشش کروں گا۔

تمام رات پریشانی کی بدولت مجھے نیند نہیں آئی۔ علی الصباح ریڈیو پر خبریں سننے کے بعد مجھ پر انکشاف ہوا۔ ''ہیڈے ٹاؤن کے تمام داخلی اور خارجی راستوں کو دو دن کے لئے مکمل طور پر بند کردیا گیا ہے۔''

پولیس ڈپارٹمنٹ کے کہنے کے مطابق ان کی تفتیش کا دائرہ کارڈیوس روڈ کے اردگرد محدود تھا۔ اور انہیں اس ایریے کے درمیان مجرم کی پوشیدگی کا یقین تھا۔ ٹاؤن کے رہائشیوں سے معذرت کرتے ہوئے انہوں نے تعاون کی اپیل کی تھی ان کے مزید کہنے کے مطابق ٹاؤن کی تمام گاڑیوں کے ٹائر چیک کرنے کے لئے انہیں پولیس کے اہلکاروں کی مزید نفری دستیاب تھی اور یہ نفری دوپہر کے بارہ بجے تک ٹاؤن میں پہنچنے والی تھی۔ میں ٹاؤن میں بری طرح پھنس گیا تھا داخلی اور خارجی راستوں پر ناکہ بندی کی بدولت ٹاؤن سے باہر نکلنا اب ممکن نہیں رہا تھا لیکن مجھے جلد از جلد فورڈ برانکو کے ٹائروں سے چھٹکارا حاصل کرلینا چاہئے تھا۔ یہ وہ واحد ثبوت تھے جو مجھے بوڑھے شخص کا قاتل ثابت کرسکتے تھے میں نے ٹی وی لاؤنج کے قریب رکھے ہوئے ٹیلی فون کا ریسور اٹھایا اور میگی کا نمبر ڈائل کرنے لگا سنڈے کا دن تھا اسے گھر پر ہی موجود ہونا چاہئے تھا دوسری بیل پر مجھے اس کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی۔

''میں میگی بات کررہی ہوں۔ آپ کو کس سے بات کرنی ہے؟''

میں نے پریشان لہجے میں اسے فوراً سے پیشتر گھر آنے کا حکم دیتے ہوئے ریسیور کو کریڈل پر پٹخ دیا اور شراب کی بوتل اٹھا کر اس کے گھونٹ بھرنے شروع کردیئے آدھا گھنٹہ میں۔

آدھے گھنٹے سے کچھ زیادہ کا وقت تھا کہ میگی آگئی اس کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات ثبت تھے۔ اندر داخل ہونے کے فوراً بعد اس نے مجھ سے خیریت دریافت کی۔ میں نے جواب دینے کے بجائے الٹا سوال کردیا۔

''تمہیں حالات حاضرہ سے کچھ دلچسپی ہے۔ یقیناً تم ریڈیو تو سنتی ہی ہوگی۔'' اس نے حیرت بھرے لہجے میں جواب دیا۔

''بے شک..... لیکن صرف مخصوص گانوں کے چینلوں کی حد تک..... مجھے خبریں سننے کا شوق نہیں ہے۔'' میں نے سر ہلاتے ہوئے پوچھا۔

''یعنی تم ٹاؤن کے حالات سے باخبر نہیں ہو۔''

اس نے چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد پریشان لہجے میں پوچھا۔

''کہیں آپ میئر کے والد والے حادثے کے متعلق تو بات نہیں کرنا چاہتے۔'' میں نے اقرار میں سر ہلایا۔

''بات کچھ ایسی ہی ہے۔ یقین جانو جو کچھ بھی ہوا نادانستگی کے عالم میں ہوا۔ اس میں کوئی ذاتی مفاد یا کسی بھی قسم کی دشمنی اور رنجش نہیں پائی جاتی۔ وہ اچانک ہی میری

گاڑی کے سامنے آگیا تھا اور میں نے اسے کچل دیا۔''

میگی کا منہ حیرت کے مارے کھل گیا۔ آنکھیں پھٹ کر حلقوں سے باہر آنے لگیں۔ پھر اپنی حالت پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

''نادانستگی میں ہی صحیح لیکن آپ بہت بڑی مصیبت میں پھنس چکے ہیں۔ میئر ٹونی ہیکسن کے باپ ہیڈے ٹاؤن کی معزز ترین ہستی کا اختیار رکھتا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ اس وقت آپ کی گرفتاری کی پیش رفت کے لحاظ سے تمام ٹاؤن کے رہائشی سرگرم عمل ہیں۔ ٹاؤن کے خارجی اور داخلی تمام راستے کچھ عرصے کے لئے بند کردیئے گئے ہیں اور مخصوص مونوگرام والے ٹائروں کی گاڑی کو تلاش کیا جارہا ہے وہ ٹاؤن کے ہر اس خاندان کی تلاشی لے رہے ہیں جہاں گاڑی موجود ہو۔''

میں نے پریشان لہجے میں اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''کیا میری گاڑی کے ٹائر تبدیل نہیں ہوسکتے۔ ان کے پاس واحد ثبوت گاڑی کے مونوگرام پر مشتمل ٹائروں کا ہے۔ وہ ٹائر جس کے پاس ہوں گے ان کی نگاہ میں قاتل وہی ہوا۔'' میگی انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

''اب یہ بھی ممکن نہیں۔ ٹاؤن میں ٹائر فروخت کرنے والی چار دکانیں پائی جاتی ہیں ان دکانوں پر پولیس کے اہلکار متعین کئے جاچکے ہیں۔ وہ ہر آنے جانے والے کسٹمر سے پوچھ گچھ کرنے کے بعد خرید و فروخت کی اجازت دیتے ہیں۔''

میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا پھر جھنجلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اب اس کے علاوہ مزید چارہ کار باقی نہیں بچا ہے کہ میں اپنے آپ کو خود ہی ان کے حوالے کردوں۔ یہ اتفاقیہ حادثہ تھا شاید سزا میں کچھ تخفیف کردی جائے۔''

میگی بولی۔ ''آپ کی خوش فہمی ہے۔ قاتل کی صورت میں جو بھی ٹاؤن والوں کے سامنے پیش کیا جائے گا اس کے بچنے کے امکان نہ ہونے کے برابر ہوں گے اس کے علاوہ ناگہانی واقعہ میں آپ قانون کی خلاف ورزی کے مرتکب ہیں، شراب کی بوتل کی کرچیاں جائے حادثہ سے دستیاب ہوچکی ہیں ایسی صورت میں اگر آپ کو پھانسی کی سزا نہ بھی ہوئی تو عمر قید کی ضرور ہوجائے گی۔''

میں نے بے اختیار آگے بڑھتے ہوئے میگی کے دونوں ہاتھ تھام لئے اور اس کے قدموں میں بیٹھتے ہوئے التجائیہ لہجے میں کہا۔

''میری مدد کرو میگی۔ تمہارے علاوہ کوئی نہیں کرسکتا۔ ہیڈے ٹاؤن مجھ پر راس نہیں آرہا۔ میں نے اپنے اور تمہارے بارے میں بہت کچھ سوچا تھا۔ سب درہم برہم ہوکر رہ گیا۔''

میگی نے بات درمیان میں کاٹتے ہوئے پوچھا۔

''کیا میں جان سکتی ہوں۔ کہ آپ نے میرے اور اپنے بارے میں کیا سوچا تھا یقیناً کچھ اچھا ہی ہوگا۔ میں جاننے کی خواہش مند ہوں۔''

میں نے اس کے دونوں ہاتھوں کو چومتے ہوئے جواب دیا۔

''مجھے تمہارے جیسے ساتھی کی ضرورت تھی۔ چند ہی ملاقاتوں کے دوران میں تمہیں پسند کرنے لگا ہوں۔ کل رات حادثے سے قبل میں نے دل میں پکا تہیہ کیا تھا۔ کہ مسودہ مکمل ہونے کے فوراً بعد تم سے شادی کرکے تمہیں اپنے ہمراہ نیویارک لے جاؤں گا۔ حادثہ اسی فیصلے پر پہنچنے کے دوران ہوا تھا۔''

میگی نے جھٹکے کے ساتھ اپنے ہاتھ کو میرے ہاتھوں سے چھڑایا۔ پھر تلخ لہجے میں بولی۔

''شاید خدا کو ایسا منظور نہیں تھا۔ اسی وجہ سے حادثہ ہوا۔ اگر بات صرف ٹاؤن سے فرار ہونے کی ہے تو اس کے لئے محبت کا ڈھونگ رچانا ضروری نہیں ہے اس کے بغیر بھی میں مدد کرنے کے لئے تیار ہوں۔ مجھے بھیک میں ملی ہوئی محبت کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے پشیمان لہجے میں مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''میں جانتا ہوں کہ اظہار محبت کے لئے یہ وقت مناسب نہیں۔ میں اس کے لئے معافی چاہتا ہوں لیکن

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

حقیقت وہی ہے جس کا میں نے اظہار کیا تم یقین کرو یا نہ کرو۔ میں مصیبت سے جان خلاصی کے بعد تم سے شادی ضرور کروں گا۔"

میگی ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولی۔ "میرے خیال میں یہ وقت ان باتوں کے لئے مناسب نہیں پولیس کسی بھی وقت آپ کے گھر کا رخ کرسکتی ہے۔ اس سے قبل ہمیں ان منحوس ٹائروں سے نجات حاصل کرلینی چاہئے۔

میں نے اس کے ہاتھوں کو یکدم چھوڑ دیا اور دوبارہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے رو دینے والے لہجے میں پوچھا۔

"کیا تمہارے دماغ میں کوئی ایسی تدبیر موجود ہے جس کو بروئے کار لا کر میں ٹاؤن سے فرار ہوسکوں۔"

اس نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

"نہیں..... لیکن کوشش ضرور کرسکتی ہوں۔ گاڑی کے چاروں ٹائروں کو نکال کر ٹی وی لاؤنج میں چھپا دیجیے۔ میں اندھیرا پھیلنے کے بعد انہیں اپنے ہمراہ لے جاؤں گی۔ اگر یہ ٹائر میرے گھر میں پوشیدہ رہیں تو کچھ مغالطہ نہیں۔ یاد رہے ٹاؤن کی پولیس ان گھروں کی تلاشی میں سرگرداں ہے جہاں گاڑیاں پائی جاتی ہیں، میرے ایک کمرے کے مکان میں گاڑی کھڑی کرنے کی جگہ نہیں۔ اس لئے وہ اسے قابل توجہ نہ گردانتے ہوئے تفتیش سے انحراف کریں گے۔"

میں نے کہا۔ "لیکن شک کے زمرے سے باہر پھر بھی نہیں نکل پاؤں گا میری گاڑی کے غائب ہونے والے چاروں ٹائر مجھے ہمیشہ کے لئے مشکوک بنادیں گے۔ میں ان کی گمشدگی کی کہانی بیان کرنے کے قابل نہیں۔ اور وہ وجہ ضرور دریافت کریں گے۔"

میگی چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ "پولیس والوں کی تفتیدی نگاہوں سے بچنے کے لئے یقیناً آپ کو چار عدد ایسے ٹائر دستیاب ہونے چاہئیں۔ جن پر کسی بھی قسم کا مونوگرام موجود نہ ہو۔ میرے اسکول کا ایک کولیگ ایسا ٹاؤن میں موجود ہے۔ جو ٹائروں کی دستیابی میں معاون ثابت ہوسکتا ہے اس کے پاس پرانے ماڈل کی جیپ بھی ہے۔ اگر وہ ٹائروں کی خریداری کے لئے ٹائروں کی دکان کا رخ کرے گا تو مجھے یقین ہے کہ پولیس والوں کی پوچھ گچھ اور جانچ پڑتال میں پورا اترنے کے بعد ٹائروں کی خریداری میں کامیاب ہوجائے گا۔"

میں نے ممنونانہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بے صبری کے ساتھ کہا۔

"میں ٹائروں کو جیپ سے علیحدہ کرتا ہوں تم رات کو آکر انہیں اپنے ہمراہ لے جانا یقین جانو میں تمہارے احسان کو زندگی بھر یاد رکھوں گا۔"

میگی صوفے سے اٹھتے ہوئے بولی۔

"مجھے مکالمے بازی پسند نہیں ہیں۔ ٹائروں کی دستیابی کے لئے مجھے رقم کی ضرورت پڑسکتی ہے وہ آپ کو ابھی ادا کرنا ہوگی میں کوشش کروں گی کہ جلد از جلد ٹائروں کا انتظام کرلوں آپ رات کو فورڈ برانکو کے چاروں ٹائروں کو میرے گھر منتقل کردیجیے گا۔ انہیں سائیکل پر رکھ کر وہاں لے جانا مشکوک ہوگا۔ علاوہ ازیں میں کوشش کروں گی کہ چاروں ٹائروں کی خریداری یکمشت نہ ہو اس کے لئے مجھے اپنے اسکول کے کسی دوسرے کولیگ کو بھی ساتھ ملانا ہوگا چاروں ٹائروں کی ایک دم خریداری سے بھی پولیس کے اہلکار چوکنے ہوسکتے ہیں۔"

میں نے تعریفی نگاہوں سے میگی کی طرف دیکھا اور اٹھ کر اندرون کمرے کی طرف رقم لینے کے لئے چل دیا، رقم اسے تھمانے کے بعد اظہار تشکر کے طور پر ایک دفعہ پھر میں نے اس کے ہاتھوں کو تھامنے کی کوشش کی لیکن وہ بے دردی کے ساتھ میرے ہاتھوں کو جھٹکتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔

میگی کا سرد رویہ میری سمجھ سے باہر تھا۔ میری شخصیت مجھے لڑکیوں میں ممتاز کرتی تھی لیکن میگی میری شخصیت کے اختیار سے باہر تھی۔ میرے پاس سوچنے سمجھنے کا وقت نہیں تھا میں جلد از جلد ہیڈے ٹاؤن سے جان چھڑا کر نیویارک بھاگ جانا چاہتا تھا۔ اور میگی کا وجود میرے فرار میں مددگار ثابت ہوسکتا تھا، میں اسے اپنے رویے سے بھڑکانا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے میں نے

خاموشی کے ساتھ فورڈ برانکو کے چاروں ٹائر علیحدہ کردئے اور جیپ کو اینٹوں کے سہارے کھڑا کردیا پھر میگی کے انتظار میں ٹی وی لاؤنج میں بیٹھ کر شراب نوشی کرنے لگا۔

میگی کی واپسی تین گھنٹے کے بعد ہوئی۔ اس کے ہمراہ پچیس سال کا ایک نوجوان لڑکا بھی تھا جس کا نام ہیری تھا۔ وہ دونوں پرانی فوجی جیپ میں آئے تھے اور ان کے ساتھ چار عدد استعمال شدہ ٹائر موجود تھے۔ میں نے ایک دفعہ پھر میگی اور ہیری کی امداد پر ان دونوں کا شکریہ ادا کیا لیکن انہوں نے سپاٹ لہجے میں مجھے فورڈ برانکو کے چاروں استعمال شدہ مشکوک ٹائر فوجی جیپ میں منتقل کرنے کے لئے کہا، وہاں پچھلے حصے میں تربوز اوپر سے نیچے تک بھرے ہوئے تھے۔ یہ تربوز ٹاؤن سے باہر سے لائے گئے تھے میں نے اور ہیری نے فورڈ برانکو کے چاروں ٹائروں کو تربوزوں کی کھیپ کے نیچے دفن کیا اور پھر وہ دونوں واپس چلے گئے۔ میں نے طویل سانس لیتے ہوئے گیٹ کو بند کیا اور دونوں کی عقلمندی کو داد دیتے ہوئے استعمال شدہ ٹائروں کو فورڈ برانکو کے وہیل میں لگانے لگا، نئے ٹائر پولیس کو شک میں مبتلا کرنے کے باعث بن سکتے تھے اس لئے ان دونوں کا استعمال شدہ ٹائر لانا قابل تعریف تھا لیکن ان دونوں کے سرد رویوں نے مجھے جھنجھلاہٹ میں مبتلا کرکے رکھ دیا تھا۔

آج کے دن سے قبل میگی کا رویہ ایسا نہیں تھا مجھے اس پر کچھ غصہ آنے لگا لیکن میں نے اسے شراب نوشی کی شدت میں دفن کردیا، ہیڈے ٹاؤن سے باہر جانا ناکہ بندی کی بدولت ممکن نہیں تھا۔ ٹاؤن میں اب میں محفوظ تھا اس لئے مجھے اس کی فکر بھی نہیں تھی آج نہ سہی دو دن بعد ہی سہی..... مجھے باہر جانے سے کوئی روک نہیں سکتا تھا۔ لیکن یہ میری خام خیالی ثابت ہوئی ہیڈے ٹاؤن مجھے راس نہیں آرہا تھا یہ میرے لئے ایک ایسی دلدل ثابت ہورہا تھا جس میں سے فرار کے لئے میں جتنی جدوجہد کرتا تھا اتنا نیچے کی طرف دھنستا چلا جاتا تھا۔

شام کو چھ بجے کے قریب دروازے کی بیل بجی میں نے دروازہ کھولا تو سارجنٹ جیف کو اپنا منتظر پایا۔ وہی سارجنٹ تھا جسے میں نے ٹاؤن میں داخل ہوتے ہوئے ایکسیڈنٹ میں ملوث بازار کے درمیان میں پایا تھا۔ اس وقت اس کے چہرے پر سنجیدہ تاثرات موجود تھے۔ میں نے آنے کی وجہ دریافت کی تو وہ درشت لہجے میں بولا۔

"مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔"

"یہاں نہیں..... اندر بیٹھ کر..... گرمی بہت زیادہ ہے اور مجھے شراب کی طلب بھی محسوس ہورہی ہے۔" میں نے اسے اندر آنے کے لئے کہا۔ مجھے اس سے اتنی جلدی ملاقات کی توقع نہیں تھی، نہ جانے میری ایسی کون سی غلطی اسے یہاں تک لانے کا سبب ثابت ہوئی تھی جو اس وقت وہ میرے سامنے موجود تھا۔ بہرکیف وہ میرے پیچھے اندر چلا آیا۔ ٹی وی لاؤنج میں قدم رکھتے ہی اس کی نگاہ میری مخصوص شراب کی بوتل سے چپک کر رہ گئی۔ اس نے بے تابانہ قدموں سے آگے بڑھتے ہوئے بوتل کو اٹھایا پھر لمبا گھونٹ بھرتے ہوئے بولا۔

"مجھے اسی کی تلاش تھی۔ اور مجھے یقین تھا کہ یہ یہیں سے دستیاب ہوگی۔"

میں نے پریشان لہجے میں یقین کی وجہ دریافت کی۔ تو وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"کل رات میئر کے باپ کو بے دردی کے ساتھ قتل دیا گیا ہے اس کی لاش کے پاس سے شراب کی ٹوٹی ہوئی بوتل کی کرچیاں ملی ہیں اور وہ کرچیاں اسی برانڈ سے متعلق ہیں، ہیڈے ٹاؤن میں شراب کی صرف تین دکانیں پائی جاتی ہیں۔ دو دکان پر اس مہنگی شراب کی عدم دستیابی ثابت ہوئی لیکن تیسری دکان کی بوڑھی مالکہ اس شراب کی خرید و فروخت میں ملوث تھی، ہماری پوچھ گچھ کے بعد اس نے بتایا کہ گزشتہ روز صرف ایک گاہک اس شراب کا دکان میں آیا اور اس کے پاس سیاہ رنگ کی شکاری جیپ تھی اس نے مہنگی شراب کا مکمل کارٹن خریدا۔ اور ڈیوس روڈ پر آگے چلا گیا۔ اور تم جانتے ہو کہ یہ وہی روڈ ہے جہاں حادثہ ہوا۔"

میں نے استفہامیہ لہجے میں پوچھا۔ "یعنی

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

تمہارے کہنے کے مطابق میئر والے واقعہ میں..... میں ملوث ہوں۔'' سارجنٹ نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

''ابھی حتمی طور پر کچھ کہنا ممکن نہیں ہے۔ لیکن شواہد کے منظر عام تک آنے سے پہلے اب تم ہیڈے ٹاؤن سے باہر نہیں جاسکتے۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور وہ شراب کی بوتل اٹھا کر ٹی وی لاؤنج سے باہر نکل گیا، باہر میری فورڈ برانکو کھڑی ہوئی تھی وہ اس کے قریب جا کر رک گیا پھر ٹائروں کو چیک کرنے لگا، وہ مٹی اور گرد سے اٹے ہوئے تھے چند لمحے کے معائنہ کے بعد وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

''میئر کے باپ کو کچلنے والی گاڑی کے ٹائر اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ گاڑی بڑی اور بھاری تھی شاید تمہاری جیپ کی طرح..... لیکن اس کے ٹائروں پر فورڈ کمپنی کا مونوگرام نہیں بنا ہے۔ اور ٹائر گرد آلود بھی ہیں شراب فروش بوڑھی عورت کے کہنے کے مطابق تم رات کو پونے دس بجے کے قریب اس کی دکان میں داخل ہوئے تھے۔ حادثہ دس بج کر پانچ منٹ پر وقوع پذیر ہوا میرے اندازے کے مطابق یہ وہی وقت تھا جب تمہاری شکاری جیپ ڈیویس روڈ سے گزر کر رہائشی علاقہ جات کی طرف بڑھ رہی تھی بوڑھی کے مزید کہنے کے مطابق اس وقت موسلا دھار بارش کا آغاز ہوا تھا۔ تمہاری گاڑی کے ٹائروں کو بارش کی بدولت کیچڑ میں لت پت ہونا چاہئے تھا۔ لیکن حیرت انگیز طور پر ایسا نہیں ہوا۔ یہ صرف گرد آلود ہیں تم اس غیر معمولی بات کی وجہ تسمیہ بیان کرسکتے ہو۔

میں برجستگی کے عالم میں بولا۔

''کچھ بڑی بات نہیں ہے میں نے گھر آنے کے فوراً بعد ٹائروں کو ڈیٹرجنٹ ملے پانی کے ساتھ دھو ڈالا تھا کیچڑ سے بھرے ٹائر بدنما داغوں کا باعث بن رہے تھے۔''

سارجنٹ کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ سرد لہجے میں بولا۔

''لیکن تمہاری جیپ کے ٹائر اس وقت گرد آلود ہیں ان کی حالت کو دیکھ کر یہ کہنا ناممکن نہیں کہ مہینے بھر سے انہیں دھویا نہیں گیا۔''

میں نے زبردستی قہقہہ لگاتے ہوئے جواب دیا۔

''اگر قریبی ریگستان کا طویل اور پیچیدہ راؤنڈ لگایا جائے تو نئی گاڑی کے ٹائروں کی حالت میری جیپ کے ٹائروں سے مختلف نہیں ہوگی، تم میری بات کی تہہ تک پہنچ گئے ہو گے ظاہر ہے۔ اس کے کیچڑ آلود ٹائروں کو دھوئے ہوئے بیس گھنٹے سے کچھ زیادہ کا وقت گزر چکا ہے آج صبح ہی میں نے، ریگستان کا طویل چکر لگایا ہے جس کی بدولت ٹائر گرد آلود ہو گئے ہیں۔''

سارجنٹ کے چہرے پر سوچ کے تاثرات ابھرے۔ اس نے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی شراب کی بوتل کو ہونٹوں کے ساتھ لگایا اور طویل گھونٹ بھرنے کے بعد دوبارہ سرد لہجے میں بولا۔

''نہ جانے کیوں مجھے یہ ٹائر تمہاری جیپ کے دکھائی نہیں دیتے۔ یقیناً تمہارے پاس اس کمپنی کا رابطہ نمبر موجود ہوگا۔ میں انہیں تفتیش کے دائرہ کار میں داخل کرنا چاہتا ہوں مجھے لگتا ہے کہ فورڈ کا مخفف فورڈ برانکو کے ٹائروں پر ہی پایا جاتا ہے پوچھنا ضروری ہے۔''

میں نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

''کمپنی کا نمبر میرے پاس موجود نہیں ہے۔ میرے اندازے کے مطابق اسے میرے نیویارک والے فلیٹ میں ہونا چاہئے جیپ کو خریدے ہوئے دو سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے اگر ایسا کوئی نمبر موجود بھی ہوا تو اسے کاغذوں کے درمیان میں ہی ہونا چاہئے۔''

سارجنٹ تلخ لہجے میں بولا۔ ''میں رابطہ نمبر معلوم کرلوں گا۔ لیکن رخصت ہونے سے پہلے تمہیں دوبارہ تنبیہ کروں گا کہ کیس کے اختتام سے پہلے اب تم ہیڈے ٹاؤن سے باہر جانے کی کوشش نہیں کرو گے۔ تمہارے بیان کردہ مفروضات میں تضاد پایا جاتا ہے ان کی دوری تک میں تمہیں مشکوک قرار دیتا ہوں۔ اگر تم نے ٹاؤن سے باہر ریگستان کا رخ کیا ہے تو نا کہ بندی پر معمور

اہلکاروں کے پاس اس کا اندراج ضرور موجود ہوگا میں چند لمحوں میں معلومات حاصل کرکے واپس آتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ تم فرار ہونے کی کوشش نہیں کرو گے۔'' وہ بات مکمل کرنے کے بعد مکان سے باہر نکل گیا۔

میں نے پریشانی کے عالم میں میگی کو فون کیا۔ اور حالات سے آگاہی کے بعد ٹاؤن سے فرار کے راستوں کے متعلق دریافت کیا۔ اس نے مجھے انتظار کرنے کے لئے کہا اور پندرہ منٹ بعد اپنی سائیکل کے ہمراہ میرے گھر چلی آئی، ٹی وی لاؤنج میں بیٹھنے کے بعد دھیمے لہجے میں بولی۔

''آپ کو ریگستان کی طرف جانے کا بہانہ نہیں بنانا چاہئے تھا۔ ٹاؤن کے اندر اور بہت سی ضروریات کے لئے جیپ درکار ہوسکتی تھی جیپ کے ساتھ باہر کا رخ کرنا اب اندراج کے بغیر ممکن نہیں۔'' میں نے تاسف بھرے لہجے میں جواب دیا۔

''تم ٹھیک کہتی ہو۔ لیکن اس کے اوپر تلے سوالوں جوابوں سے بوکھلا کر میں یہ غلطی کر بیٹھا۔ وہ یقیناً ٹاؤن سے باہر نا کہ بندی پر مامور اہلکاروں سے معلومات حاصل کرنے کے لئے جائے گا۔ جیسے ہی اسے یہ معلوم ہوگا کہ میں نے اس کے ساتھ غلط بیانی سے کام لیا ہے تو وہ بھاگتا ہوا مکان کا رخ کرے گا اس کے بعد مجھے پھانسی پر چڑھنے سے کوئی بھی بچا نہیں پائے گا۔''

میگی بولی۔ ''اور یقیناً فورڈ کمپنی سے اسے یہ معلوم کرنے میں دشواری پیش نہیں آئے گی کہ جیپ کے ٹائروں پر ان کا مونوگرام فورڈ کے نام کا کھدا ہوتا ہے۔ آپ بری طرح پھنس چکے ہیں۔ لیکن آپ فکر نہ کریں میں سب کچھ سنبھال لوں گی۔ حالات اب بھی میرے اختیار سے باہر نہیں ہیں۔''

میں نے حیرت بھری نگاہوں کے ساتھ اس کی طرف دیکھا اور کچھ پوچھنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ باہر کے دروازے کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

''وہ منحوس آ گیا ہے اب ٹاؤن سے بھاگنا بھی ممکن نہیں رہا۔ خود کو گرفتاری کے لئے پیش کردینا زیادہ بہتر رہے گا۔''

میگی نے کوئی جواب نہیں دیا اور میں ٹی وی لاؤنج سے نکل کر باہر چلا آیا گھنٹی متواتر بجتی چلی جارہی تھی وہ جو کوئی بھی تھا گھنٹی پر ہاتھ رکھنے کے بعد اٹھانا بھول گیا تھا۔ میں نے جھٹکے کے ساتھ دروازہ کھول دیا اور خلاف توقع شراب فروش بوڑھی عورت کو سامنے کھڑے پایا۔ اس کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ رقص کررہی تھی۔ میں نے حیرت بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے آنے کی وجہ دریافت کی۔

وہ بدستور مسکراتے ہوئے بولی۔ ''میرے خیال میں تمہیں وجہ دریافت کرنے کی ضرورت نہیں محسوس ہونی چاہئے۔ حالات سے آگاہی تمہیں بھی ہے اور مجھے بھی..... شاید مجھے کچھ زیادہ ہے۔ اگر اندر بیٹھ کر بات چیت کرلیں تو زیادہ بہتر ہوگا، بات ختم ہونے کے فوراً بعد اس نے مجھے ایک جانب دھکیلا اور مکان کے اندر گھستی چلی گئی۔ صحن میں کھڑی ہوئی فورڈ برانکو پر اس کی نگاہیں چپک کر رہ گئیں۔

پھر وہ سرد لہجے میں بولی۔ ''یقیناً میں نے اسی شکاری جیپ کو اپنی دکان کے سامنے کھڑے ہوئے دیکھا تھا۔ لیکن جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔ اس وقت جیپ کے وہیل کیپ اور ٹائروں پر فورڈ کمپنی کا مونوگرام بنا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ ٹائر بھی کچھ بہتر حالت میں تھے۔ مجھے یقین ہے کہ انہیں تبدیل کردیا گیا ہے۔''

میں نے گھبراہٹ کے عالم میں کہا۔ ''تم پاگل تو نہیں ہوگئی ہو۔ مجھے ٹائر تبدیل کرنے کی بھلا کیا ضرورت ہے تمہاری مہربانی ہوگی اگر اپنے آنے کا مقصد جلد از جلد بیان کرنے کے بعد مجھے کام کرنے کی اجازت دے دو میں نہایت مصروف ہوں۔''

بوڑھی عورت نے ہنکارہ بھرا پھر دروازہ کھول کر ٹی وی لاؤنج میں داخل ہوگئی میگی نے استفہامیہ نگاہوں کے ساتھ میری طرف دیکھا میں نے اسے بتایا کہ ''ہیڈے ٹاؤن میں بوڑھی عورت کی شراب فروخت

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

کرنے کی دکان موجود ہے۔ لیکن میں اس کے یہاں آنے کے مقصد سے لاعلم ہوں۔"

بوڑھی عورت صوفے پر بیٹھتے ہوئے شراب کی بوتل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

"یہ میری دکان سے خرید کردہ ہے۔ کل رات کو میئر کے باپ کے قتل سے قبل تم نے انہیں میری دکان سے خریدا تھا اور شراب نوشی کی حالت میں اس بوڑھے اور بے گناہ شخص کو کچل کر ہلاک کردیا۔ میں اس واقعہ کی چشم دید گواہ ہوں۔"

میں سر پکڑ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ میگی کے چہرے پر بھی پریشانی کے تاثرات ابھرنے لگے۔ بوڑھی عورت نے بے تکلفی کے ساتھ شراب کی بوتل کا ڈھکنا کھولا اور قریب رکھے ہوئے گلاس میں شراب انڈیلنے کے بعد چسکیاں بھرنے لگی، میں نے تلخ لہجے میں اس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔ میں نے تمہیں سائیکل کے ہمراہ ڈیوس روڈ کے مخالف جانب جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ تمہارے کہنے کے مطابق اگر تم حادثے کی عینی شاہد ہو تو مجھے سمجھ نہیں آرہی کہ تم نے مخالف جانب جانے کے باوجود حادثے کو اپنی آنکھوں سے کیسے دیکھ لیا۔"

بوڑھی عورت نے شراب کا گلاس میز پر رکھتے ہوئے جواب دیا۔

"ڈیوس روڈ پر واپس آنا میرے لئے ناممکن نہیں تھا۔ کچھ بھی کام پڑ سکتا ہے۔ مثلاً ڈیوس روڈ پر ٹیلی فون بوتھ لگا ہوا تھا۔ جسے تم نے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ میرا تقریباً تمام کام ٹیلی فون سروس کا مرہون منت ہے۔ کل رات گھر جانے سے قبل مجھے فون کی ضرورت محسوس ہوئی میری دکان میں سہولت دستیاب تھی لیکن دکان کو دوبارہ کھولنا مجھے دشوار دکھائی دیا۔ اس لئے میں سائیکل پر بیٹھ کر ڈیوس روڈ کی طرف چلی آئی۔ اور میں نے پہلے تمہیں ٹیلی فون بوتھ برباد کرتے ہوئے دیکھا بعد ازاں بوڑھے کو کچلتے ہوئے بھی دیکھا۔"

اس بات چیت کے دوران میگی خاموش بیٹھی ہماری گفتگو سنتی رہی۔ اس نے بات چیت میں مداخلت کرنے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے سرد لہجے میں بوڑھی عورت سے پوچھا۔

"اب تم کیا چاہتی ہو؟"

وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

'خاموش رہنے کا معاوضہ.....؟"

میں نے طنزیہ لہجے میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیسی خاموشی .....؟ تم حادثے کے متعلق سارجنٹ کو بتا چکی ہو۔ وہ تمہاری آمد سے چند منٹ قبل تفتیش کر کے یہاں سے جا چکا ہے۔ اور شاید کچھ دیر بعد اس کی آمد دوبارہ متوقع ہے۔"

بوڑھی کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات ابھرنے لگے۔ اور وہ میرے خاموش ہونے کے فوراً بعد پھٹ پڑنے والے لہجے میں بولی۔

"میں نے اسے ایسا کچھ نہیں بتایا۔ وہ جو کچھ کہتا ہے سب جھوٹ ہے۔ یہ سچ ہے کہ وہ پوچھ گچھ کے لئے میری دکان پر آیا تھا۔ لیکن میں نے حتمی بیان نہیں دیا تھا۔ صرف خدشہ ظاہر کیا تھا کہ حادثے میں تم ملوث ہو سکتے ہو۔"

میں نے غصیلے لہجے میں اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"اب اگر تم خاموشی کے ساتھ مکان سے باہر کا رخ کرلو تو تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔ بصورت دیگر میں تمہیں اٹھا کر بھی باہر پھینک سکتا ہوں۔"

بوڑھی عورت کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ پھر لفظوں کو چباتے ہوئے بولی۔

"سارجنٹ نہایت کمینہ انسان ہے۔ معاہدے سے پھرنا کوئی اس سے سیکھے۔ وہ تم سے ہتھیانے والی رقم کو یکمشت ہضم کرنا چاہتا ہے۔ حالانکہ اس میں میرا حصہ بھی پایا جاتا ہے۔ میں اسے ایسا کرنے نہیں دوں گی۔ بہتر ہوگا کہ تم میرے ساتھ معاملے کو ڈیل کرلو۔ ورنہ نقصان سو فیصد تمہارا ہوگا۔"

میں نے اسے بازو کے پاس سے تھاما اور دھکیلتے ہوئے دروازے کی طرف لے گیا۔ وہ چلاتی رہی۔

"تمہیں اس بدتمیزی کی سزا بھگتنی ہوگی۔ سب کچھ میرے بیان پر منحصر ہے۔ میری بات مانو اور کچھ رقم لے دے کر معاملہ حل کرنے کی کوشش کرو۔"

میں نے اسے دروازے سے باہر دھکیلنے کے بعد دروازہ لاک کردیا۔ پھر جھنجھلائے ہوئے قدموں کے ساتھ ٹی وی لاؤنج میں واپس آ گیا میگی کے چہرے پر مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ میں نے تلخ لہجے میں اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"تم میری بے بسی پر ہنس رہی ہو۔ ..... اب یہاں مزید رہنا میرے اختیار میں نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میں پیدل ٹاؤن سے فرار ہونے کی کوشش کروں تو مجھے کوئی روکے گا نہیں ٹاؤن سے باہر نکلنے کے بعد مجھے لامحالہ شہر تک لفٹ مل ہی جائے گی۔"

میگی کے چہرے پر سنجیدگی کے تاثرات ابھرے پھر وہ مستحکم لہجے میں بولی۔

"آپ کو فرار ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ کل صبح حادثے میں ملوث قاتل گرفتار ہو جائے گا۔ میئر کے واپس آنے کی امید بھی کل تک متوقع ہے۔ اس کے بعد سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

میں نے جھنجھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"مجھے تمہاری بات کا مفہوم سمجھنے میں دشواری پیش آ رہی ہے۔ یا پھر شاید تم بھول رہی ہو کہ میئر کے باپ کا قاتل میں ہوں۔ اگر صبح مجھے ہی گرفتار کروا دو گی تو پھر تمہارا یہاں بیٹھنا فضول ہے۔ پولیس ڈپارٹمنٹ جا کر انہیں میرے متعلق انفارم کردو۔ باقی سب کچھ وہ خود ہی سنبھال لیں گے۔"

میگی بہ صورت سنجیدہ لہجے میں بولی۔

"میرا آپ سے وعدہ ہے کہ میں آپ کو گرفتار نہیں ہونے دوں گی اور آپ یقین کر لیجیے کہ میئر کے باپ کے قتل میں آپ کو ملوث نہیں ہونے دوں گی وہ قاتل جو کوئی بھی ہے کل صبح اس کی شخصیت منظر عام پر آ جائے گی۔ آپ کی رہائی میں میرا بھی کچھ مفاد پوشیدہ ہے۔"

میں نے حیرت بھری نگاہوں کے ساتھ اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تمہارا کیا مفاد ہو سکتا ہے۔ کیا میں اس کے متعلق دریافت کر سکتا ہوں۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور بولی۔

"بتانے میں مغالطہ نہیں۔ میرا گزشتہ شوہر مجھے طلاق دینے کے لئے رضامند نہیں ہو رہا۔ وہ جانتا ہے کہ طلاق کے فوراً بعد میں ہیری سے شادی کرنے کی کوشش کروں گی وہ ایسا نہیں چاہتا ہے اس لئے میں اور ہیری آپ کے جرم کی سزا اس کے سر ڈالنا چاہتے ہیں۔ وہ اس سزا کا حق دار ہے۔ میں آپ کو پہلے ہی بتا چکی ہوں کہ وہ میری ماں کا قاتل بھی ہے اس لئے سزا تو اسے ملنی ہی چاہئے آج کی رات اس کی گرفتاری پر مہر ثبت کردی جائے گی کل کی صبح جو میئر کے باپ کے قاتل کے طور پر منظر عام پر آئے گا۔ یاد رکھئے گا کہ وہی میری ماں کا قاتل اور سابقہ شوہر ہوگا۔"

بات مکمل کرنے کے بعد وہ کھڑی ہوگئی، پھر الوداعیہ کلمات بولتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔

میں حیرت بھری نگاہوں سے اسے باہر جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ مجھے اس کے سرد رویے کے متعلق معلوم ہو گیا تھا اس کی وجہ ہیری تھا جس سے وہ محبت کرتی تھی۔

بہرحال اس کے جانے کے آدھے گھنٹے کے بعد سارجنٹ طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ گھر میں داخل ہوا۔ پھر معنی خیز نگاہوں سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

"میری تفتیش مکمل ہو چکی ہے۔ تاکہ بندی پر متعین اہلکاروں نے اس بات کی تصدیق کردی ہے کہ تم ٹاؤن سے باہر نہیں گئے تھے اور فورڈ برانکو کمپنی سے رابطے کے بعد اس بات کی بھی حتمی تصدیق ہو گئی ہے کہ اس کمپنی کی جیپوں کے ٹائروں پر فورڈ کمپنی کا مونوگرام پرنٹ ہے۔ لیکن تمہاری جیپ کے ٹائروں پر نہیں ہے یقیناً تم نے اس کے ٹائر تبدیل کئے ہیں اور فورڈ برانکو کے اصل ٹائر تمہارے گھر میں ہی کہیں پوشیدہ ہیں۔ اگر تمہیں

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

اعتراض نہ ہو تو میں تمہارے گھر کی تلاشی لینا چاہتا ہوں میرے پاس تلاشی کے وارنٹ موجود ہیں۔"

میں نے بے بسی کے عالم میں سر اثبات میں ہلایا اور وہ تلاشی میں مصروف ہو گیا تھوڑی ہی دیر بعد ناکام و نامراد میرے سامنے کھڑا میرے چہرے کو گھور رہا تھا۔

"وہ یہاں موجود نہیں ہیں۔ شاید تم نے انہیں کہیں اور منتقل کر دیا ہے۔ لیکن یاد رکھو کہ وہ جہاں بھی ہیں ہم جلد از جلد ان تک پہنچنے کی کوشش کریں گے۔ ٹائروں کی برآمدگی کے فوراً بعد تمہیں گرفتار کیا جائے گا اس سے پہلے تم پر گھر سے باہر نکلنے پر بھی پابندی عائد کی جاتی ہے امید کرتا ہوں کہ تم ہم سے تعاون کرو گے۔" بات مکمل کرنے کے بعد وہ گھر سے باہر نکل گیا اور میں سر پکڑ کر صوفے پر بیٹھ گیا اب اپنے لئے مزید کچھ کرنا میرے لئے ممکن نہیں رہا تھا۔ سو خاموشی کے ساتھ اگلے دن کا انتظار کرنے لگا۔

رات گزر گئی۔ صبح موسم ابر آلود تھا ہلکی بارش کا آغاز ہو گیا تھا اور موسم کافی حد تک خوشگوار ہونے لگا تھا میں نے بے دلی کے ساتھ ناشتہ کیا پھر اگلے واقعات کی امید میں ٹی وی لاؤنج میں بیٹھ کر شراب نوشی کے دوران ٹی وی پر خبریں سننے لگا۔ یہ مقامی چینل تھا اور اس پر ہیڈے ٹاؤن کے حالات پر تبصرہ پیش کیا جا رہا تھا اناؤنسر بتا رہی تھی۔

"ناظرین و سامعین۔ میئر ٹونی ہیکن کی آمد اگلے گھنٹے بھر کے دوران متوقع ہے رواں دن کی شروعات کے دوران تک میئر کے بوڑھے والد کا قاتل پولیس گرفتار کرنے میں ناکام رہی ہے۔ لیکن ان کے کہنے کے مطابق یہ گرفتاری میئر کی آمد تک جان بوجھ کر پس پشت ڈالی جا رہی ہے آمد کے فوراً بعد مجرم کا نام ہنگامی طور پر میڈیا کے سامنے پیش کر دیا جائے گا تب تک ہم آپ سے اجازت چاہتے ہیں اور اپنے مزید پروگراموں کا آغاز کرتے ہیں۔"

میں نے ٹی وی کا بٹن آف کر دیا اور شراب کا آخری گھونٹ بھرنے کے بعد گلاس کو میز پر رکھ دیا۔ میری شراب نوشی حالات کی پیچیدگیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی انتہا کو پہنچتی چلی جا رہی تھی۔ میں نے شراب کا تمام کریٹ ایک دو دن کے دوران ختم کر دیا تھا یہ کچھ اچھا شگون نہیں تھا لیکن بڑھتی ہوئی پریشانی کی بدولت مجھے اپنے آپ پر اختیار نہیں رہا تھا۔

دروازے کی گھنٹی نے بج کر ہنگامہ خیز دن کا آغاز کیا۔ میں نے دروازہ کھولا تو میگی کو سامنے کھڑے پایا۔ اس کے چہرے پر طمانیت رقص کر رہی تھی۔ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھنے کے بعد وہ بولی۔

"ٹی وی کو آن کر دو۔ کچھ ہی دیر میں میئر کے باپ کے قاتل کا اعلان کیا جانے والا ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ اعلان تمہارے حق میں مفید ثابت ہوگا۔"

میں نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے ٹی وی کو آن کر دیا۔ اس پر مشہور زمانہ جاز کی دھن پیش کی جا رہی تھی۔ دوسرے چینلوں کا بھی کچھ ایسا ہی عالم تھا۔ میں دوبارہ صوفے پر آ بیٹھا۔ میگی کے چہرے پر سنجیدگی کے تاثرات موجود تھے۔ وہ خاموش تھی۔ میں نے بھی کچھ پوچھنا مناسب نہیں جانا اور خاموشی کے ساتھ ٹی وی دیکھنے لگا تقریباً آدھے گھنٹے کے انتظار کے بعد متوقع بلٹین پیش کیا جانے لگا میئر کی آمد کا یکلخت اعلان ہوا اس کی آمد پندرہ منٹ تک ممکن تھی میئر کے باپ کو بارہ بجے کے قریب دفنایا جانا مقصود تھا۔ انتظامات مکمل تھے صرف میئر کی آمد کا انتظار کیا جا رہا تھا پھر اچانک ہی بریکنگ نیوز پیش کی جانے لگیں اناؤنسر پرجوش لہجے میں مخاطب تھی۔

"ہیڈے ٹاؤن کے رہائشیوں کو مطلع کیا جاتا ہے کہ چند لمحات کے بعد میئر ٹونی ہیکن کے والد کے قاتل کا نام منظر عام پر پیش کیا جانے والا ہے۔ ناظرین کرام سے گزارش کی جاتی ہے کہ اپنی جگہوں کو چھوڑنے کی کوشش نہیں کیجیے گا ہم مکمل ثبوت کے ساتھ قاتل کو ہیڈے ٹاؤن کے رہائشیوں کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کریں گے یہ متوقع پردہ کشائی ٹاؤن کے ایک رہائشی کی مرہون منت ہے جو ٹاؤن کے

اکلوتے اسکول میں میتھ کے ٹیچر کے طور پر خدمات انجام دے رہا ہے اس کے کہنے کے مطابق وہ اس سے بخوبی آگاہی رکھتا ہے۔ میئر ٹونی ہیکسن کے والد کو کچلنے والے ٹائر جن پر فورڈ کمپنی کا مونوگرام پایا جاتا ہے یاد رہے یہی ٹائر ڈپارٹمنٹ کو مقصود ہیں کیونکہ حادثے کے دوران گاڑی کے ٹائر پر موجود نشانات اور فورڈ کمپنی کا مونوگرام سڑک پر ثبت پایا گیا تھا۔

ٹاؤن کے رہائشی جس کا نام اس وقت صیغہ راز میں رکھا جا رہا ہے اس کے بیان کے مطابق یہ ٹائر جہاں موجود ہیں وہ ان کے متعلق خبر رکھتا ہے، رپورٹر کے ہمراہ قاتل کی جگہ پوشیدگی کی جانب روانہ ہو چکے ہیں ہم براہ راست آپ کو قاتل کی گرفتاری کا منظر ٹی وی اسکرین پر دکھانے والے ہیں۔"

میں نے اپنے ہمراہ بیٹھی ہوئی میگی کی طرف دیکھا۔ وہ سپاٹ چہرہ لئے اسکرین کو گھور رہی تھی۔ اس کے چہرے پر کسی بھی قسم کے تاثرات موجود نہیں تھے۔

میں نے سرگوشی بھرے لہجے میں اس سے پوچھا۔ "شاید میتھ کے ٹیچر کے ساتھ میری ملاقات گزشتہ روز ہو چکی ہے۔ کیا یہ تمہارا ساتھی ہیری نہیں ہے جس کے ساتھ تم شادی کرنا چاہتی ہو؟" میگی کے سپاٹ چہرے پر کرب کے تاثرات ابھرنے لگے اور وہ سرد لہجے میں بولی۔

"یقیناً وہی ہے لیکن مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں۔ میں تو صرف اپنی والدہ کے قاتل کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے کھڑا دیکھنا چاہتی ہوں قتل کے وقت قانون نے میرا ساتھ نہیں دیا تھا لیکن اب اسے مجبوراً میرا ساتھ دینا پڑے گا۔"

اناؤنسر کی آواز سنائی دی۔ "اب ہم آپ کو لائیو سین دکھانے والے ہیں۔ آپ ٹی وی کی طرف متوجہ ہو جائیے۔" اس کے بعد اسکرین پر جو منظر نمایاں ہوا۔ وہ ہیڈے ٹاؤن سے باہر ڈے روڈ کا تھا موسم خوش گوار تھا بادل چھٹ چکے تھے اور دھوپ نکلی ہوئی تھی ٹی وی کے نمائندے کے ہمراہ کیمرہ مین اور دیگر اسٹاف گاڑی میں سوار تھا۔ اگلی سیٹ پر ہیری بھی براجمان تھا گاڑی سڑک پر تیز رفتاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے پولیس ڈپارٹمنٹ کی عمارت کے سامنے پہنچ کر رک گئی کیمرہ مین اور دیگر کریو اپنے لوازمات کے ہمراہ گاڑی سے نیچے اترنے لگے۔ پولیس ڈپارٹمنٹ کا گیٹ بند تھا۔ ٹی وی رپورٹر نے آگے بڑھ کر کال بیل پر ہاتھ رکھ دیا۔ فوراً ہی دروازہ کھول دیا گیا اور ٹی وی رپورٹر کے ہمراہ تمام اسٹاف عمارت میں داخل ہو گیا۔ وہاں چند جیپیں ایسی کھڑی تھیں جو ہیوی ہونے کے علاوہ نہایت جدید بھی تھیں رپورٹر نے کیمرے کی طرف رخ کرتے ہوئے مائیک کو چہرے کے قریب لاتے ہوئے کہا۔

"ناظرین جس طرح کہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہم اس وقت پولیس ڈپارٹمنٹ کی عمارت کے اندر موجود ہیں اور ہمارے سامنے چند ایسی جیپیں کھڑی ہیں جن کا براہ راست تعلق پولیس ڈپارٹمنٹ کے سرکردہ افراد سے ہے۔ آپ ہمارے ساتھ کھڑے ہوئے اس ٹیچر کو بھی بہ خوبی دیکھ سکتے ہیں جس کی نشان دہی کی بدولت ہم مجرم تک پہنچنے میں کامیاب ہونے والے ہیں۔ میری معلومات کے مطابق میئر ٹونی ہیکسن کی گاڑی ہیڈے ٹاؤن میں داخل ہو چکی ہے اگر ان کے قریب ہمارے چینل کا کوئی نمائندہ موجود ہو تو مہربانی کر کے انہیں ٹی وی کی اسکرین کی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کرے کیونکہ نشان دہی کے فوراً بعد مجرم فرار ہونے کی ناکام کوشش کرے گا۔"

بات مکمل کرنے کے بعد اس نے کیمرہ مین کو کیمرہ پولیس ڈپارٹمنٹ کی عمارت میں کھڑی ہوئی جیپوں کے ٹائروں کی طرف کرنے کا حکم دیا کیمرے کا رخ رپورٹر کے چہرے سے ہٹ کر جیپوں کے ٹائروں کی طرف ہو گیا دو جیپوں کے ٹائر ہر قسم کے مونوگرام سے مستثنیٰ تھے لیکن تیسری جیپ کے ٹائر پر فورڈ کمپنی کا مونوگرام موجود تھا۔ رپورٹر نے اپنے پیچھے کھڑے ہوئے چپڑاسی سے پوچھا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"یہ جیپ کس کی ہے؟" چپڑاسی نے جواب دیا۔

"سارجنٹ جیف کی..... وہ عمارت کے اندر موجود ہیں۔" جیپ کا کلوزاپ مکمل کرنے کے بعد کیمرہ مین نے جیپ کے اندر کا منظر فلمبند کرنا شروع کردیا۔ وہاں شراب کی خالی بوتل ڈیش بورڈ کے نیچے پڑی ہوئی دکھائی دی، ٹی وی رپورٹر نے بوتل کو سر کے پاس سے تھامتے ہوئے کیمرہ مین کی طرف کیا اور پر جوش لہجے میں بولا۔

"ناظرین آپ اپنے ٹی وی اسکرین پر شراب کی بوتل کو بہ خوبی دیکھ رہے ہوں گے یہ وہی برانڈ ہے جس کی کرچیاں ہمیں جائے حادثہ کے قریب دستیاب ہوئی تھیں۔ یہاں میں آپ کو یہ بھی بتاتا چلوں کہ چند روز قبل سارجنٹ جیف ایک ایسے ہی حادثے میں ملوث پایا گیا تھا اس حادثے کی تفصیل میں نے ہی اپنے چینل پر بیان کی تھی شاید آپ میں سے چند ناظرین کو یاد ہو کہ اس وقت بھی ایک بوڑھے شخص کو حادثے کا ہدف بنایا گیا تھا اور سارجنٹ جیف شراب کے نشے میں دھت جیپ چلاتے ہوئے گرفتار کیا گیا تھا۔ اس وقت سارجنٹ یہی مہنگی شراب پینے میں ملوث تھا اس وقت وہ اپنے اثر ورسوخ کو بروئے کار لاتے ہوئے گرفتاری سے بچ گیا تھا۔ لیکن اب ایسا ممکن نہیں ہوگا سب کچھ آپ کے سامنے ہے۔

اب دیکھتے ہیں میئر ٹونی ہیکسن کس حد تک معاملے کو آگے لے جانے میں کامیاب ہوتا ہے۔ میں پھر یقین دہانی کروادوں کچھ دیر میں ہی سارجنٹ جیف کی گرفتاری کا منظر ہمارے چینل پر براہ راست پیش کیا جانے والا ہے۔ مہربانی کر کے آپ لوگ اسکرین کے سامنے سے اٹھنے کی کوشش نہ کیجیے گا۔"

میں نے لمبا سانس لیتے ہوئے میگی کی طرف دیکھا اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔ لیکن چہرے پر اطمینان کی لہر موجود تھی۔ میری آنکھوں کی تپش کو محسوس کرتے ہوئے اس نے میری طرف دیکھا پھر دھیمے لہجے میں بولی۔

"پولیس ڈپارٹمنٹ کی زیر تعمیر عمارت میں چوکیدار کی عدم موجودگی کے باعث سارجنٹ جیف کی جیپ کے ٹائر تبدیل کرنا مشکل ثابت نہیں ہوا۔ میں نے اور ہیری نے رات کے وقت یہ کام نہایت اطمینان کے ساتھ انجام دیا اور سارجنٹ جیف میرا سابقہ شوہر اپنے کیفر کردار کو پہنچ گیا۔ یقیناً میری ماں کی روح کو بھی تسکین میسر آ گئی ہوگی اب میں اپنی خوشی کا جشن ہیری سے شادی کر کے مناؤں گی سارجنٹ جیف کے پھانسی چڑھنے کے بعد....."

میں نے آگے بڑھ کر اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھامتے ہوئے گلوگیر لہجے میں کہا۔

"میگی میں تمہارا احسان تمام زندگی بھلا نہیں پاؤں گا۔ اور جب بھی عبادت کے لئے چرچ کی طرف جاؤں گا تو میرا تم سے وعدہ ہے کہ تمہاری مرحومہ والدہ کے لئے ضرور دعا کروں گا۔" میگی بھرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

"میں نے آپ پر کوئی احسان نہیں کیا بلکہ یہ سب میری ضرورت تھی سارجنٹ جیف نے آپ کو اپنے مفاد کے لئے استعمال کرنے کی کوشش کی اور میں نے آپ کو چارہ کار کے طور پر استعمال کرتے ہوئے اسے کیفر کردار تک پہنچادیا، میرے خیال میں اس میں کچھ مغالطہ نہیں، ہاں ایک نصیحت آپ کو ضرور کرنا چاہوں گی۔ "خدارا دوران ڈرائیونگ شراب نوشی سے آئندہ پرہیز کیجیے گا۔ اس تمام کئے ہوئے میں قصوروار آپ ہیں کیونکہ آپ نے نشے کی حالات میں ڈرائیونگ کے دوران میئر کے باپ کو قتل کیا اسے مدنظر رکھتے ہوئے سزا آپ کو بھی ملنی چاہئے۔"

میرا سر شرم کے مارے جھک گیا اور میں نے دل میں پکا عہد کیا کہ دوران ڈرائیونگ شراب تو دور کی بات ہے سگریٹ نوشی سے بھی پرہیز کرنے کی کوشش کروں گا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

راکھ

ساحل دعا بخاری۔ بصیر پور

نوجوان کے گرد اچانک شعلے بھڑکے مگر نوجوان اپنی جگہ ساکت بیٹھا رہا، اس کا ضبط عروج پر تھا، آگ آہستہ آہستہ سمٹتی رہی اور پھر آگ نے آگے بڑھ کر نوجوان کو اپنی آغوش میں لے لیا، پھر بھی نوجوان ساکت ہی رہا اور پھر.....

محبت کے متلاشی جب محبوب سے بچھڑ جاتے ہیں تو دل کا کیا حال ہوتا ہے، کہانی پڑھ کر دیکھیں

سورج سوا نیزے پر تھا۔ گرمی اتنی زیادہ تھی کہ زمین پر انڈہ پھینکو تو فرائی ہو جائے۔ اس بلا خیز گرمی میں ہوا بھی کہیں دبکی ہوئی تھی اور اگر کبھی وہ باہر نکل کر لہراتی تو یوں لگتا جیسے وہ بھٹی سے نکل کر آئی ہے ایسے میں کون پاگل ہوگا جو دھوپ میں نکلے..... لیکن ایسے میں کوئی تھا جو بستی سے پرے، جہاں کی زمین بنجر پڑی تھی اور جا بجا جھاڑیاں وغیرہ اگی تھیں، وہ وہاں جلتی زمین پر بیٹھا تھا۔ اس کی عمر چھبیس سے اٹھائیس برس رہی ہوگی۔ رنگت گندمی، ناک تیکھی اور سیاہ آنکھیں بلا کی اپنے اندر عجیب سحر رکھتی تھیں، اس نے اپنے گرد دائرے کی صورت میں آگ جلا رکھی تھی تپش اتنی زیادہ تھی کہ الامان..... اس کے چہرے پر نہایت کرب واذیت کی کیفیت رقم تھی وہ بار بار پہلو بدل رہا تھا۔ اضطراب اس کی رگوں میں پارے کی مانند مچل رہا تھا۔ لیکن اس کے

باوجود اس سب کے باوجود وہ وہاں سے اٹھنے کا یا پھر آگ بجھانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا آگ واذیت کو محسوس کرتے اس کا ذہن ایک ہی بات سوچ رہا تھا کہ "اس نے بھی ایسی ہی آگ جھیلی ہوگی۔ اسے بھی ایسی ہی..... اتنی تکلیف ہوئی ہوگی۔"

اس کے کپڑے پسینے سے نچڑ رہے تھے۔ "چلو اب بس کرو۔" ایک آواز اس کی پشت پر ابھری وہ سپاٹ چہرہ لئے بیٹھا رہا۔ اس کے گرد جلتی آگ پر پانی انڈیلا گیا تو آگ بجھ گئی آگ بجھ گئی تو تپش کم ہوگئی۔

"چلو اٹھو۔" آنے والے نے تاسف زدہ لہجے میں کہتے ہوئے اسے اٹھایا۔

وہ بنا کسی مزاحمت کے اٹھ کھڑا ہوا اس کے اعصاب اس قدر نڈھال ہو چکے تھے کہ مزاحمت کا تصور بھی نہ تھا۔

"تم کب تک یوں خود کو سزا دیتے رہو گے؟" اس نے ہمیشہ کی طرح اپنا سوال دہرایا تھا اور اس نے ہمیشہ کی طرح خاموشی دہرائی تھی۔

"اب بس کرو جو ہوا اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں تھا اس کی زندگی ہی اتنی تھی۔ اس کی موت اسی طرح لکھی تھی۔ اسے ایسے ہی مرنا تھا۔" اس نے تھکے تھکے لہجے میں سمجھانا چاہا۔

وہ چپ رہا۔

"صبر کرو۔ خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔"

"میری موت بھی ایسے ہی لکھی ہے۔ مجھے ایسے ہی مرنا ہے آپ صبر کریئے گا۔ خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔" اس نے نجانے کتنے عرصے بعد کوئی لفظ منہ سے نکالا تھا۔

ساتھ والا ٹھٹک کر رک گیا اس کا جسم تھرتھرا اٹھا تھا وہ جو اس کی چپ پہ ہمیشہ اس کے بولنے کی تمنا کرتا تھا اب اس کے بولنے پر..... اپنی تمنا پر پچھتا رہا تھا۔

"تب آپ صبر کیجیے گا۔ پھر پتہ چلے گا کہ صبر کی تلقین کرنے اور صبر کرنے میں کتنا فرق ہوتا ہے۔" وہ مزید کہہ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا چلا گیا۔

کرب کے شہر میں رہ کر نہیں دیکھا تو نے
کیا گزرتی رہی ہم پر نہیں دیکھا تو نے
اے مجھے "صبر" کے آداب سکھانے والے
جب وہ بچھڑا تھا وہ منظر نہیں دیکھا تو نے

☆.....☆.....☆

"عمر کہاں ہے؟" زرد موسم فضا میں اپنے پنجے گاڑ چکا تھا ایک ذرا ہوا کا جھونکا لہراتا ہوا لاتعداد پتے زمین پر آرہے تھے وہ آم کے پیڑ کے تنے سے ٹیک لگائے کھڑی تھی جب شاہ زیب نے اس سے پوچھا۔

"پتہ نہیں۔" وہ نفی میں سر ہلا گئی۔

پتہ رکھا کرو۔ پہلے تو بہت اس کے آگے پیچھے پھرتی تھیں۔ یہ تمہاری ہی ضد تھی۔ اب اگر وہ بکھر گیا ہے۔ تو اسے سمیٹ لو۔ انہوں نے تنبیہ کی۔

"وہ ہاتھ کہاں آتا ہے؟ گھر پہ رہتا ہی کب ہے؟" اس نے بے بسی سے ہاتھ ملے۔

"تم..... اسے اپنے ہونے کا احساس دلاؤ۔ بلکہ میں ہی کچھ کرتا ہوں۔" وہ کہہ کر چلے گئے۔

وہ وہیں کھڑی عالم بے زاری میں پرندوں کی کرخت آوازیں سنتی رہ گئی۔ عمر حیدر اس کی دھڑکنوں میں بستا تھا۔ اس کی ہر سانس اسی کے نام کا ورد کرتی تھی مگر..... "تانیہ فیروز!" سرد ہوا کے ایک جھونکے نے اس کی پشت پر سرگوشی کی بجلی کی ایک لہر اس کے پیروں سے لے کر سر تک کوند گئی وہ ایک جھٹکے سے پلٹی تھی۔

"تم کیا سمجھتی ہو تانیہ فیروز؟ مجھے راہ سے ہٹا کر تم منزل پالو گی؟" وہ اس کے عین سامنے کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر وہی مخصوص نری تھی۔ ہونٹوں پر بھی وہی مسکراہٹ۔

مگر..... تانیہ کسی پتھر کے بت کی مانند ساکت کھڑی تھی گویا اس نے پہاڑوں کو اپنی جگہ سے سرکتے دیکھ لیا ہو۔

"عمر حیدر صرف میرا ہے۔ تم اسے مجھ سے کبھی

نہیں چھین سکتی۔" وہ سختی سے اسے باور کروا رہی تھی۔

"تت..... تم تو مر چکی ہو۔" تانیہ بری طرح ہکلائی۔ لفظ اس کے حلق میں کانٹوں کی طرح پھنس رہے تھے۔

"میں مر چکی ہوں، مگر پھر بھی واپس آ گئی ہوں۔ میں عمر حیدر کو ساتھ لے کر جاؤں گی۔"

تانیہ چیختی چلاتی بھاگ گئی۔ اندر سے نکلتے روحیل نے اسے تھاما۔ "کیا ہوا ہے؟"

"وہ..... وہ..... وہ ثنائلہ....." وہ اٹک اٹک گئی۔

"ثنائلہ؟"

"ہاں وہ ثنائلہ وہ باہر لان میں۔" وہ سہمی ہوئی تھی۔

ابھی تک روحیل کے سر پر گویا اس نے ہتھوڑا دے مارا تھا۔ "آر یو میڈ؟ ثنائلہ مر چکی ہے۔" اس نے اسے یاد دلایا۔

"ہاں....." تانیہ پھٹ پڑی۔ "وہ مر چکی ہے مگر وہ واپس آ گئی اور وہ کہہ رہی تھی کہ وہ عمر کو لے جانے آئی ہے۔"

وہ روحیل کے کندھے سے لگ کر رونے لگی۔

"تمہیں وہم ہوا ہے۔"

"نہیں ہوا ہے وہم....." وہ چلا اٹھی۔

"چلو دکھاؤ مجھے۔" وہ اسے بازو سے تھام کر باہر نکلا۔ آم کے درخت کے پاس پہنچ کر تانیہ کو دھچکا لگا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔

"کوئی بھی نہیں..... دیکھو کوئی نہیں ہے یہاں..... سب وہم ہے تمہارا۔" روحیل نے دانستہ ہلکا پھلکا لہجہ اپنایا۔

"وہم نہیں ہے میرا۔" وہ محض سوچ کر رہ گئی۔

"چلو تم چائے بناؤ۔ میں عمر کو لے کر آتا ہوں۔"

وہ اسے کچن میں دھکیل کر چلا گیا، تانیہ کھوئی کھوئی سی فریز کیے کباب نکال کر تلنے لگی۔

☆.....☆.....☆

عمر حیدر قبرستان میں ایک قبر کے سرہانے چراغ جلانے کے بعد دونوں ہاتھ اٹھا کر فاتحہ پڑھنے لگا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو قطار کی صورت بہہ رہے تھے۔ یہ قبر اس کی محبت کی قبر تھی۔ دعا کے بعد وہ وہیں بیٹھا رہا۔ اس کی بصارت وبصیرت پر ایک چہرہ..... ایک نرم خدوخال والا پرکشش چہرہ منجمد ہوگیا۔ اس کا ذہن ماضی میں بھٹکنے لگا۔ ماضی جو اس کا اپنا تھا، کاش وہ حال کو لے کر بھی ماضی میں جا سکتا۔ لیکن افسوس! کہ ایسا ممکن ہی نہیں۔

☆.....☆.....☆

شاہ زیب، شاہ حیدر اور شاہ فیروز تین بھائی تھے۔ ان کے والد شاہ حسین ایک بارسوخ شخص تھے۔ شاہ حسین کی وفات کے بعد شاہ زیب کو ان کی جگہ مل گئی شاہ حیدر اور شاہ فیروز ان کا فیصلہ پتھر پر لکیر سمجھتے تھے۔ شاہ زیب کا بیٹا روحیل اور بیٹی فرزین تھی۔ شاہ حیدر کا اکلوتا بیٹا عمر حیدر تھا اور شاہ فیروز کی بیٹی تانیہ اور بیٹا شہروز تھا۔ عمر حیدر دس برس کا تھا جب ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں اس کے ماں باپ دونوں جاں بحق ہوگئے، یوں شاہ زیب اس کے سرپرست ٹھہرے۔ روحیل، عمر اور شہروز نے ایک ساتھ تعلیم مکمل کی تھی ابھی صرف تین سال قبل

دل

دماغ کی کئی آنکھیں ہیں لیکن دل کی صرف ایک۔ (نسلی کہاوت)

دل کی طرح سخت اور اس کی طرح ملائم کوئی چیز نہیں ہوتی۔ (زہادی)

دل کا خط، آنکھوں میں پڑھا جاتا ہے۔ (مرمٹ)

دل کے کان ہوتے ہیں۔ (پلوٹس)

دل ضدی بچے کی طرح ہے وہ جس چیز کی خواہش کرتا ہے اسے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ (سارتینا)

انسان کا دل کبھی مطمئن نہیں ہوتا، یہ ایسی ہی بات ہے گویا سانپ ہاتھی کو نگل رہا ہے۔ (ریلے)

(انتخاب: سمرین کراچی)

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

کی بات ہے جب ایک روز عمر حیدر نے ثنائلہ کی والدہ کی تدفین کے موقع پر پہلی بار ثنائلہ کو دیکھا تھا۔ پیپل کے پیڑ کے ساتھ کھڑی وہ بار بار اپنی برستی آنکھیں صاف کررہی تھی۔

"آپ پلیز! چپ ہوجائیں۔ اس طرح تو آپ کی امی کو بھی تکلیف ہورہی ہوگی۔ آپ ان کے لئے دعا کریں۔ جانے والوں کو ہمارے آنسوؤں کی نہیں ہماری دعاؤں کی ضرورت ہوتی ہے۔" اسے ثنائلہ کو روتے دیکھ کر تکلیف ہوئی تھی۔

پھر دھیرے دھیرے کب دونوں ایک دوسرے کے دل میں سما گئے انہیں پتہ ہی نہیں چلا تھا۔ ثنائلہ کا باپ مراد احمد شاہ زیب کی زمینوں پر کام کرنے والا ایک کم مایہ شخص تھا۔ ثنائلہ کو اکثر فکر رہتی کہ عمر کے گھر والے اسے قبول بھی کرتے ہیں یا نہیں..... "تم فکر مت کرو۔ تمہیں میں قبول کرچکا ہوں۔ یہ کافی ہے اپنی زندگی کا فیصلہ مجھے خود کرنا ہے۔" وہ اس کا ہاتھ تھام کر تسلی دینے کی کوشش کرتا تو وہ سرخ ہوکر ہاتھ چھڑا جاتی۔

"ہاتھ بھی نہیں تھامنے دیتی ہو؟"

"ابھی میں آپ کی کچھ نہیں لگتی۔"

"تم میرے لئے کیا ہو، اگر یہ جان لونا تو، ہواؤں میں اڑنے لگو۔" وہ مسکراتا۔

"پھر..... اس نے اپنا مدعا روحیل کے ذریعے شاہ زیب تک پہنچایا۔" مگر عمر کے لئے تو میں نے تانیہ کا سوچا تھا۔" بابا! زندگی عمر نے گزارنی ہے۔" روحیل رسانیت سے بولا۔

مگر ایک کم ذات شاہ خاندان کی بہو بنے؟" وہ غصے سے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

"ابھی وہ غصے میں ہیں۔ مان جائیں گے۔" روحیل نے سوچا تھا مگر اس نے غلط سوچا تھا جب تانیہ کو پتہ چلا تو وہ شاہ زیب کے پاس چلی آئی۔ اگر عمر کی شادی کسی اور سے ہوئی تو میں خودکشی کرلوں گی۔"

"تم فکر مت کرو، ایسا کچھ نہیں ہوگا۔"

"لیکن عمر.....؟" وہ روہانسی ہورہی تھی۔

"تم عمر کو اپنے جذبات کا احساس دلاؤ۔ باقی مجھ پر چھوڑ دو۔" وہ سگار کا کش لے کر بولے۔

"لیکن اگر عمر نہ مانا تو؟" تانیہ خدشات میں گھری تھی۔

"اس کے نہ ماننے کی وجہ ہی نہیں رہے گی؟" انہوں نے کرسٹل کے دیدہ زیب ایش ٹرے میں راکھ جھاڑی۔

"وہ کیسے؟" جواباً سگار انگلیوں میں دبائے وہ اسے دھیمی آواز میں بتانے لگے کہ کیسے؟ تانیہ مطمئن سی ان کے کمرے سے نکلی تھی۔

☆.....☆.....☆

"عمر! میں سچ کہہ رہی ہوں۔"

"مجھے یقین ہے تانیہ! مگر میں ثنائلہ کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تم بھی میری مجبوری سمجھ سکتی ہو۔ تم بہت اچھی لڑکی ہو۔ لیکن یہ محبت..... جو مجھے ثنائلہ سے ہے۔" "آئی ایم سوری۔" وہ کچھ رسانیت، کچھ ندامت سے اسے بتا رہا تھا۔ اور تانیہ کے دھواں دھواں ہوتے چہرے سے وہ نظریں چرانے کے سوا اور کچھ نہیں کرسکا۔ آئی ریلی ویری سوری۔ وہ دھیرے سے کہہ کر پلٹ گیا تھا۔

اور یہ اس سے محض تین دن بعد کی بات ہے ..... جب سب ختم ہوگیا تھا۔ سب کچھ آگ کھا گئی تھی۔ اس کی ہر خواہش، ہر خواب، ہر تمنا ہر آرزو، ہر امید۔ حتیٰ کہ زندہ رہنے کی آس تک کو آگ چاٹ گئی تھی۔ اور جب اسے خبر ہوئی تھی تب تک سب راکھ ہوچکا تھا۔

عجب رنگ تھا ان آنکھوں کا
بچھڑنے سے ذرا پہلے
فضاء میں خوف آبسا تھا
بچھڑنے سے ذرا پہلے
ہر ایک خواب میرے تیرے سینے سے لگ کے
ٹوٹ کے رویا تھا
نہ دے پائے تم دلاسہ، بچھڑنے سے ذرا پہلے
تمہارے واسطے جاناں!
ہم نے ساری خدائی اور خدا چھوڑا

اور تم نے پہلے ہی کردیا تنہا
بچھڑنے سے ذرا پہلے

"مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے عمر!" خوف تو ثنائلہ کی آواز سے ہی مترشح تھا۔

"لیکن کیوں؟"

"پتہ نہیں۔ تم آج کہیں مت جاؤ۔"

"میرا آج جانا بہت ضروری ہے۔ اور میں شام کے بعد لوٹ آؤں گا۔" دیکھو! ناصر میرا بہت اچھا دوست ہے اس کا اپنے پاپا کے سوا دنیا میں کوئی نہیں۔ اب ان کے جنازے میں شریک ہونا! میں جلدی آجاؤں گا۔ تم پریشان مت ہو۔" وہ اسے تسلی دیتا ہوا بولا۔

"ٹھیک ہے۔" ثنائلہ نے سر اثبات میں سر ہلایا۔ "اپنا خیال رکھنا۔"

"وہ اسے تاکید کرکے چلا گیا اور ثنائلہ اپنے آنسو روکنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کا دل جیسے پاتال میں اترتا جارہا تھا۔

☆.....☆.....☆

بستی کے سارے لوگ ہی آتش پرست تھے جل رہا تھا میرا گھر، اور سمندر قریب تھا اور جب وہ لوٹ کے آیا تو اس کے لئے کچھ بھی نہیں بچا تھا ثنائلہ کے گھر میں بجانے کیسے آگ لگ گئی تھی اور..... عمر حیدر پھٹی پھٹی سی آنکھوں سے پتھرائے تاثرات کے ساتھ ثنائلہ کے سیاہ جلے وجود کو دیکھے گیا اور اس جلے ہوئے کوئلہ بنے سیاہ وجود کو دیکھ کر اسے اسی پل ادراک ہوگیا تھا کہ وہ زندگی بھر کبھی سکون کی نیند نہ سو سکے گا۔ اسے پتہ چل گیا تھا کہ اس کی باقی زندگی کیسے گزرے گی۔ اسے غیب دان ہونے کا دعویٰ نہیں تھا مگر اس کے باوجود حقیقت یہی ہے کہ اسے علم ہوگیا تھا اور بخوبی علم ہوگیا تھا کہ وہ "سکون" نامی چیز کو آخری سانس تک ترسے گا۔ اور خوشی تو خیر اب ان کی زندگی کا ایک بھولا بسرا خواب تھا..... پھر ثنائلہ اور اس کے والد کو مقامی قبرستان میں دفنا دیا گیا۔

☆.....☆.....☆

کبھی جو چھیڑ گئی یاد رفتگاں محسن
بکھر گئی ہیں نگاہیں کہاں کہاں محسن

وہ ثنائلہ کے جلے گھر کی راکھ پر لٹا پٹا سا بیٹھا تھا۔ ایک ایسے بادشاہ کی مانند جو ہفت اقلیم کی دولت محض ایک پل میں ہار کر بالکل خالی ہاتھ ہوگیا ہو۔

پھر اس کے بعد اس کی زندگی کا ڈھنگ، بدل کر رہ گیا وہ خود کو اذیت دینے لگا۔ گھر میں موقع ملا تب بھی ورنہ اگر وہ باہر کہیں ہوتا تو اپنے گرد آگ جلا لیتا۔ اور پھر اس تپش میں ثنائلہ کی اذیت کا اندازہ کرتا رہتا۔

روحیل اور تانیہ نے بہت کوشش کی تھی اسے زندگی کی طرف واپس لانے کی..... مگر وہ زندگی کو اب موت سے بھی بدتر سمجھتا تھا۔ اس شام بھی وہ آگ جلا کر بیٹھا تھا۔ آگ بجھ گئی، بجھ کر راکھ میں بدل گئی اور وہ اب راکھ کو گھور رہا تھا۔ گویا راکھ سے وہی سب..... اپنی زندگی نمودار ہونے کی توقع رکھتا ہو۔ اس کے سارے خواب جل کر..... زندگی جل کر راکھ میں بدل گئی تھی اور وہ راکھ بھی کب کی فضاؤں میں بکھر چکی تھی۔ اور وہ عالم دیوانگی میں راکھ پر نگاہ جمائے ہوئے تھا۔ جب اس راکھ میں ایک وجود مجسم ہوا۔ وہ بے یقینی کے سمندر میں غوطہ زن ششدر سا دیکھنے لگا۔

"ثنائلہ۔" عمر کے لبوں نے بے آواز سرگوشی کی تھی۔ "مم..... میں تمہارے بغیر....."

وہ مچلا تھا۔

"میں جانتی ہوں میں بھی وہاں تمہارے بغیر بے سکون ہوں۔" وہ اٹھ کر چل دی۔

عمر اس کے ہم قدم تھا۔ اس نے گھر تک کا فاصلہ گویا کسی خواب کے عالم میں طے کیا تھا۔ لان میں شام کی چائے پر سب موجود تھے ثنائلہ کو دیکھ کر ہر آنکھ میں پاگل پن کی انتہاؤں کو چھوتی بے یقینی اتر آئی تھی۔

"تت..... تم..... مر چکی ہو۔" تانیہ اس پر برتن پھینکتے ہوئے ہذیانی انداز میں چلائی۔ "اور تم راکھ سے دوبارہ زندہ کیسے ہوسکتی ہو؟ آخر کیسے؟"

"تم کو راکھ میں ڈھالنے کے لئے مجھے ایسا کرنا

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk
Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

پڑا۔"

"اب تم اور شاہ زیب صاحب! آپ ان سب لوگوں کو بتایئے کہ میرے گھر میں آگ کیسے لگی؟ وہ منصوبہ کس کا تھا جس نے سب راکھ کر ڈالا؟ ابو کے کمرے کا دروازہ باہر سے کس نے لاک کیا تھا اور پیٹرول چھڑک کر آگ کس نے لگائی تھی۔؟" اس کے سرد برف سے لہجے میں بلا کا زہر تھا۔ وہاں سب کو سانپ سونگھ گیا۔

"چلیں میں بتاتی ہوں۔ عمر! میں جب ابو کو کھانا دینے ان کے کمرے میں گئی تھی تو دروازہ تانیہ نے بند کیا تھا۔

تانیہ کا چہرہ سفید پڑ گیا۔

"اور لکڑی کے دروازے پر پیٹرول چھڑک کر آگ شاہ زیب نے لگائی تھی۔" اس نے بڑے آرام سے جیسے پہاڑ لڑھکا ڈالا۔ جس کے بوجھ تلے ہر وجود، سوائے تانیہ اور شاہ زیب کے کچلا گیا تھا۔ یہ معمولی کام یہ لوگ یقیناً کسی ملازم سے بھی لے سکتے تھے مگر مسئلہ یقیناً رازداری کا تھا۔

عمر حیدر کا چہرہ پل بھر میں راکھ ہوا تھا۔ اس کے اپنے تایا..... جو اس کی ماں بھی تھے اور باپ بھی..... وہ..... وہ ایسا؟ اور تانیہ جو اس سے محبت کے دعوے کرتی تھی؟ محبت کسی کو پالینا تو نہیں..... محبت تو محبوب کو خوش دیکھنا ہے۔ بھلے اس کی خوشی کسی اور کے ساتھ میں ہی ہو۔ آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، جان کے بدلے جان۔

وہ تانیہ کو گھور رہی تھی آگ کے بدلے آگ اور راکھ کے بدلے راکھ..... اس نے جلتی آنکھوں سے تانیہ اور شاہ زیب کو گھورا۔

ان کے اجسام میں آگ بھڑک اٹھی دیگر لوگوں کا سکتہ ان کی موت گزیدہ چیخوں نے توڑا تھا۔ وہ آگ کا لباس پہنے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ روحیل شہروز اور دیگر لوگوں کی آگ بجھانے کی تمام کوششیں رائیگاں ٹھہریں..... اور محض چند منٹ بعد..... ان کی راکھ پڑی تھی جس سے ہوا کھیل رہی تھی جو لوگ دوسروں کے خوابوں، ان کی زندگیوں سے کھیلتے ہیں، موت ان سے کھیلتی ہے۔

"میرے ساتھ چلوگے؟" ثنائلہ نے عمر کی آنکھوں میں جھانکا۔

"بالکل....." وہ نجانے کتنے عرصے بعد مسکرایا تھا۔

"میں چلتا ہوں روحیل!" متوحش سا روحیل اسے رکنے کا کہہ بھی نہ پایا۔

ہوا نے راکھ اڑائی تو دل کو یاد آیا
کہ جل بجھیں میرے خوابوں کی بتیاں محسن

روحیل پتھرائی نظروں سے عمر کے گھاس پر پڑے بے جان وجود کو دیکھنے لگا جس کے لبوں پر مسکراہٹ منجمد ہو چکی تھی اور چہرے پر بے پناہ سکون تھا۔ اور کچھ ہی فاصلے پر کچھ راکھ بکھری تھی جو تانیہ اور شاہ زیب کے گم گشتہ وجود کا پتہ دیتی تھی۔ یہ زندگی ایک بڑی حقیقت ہے کہ جو کوئی دانستہ یا نادانستہ کسی کے خواب، دل یا خواہش کو راکھ کرتا ہے اسے خود بھی راکھ ہونے کی جلنے اور جل کر راکھ میں بدلنے کی اذیت جھیلنا پڑتی ہے یہ زندگی کی موت سے جیسی اٹل حقیقت ہے جس سے فرار کسی طور پر ممکن نہیں۔ راکھ کرنے والے راکھ ہو ہی جایا کرتے ہیں۔

اگر آپ کسی کا کوئی خواب، کوئی خواہش یا دل، یا زندگی راکھ ہونے سے بچا سکتے ہیں، تو ضرور ضرور بچا لیجیے، کل کو اللہ رب العزت آپ کا کوئی خواب، کوئی خواہش آپ کا دل یا زندگی راکھ ہونے سے ضرور بچائے گا اور اگر آپ کسی کو کوئی بھی شے خواب، خواہش، زندگی، راکھ ہوتے دیکھ کر محض شانے اچکا کر سوچیں "مجھے کیا؟" تو پھر ایسا وقت آپ پر بھی آ سکتا ہے۔

بقول شاعر:۔

میں آج زد پہ اگر ہوں تو خوش گمان نہ ہو
چراغ سب کے بجھیں گے، ہوا کسی کی نہیں

پریمی آتما

رضوان علی سومرو۔ کراچی

نوجوان اس روح پر مرمٹا تھا اور روح نے بھی ہر طرح سے اپنی چاہت کا ثبوت دے دیا تھا کہ پھر اچانک ایک روز اس روح نے نوجوان کو دھلا کر رکھ دیا..... وہ نوجوان سے بولی میری چاہت میں تمہیں مرنا پڑے گا کہ.....

ایک روح کی چاہت خلوص اور والہانہ پیار و محبت کہانی پڑھنے والوں کو دنگ کر دے گی

کہتے ہیں کہ تقسیم ہند کے وقت مسلمان بے حد طاقتور تھے، مسلمانوں کے بڑے بڑے خاندان زمیندار اور دولت مند تھے، ہندوستان کی متعصب حکومت نے مسلمانوں کی جڑیں کاٹنے اور ایک باقاعدہ جامع منصوبہ تیار کیا۔ خاتمہ زمینداری اس سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ زمینداری کے خاتمہ کا مقصد مسلمانوں کی کمر توڑنے کے لئے ان کی معاشی حالت کو تباہ کیا جائے۔ چنانچہ مساوات اور کسان دوستی کی آڑ میں خاتمہ زمینداری کا قانون پاس کر کے مسلمانوں کی حیثیت پر سب سے پہلی کاری ضرب لگائی گئی اس سے مسلمانوں کے بہت سے خاندان متاثر ہوئے، ہمارا خاندان بھی ان میں سے ایک تھا۔ تقسیم ہندوستان کا اعلان ہو چکا تھا پڑھتے ہوئے مالی اخراجات کے سبب والد نے مجبور ہو کر نوکری کی تلاش شروع کر دی، مگر مسلمان ہونے کے سبب

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

والد صاحب کو ملازمت نہ ملی۔ اس وقت میری عمر 20 سال تھی۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا خواب میرے دل میں موجود تھا۔ خواہش یہ تھی کہ پڑھ لکھ کر ڈاکٹر بن جاؤں۔ مگر دل کی دل میں رہ گئی۔ ایک روز والد صاحب نہایت تھکے ہارے گھر میں داخل ہوئے۔

"جی..... کچھ کام بنا....." والدہ نے والد صاحب سے پوچھا۔ "نہیں وقت کی سختی بڑھتی جارہی ہے، مگر فسادات کی آگ ٹھنڈی نہیں ہورہی..... ہندو ابھی تک اس بات کو کسی صورت ہضم نہیں کرپارہے کہ ہندوستان تقسیم ہوسکتا ہے....." والد نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اس ملک میں مسلمان ہونا جرم ہے..... لیکن ہمیں فخر ہے کہ ہم مسلمان ہیں۔"

"وقتی پریشانیاں تو آتی ہیں لیکن ایک دن وہ بھی ختم ہوجائیں گی۔" والدہ نے پرعزم لہجے میں کہا۔ ان کی آنکھوں میں امید کی چمک تھی۔

"نیک بخت تم ہی ہو جو مجھے سنبھالے ہوئے ہو....." والد صاحب نے کہا۔

"حامد جا بابا کے لئے پانی لے کر آ۔" امی نے مجھے دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ میں باورچی خانے میں دوڑ گیا۔

میں مٹکے سے پانی نکال ہی رہا تھا کہ ایک دلخراش چیخ میرے کانوں میں گونجی۔ گلاس میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا..... چیخ یقیناً میرے والدہ کی تھی میں بھاگتا ہوا باہر آیا تو صحن کا منظر دیکھ کر میرا پورا وجود پتھرا گیا۔

وہ منظر اتنا ہولناک اور شدید تھا کہ میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ میرے والد کی لاش میری آنکھوں کے سامنے تھی، 8 سے 10 ہندو بلوائی میری والدہ کو اپنی بربریت کا نشانہ بنا رہے تھے، یہ منظر دیکھ کر میں پتھرا سا گیا، دفعتاً ایک ہندو بلوائی کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ "وہ رہا ایک اور ملیچھ....." اس نے چیخ کر اپنے دوسرے ساتھیوں کو میری طرف متوجہ کیا۔

یہی وہ وقت تھا فیصلے کا، میں تیزی سے صحن میں آیا اور صحن میں موجود نیم کے پیڑ پر چڑھ کر وہاں سے باہر کی طرف کود گیا۔

میں تیزی سے بھاگتا ہوا گاؤں کے کھیتوں میں گھس گیا، مجھے اندازہ نہ تھا کہ ہندو ہمارے گاؤں میں بھی گھس جائیں گے، انتقام کی آگ میں میرا رواں رواں جھلس رہا تھا، لیکن دانشمندی کا تقاضا یہ تھا کہ جان بچا کر بھاگا جائے، اب ہندوستان میں میرے لئے کچھ نہ تھا مگر ارض پاک میں میرے لئے سب کچھ تھا، چنانچہ مجھے کسی بھی طرح سے پاکستان پہنچنا تھا۔

چنانچہ میں کسی نہ کسی طرح ریلوے اسٹیشن پہنچا، میری قسمت اچھی تھی کہ ایک ریل گاڑی وہاں رکی ہوئی تھی جو کہ چند منٹوں کے بعد وہاں سے روانہ ہونے والی تھی، میں اس ریل میں چھپ کر بیٹھ گیا، ریل چلنے لگی، تھوڑی دیر بعد اس کی رفتار تیز ہوگئی۔

اچانک ڈبے میں شور اٹھا کہ آگے ہندو بلوائی گاڑی کو روک کر ظلم کا بازار گرم کریں گے۔ اور یہ سنتے ہی دفعتاً میرے ذہن میں ایک خیال تیزی سے آیا میں نے آگے بڑھ کر زنجیر کھینچ دی۔

اور پھر دروازہ کھول کر ہلکی ہوتی ہوئی ٹرین سے نیچے کود گیا۔ میں جس جگہ گرا تھا وہ گہرا اور گھنا جنگل تھا۔ میں نے گرتے ہی تیزی سے جنگل کے اندر دوڑنا شروع کردیا تاکہ مبادا اگر کوئی پیچھے آئے تو مجھے نہ پاسکے۔ شام کے اندھیرے رات کے سائے میں تبدیل ہورہے تھے۔ میں بھاگتا جارہا تھا اس بات کی پروا کئے بغیر کہ میرے پیر کئی جگہ سے زخمی ہوچکے ہیں، تھکن اور بھوک پیاس کے احساس نے مجھے نڈھال کردیا تھا۔ دفعتاً ایک تیز سیٹی نما سی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی اس آواز کو میں اچھی طرح سے پہچانتا تھا یہ آواز سنکھ پھونکنے کی آواز تھی..... جیسا کہ ہندو اپنے مندروں میں سنکھ پھونکا کرتے ہیں۔ اس اندھیرے جنگل میں سنکھ کی آواز نے مجھے لرزا دیا۔ مجھے دور سے روشنیاں نظر آئیں۔

میں تیز تیز چلتا ہوا ان روشنیوں کے قریب ہونے کی کوشش کرنے لگا، جیسے ہی میں روشنیوں کے قریب آیا یہ دیکھ کر لرز گیا کہ یہ روشنیاں کسی مندر کی

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

تھیں، وہاں پر مشعل جل رہے تھے، اچانک مجھے تیز گھنٹیوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں، ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ کیا کروں کہ مجھے قدموں کی آہٹ کی آوازیں سنائی دینے لگیں میں لپک کر جھاڑی کے پیچھے ہوگیا۔

میں نے دیکھا کہ چار آدمی ایک تابوت لے کر مندر کے اندر جارہے ہیں، مشعل کی روشنیوں میں، میں نے دیکھا کہ وہ چاروں آدمی سیاہ لباس میں موجود ہیں، جیسے ہی وہ چاروں مندر کے اندر داخل ہوئے، میں بھی جلدی سے ان کے پیچھے چل پڑا۔

مندر کے اندر جو کچھ بھی میں نے دیکھا اس کے تصور سے آج بھی میرے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔

مندر کی ساری دیواریں سیاہ رنگ کی تھیں عجیب سا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد مندر کے اندر چاروں طرف روشنی ہوگئی، وہ روشنی مشعلوں کی تھی، جو کہ مندر کے چاروں کونوں میں روشن تھیں۔

وہ تابوت ایک بڑے چبوترے پر رکھا تھا چبوترے کے بالکل سیدھ میں ایک عجیب سے جانور کا بت رکھا تھا۔

ایک ننگ دھڑنگ آدمی اس بت کے سامنے سنکھ بجا رہا تھا۔ وہ سرتاپا قدرتی لباس میں تھا۔ ہندوستان دنیا کا وہ واحد ملک ہے جہاں ایسے ایسے مذاہب موجود ہیں جو نہ دیکھے نہ سنے گئے۔

وہ ننگا سادھو سنکھ بجا رہا تھا، تابوت کے پاس چاروں لوگ دائرے کی صورت میں سر جھکائے کھڑے تھے۔

جب وہ سادھو سنکھ بجا چکا تو آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس بت کے نزدیک آگیا جو کہ عجیب الخلقت تھا، بت کے پاس آکر چند لمحے تک عقیدت بھری نظروں سے اسے دیکھتا رہا، پھر نہایت ہی سرعت سے بت کے ہاتھ میں پکڑے خنجر سے اپنی انگلی زخمی کرلی۔ پھر وہی زخمی انگلی بت کے ماتھے پر لگادی۔ پھر وہ تیزی سے اسی تابوت کے پاس جا پہنچا۔

میرے دیکھتے ہی دیکھتے ان چاروں نے بھی اپنے سیاہ لباس اتار پھینکے، اب وہ تابوت کے سامنے قدرتی لباس میں کھڑے تھے، ایک نے آگے بڑھ کر تابوت کا ڈھکن اٹھادیا۔ تابوت کے اندر سے ایک لاش کو باہر نکال کر فرش پر رکھ دیا۔ وہ لاش کسی عورت کی تھی..... دوسرے لمحے میرے سامنے نہایت خوفناک اور حیرت انگیز منظر تھا۔ وہ سب لاش پر کتے کی طرح لپٹ گئے اپنے دانتوں سے اسے بھنبھوڑنے لگے، چند ہی لمحوں میں وہ لاش خون سے لت پت نظر آنے لگی، حیوانیت کا اتنا بھیانک منظر تھا کہ جب تک زندہ رہوں گا کبھی نہ بھلا پاؤں گا۔ منظر اتنا خوفناک تھا کہ میری چیخ نکل گئی۔ میری چیخ نکلتے ہی ان کا وحشیانہ فعل رک گیا۔

"رکھو..... یہاں کوئی ہے....." ایک نے دوسرے کو مخاطب کرکے کہا۔

"پکڑ سالے..... کو ورنہ پولیس کو لے آئے گا....." دوسرے نے کہا۔ اس کی بات سن کر میں چیختا ہوا باہر کی جانب بھاگا وہ بھی میرے پیچھے پیچھے باہر کی طرف لپکے، اب میں نے جنگل میں مخالف سمت بھاگنا شروع کردیا، بھاگتے بھاگتے میرا پیر پھسلا اور میں لڑھکڑا کر گر پڑا، درد کی ایک شدید ٹیس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ لیکن پکڑے جانے کا خوف ہر خوف پر بھاری تھا، اس لئے میں نے درد کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اور تیزی سے بھاگنا شروع کردیا۔ رات کا اندھیرا گہرا ہوچکا تھا جنگل بہت ہی خطرناک ہوتا ہے، طرح طرح کے جنگلی جانوروں کا خطرہ ہمیشہ درپیش ہوتا ہے۔

بھاگتے بھاگتے مجھے ایک کچا سا راستہ نظر آیا۔ میں نے اس راستے پر اتر کر چلنا شروع کردیا۔ میں بہت تھک چکا تھا۔ یہ کچے راستے محکمہ جنگلات کی اصطلاح میں سانپ لائن کہلاتے ہیں کیونکہ جہاں جہاں سانپ لائن ہوتے ہیں جہاں جنگل زیادہ گھنے اور دلدلی ہوں۔

اب ایک نیا خوف میرے ذہن پر سوار تھا، آدم خور جانوروں کا سب سے زیادہ۔

چلتے چلتے میں ایک ڈھلان اترنے لگا ڈھلان

جہاں ختم ہوتی تھی وہاں جھاڑیاں تھیں اور چھوٹا سا نالہ بہہ رہا تھا، میں نالہ عبور کرنے لگا تو اچانک جھاڑیوں میں حرکت پیدا ہوئی اور میں وہیں رک گیا، جھاڑیوں میں سے جو چیز باہر آئی اسے دیکھ کر خوف سے میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔

جھاڑیوں سے نکلنے والا ایک شیر تھا.....

جھاڑیوں سے باہر نکل کر اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا، چند سیکنڈ تک وہ میری طرف چمکیلی آنکھوں سے دیکھتا رہا، پھر منہ کھول کر جمائی لی اور آگے بڑھ گیا میں نے خدا کا شکر ادا کیا، ورنہ اس وقت میری موت لازمی تھی، میں نالہ پار کر کے دوسری طرف نکل گیا، جیسے ہی میں دوسری طرف پہنچا میرے سامنے ایک طویل جنگل تھا، میرا جسم تھکن سے چور تھا، مزید آگے بڑھنے کی ہمت نہ تھی چنانچہ میں ایک پیڑ سے ٹیک لگا کر وہیں لیٹ گیا، تھوڑی دیر میں نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

آنکھ کھلی تو سورج نکل چکا تھا، جسم کی تھکن سے تو میں تر و تازہ ہو چکا تھا لیکن پیٹ کے تھکن اب بھی موجود تھی۔ جس جگہ میں بیٹھا تھا وہاں جنگلی پھلوں کے درخت وافر مقدار میں تھے اب یہ مجھے معلوم نہیں تھا اس میں کون سا پھل کھانے والا ہے اور کون سا زہریلا، میں نے ڈرتے ڈرتے اسی درخت کا پھل توڑا جس سے میں ٹیک لگا کر سویا تھا وہ پھل دیکھنے میں تو سیب جیسا تھا۔ چنانچہ میں نے اللہ کا نام لے کر اسے کھانا شروع کر دیا۔

وہ پھل ذائقے میں انتہائی شیریں تھا۔ میں کافی سارے پھل کھا گیا۔ اب میرا ارادہ کسی گاؤں میں پہنچنے کا تھا تاکہ وہاں سے پاکستان جا سکوں، مجھے یہ علم نہ تھا کہ میں ہندوستان کے کس حصے میں ہوں، بہرحال کسی نہ کسی طرح سے یہاں سے نکل کر پاکستان جانا تھا۔

پھل کھانے کے بعد میں اٹھ کھڑا ہوا، میرا ارادہ جنگل کو عبور کر کے کسی بستی یا گاؤں میں جانے کا تھا مگر جنگل گہرا اور گھنا ہوتا ہی جا رہا تھا، جیسے ہی میں آگے بڑھا ایک چھوٹی کھائی سی آ گئی، میں کھائی کو عبور کر کے باہر سامنے تھوڑی کھلی جگہ آ گیا، اس کھلی جگہ پر اونچی اونچی قد آدم گھاس اگی ہوئی تھی، سامنے اس گھاس میں ایک چھوٹا سا راستہ بنا ہوا تھا۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس راستے سے آگے بڑھنے لگا، بہرحال میں پھونک پھونک کر قدم بڑھاتا گھاس کے قطعے سے باہر نکل آیا۔

آگے پھر جنگل تھا مگر درخت الگ الگ کھڑے تھے۔ سامنے ایک چھوٹا سا ٹیلہ تھا۔ جس کی ڈھلان جھاڑیوں نے ڈھانپ رکھی تھی۔ میں ٹیلے کے پہلو سے ہوتا ہوا دوسری جانب آیا، سامنے درختوں کے جھنڈ تھے اس کے درمیان ایک چھوٹا سا تالاب تھا اور اس کے پیچھے ایک سیاہی مائل بھوری دیوار دکھائی دی، میں تالاب کے پاس آ گیا، تالاب زیادہ بڑا نہ تھا۔ تالاب سے آگے ایک ٹوٹا ہوا گیٹ جو کہ آدھا زمین میں دھنس چکا تھا۔ شاید میں کسی پرانے قلعے کے پاس کھڑا تھا، قلعے کی طرز و تعمیر بالکل مغلیہ دور کی تھی۔

میں تیز تیز چلتا ہوا گیٹ سے اندر داخل ہو گیا۔

دفعتاً میں چونک کر رک گیا۔ میرے سامنے ایک گول چبوترے پر بنی ہوئی چھوٹی سی بارہ دری تھی، میں بارہ دری کے پاس آ گیا، بارہ دری کے اندر ایک مخروطی برجی تھی۔ برجی کا رنگ بارشوں اور دھوپ کی وجہ سے سیاہ پڑ چکا تھا۔

میں برجی کے چبوترے سے اتر کر راہداری میں پھرنے لگا ایک جگہ زینہ محل کے چوپائے کو جاتا تھا، میں زینہ طے کر کے اوپر کو آ گیا۔ وہ ایک نیم سا تاریک چھوٹا سا خالی کمرہ تھا۔ جس کی سیاہ دیواریں گویا آگے کو جھکی ہوئی تھیں، ایک عجیب سی خاموشی طاری تھی۔ میں چھوٹے دروازے سے گزر کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ یہ مستطیل کمرہ تھا اس کے جنگل کی جانب تین جھروکے تھے۔ ایک جھروکے میں سے چھوٹی سی گیلری باہر کو نکلی ہوئی تھی۔ مگر گیلری کا فرش غائب تھا اور زمین کی گہرائی نظر آ رہی تھی۔

میں اس لمبے کمرے سے بھی گزر گیا۔ کمرے کے آخر میں پتھر کی تین سیڑھیاں نظر آئیں، میں سیڑھی سے اوپر چڑھنے لگا، جیسے ہی میں دوسری سیڑھی پر پہنچا

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

سیڑھی میرے پاؤں کے وزن سے دب گئی اس اچانک افتاد سے میں پریشان ہو گیا، میرے حلق سے چیخ نکلی..... اور تیزی سے پھسلتا ہوا خلاء سے نیچے گرنے لگا..... میری آنکھوں میں اندھیرا چھانے لگا تھا۔

تھوڑی دیر بعد میرے ہوش حواس بحال ہوئے تو میں نے اپنے آپ کو نیم اندھیرے کمرے میں پایا شاید یہ کوئی تہہ خانہ تھا۔

روشنی اتنی ناکافی تھی کہ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا، اندھیرے کمرے میں نہایت ٹھنڈ تھی، کوئی شے واضح نہ تھی، کمرے کے صحیح خدوخال کا بھی اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا۔

دفعتاً مجھے خوشبو کا احساس ہوا، خوشبو کا احساس نہایت لطیف تھا، نہ وہ خوشبو گلاب کی تھی، نہ ہی موتیے کی لیکن خوشبو انتہائی معطر اور اپنے اندر ایک پراسرار سا احساس رکھتی تھی، اس کے ساتھ ہی مجھے کسی کے لباس سے سرسراہٹ سنائی دی ایسا لگا کہ جیسے کوئی ریشمی لباس والی عورت میرے قریب سے گزری ہو اور خوشبو کا ایک بھرپور جھونکا میرے پاس چھوڑ گئی ہو۔

دفعتاً مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کسی نے میرے ہونٹوں کو چھوا ہو..... کسی کے لطیف سے لمس کا بھرپور احساس مجھے محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے ہونٹوں کو چوما ہو۔

میں تھر تھر کانپنے لگا کہ یا اللہ یہ کیا ماجرا ہے، اچانک مجھے کسی نے زوردار دھکا دیا تو میں چیختا ہوا دیوار سے جا ٹکرایا اور وہیں چپک گیا۔

خوشبو کا احساس لطیف احساس اب تیز ہونے لگا اب مجھے ہر طرف خوشبو ہی خوشبو محسوس ہونے لگی، میرے ہوش و حواس تیزی سے میرا ساتھ چھوڑتے جا رہے تھے..... اس کے بعد میں نے اپنے آپ کو خلاؤں میں تیرتا ہوا محسوس کیا..... پھر ہر احساس منجمد ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

''بھائی اٹھو..... اٹھ بھی جاؤ.....'' کسی کے جھنجھوڑے جانے پر میں بوکھلا کر اٹھ بیٹھا..... میں نے دیکھا کہ میں ایک پتھریلی بنچ پر موجود ہوں، ایک معمر آدمی میرے سامنے کھڑا مجھے حیران نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

یہاں کی تو ساری دنیا ہی بدلی ہوئی تھی، میں کسی ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر موجود تھا۔ عوام کی کافی چہل پہل پلیٹ فارم پر موجود تھی۔ ''میاں سونے کے لئے گھر ہوتا ہے، ریلوے پلیٹ فارم نہیں..... ہمیں بھی جگہ دو بیٹھنے کے لئے، کب سے کھڑے ہیں، کوئی بیٹھنے نہیں دیتا.....'' معمر آدمی منہ بنا کر بولا تو میں تھوڑا سا سائیڈ میں ہو گیا۔

مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میں اس اندھیرے کمرے سے یہاں کیسے پہنچ گیا۔

''بزرگوں کا احترام سیکھو میاں..... اللہ بخشے میرے والد مرحوم کو ان کے سامنے ہم بیٹھنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے تم اب تک بیٹھے ہو.....'' بڑے میاں بیٹھتے ہوئے بولے۔

میں نے بغور ان بڑے میاں کا جائزہ لیا 60,65 سال کے عمر رسیدہ بزرگ تھے، کالی شیروانی اور سفید پاجامے میں ملبوس تھے۔

ریلوے پلیٹ فارم پر عوام کی ایک تعداد تھی، حیرت کی بات یہ تھی اس پلیٹ فارم پر مجھے سارے کے سارے شلوار قمیض، کرتا پاجامہ یا ہیٹ شرٹ میں ملبوس نظر آئے، لیکن ہندو لباس میں کوئی نہ تھا اور نہ کوئی پولیس والا نظر آیا.....

''انکل یہ کون سی جگہ ہے.....؟'' میں نے بڑے میاں سے پوچھا جو کہ مجھ سے لاتعلق ہو کر اپنا پاندان کھول رہے تھے۔

''میاں رہی جل گئی پر بل نہیں گئے..... انگریز چلے گئے ڈکشنری چھوڑ گئے..... انکل سے بہتر تو یہ تھا کہ اردو میں مخاطب کر کے بولتے۔'' بڑے میاں منہ بنا کر بولے۔

اتنی ٹینشن کے باوجود بھی میری ہنسی چھوٹ گئی۔

''بہت زیادہ بے ادب ہو۔ میاں بزرگوں سے بات کا سلیقہ نہیں سیکھا۔''

وہ سیخ پا ہو کر بولے۔

"اچھا چچا جان مجھے معاف کردیں۔ یہ بتائیں کون سی جگہ ہے؟" میں نے مسکرا کر پوچھا۔

"میاں یہ کینٹ ہے..... کراچی پاکستان....."

بڑے میاں اتنا کہہ کر منہ بنا کر اٹھ گئے۔

اتنا سننا تھا کہ میرا دل خوشی سے اچھل پڑا، لیکن بڑے میاں کی بات پر یقین کرنے کے لئے میں ریلوے اسٹیشن سے باہر نکل آیا۔ واقعی بڑے میاں کی بات سچ تھی۔ یہ کراچی ہی تھا کینٹ اسٹیشن کے آس پاس کا علاقہ اب تو کافی آباد ہے، بڑے، بڑے روڈ بن چکے ہیں لیکن 1950ء میں یہ سب نہ تھا، میں خوشی سے باہر نکل کر سجدہ ریز ہوگیا، وہ پراسرار قوت جس کی بھی تھی لیکن اس نے مجھے ارض پاک میں پہنچا دیا تھا۔

دو دن میں مجھے اچھی طرح سے اندازہ ہوگیا کہ زندگی بغیر کسی سہارے کے چلانا کتنا مشکل ہے روشنیوں کے اس شہر میں دور دور تک اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ دل ہی دل میں اس اجنبی شہر میں بیگانگی کا احساس لئے نوکری کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہا۔ میونسپلٹی کا نل ہی پیٹ کی آگ بجھاتا اور پیاس بجھی۔

دو روز کے بعد میں ایک مزار کے سامنے بیٹھ گیا اس مزار سے ملی ہوئی خیرات سے، پیٹ کی آگ بجھائی، لیکن دل میں تھوڑی غیرت اور ضمیر باقی تھا۔ چنانچہ میں نے نوکری کی تلاش شروع کردی، لیکن جلد ہی مجھے اندازہ ہوگیا، اس شہر میں نوکری کا ملنا، ریگستان میں پانی تلاش کرنے کے مترادف تھا، اب تو میرا یہ معمول تھا کہ دن بھر ملازمت کی تلاش میں سرگرداں رہتا اور رات کے وقت اسٹیشن پر آکر تیسرے درجے کے مسافر خانے میں سو جاتا، مگر ملازمت کی کوئی امید نظر نہ آتی، ایک روز میرے دل میں یہ بات آئی کہ مجھے خودکشی کرلینی چاہئے، چنانچہ میں نے طے کرلیا کہ کل اگر کچھ نہ ہوا تو میں مرجاؤں گا، دوسری صبح میں نوکری کی تلاش میں نکلا، بھوک کے مارے میرا دم نکلا جارہا تھا، کپڑے بھی میلے ہورہے تھے۔ دفعتاً میری نظر ایک اخبار پر پڑی جو کہ ایک صاحب پڑھ رہے تھے اس اخبار میں ضرورت والے کالم پر پڑی، جس میں ایک کلرک کی ضرورت تھی، میں نے پتہ نوٹ کیا اور سیدھا کمپنی کے دفتر جا پہنچا۔

انٹرویو ہوا اور رحمت الٰہی جوش میں آگئی اور مجھے 40 روپے ماہوار پر نوکری پر رکھ لیا گیا۔ 40 روپے اس زمانے میں کافی بڑی رقم تھی۔

مجھے ایک سینئر کلرک کے نیچے رہ کر کام کرنا تھا، بزرگوار نہایت ہی مہربان آدمی تھے کہ انہوں نے مجھ سے نہایت ہمدردی اور محبت کا برتاؤ کیا اور بے حد اصرار کرکے اپنے ساتھ کھانے میں شریک کرلیا۔

ملازمت کے حصول کے بعد فوری طور پر مکان کی تلاش شروع کردی، لیکن کرائے اتنے زیادہ تھے میرے لئے نہایت مشکل ہوجاتا، چنانچہ مجھے کافی عرصے تک مکان نہ مل سکا۔

چنانچہ میں نے غریبوں کی آبادی میں مکان کی تلاش شروع کردی، جلد مجھے "قبرستان کالونی" میں ایک چھوٹا سا مکان مل گیا۔ یہ محلہ قبرستان کالونی اس لئے کہلاتا تھا کہ اس محلے کے وسط میں ایک پرانا قبرستان آباد تھا، لوگوں کو اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے اس قبرستان سے گزر کر جانا پڑتا، وہ چھوٹا سا مکان بالکل قبرستان کے ساتھ ہی بنا ہوا تھا۔ جاہل اور توہم پرست لوگوں نے اس کے ساتھ ہی عجیب وغریب روایات جوڑ دی تھیں کہ یہ مکان آسیب زدہ ہے، آسیب زدگی زیادہ پرانی نہیں صرف 1 ماہ قبل ہی اس مکان میں پراسرار واقعات رونما ہونا شروع ہوگئے تھے جس کی بدولت یہ مکان خالی ہوگیا، لوگوں کا خیال تھا کہ قبرستان کی روحیں اس مکان میں بسیرا کرنا چاہتی ہیں۔ خیر وہ مکان میں نے کرائے پر لے لیا۔

مالک مکان بھی خوش تھا چلو مسئلہ حل ہوا۔

اس مکان میں وہ میری پہلی رات تھی مکان کی کھڑکی سے قبرستان صاف دکھائی دیتا تھا۔ میرے پاس لیٹنے کے لئے چارپائی اور چادر تک نہ تھی، بہرحال میں اس مکان میں داخل ہوا تو مجھے ایسا لگا کہ گلابوں کی سی

خوشبو میرے اردگرد پھیل گئی ہو..... مجھے ایسا لگا کہ جیسے یہ خوشبو میں نے پہلے بھی سونگھی ہو، مجھے انتہائی عجیب سا لگا کہ یہ خوشبو کہاں سے آئی..... میں نے کوئی خیال نہ کیا اور فرش پر ہی لیٹ گیا۔ فرش خاک کی نیند بھی بہت ہی اچھی تھی، ایسی نیند جو کہ مخملی گدوں پر نصیب نہ ہوسکتی تھی۔

صبح میں آنکھیں ملتا ہوا اٹھا آفس جانے کی تیاری کرنے لگا، دفعتاً میری نظر کاغذ کے ایک پرزے پر پڑی، میں نے اس پرزے کو اٹھایا تو پتہ چلا کہ 10 روپے کا نوٹ تھا، نوٹ دیکھتے ہی مجھ پر شادی مرگ کی کیفیت طاری ہوگئی، 10 روپے اس زمانے میں کافی بڑے تھے، بہرحال میں موقع غنیمت جان کر وہ نوٹ رکھ لیا۔

نوٹ کو بھرپور طریقے سے استعمال کرتے ہوئے میں نے تقریباً ضرورت کی چیزیں خرید لیں، چادر، تکیہ، مٹی تیل کا لیمپ، پانی کا گلاس اور ایک صراحی، یہ سب خریدنے کے بعد بھی روپیہ بچ گیا۔

رات کے قریب 11 بجے ہوں گے..... گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی.....

"چھن..... چھن..... چھن....." کی آواز سنائی دی، جیسے کوئی دوشیزہ پازیب پہن کر چل رہی ہو۔ آواز قبرستان سے آرہی تھی، میں تجسس کے زیر اثر اٹھ کر اس آواز کے پیچھے چل پڑا۔

قبرستان میں گہری تاریکی اور سناٹا تھا۔ آواز اب بھی میرے کانوں میں گونج رہی تھی، دفعتاً مجھے اپنے پاس سے خوشبو کا جھونکا سا گزرتا ہوا محسوس ہوا، مجھے ایسا لگا کہ کسی نے میرے بالوں کو چھوا ہو..... میں ڈر کر پیچھے ہٹ گیا اور ساتھ ہی میں نے کھنکتے ہوئے قہقہے کی آواز سنی، یہ سب محسوس کرکے میں بہت ڈر گیا اور بھاگتا ہوا اپنے کمرے میں داخل ہوگیا۔

مجھے سمجھ نہ آرہا تھا کیا چکر ہے؟ کافی دیر تک جاگتے رہنے کے بعد میں سوگیا۔ صبح سویرے جب میں اٹھا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی 10 کا ایک نیا نوٹ موجود تھا، یقیناً کسی شخص کی یہ حرکت تھی، جو مجھے پریشان کرنا چاہتا تھا۔ میرے خیال میں میری غیر موجودگی میں کسی نے وہ نوٹ وہاں رکھ دیا تھا۔ میرے لئے یہ بات باعث حیرت تھی، ایک اجنبی شہر میں اپنے بھی بیگانے ہوتے ہیں، کون اتنی رات کو دوسرے کی مدد کرنے آئے گا۔

میں نے بہت کوشش کی اس معاملے کو سمجھنے کی مگر میں قاصر رہا، شام کو دفتر سے لوٹتے وقت میں نے اور ضروریات زندگی کا سامان خریدا اور واپس آگیا۔

اب تو ہر روز مجھے صبح ایک نیا 10 کا نوٹ مل جاتا، میں نے راتوں کو جاگ کر بھی اس راز کو معلوم کرنے کی کوشش کی مگر میں ناکام رہا، چنانچہ میں نے سعی لاحاصل چھوڑ کر اس نعمت سے فیضیاب ہونا شروع کردیا۔

چند ہی دنوں میں میرے ٹھاٹ ہی بدل گئے، دفتر والے حیران تھے کہ یہ کیا ماجرا ہے، واقعی مکان کے اس آسیب نے میری زندگی بدل دی تھی۔

محلے والے بھی حیران تھے کہ اس آسیب زدہ مکان میں کوئی شخص اتنے دن کیسے رہ سکتا ہے، اس روز کے بعد مجھے ایسا لگتا کہ کوئی غیر مرئی مخلوق میرے ساتھ ہے، خوشبو کا ہلکا ہلکا سا احساس مجھے ہر وقت معطر کیے رہتا۔

درست ہے

جنرل شرمن کے اعزاز میں تقریب ہورہی تھی۔ جنرل نے تقریر کرتے ہوئے کہا۔ "اگر میں جہنم اور ٹیکساس دونوں کا مالک ہوتا تو ٹیکساس کو کرائے پر دے دیتا اور جہنم میں رہنا پسند کرتا۔"

"بالکل درست فرمایا۔" ٹیکساس کے ایک شہری نے کہا۔ "ہر شخص اپنے اپنے وطن میں رہنا پسند کرتا ہے۔"

(ماہم۔کراچی)

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

میں جہاں جہاں جاتا، خوشبو ہر وقت میرے ساتھ رہتی، نہ جانے وہ کون سی مخلوق تھی جس کا سایہ ہر وقت میرے ساتھ رہتا تھا، نوٹوں کی آمد روز کی طرح جاری تھی، ایک رات میں پہلے کی طرح تمام چیزوں کا جائزہ لینے کے بعد بستر پر دراز ہوگیا۔ نیند کا کوسوں دور تک پتہ نہیں تھا۔ چند ہی منٹ گزرے ہوں گے مجھے بستر پر دراز ہوئے دفعتاً میرے کانوں میں ''چھن..... چھن.....'' کی آواز گونجی، مجھے ایسا محسوس ہوا کہ مجھے کسی نے اپنے ہاتھوں کی چوڑیاں کھنکھنا کر متوجہ کیا ہو، پھر دوسرے لمحے ہی ایسا لگا کہ جیسے کسی نے میرے تکیے کو چھوا ہو، میں سمجھ گیا میرے اس نادیدہ ہمدرد نے نوٹ تکیے کے نیچے رکھ دیا ہے، زندگی میں پہلی مرتبہ کسی غیر مرئی وجود کو اتنے قریب سے محسوس کیا تھا، ڈر سے جیسے میرا حلق خشک ہوگیا۔ پسینے کی ننھی ننھی بوندیں میں اپنے ماتھے پر محسوس کررہا تھا۔

''کک..... کون ہو تم..... سامنے آؤ.....''

جواب میں ایک نقرئی قہقہہ میرے کانوں میں گونج گیا۔

اب تو کیا تھا خوف سے میرے سارے مساموں سے پسینہ پھوٹ پڑا۔

میں حامد علی خان یہ اعتراف کرتا ہوں کہ میں اس وقت بہت زیادہ ڈر گیا تھا۔

''مم..... مم..... مجھے معاف کردو..... میں کل یہاں سے چلا جاؤں گا.....'' میں نے کہا۔

میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ لمحہ کے ہزارویں حصے میں کمرہ میں سفید رنگ کا ہلکا سا دھواں پھیل گیا۔ اسی لمحے مجھے ایک سفید پیکر کی جھلک دکھائی دی، وہ سفید پیکر روشنی کے ذرات میں منقسم ہوتا رہا، روشنی کے سنہری ذرات مجسم ہوتے رہے..... پھر میں نے ایک انتہائی حسین وجمیل دوشیزہ کو دیکھا۔

وہ انتہائی خوبصورت تھی..... اس کی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی، چہرے پر بے پناہ رونق تھی، میں شاعر تو نہیں نہ مجھے شاعری آتی ہے، مگر مجھے ایسا لگا جیسے سنہری اور کاسنی رنگت نے مل کر دوشیزہ کا روپ لے لیا ہو، یوں لگ رہا تھا جیسے کہ چودھویں کا چاند اس کے چہرے پر چمک رہا ہو، اس کا جسم انتہائی خوبصورت اور لوچ دار تھا۔ اس میں رعنائی بھی تھی اس میں بھڑکتے ہوئے جذبات بھی تھے، معصومیت بھی تھی، غرض کہ ہر رعنائی اس میں موجود تھی، ایک لمحہ کے لئے میں اپنے آپ کو بھول گیا، ڈر و خوف میرے دل سے نکل گیا، اس کے جسم سے پھوٹتی سوندھی سوندھی خوشبو میرے وجود کو معطر کئے جارہی تھی، وہ پرشوق نگاہوں سے مجھے گھورے جارہی تھی۔ ''ماشاء اللہ.....'' میرے منہ سے از خود نکل گیا۔ اس نے شرما کر سر جھکالیا۔

''کک..... کون ہو تم؟''

''میں قلعہ کی آتما ہوں..... میرا نام اوشا ہے.....'' وہ مسکرا کر بولی۔

''قلعہ کی آتما؟.....'' میں نے حیرت سے کہا۔

''ہاں..... جب تم پہلی بار اس قلعہ میں داخل ہوئے تھے جو کہ جنگل میں ہے..... تمہیں داخل ہوتا دیکھ کر، تم مجھے اچھے لگے..... میرے دل میں تمہارے لئے پریم کا احساس جاگا..... اس لئے میں نے تمہیں پاکستان پہنچایا..... اور پھر تمہارے پیچھے یہاں آگئی.....''

''تو..... وہ آپ تھیں جس نے مجھے پریشانیوں سے بچایا..... لیکن اتنے دن میری مدد کیوں نہ کی؟''

''میں نے تمہاری ہر لمحہ مدد کی۔''

''مگر تم ہو کون؟'' میں جرأت کرکے پوچھا۔

''میں ایک مظلوم آتما ہوں..... ایک وحشی درندہ جو کہ میری دولت کا بھوکا تھا وہ میرا چچا تھا..... اس نے زبردستی میری دولت چھپالی..... اور میری معصومیت کو بھی داغ دار کردیا.....''

میرے دل میں بھی خواب تھے ارمان تھے کہ میں کسی کی دلہن بنوں، لیکن عزت کے چلے جانے کے بعد میں نے خودکشی کرلی، میں نہیں چاہتی تھی کہ کلنک کا ٹیکہ بن کر دنیا میں رہوں۔ میں نے اپنے چچا سے بدلہ لیا، اسے اتنی بھیانک موت مارا کہ..... بس..... اس کے بعد ایک عامل نے میری آتما کو قلعہ میں قید کردیا..... اس کے بعد تم آئے تو میں آزاد ہوگئی۔''

اس کے لہجہ میں بلا کا سوز تھا..... اس قدر درد تھا کہ پتھر کا دل بھی پگھل جائے.....

''مگر آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''میں آپ کی سیوا کرنا چاہتی ہوں..... اور پریم پر میرا ادھیکار ہے..... میں آپ سے اس قدر پریم کروں گی کہ سارے دکھ ختم ہوجائیں گے۔''

دکھوں کا سن کر میری آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

''میرے دکھ تو میری موت کے ساتھ ختم ہوں گے..... جن لوگوں نے میرے ماں باپ کو مارا میری ماں کو بے عزت کیا، وہ اب بھی زندہ ہیں، اور میں بدلہ نہیں لے سکتا.....''

میری بات سن کر اس کی غزالی آنکھوں میں غیظ وغضب ناچنے لگا۔ ''تمہارے ماں باپ کے قاتل، وہ اپنے انجام کو پہنچ چکے ہیں، میں نے ان کو چن چن کر مارا ہے..... میں نے کہا تھا نا کہ میں نے ہر لمحہ تمہاری مدد کی، میں یہی کام کررہی تھی۔''

اس کی بات سن کر میں نے اپنے دل میں سکون سا اترتا محسوس کیا۔

چنانچہ میں بستر پر دراز ہوگیا۔ تو اسی لمحے نرم و نازک انگلیاں میں نے اپنے بالوں میں گھومتی محسوس کیں۔ نہ جانے کب تک وہ میرا سر سہلاتی رہی دباتی رہی، اس کے بعد مجھے نیند آگئی۔ اب تو اس روح کا ساتھ ہر وقت میرے پاس ہوتا، وہ ہر وقت میرے ساتھ ہوتی، اس کی باتیں ختم نہ ہوتیں۔

ایک روز اس نے مجھ سے نہایت عجیب وغریب سوال کیا۔

''کیا آپ میری تشنہ پریم کو پورا کرسکتے ہیں، کیا میں آپ کی سیوک بن کر رہ سکتی ہوں ہمیشہ کے لئے۔''

''ایسا تو نہیں ہوسکتا۔ تم ایک روح ہو..... اور میں انسان..... ہمارا میل نہیں ہوسکتا۔'' میں نے کہا۔

''ہوسکتا ہے..... لیکن وعدہ کرو جو میں کہوں گی اسے پورا کرو گے۔ کیونکہ میں تمہیں اپنا سب کچھ مان چکی ہوں۔''

''میں وعدہ کرتا ہوں.....'' میں نے شدت جذبات سے مغلوب ہوکر اس کے ہاتھ کو دباتے ہوئے کہا۔

میری بات سن کر وہ مسکرائی اور بولی۔ ''اگر تم نے وعدہ توڑا تو میں واپس چلی جاؤں گی ہمیشہ کے لئے۔''

''میں وعدہ کرتا ہوں..... محبت کی منزلوں کو پاکر رہوں گا۔'' میں جذباتی لہجے میں بولا۔

''تو تمہیں مرنا ہوگا تاکہ تم بھی میری طرح ہوجاؤ۔'' وہ عجیب لہجے میں بولی۔

اور اس کی بات سن کر میں سناٹے میں رہ گیا۔

موت جیسے مجھے اپنے چاروں طرف منڈلاتی ہوئی نظر آئی، میں شاید محبت کی اس منزل تک نہیں پہنچا تھا جو کہ محبت کا حاصل ہے، جہاں صرف اور صرف محبوب ہو اور کچھ نہیں، عشق اور محبت کی منزلیں اور قسمیں، میں اپنی جگہ سہم کر رہ گیا۔ مجھے خاموش دیکھ کر وہ مسکرائی، وہ مسکراہٹ انتہائی پھیکی تھی۔ ''کیا ہوا جواب دو؟''

''تم ایک روح ہو..... اور میں زندہ انسان..... میری محبت اتنی کامل نہیں کہ میں تمہارے لئے مرسکوں۔'' میں نے سر جھکائے دھیرے سے کہا۔

میری بات سن کر اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ دوسرے لمحے وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی، کافی دیر تک ہذیانی انداز میں ہنستی رہی، ہنستے ہنستے اس کی غزالی آنکھوں سے آنسو گر پڑے۔

میں جانتی تھی کہ ایسا ہی ہوگا..... میں نے جھوٹ بولا تھا کہ میرے چچا نے مجھے برباد کیا۔ میری ساری داستان جھوٹ تھی۔''

''جھوٹ بولا..... مگر کیوں؟'' میں نے کہا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"یہ کہانی آج سے 400 سال پہلے شروع ہوتی ہے..... میری شادی راج کمار نیل کنٹھ سے شروع ہوتی ہے وہ مجھ سے بہت پیار کرتا تھا، اور میں بھی اس سے پیار کرتی تھی، مجھے خون خرابے سے نفرت تھی۔ چنانچہ اس نے میرے لئے وہ قلعہ بنوایا..... جہاں تم پہلی بار آئے تھے....." اس نے میری طرف اشارہ کر کے کہا، میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے.....

"میں خوشی خوشی اس قلعے میں رہنے لگی..... پھر اس قلعہ میں کرمان سنگھ آیا..... کرمان سنگھ فوج کا سپہ سالار تھا..... اس جیسا بھرپور مرد میں نے کہیں نہ دیکھا تھا۔ اتنا بانکا اتنا سجیلا کہ ہر عورت اس کی چوڑی چھاتیوں میں سمانا فخر محسوس کرتی۔

میں اس پر بری طرح سے ریجھ گئی، چند دنوں بعد نیل کنٹھ کسی کام سے ریاست کی طرف گیا، پھر تو کیا تھا، چند دنوں میں کرمان سنگھ اور میں رانی اوشا دیوی جس نے اپنا سب کچھ ایک سپہ سالار کے حوالے کر دیا۔ میرا جسم، میری آتما سب کے سب کرمان سنگھ کے غلام بن گئے۔

ایک روز نیل کنٹھ نے ہمیں قابل اعتراض حالت میں دیکھ لیا وہ اچانک ہی شہر سے واپس آ گیا تھا، نیل کنٹھ، یہ منظر دیکھ کر آپے سے باہر ہو گیا اور اس نے کرمان سنگھ پر حملہ کر دیا۔

لڑائی میں نیل کنٹھ بھاری پڑ رہا تھا، دونوں ہی تلوار بازی کے ماہر تھے، اس سے قبل کہ نیل کنٹھ کرمان سنگھ کو قتل کرتا، میں نے تلوار نیل کنٹھ کے پشت میں گھونپ دی، مرنے سے قبل نیل کنٹھ نے مجھے بد دعا دی کہ "میں بھی پیار کو ترسوں..... ٹھکرائی جاؤں، استعمال کی جاؤں۔"

پھر کرمان سنگھ اور میں نے وواہ کر لیا، اس نے مجھ کو محبت دی، بے حد محبت دی کہ نیل کنٹھ کی بد دعا بے معنی لگنے لگی، محبت بھی ایک دھوکہ تھی، ایک روز کرمان سنگھ نے قلعہ مجھ سے اپنے نام کروالا..... اور لات مار کر قلعہ سے مجھے نکال دیا کیونکہ اس کا دل کسی اور پر آ گیا تھا۔

میں نے قلعہ کی چھت سے کود کر آتما ہتھیا کر لیا در میری آتما وہاں بھٹکنے لگی۔

رفتہ رفتہ لوگ ڈر کر قلعہ چھوڑ کر بھاگنے لگے اور کرمان سنگھ ایک لڑائی میں مارا گیا۔

نیل کنٹھ کی بد دعا کام آئی اور میں محبت کو ترسنے لگی..... لوگ مجھ سے ڈرنے لگے..... بھاگنے لگے، قلعہ ویران ہو گیا..... قلعہ میں ہر جگہ نیل کنٹھ ہنستا ہوا محسوس ہوتا، جیسے وہ کہہ رہا ہو کہ "دیکھو اوشا..... محبت کے بدلے محبت ملتی ہے اور دھتکار کے بدلے دھتکار، تم نے مجھے ٹھکرا کر ذلت کا راستہ چنا..... اور ذلت رسوائی کی موت تمہیں ملی۔"

میں ہر وقت روتی رہتی، ندامت اور بے چینی نے مجھے کہیں کا نہ رکھا تھا۔ کوئی 300 سال بعد اس قلعہ میں ایک عامل سادھو آیا..... اس کا نام بھیرو تھا۔ بھیرو بہت خطرناک انسان تھا، طاقت حاصل کرنے کے لئے وہ کچھ بھی کر سکتا تھا، چنانچہ اس نے میری آتما کو قابو کر لیا اور اپنی شیطانی قوتوں کی تکمیل کرنے لگا، مجھے قابو کرنے کی وجہ اور بھی تھی، اس نے اپنے استاد کی بیٹی کے ساتھ منہ کالا کیا اور اسے مار دیا۔

استاد کو پتہ چل گیا اس نے اپنی قوتوں سے اس کی مردانہ قوت چھین لی، اس سادھو نے کالے جادو کی کسی کتاب میں پڑھا تھا، ایک ایسی عورت جو کہ آتما ہتھیا کر چکی ہو اور جس نے اپنے پتی کو قتل کیا ہو، اس کی آتما کو قابو کرنے سے میری مردانہ قوت بحال ہو جائے گی۔ تو اس نے مجھے قابو کر لیا۔

ہر روز کسی نہ کسی نئی لڑکی کے ساتھ منہ کالا کرتا، اور کالے جادو کا علم کرتا، جب وہ مرنے لگا تو اس نے مجھے کہا کہ "مرنے کے بعد وہ بدروح بن کر اس کی روح کو نہیں چھوڑے گا لیکن ایک ایسا نوجوان آئے گا، جو کہ میرے پتی کا ہم شکل ہو گا، اس کے آتے ہی تیری آتما میرے چنگل سے آزاد ہو جائے گی لیکن اگر اس نے تیری بات کو منع کیا اور تجھے ٹھوکر ماردی تو میرے وش میں ہو جائے گی۔" وہ سادھو مر گیا۔

اوشا کی روح خاموش ہوئی تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

میں حیرت سے کھڑا یہ الف لیلوی داستان سن رہا تھا۔ میں اس کو دلاسہ دینے کے لئے آگے بڑھا تو وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

"پاس مت آؤ..... تم میرے پتی کے ہم شکل ضرور ہو..... لیکن ویسے نہیں وہ میری کسی بات کو نہیں ٹالتا تھا..... میں نے اسے دھوکہ دیا..... میرے پتی کی بد دعا پوری ضرور ہو گی..... تم نے مجھے ٹھکرا دیا، انکار کر دیا..... میں جا رہی ہوں اس سادھو کی سیوک بننے..... میرے قریب مت آؤ..... میرے گرد آگ کا چکر ہے۔" اتنا کہہ کر وہ رونے لگی۔

اچانک میں نے دیکھا کہ نہ جانے کہاں سے ایک آگ کے شعلے نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

کچھ ہی لمحوں بعد وہاں نہ شعلہ تھا نہ ہی اوشا۔

اوشا چلی گئی..... اپنے ساتھ 10 کا نوٹ بھی لے گئی..... میری زندگی کی وہ عیاشی جو اس نوٹ کے سبب تھی وہ بھی ختم ہو گئی..... وہ تو گئی لیکن دل میں ایک کسک چھوڑ گئی ایک ایسی کسک جس کا کوئی نام نہ تھا۔

چند دنوں بعد مجھے احساس ہونے لگا کہ میری زندگی کا مقصد وہ نوٹ نہیں اوشا کی محبت تھی اس کی کمی مجھے محسوس ہونے لگی تھی۔

میں پاگلوں کی طرح اوشا..... اوشا کرنے لگا..... آفس میں بھی کام سے میرا جی اچاٹ ہونے لگا۔ بالآخر مجھے کام سے جواب مل گیا۔ لیکن مجھے اس کی پرواہ نہ تھی۔

میں کراچی کی سڑکوں پر پاگلوں کی طرح پھرنے لگا، اوشا کو ڈھونڈنے لگا، لیکن میرے درد کا مداوا نہ تھا۔

ایک روز میں دیوانوں کی طرح اسی قبرستان میں بیٹھا تھا۔ گھر میں اوشا کے ساتھ میں نے کافی وقت گزارا تھا۔ میرے کپڑے میلے ہو چکے تھے۔ سر اور داڑھی کے بال بھی کافی بڑھ چکے تھے۔

میں بیٹھا ہوا تھا کہ مجھے فضا میں خوشبو کا ہلکا سا جھونکا محسوس ہوا، اس خوشبو کو میں ہزاروں میں پہچان سکتا تھا۔

یہ میری اوشا کی خوشبو تھی، میں اٹھ کر پاگلوں کی طرح بھاگا۔

"اوشا..... اوشا....." اندھوں کی طرح یوں بھاگتے ہوئے میں ایک کھلی ہوئی قبر میں جا گرا۔

میں نے اٹھنے کی کوشش کی، لیکن اٹھ نہ سکا..... مجھے ایسا لگا کہ جیسے کسی نے مجھے دبوچ لیا..... گرفت سخت تھی، خوف سے میرے جسم نے پسینہ اگل دیا۔

"کک..... کک..... کون ہے؟" میرے حلق سے سہمی ہوئی آواز نکلی۔

"تم بغیر اجازت میری قبر میں کیسے آئے....." ایک سخت کھردری آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"غلطی سے..... اوشا کی خوشبو آئی تھی مجھے..... مم..... معاف کر دو..... جانے دو....." میں نے گھگھیاتے ہوئے کہا۔

"اوہ..... عاشق ہو..... وہ بھی ایک روح کے....." ایک طنزیہ آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

"تم کیسے جانتے ہو؟" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"ہم سب جانتے ہیں....." ایک قہقہہ میرے کانوں سے ٹکرایا۔

"اگر سب جانتے ہو..... تو میری مدد کرو..... مجھے اوشا لا دو..... تم نے بھی محبت کی ہو گی..... تمہیں اس محبت کی قسم....." میں نے منت سماجت کرتے ہوئے کہا۔

جواب میں، میں نے ہلکا سا قہقہہ سنا پھر آواز آئی۔

"محبت ہے، بہت فضول چیز..... نکمے لوگ جن کے پاس کوئی کام نہیں ہوتا وہ محبت کر بیٹھتے ہیں..... میں تمہاری مدد کروں گا ضرور کیونکہ میں بھی نکما ہوں..... زندہ تھا جب تو بے چین تھا اور موت کے بعد اور بے چین ہوں۔"

"شکریہ....." میں نے قبر میں سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"تم اس قبر سے نکلو گے تو ہندوستان پہنچ چکے ہو گے..... میں تم کو اسی جنگل میں بھیج دوں گا..... جہاں یہ داستان شروع ہوئی تھی۔ اس قلعہ سے تھوڑا دور ایک کالی کا مندر ہے، اس مندر کے نیچے ایک کنواں ہے اس کنویں میں وہ قید ہے، اس مندر کی حفاظت کئی بدروحیں کر رہی ہیں اور کنویں کی بھی، اب جاؤ..... دفع ہو جاؤ..... دوبارہ مت آنا۔" آواز سنائی دی۔

میں اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا کہ مجھے زوردار جھٹکا لگا۔ اور میں اچھل کر قبر سے باہر آ گیا۔

میرے سامنے وہی جنگل تھا، سورج ڈھل رہا تھا، میں آگے بڑھنے لگا، میرے لئے خیال ہی انتہائی وحشت ناک تھا کہ میں بھیرو کی بدروح سے اوشا کو آزاد کروانے کے لئے بدروحوں سے مقابلہ کرنا پڑے گا..... جنگل نہایت ہی گھنا اور تاریک تھا، درختوں کے درمیان، آگے جانے کا راستہ بنا ہوا تھا۔ وہاں سے باہر نکل آیا، سامنے ایک میدان تھا، جس کے دائیں بائیں ٹنڈ منڈ درختوں کی لمبی قطار تھی، میدان سے تھوڑے فاصلے پر ایک کالے رنگ کی عمارت کھڑی تھی۔ یہ وہی مندر تھا جو کہ کالی کا مندر کہلاتا تھا، مندر کا دروازہ دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ ایک بہت بڑا اژدھا منہ پھاڑے کھڑا ہو، دروازہ اس طرح بنایا گیا تھا جیسے کہ بڑا اژدھا منہ پھاڑے کھڑا ہو..... یہاں میری اوشا قید تھی۔

میں جیسے آگے بڑھا مجھے ایک تیز پھنکار کی آواز سنائی دی۔ میں نے دیکھا کہ مجھ سے چند قدموں کے فاصلے پر ایک بہت موٹا سانپ اپنی دو شاخہ زبان نکالے جھوم رہا ہے..... سانپ کی آنکھوں سے سرخ روشنی پھوٹ رہی ہے۔ میں سمجھ گیا یہ کوئی عام سانپ نہیں۔ شاید بھیرو کی محافظ بدروح تھی، سانپ کے منہ سے خوفناک قسم کی پھنکاریں نکل رہی تھیں۔

صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اب وہ حملہ کے لئے تیار ہے، مجھے نہیں معلوم تھا دفعتاً سانپ نے زقند بھری اور اڑتا ہوا مجھ پر آ رہا، سانپ کو اپنے اوپر آتا دیکھ کر میں تیزی سے درخت سے جا ٹکرایا، درخت سے ٹکراتے ہی سانپ کے دو ٹکڑے ہو گئے لیکن حیرت انگیز طور پر وہ دونوں ٹکڑے آپس میں مل گئے اب وہاں دو سانپ تھے، ان کے کٹے ہوئے ٹکڑوں سے ایک دوسرا سانپ پیدا ہو گیا، دونوں سانپ اب میری طرف رینگنے لگے۔

مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں، موت کے اندھیرے مجھے نگلنے کے لئے بے تاب تھے۔

اچانک میرے حلق سے چیخ نکل گئی، زمین سے چھوٹے چھوٹے کن کھجورے ٹکڑیوں کی صورت میں برآمد ہو رہے تھے، میرے حلق سے دل خراش چیخ نکلی اور میں نے مندر کی سمت بھاگنا شروع کر دیا۔

کن کھجوروں کی تعداد ہزاروں میں تھی جو تیزی سے میری طرف بڑھ رہے تھے، دونوں سانپ بھی برق رفتاری سے میری جانب پہنچنے کی سعی کر رہے تھے۔

اس سے قبل کہ میں مندر تک پہنچتا، میرے قدم لڑکھڑائے اور منہ کے بل نیچے گر پڑا، گرتے ہی میری پیشانی پر شدید چوٹ آئی..... پھر میں نے ارد گرد اندھیرا ہی اندھیرا محسوس کیا۔

نہ جانے کتنی دیر تک بے ہوشی مجھ پر مسلط رہی، ہوش آنے پر مجھے کچھ سمجھ نہ آیا کہ میں کہاں ہوں، چاروں طرف لوہے کی زنگ آلود سلاخیں نظر آ رہی تھیں..... حواس بحال ہونے پر مجھے پتہ چلا کہ میں ایک بڑے پنجرے میں ہوں اور پنجرہ فضا میں معلق ہے۔

میں نے نیچے دیکھا تو چاروں طرف ایک میدان سا ہے دلدل اوپر نیچے ہو رہی تھی جیسے کوئی عفریت سانس لے رہا ہو، دلدل کے وسط میں ایک بڑا چوکور پتھر ہے، جس پر ایک سیاہ بھجنگ انسان نما دھڑنگ بیٹھا ہے۔

دفعتاً میں نے حیرت انگیز منظر دیکھا، دلدل میں کسی عورت کا آدھا دھڑ اندر تھا آدھا باہر تھا وہ عورت کبھی ڈوبتی کبھی ابھرتی، اس کا چہرہ مجھے صحیح پہچان میں نہیں آ رہا تھا۔

"یہ تمہاری اوشا ہے..... اور میں بھیرو، مجھے مرے 60 سال ہو چکے ہیں....." وہ نما دھڑنگ انسان بولا۔

اوشا کو اتنی کربناک حالت میں دیکھ کر میری آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔

"میں جانتا ہوں تم اس سے پریم کرتے ہو..... جب تم اس قلعہ میں آئے تھے تو میں تم کو مار سکتا تھا مگر اس میں ایک راز تھا....." بھیرو کی چیختی آواز مجھے سنائی دی۔

"اسے چھوڑ دو..... اسے چھوڑ دو....." میں چلایا۔

"اگر میں نے اسے چھوڑ دیا تو میں دوسرا جنم کیسے لوں گا..... اب میں ایک آخری چاپ کروں گا جس کے بعد میرا دوسرا جنم ہو گا....." بھیرو کی آواز مجھے سنائی دی۔

اوشا کو اس حالت میں دیکھ کر میں سسک پڑا، میں اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔

بھیرو اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا، ڈوبتی ابھرتی اوشا کا ہاتھ پکڑ لیا۔ تیز تیز آواز میں عجیب و غریب زبان میں کچھ پڑھنے لگا۔

اچانک میرے دل میں آیا اور میں نے بلند آواز سے آیت الکرسی کی تلاوت شروع کر دی۔

پھر اچانک میں نے بھیرو کو خوفزدہ ہوتے دیکھا..... اس نے خوف سے میری طرف دیکھا اور اوشا کو چھوڑ کر فضا میں بلند ہو گیا..... اور سیدھا میری طرف آیا۔ "یہ کیا پڑھ رہے ہو تم..... بند کرو مجھے ڈر لگ رہا ہے....." وہ میرے پنجرے کی طرف آ کر بولا۔

میں نے جواب دینے کے بجائے آیت الکرسی مکمل کر کے اس کی جانب پھونک ماری..... میرے پھونک مارتے ہی فضاء میں ہواؤں کے جھکڑ چل پڑے۔ چاروں طرف جیسے آگ لگ گئی، آگ کے شعلے تیزی سے چاروں طرف پھیل رہے تھے، بھیرو کی غیر انسانی چیخیں بدروحوں کی آوازیں، یوں لگ رہا تھا کہ جیسے سب کچھ تباہ ہو رہا ہو، اسی لمحے پنجرہ ٹوٹ گیا۔

پھر میں تیزی سے نیچے گرنے لگا تو مجھے دو ہاتھوں نے تھام لیا۔

اور جب میرے حواس کچھ بحال ہوئے تو میں نے دیکھا کہ اوشا اس وقت دلہن کے لباس میں تھی، وہ بغور میری طرف دلکش مسکراہٹ سے دیکھ رہی تھی، پھر وہ گویا ہوئی۔ "میں تمہارا کس منہ سے شکریہ ادا کروں، تمہاری وجہ سے مجھے آزادی ملی، میں ہمیشہ یہ یاد رکھوں گی اور ایشور سے تمہاری خوشیوں اور خوشحالی کے لئے پرارتھنا کرتی رہوں گی، میری طرف سے سامنے پڑا یہ تحفہ قبول کرو، اپنی دنیا میں خوش رہنا، زندگی کی تمام خوشیوں سے لطف اٹھانا، میری خواہش تھی کہ میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں مگر اب میں نے اپنا ارادہ بدل دیا، تم میرے پریمی ہو اور ایک پریمی اپنے پریمی کو خوش و خرم دیکھنا چاہتا ہے، میں ایشور سے پرارتھنا کروں گی کہ دوسرے جنم میں ہم دونوں کا ساتھ ہو، اچھا اب میں چلتی ہوں۔"

اور پھر اس کے گرد گاڑھا گاڑھا سفید دھواں پھیلنے لگا، اس کے بعد جب دھواں چھٹا تو اس جگہ سے اوشا غائب تھی۔ اس وقت میں اپنا دل پکڑ کر فرش پر بیٹھ گیا۔ میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے، میں سسکتا رہا بلکتا رہا، کئی گھنٹے میں اسی حالت میں بیٹھا رہا۔

کافی دیر بعد جب میرا غم کچھ کم ہوا تو میں نے اپنے قریب پڑی ہوئی پوٹلی پر نظر ڈالی اسے کھولا تو حیران رہ گیا، میری آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ کیونکہ پوٹلی میں ہیرے جڑے سونے کے زیورات موجود تھے۔ میں تمام زیورات کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔

پھر اچانک میرے دل میں آیا کہ کہیں کوئی آ گیا تو..... پھر میں نے پوٹلی باندھی اور بغل میں دبائے وہاں سے نکل گیا۔

میرے دن پلٹ گئے اور میں ترقی کرتا چلا گیا، شادی ہوئی، شادی کے بعد اللہ نے دو بیٹے اور ایک بیٹی سے نوازا۔

مگر کوئی ایسا دن نہیں ہوتا کہ اوشا مجھے یاد نہیں آتی، جب اس کی یاد آتی ہے تو میں اس کی یادوں میں کھو جاتا ہوں، اور اس کے لئے دل سے دعائیں نکلتی ہیں۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

رولوکا

تحریر: اے وحید

قسط نمبر: 130

وہ واقعی پراسرار قوتوں کا مالک تھا، اس کی حیرت انگیز اور جادوئی کرشمہ سازیاں آپ کو دنگ کردیں گی

گزشتہ قسط کا خلاصہ

رولوکا کے سامنے وہ سانپ ساکت تھا، مگر اس کی انگارہ برساتی آنکھیں رولوکا پر مرکوز تھیں، اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ رولوکا کو مجسم نگل جاتا، وہ بہت کالا بھجنگ تھا، رولوکا کی آواز سنائی دی۔ ''کالیا بول تیرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔'' پھر وہ انسانی آواز میں بولا۔ ''وچ ڈاکٹر میں تو حکم کا غلام ہوں، میرا آقا مالوتا بہت ظالم ہے اور اسی کے حکم پر میں آیا تھا تا کہ آپ کو نقصان پہنچا سکوں۔ لیکن آپ کی طاقت مالوتا سے بڑھ کر ہے، میں آپ کے رحم و کرم پر ہوں، آپ جو چاہیں میرے ساتھ سلوک کر سکتے ہیں۔'' یہ سن کر رولوکا کو اس سانپ جس کا نام ناگنا تھا، رحم آ گیا اور رولوکا نے ناگنا کو مالوتا کے پاس بھیج دیا اور بولا کہ تو مالوتا کے پاس جا اور پھر کچھ لمحے کے بعد تیری جان مالوتا سے چھوٹ جائے گی، میرے کارندے تجھے ہندوستان کے جنگل میں پہنچا دیں گے اور پھر یہی ہوا۔ اس جنگل میں ایک اچھادھاری ناگن جس کا نام روپا تھا وہ رہتی تھی، ویسے ناگنا بھی اپنی عمر پوری کرنے کے قریب تھا اور اپنی عمر پوری کر کے وہ بھی ایک اچھادھاری ناگ بن جاتا، ناگنا کی ساری حقیقت روپا کو معلوم تھی، کیونکہ ناگ دیوتا نے اسے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ ایک روز ایک ناگ آئے گا اور آئندہ زندگی میں تمہارا جوڑ بنے گا اور پھر ناگنا کی حفاظت روپا کرنے لگی۔ ادھر مالوتا تلملا کر رہ گیا اور رولوکا سے انتقام لینے کے لئے اپنے بیروں کی ایک ٹیم تیار کی اور رولوکا کی سرکوبی کے لئے بھیج دیا، رولوکا سے مالوتا ہر قیمت پر اذیت ناک انتقام لینا چاہتا تھا۔ مالوتا کے تمام بیر رولوکا اور اس کے کارندوں کی نگرانی کر رہے تھے، ہر بیر کی کوشش تھی کہ رولوکا کو نیست و نابود کرنا ہے اور ایک روز رولوکا کے ایک بیر کو انہوں نے مار دیا اور یہ خبر رولوکا پر بجلی بن کر گری، کیونکہ جس کارندے کو مارا گیا تھا وہ رولوکا کا خاص کارندہ تھا، رولوکا اچنبھے اور ادھیڑ بن میں تھا کہ اچانک ایک رات رولوکا کو مالوتا کے بیروں نے اپنے نرغے میں گھیر لیا اور آناً فاناً رولوکا کو لے کر ایک طرف آندھی طوفان کی طرح بڑھنے لگے اور ایک جگہ وہ پہنچ گئے، وہاں پر ایک بہت بڑا آتش فشاں پہاڑ تھا اور پھر وچ ڈاکٹر مالوتا کے بیروں نے دست و پا کر کے رولوکا کو آتش فشاں کے ابلتے ہوئے اور دہکتے لاوا میں ڈال دیا۔

(اب آگے پڑھیں)

وقت آگے بڑھتا رہا اور ناگنا کے ساتھ ساتھ روپا رہتی تھی، وہ زیادہ تر ناگن کے ہی روپ میں رہتی تھی۔

انسانی روپ اس وقت دھارتی تھی جب وہ پھول کے پودے کے پاس آتی اور پھر گھنٹوں انسانی روپ میں پھول کے پودے کے پاس وقت بتاتی تھی، ناگنا بھی اس کے قریب ہی موجود رہتا تھا۔ ہر روز بلا ناغہ روپا اپنے ہاتھوں میں ایک پھول لے کر اپنے دل کی باتیں کرتی تھی۔

روپا کے دل میں اس وقت یہ بات ہوتی تھی کہ شنکر میری ساری باتیں سن رہا ہے اور اسی وجہ سے وہ اپنے دل کی باتیں کرتی تھی۔

جب ڈیڑھ دو گھنٹے بیت جاتے تو وہ پھر آنے کا وعدہ کر کے وہاں سے ہٹتی اور ناگن کا روپ دھار کر ناگنا کے ساتھ کسی اور طرف نکل جاتی۔

ایک ایک پل وہ گن گن کر گزارتی تھی اور ناگ دیوتا کا کہا اس کے دماغ میں گردش کرتا رہتا تھا۔ ناگ دیوتا نے کہا تھا کہ ''ایک اچھادھاری ناگ، تمہاری زندگی

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

میں آئے گا....." اور ناگنا ہی وہ ناگ تھا جو کہ اپنا وقت پورا کرکے شکتی شالی بن جانا تھا اور اس میں روپ بدلنے کی شکتی آنی تھی لیکن اس وقت کے پورا ہونے میں ابھی کچھ وقت باقی تھا۔

خیر کسی کے چاہنے اور نہ چاہنے میں فرق نہیں پڑتا..... وقت تو اپنی مخصوص رفتار سے ہی آگے بڑھتا رہتا ہے لیکن روپا کی زندگی میں جو ہلچل اور بھونچال آیا تھا وہ کسی صورت کٹ کے نہیں دے رہا تھا وہ چاہتی تھی کہ جتنی بھی جلدی ہو ناگنا میں روپ بدل شکتی آجائے اور اس طرح روپا کی زندگی میں جو اتار چڑھاؤ تھا وہ تھم جائے اور روپا پھر سے دوبارہ ایک نئی زندگی کا آغاز کرے۔

وقت بڑی سبک رفتاری سے آگے بڑھ رہا تھا۔

جنگل میں موجود سارے سانپ ایک مقررہ وقت پر روزانہ ایک مخصوص جگہ پر جمع ہوتے اور روپا کے آگے اپنا سر جھکاتے یعنی روپا کی شکتی کے آگے سربسجود ہوتے۔ اس طرح یہ بھی پتہ چلتا رہتا تھا کہ جنگل میں جتنے بھی سانپ ہیں وہ بخیر و عافیت ہیں کوئی غائب نہیں اور پھر یہ بات بھی تھی کہ ہر ایک کی دلی کیفیت روپا کے سامنے رہتی تھی۔

ایسی حالت سے روپا اندازہ لگا لیتی تھی کہ ہر ایک کے دل میں ایک دوسرے کے لئے نرم گوشہ ہے اور خاص طور پر روپا یہ بھی اندازہ لگا لیتی تھی کہ جنگل میں موجود جتنے بھی سانپ ہیں ان سب کے دلوں میں ناگنا کے لئے بھی کسی قسم کی نفرت نہیں ہے۔

ورنہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ چاہے انسانی زندگی ہو یا جنگل کی زندگی، جب کوئی ایک انسان یا نیا جانور جنگل میں نیا نیا وارد ہوتا ہے تو کچھ وجود ایسے ہوتے ہیں کہ نئے آنے والے کے لئے اچھا سوچ ان کے دل میں نہیں ہوتا..... اور خاص طور پر وہ وقت ہوتا ہے جب نئے وارد ہونے والے کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔

اور یہی بات روپا کے دل میں رہتی تھی..... کہ ایسا نہ ہو کہ جنگل میں موجود پرانے سانپ میں کوئی ایسا ہو جس کے دل میں ناگنا کے لئے نفرت پیدا ہو جائے جبکہ وہ یہ بھی جانتا ہو کہ بہت تھوڑے وقت میں جب ناگنا کا وقت پورا ہوگا تو ناگنا میں روپ بدل شکتی آجائے گی۔

اور یہ محسوس کرتے ہوئے وہ سانپ پلک جھپکتے ہی ناگنا پر حملہ کردے اور ناگنا کو موت سے ہمکنار کردے اور ناگنا بے موت مارا جائے۔

اور یہی وہ تمام باتیں تھیں جنہیں محسوس کرتے ہوئے روپا ہر وقت ناگنا پر نظر رکھتی تھی اور اپنے ساتھ ساتھ رکھتی تھی اور ناگنا بھی مطیع و فرمانبرداری کا ثبوت دیتا تھا۔

ایک دن کی بات ہے صبح کے کوئی دس بجے کا وقت تھا سارے سانپ روپا اور ناگنا سمیت جو، ان کا ایک خاص غار تھا اس میں جمع تھے اور روپا ان سب سے مخاطب تھی۔

کہ اچانک جنگل کی فضاء میں ہلچل مچ گئی سارے سانپ یک بیک چونک پڑے روپا چونکہ ناگن کے روپ میں تھی وہ بھی چونک کر غار کے کھلے حصے کی طرف دیکھنے لگی۔

وجہ یہ تھی کہ کوئی بہت ہی سریلی آواز میں بین بجا رہا تھا۔

بین کی سریلی آواز میں یہ جادو ہوتا ہے کہ بین کی آواز پر سانپ مدہوش ہونے لگتا ہے یعنی سانپ ایک عجیب نشہ میں آجاتا ہے وہ اپنا سدھ بدھ کھو دیتا ہے اور بین بجانے والے کے سامنے بے خودی کی حالت میں لہرانے لگتا ہے اس کے اپنے اندر کی ساری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہیں اور ایسی حالت میں بین بجانے والا اس سانپ کو پکڑ کر پٹاری میں بند کرلیتا ہے۔

بین کی آواز لحہ بہ لحہ تیز سے تیز تر ہوتی جارہی تھی اور اسی کے ساتھ ساتھ سارے سانپوں میں بے چینی بھی بڑھتی جارہی تھی۔

بین کی آواز سے لگتا تھا کہ بین بجانے والا بہت ہی قریب ہے۔

روپا جہاں موجود تھی اس کے قریب ہی ناگنا بھی موجود تھا اور بین کی لے پر ناگنا کچھ زیادہ ہی متاثر

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

ہو رہا تھا اور ایسا ہونا روپا کے لئے اچھا نہیں تھا۔

آج سانپوں کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ ایک انسان اس جنگل میں بین بجا رہا تھا، اس سے پہلے ایسا کبھی بھی نہ ہوا تھا کہ اس جنگل میں کوئی سپیرا آیا ہو اور بین کی آواز سنائی دی تھی۔

بین بجانے والا تواتر سے بین بجائے جارہا تھا اور جوں جوں وقت آگے بڑھ رہا تھا اس کے حساب سے دیگر سانپوں کے علاوہ ناگنا کی اندرونی کیفیت بدلتی جارہی تھی، وہ وقت دور نہیں تھا کہ ناگنا اپنے آپ سے بے خبر ہو کر بین کی آواز پر اس سمت دوڑ پڑتا۔

روپا فوراً روپ بدل کر انسانی روپ میں آگئی اور پھر اس کی آواز گونجی۔ "ساتھیو! یہ وقت ہم سب کے لئے بہت کٹھن ہے..... ہماری اندرونی کیفیت بین کی آواز پر بہت غیر ہو رہی ہے اور اگر بین بجانے والا ترنت اپنا بین بجانا روک نہیں لیتا..... تو ہم سب اس کے سامنے جا کر بے بس ہو جائیں گے..... ہم ابھی تک اپنی اندرونی کیفیت پر قابو رکھے ہوئے ہیں لیکن ہمارا یہ نیا ساتھی اپنے آپ پر زیادہ دیر تک قابو نہیں رکھ سکتا۔ اور یہ بہت جلد اپنے آپ سے بے خبر ہو کر بین بجانے والے کے سامنے جا کر اپنا ہوش کھو بیٹھے گا۔

یہ میرے دماغ میں آیا ہے کہ اگر ایسا ہو جاتا ہے تو..... ہم سب اس پر قابو نہیں پا سکیں گے مگر ایک حل ہے اور وہ حل یہ ہے، کہ ہم سب اس سے دورہ کر چھپتے چھپاتے اس کا پیچھا کریں گے اور یہ جیسے بھی بین بجانے والے کے سامنے جائے گا اور اپنا ہوش کھو بیٹھے گا تو یقیناً بین بجانے والا کوئی سپیرا ہی ہوگا تو وہ سپیرا فوراً اسے قابو کرلے گا اور اپنی پٹاری میں بند کر کے اسے لے کر دوڑ پڑے گا تو ایسی صورت میں ہم اس سپیرے کا پیچھا کرتے ہوئے ہم میں سے کوئی بھی جیسے موقع ملے وہ اس سپیرے کو ڈس لے گا اور پھر وہ سپیرا اپنی جان گنوا بیٹھے گا۔ تو ہمارا یہ ساتھی اس کی قید سے آزاد ہو جائے گا۔

"ساتھیو..... ! کیا آپ لوگ میرے اس منصوبے کے لئے تیار ہو۔"

روپا کی باتیں یہاں تک پہنچی تھیں کہ۔

ناگنا اپنا سدھ بدھ کھو بیٹھا اور بدحواسی کی حالت میں تیزی سے غار کے کھلے حصے کی طرف بڑھا۔

اور ناگنا پر نظر پڑتے ہی روپا نے اپنا روپ بدلا اور پھر سب کے سب سانپ روپا سمیت ناگنا کے پیچھے لپکے۔

ناگنا کی چال میں بہت تیزی آگئی تھی اور اس کے پیچھے جتنے سانپ تھے ابھی ان میں قوت برداشت باقی تھی اور بین کی آواز پر وہ اپنا حواس نہیں کھو بیٹھے تھے۔

ناگنا غار کے سامنے کے حصے میں تیزی سے آگے ہی آگے بڑھ رہا تھا۔

غار سے تھوڑی دوری پر ایک کھلا چوڑا سا میدان تھا اس میدان میں ایک درخت کے نیچے ایک عمر رسیدہ سپیرا بیٹھا تھا۔ بین اس کے منہ سے لگی تھی اور وہ کچھ زیادہ ہی مست ہو کر بین بجا رہا تھا ایسا لگتا تھا کہ اسے پتہ چل گیا ہے کہ قرب و جوار میں سانپوں کا بسیرا ہے۔

ناگنا کا آگے بڑھنا اور دیگر سانپوں کا چھپتے چھپاتے اس کے پیچھے پیچھے آگے کو بڑھنا جاری تھا اور پھر بہت کم وقت میں وہ سپیرا نظر آگیا۔ جو کہ درخت کے نیچے بیٹھا اپنی بین کی آواز سے پورے جنگل پر جیسے سحر طاری کر دیا تھا۔

ناگنا بہت زیادہ بے سدھ ہو چکا تھا، ناگنا بہت تیزی سے اس کے قریب بہت قریب گیا اور بین کی آواز پر لہرانے لگا پھر تھوڑی دیر بعد وہ فوراً سے پیشتر اپنا پھن سمیٹ کر اپنا سر زمین پر رکھ دیا۔

ناگنا کو دیکھ کر سپیرے کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوگئی اور وہ فوراً ناگنا کی اہمیت کو بھانپ گیا وہ سپیرا سمجھ گیا تھا کہ اس کے سامنے بہت ہی نایاب سانپ بے سدھ پڑا ہے۔

سپیرے نے جلدی سے ناگنا پر اپنے ایک ہاتھ کی گرفت مضبوط کرلی اور پھر جلدی سے دوسرے ہاتھ سے اپنے پاس موجود پٹاری کو کھولنے لگا..... بین پہلے ہی زمین پر رکھ چکا تھا۔

اور یہی وہ وقت تھا۔

بین کی آواز بند ہو چکی تھی اور سارے سانپ اپنے حواس پر قابو پا چکے تھے۔

آناً فاناً کئی سانپ جیسے اڑتے ہوئے سپیرے پر جھپٹے اور سپیرے کے پاؤں، ہاتھ، گردن اور ماتھے پر اپنا زہریلا ڈنک مارا۔

ناگنا ابھی تک سپیرے کے سیدھے ہاتھ کی گرفت میں تھا۔

سپیرا بدحواس ہو گیا..... اور جھٹ سے اس نے ناگنا کو اپنے ہاتھ کی گرفت سے آزاد کر دیا۔

کئی سانپوں کا زہر سپیرے کے جسم میں اتر چکا تھا..... سپیرے کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی پڑی تھیں وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس کے ساتھ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔

سارے سانپ روپا کی سربراہی میں رینگتے ہوئے ایک طرف جا رہے تھے اور سپیرا انہیں حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

سپیرے پر غنودگی طاری ہونے لگی تھی اور چشم زدن میں وہ زمین پر ڈھے گیا۔ اس کے جسم سے جان نکل رہی تھی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ سپیرا بے جان ہو گیا..... اس کی رنگت پہلے نیلی ہوئی پھر سیاہی مائل ہو گئی اور وہ مر گیا..... اس کے بعد اس کے جسم کا گوشت گلنے لگا اور پھر اس کا سارا گوشت رقیق مادہ بن کر زمین پر بہہ گیا۔

ادھر روپا کی سربراہی میں سارے سانپ غار میں پہنچ گئے اور سب کے سب اپنی اپنی جگہ پر براجمان ہو گئے اتنی دیر میں روپا نے اپنا روپ بدلا وہ انسانی روپ میں تھی اور محبت پاش نظروں سے اپنے تمام ساتھی سانپوں کو دیکھ رہی تھی ناگنا بھی اس کے قریب پھن کاڑھے موجود تھا۔

روپا کی آواز گونجی۔ ”ساتھیو! آپ سب کا بہت بہت شکریہ کہ ہم سب کی کوشش، ہمت اور حوصلے سے ہمارے نئے مہمان کی جان بچ گئی اگر ہمارے مہمان کی جان نہ بچتی تو ہمارے لئے بہت ہی اذیت کی بات تھی۔

خیر ہم سب نے ہمت کی اور اپنے مہمان کو آزاد کرا لیا۔ ہمارا نیا مہمان ہم سب کے لئے بہت ہی اہم ہے اور پھر یہ کیسی شکتی شالی ہے تم سب کو معلوم ہے، ہاں یہ بات ضرور ہے کہ ابھی یہ اپنی آزاد اور جنگلی زندگی سے آشنا نہیں، وقت کے ساتھ ساتھ اس میں بھی ہم جیسی تمام شکتیاں آ جائیں گی۔

آج تم سب نے جس حوصلے و ہمت کا مظاہرہ کیا اس کی مثال ملنی مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے اور اس طرح ہم سب میں یگانگت ملنساری ایک دوسرے کے دکھ درد کو سمجھنے کی صلاحیت وقوت رہی تو ہم پر کوئی بھی قابو نہیں پا سکتا۔

ناگنا بھی اپنی اندرونی کیفیت کی وجہ سے بہت شرمسار ہے یہ مجھ سمیت آپ سب سے معافی کا طلب گار ہے اور یہ ہم سب کا شکریہ ادا کر رہا ہے۔

ساتھیو! ہر جاندار کے لئے اس کی آزادی بہت بڑی نعمت ہے۔

انسان ہر جاندار سے زیادہ طاقتور ہے، زیادہ تر انسان بہت ظالم ہوتے ہیں، جانوروں پر ناقابل برداشت ظلم کرتے ہیں۔

اگر یہ سپیرا اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا تو ناگنا پر یہ بھی ظلم کے پہاڑ ضرور توڑتا اور یہ تو بہت اچھا ہوا کہ ہم سب کی کوشش سے ناگنا کو دوبارہ آزادی نصیب ہوئی۔

اس سے پہلے بھی ناگنا جہاں تھا..... اس جگہ پل پل اذیت کی چکی میں پستا رہا تھا..... اس نے مجھے بتایا ہے کہ میں اپنی قید کی زندگی سے اتنا عاجز تھا کہ اکثر آتما ہتھیا کرنا چاہتا تھا مگر افسوس کہ آتما ہتھیا کرنا بھی میرے بس میں نہیں تھا۔

میری اپنی کوئی خواہش اور سوچ نہ تھی..... میں ہر پل وچ ڈاکٹر کے رحم وکرم پر رہتا تھا..... جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کہ کوئی ایسا دن نہیں کہ اس دن میں نے پیٹ بھر کر کچھ کھایا ہو۔ غلامی کی زندگی بہت اذیت ناک ہوتی ہے۔

اب ناگنا یہاں آ کر بہت خوش ہے جس کا اندازہ ہم سب نے لگایا ہے میں اس کی ہر وقت خبر گیری کرتی رہتی ہوں اس لئے کہ یہ جنگل اس کے لئے نیا ہے کسی روز یہ غلطی سے کسی اور طرف نہ نکل جائے اور پھر یہ کسی انسان کی نظر میں آ جائے اور وہ انسان اسے بے موت مار دے کیونکہ ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ انسان کی نظر سانپ پر پڑتے ہی، سانپ کو مار دینا انسان کا فطری عمل ہے۔

ابھی اس میں سوجھ بوجھ کی بھی کمی ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ اپنی کم عقلی کی وجہ سے کسی کے ساتھ گتھم گتھا ہو جائے اور پھر کسی ایک کو نقصان پہنچ جائے۔

اور پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ بہت جلد اسے روپ بدل شکتی ملنے والی ہے۔

اچھا اب تم سب بھی آرام کرو..... یا پھر اپنے کھانے پینے کے لئے بندوبست میں لگ جاؤ۔ اب میں بھی ناگنا کے ساتھ چلتی ہوں۔ میں ایک بار تم سب کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔“ اور یہ بول کر روپا زمین پر بیٹھی اور ناگن کا روپ دھار لیا۔

اس کے بعد وہ اپنی جگہ سے نیچے اتری تو ناگنا بھی اس کے پیچھے ہو لیا اور اس طرح دونوں غار سے باہر نکل کر ایک طرف کو چلنے لگے۔

روپا جس جگہ رہتی تھی وہ بھی ایک بہت ہی چھوٹا غار تھا، وہاں پر روپا نے اپنے لئے چند لباس رکھے تھے، لباس کیا تھے چند چولی اور لہنگے تھے جب وہ انسانی روپ میں ہوتی تو وہ چولی اور لہنگا پہنے نظر آتی اور جب اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہوتی اور انسانی روپ دھار لیتی تو لباس سے عاری ہوتی۔

اب اس کا یہ معمول تھا کہ جب وہ انسانی روپ میں ہوتی تو اس کے اردگرد جھاڑیوں میں چند بہت ہی زہریلے سانپ ضرور ہوتے تھے تاکہ وقت بے وقت اس کی مدد کر سکیں اور جب وہ اپنے مخصوص غار میں ہوتی تو کوئی بھی سانپ اس کی حفاظت کے لئے موجود نہ ہوتا۔

اس روز روپا ایک کھلی جگہ پر ایک درخت کے تنا کے پاس بیٹھی تھی اپنی آنکھیں بند کئے خیالوں میں گم تھی اور اس قدر خیالوں کی گہرائی میں تھی کہ اسے اپنے اردگرد ہونے والی آوازیں بھی سنائی نہیں دے رہی تھیں لیکن اس کی حفاظت پر مامور سانپ اس کے قریب جھاڑیوں میں تھے اس وقت ناگنا بھی دیگر ساتھیوں کے ساتھ جھاڑیوں میں موجود تھا۔

گھنا جنگل تھا اور اس وجہ سے جنگلی جانوروں کی آوازیں بروقت آتی رہتی تھیں اور پھر یہی نہیں بلکہ پرندوں کی آوازیں تو کچھ زیادہ ہی ہوا کرتی تھیں۔

کہ اتنے میں دو شکاری جو کہ شکار کی مرضی سے جنگل میں آئے تھے روپا کو دیکھ کر ٹھٹھک کر رک گئے اور اس کے حسن میں کھو گئے، روپا انہیں اس قدر حسین لگ رہی تھی کہ اس کے حسن کی تاب نہ لاتے ہوئے وہ اس کے حسن کی رعنائی میں جیسے مبہوت ہو گئے۔

ادھر روپا اپنے خیالوں کی گہرائی میں پہنچی ہوئی تھی۔

شکاریوں کے دماغ میں یہ بات گردش کرنے لگی کہ اس گھنا جنگل میں اکیلی حسن کی دیوی کیا کر رہی ہے جبکہ اس کے اردگرد بلکہ دور دور تک اس کا کوئی ساتھی بھی نہیں کہیں ایسا تو نہیں کہ راستہ بھٹک کر یا پھر کسی حادثاتی مسئلے کے بنا پر یہ اپنوں سے بچھڑ گئی ہو۔

دونوں شکاریوں میں سے ایک آگے بڑھا اور اس نے روپا کی کلائی پکڑ لی۔

روپا نے اپنی کلائی پر کسی اجنبی کی گرفت محسوس کرتے ہی جھٹ اس نے اپنی دونوں آنکھیں کھول دیں تو جیسے اس کا سانس سینے میں اٹک گیا، اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اسے اپنی جگہ سے اٹھا بھی نہیں گیا بلکہ اس پر تو اس وقت سکتہ طاری ہو چکا تھا۔

شکاری کے منہ سے نکلا۔ ”بھگوان نے واقعی تمہیں فرصت میں بنایا ہوگا۔“

روپا اس قدر اچنبھے میں تھی کہ جیسے اس کی زبان بالکل گنگ ہو کر رہ گئی تھی کیونکہ اس کے تو تصور میں ہی نہ تھا کہ وہ کسی کی نظر میں آ جائے گی اور کوئی اجنبی اس کی کلائی پکڑے گا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk
Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

کلائی پکڑنے والا بولا اپنے ساتھی سے ۔"لگتا ہے گونگی ہے اور گونگے بہرے بھی سوتے ہیں اور لگتا ہے قسمت آج مجھ پر کچھ زیادہ ہی مہربان ہے ،اسے تو میں ساتھ ضرور لے جاؤں گا بھگوان کا تحفہ سمجھ کر۔لگتا ہے واقعی یہ گونگی ہے مگر حسین بے مثال۔"

دوسرا شکاری بولا۔"واقعی لگتا ہے کہ یہ گونگی ہے لیکن یہاں پر یہ اکیلی کیا کر رہی ہے یہ سمجھ سے باہر ہے ۔چل اسے اٹھا اور جلدی سے اسے لے کر گاڑی کی طرف چل۔"

جس نے روپا کی کلائی پکڑی تھی اس نے روپا کی دوسری کلائی بھی پکڑ لی اور پھر اس نے روپا کو اوپر کو اٹھایا، اس حرکت پر روپا نے بالکل بھی چوں چراں نہیں کی کیونکہ وہ تو ابھی تک بدحواسی کی حالت میں تھی۔

کلائی پکڑنے والے نے روپا کو اپنی طرف کھینچا تاکہ اسے اپنے ساتھ لے جا سکے مگر روپا اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئی تو اس نے اپنا ایک ہاتھ روپا کی کمر پر ڈال دیا اور پھر چاہا کہ روپا کو اپنی گود میں اٹھا لے کہ روپا بپھری ہوئی شیرنی کی طرح بپھرتے ہوئے اپنے سیدھے ہاتھ سے اس کی گردن پکڑ لی۔

یہ دیکھ کر شکاری اچنبھے میں پڑ گیا، اور پھر اس پر اشتعال سوار ہو گیا اس نے جھٹ سے روپا کو اپنی بانہوں میں دبوچ لیا۔

پھر اس کی آواز سنائی دی۔"جان من تم تو اس جگہ ہو، تمہیں کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔"

اس کے بعد روپا کی غراہٹ بھری آواز سنائی دی۔"اپنی خیر چاہتا ہے تو مجھے چھوڑ، ورنہ....."اور روپا نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

روپا کی آواز سن کر شکاری جیسے مبہوت ہو کر رہ گیا۔"ارے یہ تو بولتی بھی ہے، گونگی تو نہیں۔"

"اوئے بدذات مجھے چھوڑ دے..... نہیں تو تو اپنے پاؤں سے چل کر جا بھی نہیں سکتا، ابھی بھی وقت ہے اور یہ تیرے حق میں اچھا ہے مجھے جانے دے ،ورنہ جنگل میں تمہاری لاش بھی نہیں ملے گی۔"

"ارے تیری ایسی کی تیسی..... تو بھی کیا یاد کرے گی کہ ٹھاکر بلرام سے پالا پڑا تھا۔" پھر یہ بول کر اس نے روپا کی دونوں کلائیوں پر اپنی گرفت سخت کر دی پھر بولا دلیپ تو ذرا پرے ہٹ..... میں اس کی ہیکڑی نکالتا ہوں۔"

اس کی یہ بات سن کر دوسرا جس کا نام دلیپ تھا وہ چار قدم آگے بڑھا اور اپنا منہ دوسری طرف کر کے کھڑا ہو گیا، اور دوسرا جس نے اپنا نام بلرام بتایا تھا اس نے روپا کو دبوچ کر نیچے زمین پر گرا دیا اور اس پر چڑھنا ہی چاہتا تھا کہ۔

ایک زہریلا بپھرا ہوا سانپ فوراً آگے بڑھا اور پھر اس کی پھنکار سے بلرام دہل گیا مگر اس کے باوجود بھی وہ روپا سے دست درازی کرتا رہا۔

بپھرا ہوا سانپ جو کہ ناگنا تھا وہ اپنی جگہ سے ایک فٹ اوپر کو ہوا اور غیض وغضب کی حالت میں بلرام کے ماتھے پر اپنا زہریلا ڈنک مارا اور پھر اس کی پھنکار نے قرب وجوار کو ہلاک کر رکھ دیا۔

اتنی دیر میں بلرام جو کہ روپا سے دست درازی کر رہا تھا وہ روپا کے برابر میں زمین پر گرا مچل رہا تھا کیونکہ اس کے جسم میں اترا ہوا زہر اپنا کام کر چکا تھا۔

چند قدم کے فاصلے پر دوسرا شکاری جس کا نام دلیپ تھا اسے بھی اردگرد موجود سانپوں نے کچومر بنا ڈالا تھا، ناگنا کا پھنکارتے ہوئے، بلرام کو ڈسنا اور پھر پھنکار سن کر دیگر سانپ بھی سمجھ گئے تھے کہ دشمن کو کسی بھی صورت چھوڑنا نہیں۔

ویسے سانپ کی یہ فطرت ہے کہ اسے جب تک چھیڑا نہ جائے وہ انسان پر حملہ نہیں کرتا جب وہ سمجھتا ہے کہ میرے سامنے موجود انسان مجھے مار دے گا تو وہ بھی اپنے بچاؤ کے لئے کوشش کرتا ہے اور انسان پر حملہ آور ہو جاتا ہے۔

بلرام اپنی جگہ مچلتے ہوئے، بے سدھ ہو چکا تھا اب اس کے جسم میں جان باقی نہیں تھی اور دوسری طرف دلیپ بھی زمین پر تڑپتے ہوئے ختم ہو چکا تھا۔

بلرام کے جسم کا گوشت جگہ جگہ سے گل رہا تھا اور یہی حال دلیپ کا بھی تھا۔

کاش! کہ بلرام روپا کو دیکھ کر اپنے جذبات پر قابو رکھتا تو جو اس کا حال ہوا تھا وہ نہ ہوتا اس کے چکر میں اس کا دوست دلیپ بھی اپنی جان گنوا بیٹھا تھا۔

اور اکثر دیہ دیکھا گیا ہے کہ اوباش جذبات پر قابو نہ رکھنے والے، دوسروں کی عزت کو عزت نہ سمجھنے والے، دوسروں کے مال کو لوٹ کا مال سمجھنے والے دوسروں کو حقیر سمجھنے والے اپنی طاقت سے دوسروں کو حال سے بے حال سمجھنے والے، قدرت کی دی ہوئی طاقت سے دوسروں کو نقصان پہنچانے والے قدرت کے دیئے ہوئے اعلیٰ مقام سے دوسروں کو بے مقام کرنے والے، دوسروں کو ادنیٰ سمجھنے والے، اپنی طاقت اور دولت کے بل بوتے پر دوسروں کو بے قصور موت کے گھاٹ اتارنے والے اور دوسروں کے منہ سے نوالہ چھیننے والے، خواہ مخواہ خون خرابہ کرنے والے، دوسروں کا حق چھین کر اپنی تجوریاں بھرنے والے اور پھر عزت دار کو سرعام ان کی عزت نیلام کرنے والے نشان عبرت بن جاتے ہیں یہی قدرت کا اٹل اصول ہے۔کاش! کہ بلرام روپا کی عزت تار تار کرنے پر تل نہ جاتا تو وہ بے موت نہ مارا جاتا۔

روپا نے حقارت سے بلرام کے مسخ ہوتے وجود پر تھوکا اور اپنے ساتھی سانپوں کے ساتھ ایک طرف کو بڑھ گئی۔

تھوڑی دور جا کر وہ رکی اور اس نے ناگنا کے سر پر ہاتھ پھیرا، اور بولی۔"ناگنا تمہارا بہت بہت شکریہ کہ تم نے میری عزت بچائی اس ظالم سے اور تم نے اس ظالم کا انت کر دیا، میں تمہارے حوصلے اور ہمت کی داد دیتی ہوں اور بہت جلد تم اپنا اصل مقام پا لو گے۔

میرے شنکر سے تم بھی کسی طور کم نہیں کاش! کہ میرے شنکر کا انت نہ ہوا ہوتا تو آج میرا بھی اپنا پریوار ہوتا، خیر جو ہونا تو وہ ہو گیا بھگوان کی اچھا کے آگے کسی کی کیا چلنی۔

پھر وہ زمین پر بیٹھی اور ناگن کا روپ دھار کر ایک طرف کو رینگنے لگی، اس کے پیچھے پیچھے ناگنا تھا وہ بھی روپا کے پیچھے چلتا جا رہا تھا اور دیگر سانپ کسی اور طرف چلے گئے تھے۔

ناگنا کو لئے ہوئے روپا اس پھول کے پودے کے پاس پہنچی جہاں کہ روزانہ جاتی اور اس پر سے ایک پھول توڑ کر اپنے ہاتھ میں لیتی اور گھنٹوں وہاں رہتی اور پھول کے پودے کو شنکر بول کر مخاطب کرتی اور اپنے دل کی ڈھیروں باتیں کرتی۔

اس وقت بھی وہ پھول کے پودے کے پاس پہنچیں اور پھر اس نے اپنا انسانی روپ دھار لیا، ایک پھول توڑا اور اس پھول کو دونوں آنکھوں سے لگایا تو اس کی آنکھوں سے ساون بھادوں کی طرح آنسو بہنے لگے وہ زار وقطار روتی رہی اور جب تھوڑی دیر بعد اس کے دل کا غبار چھٹا تو اس نے ایک بہت لمبا سانس کھینچا اور بولی۔

"شنکر آج پھر ایک ظالم سے پالا پڑ گیا تھا اس نے میری عزت خراب کرنا چاہی اور قریب تھا کہ وہ میرا انت کر دیتا، ناگنا نے ترنت اس کا بیڑا غرق کر دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس پاپی کا انت ہو گیا، میں ناگ دیوتا کی اچھا میں خوش ہوں مگر تمہاری یادیں ہر لمحے میرے دل میں رہتی ہیں۔

خیر یہ ہمارے بھاگ میں لکھا تھا اور ہم دونوں کا ساتھ اس وقت تک تھا ایسا کیوں تھا یہ تو بھگوان اور ناگ دیوتا کو ہی معلوم ہے، یہ بھی بھاگ میں ہے کہ ناگنا میرا محافظ بنے گا اور اس طرح ہمارا پریوار آگے بڑھے گا لیکن یہ میری خواہش ہے کہ میں ہر روز تمہیں ضرور یاد کروں گی۔" اس طرح کوئی ڈیڑھ گھنٹہ تک باتیں کرتی رہی۔ پھر بولی۔"اچھا شنکر اب میں چلتی ہوں مجھے تو نہیں مگر ناگنا کو ضرور بھوک محسوس ہو رہی ہو گی۔" اور یہ بول کر اس نے ناگن کا روپ دھارا اور ایک طرف کو رینگتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

اس طرح وقت گزرتا رہا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

اور پھر ایک رات ناگنا کے پورے شریر میں ناقابل برداشت گرمی محسوس ہونے لگی اور ساتھ ہی ساتھ پورے شریر میں اینٹھن بھی ہونے لگی تھی کسی پل بھی اسے چین نہیں مل رہا تھا پورے غار میں وہ چکرانے لگا تھا اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ غار کی دیواروں سے اپنا سر ٹکرا کر پاش پاش کر دیتا۔

روپا اس کے اردگرد منڈلاتی رہی اور اپنی زبان میں اسے ڈھارس بندھاتی رہی روپا کی باتوں سے اسے تھوڑا سکون محسوس ہوتا پھر اس کی وہی حالت بے چینی والی ہو جاتی۔

پھر ایک وقت آیا کہ وہ لمبے لمبے سانس لینے لگا سانس ایسی تھی کہ جیسے وہ پھنکار رہا ہو آج اس کے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا تھا وہ اسے سمجھنے سے بالکل قاصر تھا۔

اس کے شریر میں پیوست گرمی کی تپش نے اسے نڈھال کر کے رکھ دیا تھا اس کا من چاہتا تھا کہ وہ سمندر کا سارا پانی پی جائے۔

مگر روپا نے اسے بتایا کہ اس حالت میں پانی پیتے نہیں بلکہ پانی پر منہ مارتے ہیں تاکہ زبان پانی سے تر رہے وہ بار بار پانی پر منہ مارتا اور روپا کے کہنے پر صرف زبان کو تر کر لیتا۔

اس کے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا تھا روپا اس کیفیت کو بخوبی سمجھتی تھی وہ چونکہ تجربہ کار تھی اور اکثر ناقابل برداشت مراحل سے گزر چکی تھی۔

آج جو کچھ ناگنا پر گزر رہا تھا وہ ایک وقت روپا پر بھی گزرا تھا روپا بھی ان حالات سے دوچار ہو چکی تھی اور پھر اسے ان حالات کا بخوبی علم تھا۔

روپا سمجھ گئی تھی کہ اب وہ وقت آن پہنچا ہے کہ ناگنا میں روپ بدل شکتی آ جائے گی۔

اور جب اپنی عمر کو پہنچ کر کسی سانپ میں روپ بدل شکتی آتی ہے تو وہ سانپ انہیں حالات سے دوچار ہوتا ہے کیونکہ جب وہ بھی اپنی عمر کو پہنچ کر روپ بدل شکتی سے دوچار ہوئی تھی تو وہ بھی ان ناقابل برداشت کیفیت سے دوچار ہوتی تھی۔

روپا بہت خوش تھی کہ ناگنا بھی اپنی روپ بدل شکتی پر قابو پالے گا اور اس طرح اس کے ساتھی میں بھی روپ بدل شکتی آ جائے گی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کے دل کی تمام خواہشیں بر آئیں گی۔

اور پھر برسوں سے اپنے دل میں پوشیدہ خواہشات کا اظہار ناگنا سے کر سکے گی۔

ناگنا تو اب بھی اس کے ساتھ تھا مگر دونوں کی شکتی میں فرق تھا دونوں سانپ تھے مگر الگ الگ طاقت کے، کیونکہ جب دونوں برابر کی طاقت اپنے اندر رکھتے ہیں تو دونوں ہم خواہش زندگی گزارتے ہیں کیونکہ یہ قدرت کا اٹل قانون ہے۔

ہر جاندار قدرت کے رائج کردہ قانون کے تحت ایک خاص عمر تک خواہشات کے پابند رہتے ہیں اور جیسے وہ ایک مخصوص عمر کو پہنچ جاتے ہیں تو ان میں فطری خواہش عود کر آتی ہے اور پھر وہ اس خواہش اور عمل کے مطابق اپنی اگلی زندگی کا آغاز کرتے ہیں۔

اور اسی قانون قدرت کے تحت روپا اور ناگنا دوچار تھے ناگنا جس طرف بھی جاتا اس کے پیچھے پیچھے روپا چلتی رہتی۔

رات کے کوئی چار بجے تھے کہ اچانک ناگنا کی پھنکار سے جیسے غار کے در و دیوار لرز کر رہ گئے، ناگنا لمبے لمبے سانس لینے لگا ایسا لگتا تھا کہ اب ناگنا کا آخری وقت آن پہنچا ہے، روپا اس کے بہت قریب تھی کہ ناگنا الٹ پلٹ ہونے لگا۔

یہ دیکھ کر ناگنا کے قریب سے روپا چند قدم دور ہٹ گئی۔

ناگنا نے پھر ایک زبردست پھنکار ماری..... اور پھر تو وہ مسلسل پھنکاریں مارنے لگا کہ اچانک اس کے قریب دودھیا دھواں سا پھیل گیا۔

اور پھر وہ سارا دھواں اس کی ناک کے نتھنوں کے راستے اس کے جسم میں اترنے لگا، اس وقت ناگنا بالکل بے سدھ پڑا تھا اس میں حرکت کرنے کی طاقت بھی نہ تھی۔

پھر ناگنا کی زبردست پھنکار سنائی دی اور اس کے بعد گاڑھا گاڑھا دھواں ناگنا کی ناک سے باہر کو نکلنے لگا، گاڑھا دھواں جب نکل چکا تو پھر ناگنا کی ناک سے سنہری کرنیں جیسی لہریں نکلنے لگیں، پھر وہ سنہری کرنیں ایک جگہ جمع ہوتی رہیں اس کے بعد ایک وقت آیا کہ اس کی ناک سے سنہری کرنیں نکلنا بند ہو گئیں پھر وہ تمام کرنیں دو حصوں میں بٹ کر ناگنا کی دونوں آنکھوں میں اندر سما گئیں۔ پھر ایک مرتبہ ناگنا کی زبردست، پھنکار سنائی دی اس کے بعد ناگنا بالکل ساکت ہو گیا۔

اور پھر صبح کا اجالا ہر سو پھیل گیا۔

صبح کے وقت روپا ایک پیالے میں ناگنا کے لئے دودھ لے کر آئی اور پیالہ ناگنا کے قریب رکھ دیا۔

چند لمحے بعد ناگنا کی دونوں آنکھیں کھل گئیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ناگنا روپ بدل کر انسانی روپ میں آ گیا۔

ناگنا حیرت سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ اپنے وجود کو بھی بھرپور نظروں سے دیکھنے میں منہمک تھا پھر اس کی نظریں روپا پر ٹھہر گئیں۔

تو روپا مسکراتی ہوئی بولی۔ ”اب میں تمہارا نام لے کر کہتی ہوں..... آج کے بعد تم ناگنا نہیں بلکہ میرے لئے شنکر ہو تمہارا نام شنکر ہے اور میں تمہیں شنکر کے نام سے ہی پکاروں گی۔

تمہیں نئی شکتی کی بدھائی ہو۔

آج سے تم اچھادھاری ناگ ہو۔

اور میں تمہارے سامنے اچھادھاری ناگن ہوں۔

ناگ دیوتا کا کہنا ہے کہ

اب ہم دونوں جیون بھر جوڑی رہیں گے۔

ہمارا اپنا پریوار ہو گا۔

ہم اپنے پریوار کے رکھوالے ہوں گے۔

ہمارا پریوار آگے بڑھے گا۔

ہمارا پریوار پھلے گا پھولے گا۔

ویسے بھی میں نے اپنے جیون کے اب تک کی کتھا سنا دی ہے اور مجھے بھی تمہارے بارے میں سب کچھ معلوم ہے ہم دونوں اب ایک دوسرے کے لئے ہیں اور ہمیشہ ایک دوسرے کے دکھ سکھ کے ساتھ ہیں گے۔

اور ہاں یاد آیا آج رات ہم دونوں نے ناگ دیوتا کے مندر میں جانا ہے۔

مندر میں ناگ دیوتا پدھاریں گے اور ہم دونوں بلکہ خاص طور پر تمہیں آشیر باد دیں گے۔

اور ہاں، اب تم پیالے میں موجود سارا دودھ پی لو دودھ پیتے ہی تمہارے جسم میں کچھ توانائی آئے گی آج تمہیں صرف دودھ پر گزارہ کرنا ہو گا بلکہ متواتر تین دن تک تمہیں صرف دودھ ہی پینا ہو گا چلو اب دودھ پی لو اور آرام کرو۔

تھوڑی دیر میں، میں ساتھیوں سے ملنے غار میں جاؤں گی اور وہ بھی اکیلی کیونکہ جب نئی شکتی ملتی ہے تو پھر کئی دن تک آرام کرنا پڑتا ہے زیادہ بھاگ دوڑ سے پرہیز کرنا پڑتا ہے، اچھا میں چلتی ہوں اور تم میرے سامنے دودھ پی لو اور آرام کرو شنکر جی۔

کیونکہ اب تمہارا نیا نام شنکر ہے۔“

یہ سنتے ہی شنکر نے پیالے میں موجود سارا دودھ پی لیا اور بولا۔ ”تمہارے حکم کے مطابق میں نے سارا دودھ پی لیا اب تم جاؤ میں آرام کرتا ہوں۔“

اور پھر روپا غار سے باہر نکلتی چلی گئی چند منٹ میں وہ غار میں پہنچ گئی سارے سانپ اس کے انتظار میں تھے یہ روز کا معمول تھا کہ روپا غار میں جاتی اور تمام سانپوں سے ملتی پھر اس کے بعد سارے سانپ ادھر ادھر اپنی مصروفیت کے لئے غار سے نکلتے۔

روپا غار میں پہنچی اور تمام سانپوں سے ملنے کے بعد پھر واپس اپنے غار میں آ گئی جہاں کہ شنکر آرام کر رہا تھا، رات کا اندھیرا پھیلنے کے بعد روپا اور شنکر نے ناگ مندر میں جانا تھا۔

خیر دونوں وقت مقررہ کا انتظار کرنے لگے اور وقت آہستہ آہستہ سرکتا رہا۔

دونوں اپنی اپنی جگہ اپنے خیالوں میں غرق تھے

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

کہ اچانک ایک شفیق آواز سنائی دی۔ ''میں ناگ دیوتا بول رہا ہوں۔ میرے سیوک غور سے میری بات سنو، آج رات تم دونوں ناگ مندر میں مت آنا کیونکہ آج ناگ مندر میں چند سیوک رات گزاریں گے اس لئے تم دونوں کا مندر میں آنا ٹھیک نہیں۔

اور تم دونوں کو آشیر باد دینا بھی ضروری ہے لہٰذا میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تم دونوں ناگوں کے غار میں پہنچ جاؤ، میں اسی غار میں آ کر خاص وقت پر آشیر باد دوں گا کیا سمجھے۔''

''جی ناگ دیوتا، میں سمجھ گئی میں شنکر کو لے کر غار میں پہنچ جاؤں گی۔'' روپا بولی اور پھر خاموشی چھا گئی۔

رات کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے پہلے شنکر کے ساتھ روپا غار میں پہنچ گئی روپا اور شنکر کو دیکھ کر سارے ناگ ناگن اچنبھے میں پڑ گئے کیونکہ اس سے پہلے کبھی بھی روپا اس سے غار میں نہیں آئی تھی۔

اپنی مخصوص چال سے چلتی ہوئی غار میں موجود چبوترے پر چڑھ گئی اس کے ساتھ شنکر بھی تھا، سارے سانپ روپا اور شنکر کے سامنے سر جھکائے کھڑے تھے۔

اتنے میں روپا نے انسانی روپ دھار لیا اس کے بعد شنکر نے بھی انسانی روپ دھار لیا۔ اس کے بعد روپا نے سارے سانپوں سے شنکر کا تعارف کرایا اور تفصیل سے بتایا کہ جو نیا مہمان آیا تھا اور اس کے متعلق سب کو معلوم تھا یہ وہی مہمان ہے، جس نے اپنی عمر پوری کرنے کے بعد کل رات میں اس کے اندر روپ بدلنے کی شکتی آ گئی ہے اور یہ سب ناگ دیوتا کے وردان دینے سے ایسا ہوا ہے اور ناگ دیوتا کے ہی حکم سے ہم دونوں اس وقت یہاں آئے ہیں تھوڑی دیر میں ناگ دیوتا بھی یہاں آنے والے ہیں۔

میں چاہتی ہوں کہ ناگ دیوتا کا زبردست طریقے سے سواگت کریں، سواگت ایسا ہونا چاہئے کہ ناگ دیوتا ہم سے زیادہ خوش ہوں۔''

روپا کی بات سن کر اس وقت غار میں جتنے بھی سانپ تھے سب نے حامی بھری۔

اس کے بعد چند لمحے ہی گزرے تھے کہ اچانک غار میں سنہری روشنی پھیل گئی۔

اس کا مقصد تھا کہ ناگ دیوتا کی آمد تھی۔

سنہری روشنی کو دیکھ کر شنکر، روپا اور سارے سانپ تیار ہو گئے ناگ دیوتا کے سواگت کے لئے، اب سنہری روشنی کے ساتھ ساتھ سنہرا دھواں بھی اٹھنے لگا۔ پھر چند لمحے گزرے کہ سنہرا دھواں زیادہ گہرا ہو گیا اور وہ دھواں ایک مخصوص جگہ پر چکراتا رہا پھر دھواں چھٹا تو ایک بہت ہی خوب صورت تخت پر ناگ دیوتا براجمان تھا۔

ناگ دیوتا پر نظر پڑتے ہی سارے سانپ اپنی زبان میں ناگ دیوتا کے نام کا نعرہ بلند کیا، روپا اور شنکر ایک طرف کھڑے تھے اور دونوں آداب بجالاتے ہوئے جھکے ہوئے تھے، اپنی اپنی جگہ سارے سانپ سر بسجود تھے۔

اتنے میں ناگ دیوتا کی آواز پورے غار میں گونجی۔ ''میرے تمام سیوک، میں تم سب کا سواگت کرنا قبول کرتا ہوں اب تم سب اپنا سر اوپر کو اٹھاؤ'' یہ سنتے ہی سارے سانپ نظر بھر کر ناگ دیوتا کو دیکھنے لگے۔

ناگ دیوتا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار تھی پھر ناگ دیوتا کی آواز سنائی دی۔ ''شنکر تمہیں روپ بدل شکتی کی بدھائی ہو روپا تمہیں بھی بدھائی ہو، کہ تمہیں شنکر کی شکل میں ناگ نا مل گیا اور اس کا تم نے نام شنکر رکھ دیا۔ تمہاری خوشی میں، میں بھی خوش ہوں تم نے ایک طویل عرصہ تک بہت زیادہ کشٹ اٹھایا ہے میں تمہارے حوصلے کی داد دیتا ہوں تمہارے ساتھ بہت زیادہ ظلم ہوا تھا، میرے ساتھ ساتھ تمام دیگر دیوتاؤں نے اور خاص طور پر ایشور نے تمہاری بنتی سن لی اور تمہاری بنتی کا اثر ہے کہ تمہیں ناگنا کی صورت میں تمہیں تمہارا جوڑا مل گیا اور اب ناگنا کا نام شنکر ہے۔

روپا اور شنکر میں تم دونوں کی سکھ شانتی کے لئے تمہیں آشیر باد دیتا ہوں میری اچھا ہے کہ تم دونوں کا پریوار پھلے پھولے تم سب ہر لمحے سکھ شانتی سے رہو، تم دونوں کو کسی کی نظر نہ لگے۔

اور اس کے ساتھ میں اس غار میں موجود تمام ناگ ناگنوں اور تمام دیگر سانپ ذاتی کے لئے پرارتنا کرتا رہوں گا کہ سب ہمیشہ سکھ شانتی سے رہیں اور ہنستے کھیلتے اپنی روپ بدل شکتی کے لئے اپنی عمر پوری کریں۔

ہمیشہ حوصلہ ہمت اور انتھک محنت سے کامیابی ملتی ہے تم سب روپا کو ہی دیکھ لو کہ اس کے جیون ساتھی شنکر کو ایک ظالم نے مار دیا۔ اس سے روپا بے یار و مددگار اپنے اوپر دکھ کا پہاڑ اٹھائے من جوگ ہو گئی تھی اس سے میں نے اسے تسلی دی اور تاکید کی کہ ہمت نہ ہارو ہر وقت ایشور سے پرارتھنا کرتی رہنا پھر بہت جلد تمہیں شانتی ملے گی، اگر کسی وقت دکھ سے پالا پڑ جائے تو ہمت نہیں ہارنا چاہئے، کچھ مسائل بھاگ میں بھی ہوتے ہیں اور اگر ان مسائل کو خوش اسلوبی سے برداشت کیا جائے تو پھر شانتی ملتی ہے جیسے کہ ہر اندھیری رات کے بعد دن کا اجالا ملتا ہے۔

روپا جیون میں جب چھوٹے موٹے دکھ آئیں تو گھبرانا نہیں اور ویسے بھی تم بہت ہمت والی ہو تمہارا دل بہت مضبوط ہے اور پھر ناری پرش کے مقابلے میں زیادہ قربانی دیتی ہے اپنے پریوار کے لئے۔

اور ہاں ایک بات گرہ میں باندھ لو کہ بھول کر بھی انسان کے سامنے جانے کی کوشش نہ کرنا کیونکہ انسان کی فطرت ہے کہ کسی سانپ پر نظر پڑتے ہی اسے موذی سمجھ کر فوراً مارنے کی سوچتا ہے اور سانپ پر حملہ آور ہوتا ہے۔

کوشش کرنا کہ جنگل کے اندر جنگل کے باہر جو راستے بنے ہوئے ہیں ان پر چلنا نہیں، ان پر نظر نہ آنا، انسان کی پرچھائیں سے بھی دور رہنا۔

اور خاص طور پر جب تم دونوں روپ بدل کر انسانی روپ میں رہو تو خاص طور سے احتیاط برتنا اور ویسے بھی جب کسی خوب صورت ناری پر انسان کی نظر پڑتی ہے تو انسان ہر صورت میں اس ناری پر اپنا قبضہ چاہتا ہے، تم روپ بدل کر انسانی روپ میں زیادہ نہ رہنا، ہو سکتا ہے کہ شکاری ادھر آئیں اور ان کی

خوشخبری

طلسماتی انگوٹھی ایک عظیم تحفہ ہے۔ ہم نے سورۂ یاسین کے نقش پر فیروزہ، یمنی، عمیق، پکھراج، لاجورد، نیلم، زمرد، یاقوت پتھروں سے تیار کی ہے۔ انشاء اللہ جو بھی یہ طلسماتی انگوٹھی پہنے گا اس کے تمام بگڑے کام بن جائیں گے۔ مالی حالات خوب سے خوب تر اور قرضے سے نجات مل جائے گی۔ پسندیدہ رشتے میں کامیابی، میاں بیوی میں محبت، ہر قسم کی بندش ختم، رات کو تکیے کے نیچے رکھنے سے لاٹری کا نمبر، جادو کس نے کیا، کاروبار میں فائدہ ہوگا یا نقصان معلوم ہو جائے گا۔ آفیسر اپنی طرف مائل، نافرمان اولاد، نیک، میاں کی عدم توجہ، جج یا حاکم کے غلط فیصلے سے بچاؤ، مکان، فلیٹ یا دکان کسی قابض سے چھڑانا، معدے میں زخم، دل کے امراض، شوگر، یرقان، جسم میں مردو عورت کی اندرونی بیماری، مردانہ کمزوری، ناراض کو راضی کرنے یہ سب کچھ اس انگوٹھی کی بدولت ہوگا۔ یا در کھو سورۂ یاسین قرآن پاک کا دل ہے۔

رابطہ: صوفی علی مراد

0333-3092826-0333-2327650

M-20A الرحمان ٹریڈ سینٹر

بالمقابل سندھ مدرسہ کراچی

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

نظر تم دونوں پر پڑ جائے اور پھر اس صورت میں خون خرابے کی نوبت آجاتی ہے۔

انسان کے پاس اسلحہ ہوتا ہے اور تم ٹھہرے سانپ ذاتی تمہارے پاس کیا ہوگا سوائے دانتوں میں زہر کے، اور کبھی کبھی موقع نہیں ملتا کہ اچھا دھاری ناگ ناگن اپنے زہر کو استعمال میں لائیں لہٰذا میری نصیحت ہمیشہ یاد رکھنا۔

اور ہاں اس بات کا بھی دھیان رکھنا کہ تمہارے کسی ساتھی کو تم سے شکایت نہ ہو، پیار محبت میں بہت شانتی ہے، پیار محبت سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں، لڑنے جھگڑنے میں سوائے نقصان کے کچھ نہیں جب ہر طرح کے جاندار آپس میں مل جل کر رہتے ہیں تو بہت شکتی شالی ہوتے ہیں اپنوں سے الگ رہنے میں ہمیشہ نقصان ہوتا ہے اور ایسی صورت میں وہ کمزور ہوتا ہے۔

اور یہ بھی یاد رکھنا کہ تمہارے چھوٹے تم سے خوش رہیں انصاف کے معاملے میں اپنے اور غیر میں فرق نہ رکھنا، جو دوشی ہو اسے سزا ضرور ملنا چاہئے، کبھی ایسا نہ ہو کہ تمہارا کوئی دوشی ہو اور تم چشم پوشی کرتے ہوئے نردوش کو سزا دے بیٹھو، اس صورت میں ایشور بہت ناراض ہوتے ہیں اور ایسا کرنے والا ایشور کی نظر میں ظالم اور پاپی ہوتا ہے اور برائی کا بدلہ ہمیشہ برا ہی ملتا ہے، اچھا وہ ہے جس کی سب تعریف کرتے ہیں، جب ظالم اور پاپی کمزور پڑتا ہے تو اسے کہیں بھی شانتی نہیں ملتی۔"

پھر ناگ دیوتا نے روپا اور شنکر کو اپنے قریب بلایا تو دونوں نے جھک کر ناگ دیوتا کے چرن چھوئے تو ناگ دیوتا نے ان کے سر پر اپنا ہاتھ پھیر کر آشیرباد دیا۔ پھر بولے۔ "اچھا اب میں چلتا ہوں۔"

یہ سن کر روپا نے ہاتھ جوڑا اور بولی۔ "ناگ دیوتا ہم اس قابل نہیں کہ آپ کی سیوا کر سکیں ہم آپ کی خوشی کے لئے ہمیشہ کوشاں رہیں گے، میری بنتی ہے کہ آپ تھوڑا سا دودھ پی لیں، میں نے ہرن کا تازہ دودھ نکال کر رکھا ہے، آپ ہماری خوشی کے لئے دودھ پی لیں۔"

یہ سن کر ناگ دیوتا مسکرانے لگے پھر بولے۔

"اچھا دودھ لے آؤ میں تم لوگوں کی خوشی کے لئے دودھ پی لیتا ہوں۔"

یہ سنتے ہی روپا فوراً ایک پیالہ میں دودھ لے آئی اور دودھ کا پیالہ اپنے ہاتھ میں پکڑے ناگ دیوتا کو دیکھنے لگی تو ناگ دیوتا نے اس کے ہاتھ سے دودھ کا پیالہ لیا اور پھر اپنے ہونٹوں سے لگالیا۔

پیالے میں جب تین چار گھونٹ دودھ کا رہ گیا تو ناگ دیوتا نے دودھ پینا چھوڑ دیا اور روپا کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ "یہ بچا ہوا دودھ تم اور شنکر دونوں پی لو۔ اب میں چلتا ہوں" اور یہ بول کر ناگ دیوتا چلے گئے، پھر روپا اور شنکر کی نئی زندگی کا آغاز ہوگیا۔

☆.....☆.....☆

ادھر مالوتا کے بیر، رولوکا کو آتش فشاں کے ابلتے اور دہکتے ہوئے لاوا میں ڈال کر بہت خوش تھے ان تمام بیروں کی خوشی دیدنی تھی۔

رولوکا کو ابلتے ہوئے لاوا میں ڈال کر اس پر اکتفا نہیں کیا بلکہ انہوں نے قریب کے ایک بہت بڑے چٹان کو اٹھا لائے اور کھلے ہوئے دہانہ کے منہ پر رکھ دیا کیونکہ انہیں شک تھا کہ کہیں رولوکا آتش میں سے بھی کہیں نکل کر بھاگ نہ جائے۔

خیر سارے بیر جب بالکل مطمئن ہوگئے تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ "اب یہاں سے چلنا چاہئے کیونکہ رولوکا کا خاتمہ ہو چکا تھا۔

بیروں کا جو سرغنہ تھا اس نے تمام بیروں کو حکم دیا کہ "ہم نے اپنے آقا وچ ڈاکٹر مالوتا کے حکم کو سرانجام دے، دیا وچ ڈاکٹر کے سب سے بڑے دشمن رولوکا کا ہم نے خاتمہ کر دیا..... اور اس میں کسی قسم کا شک و شبہ باقی نہیں رہا تھا رولوکا کے بچنے کا۔"

رولوکا خود کو بہت بڑا وچ ڈاکٹر سمجھ بیٹھا تھا مگر اسے ہمارے وچ ڈاکٹر مالوتا کی طاقت کا اندازہ نہ تھا اب ہمارے وچ ڈاکٹر ہماری کارکردگی پر خوش ہی نہ ہوں گے بلکہ ہماری کارکردگی کو سراہتے ہوئے ہماری

سب سے بڑی خواہش "کنواری لڑکیوں کا تازہ خون بھی پینے کو دیں گے۔"

خیر یہاں سے جانے سے پہلے ایک مرتبہ پھر اچھی طرح دیکھ بھال کر لیتے ہیں کہ کہیں رولوکا اپنے نہیں یا پھر اپنے کارندے کے سہارے کہیں اس آتش فشاں کے اندر سے فرار نہ ہو جائے اور اگر ایسا ہو گیا تو آقا وچ ڈاکٹر کو ہم کیا منہ دکھائیں گے۔"

وہ پھر بولا۔ "یہ تو کسی صورت ممکن ہی نہیں کہ رولوکا آتش فشاں کے ابلتے ہوئے لاوا میں سے نکل سکے اب تک تو اس کا کچومر نکل چکا ہوگا وہ بھاپ بن کر دہکتے ہوئے لاوا میں مل چکا ہوگا وہ تو اب دھوئیں کی شکل میں آتش فشاں سے نکل بھی نہیں سکتا کیونکہ ہم نے تو آتش فشاں کے کھلے دہانہ پر مضبوط اور وزنی چٹان بھی رکھ چھوڑا ہے۔"

خیر متفقہ طور پر تمام بڑے بیروں نے فیصلہ کیا کہ اب اس معاملے میں شک کرنا ٹھیک نہیں ہم نے وچ ڈاکٹر کے حکم کے مطابق رولوکا کو دبوچا اور پھر آتش فشاں کے ابلتے اور دہکتے ہوئے لاوا میں ڈال دیا۔

اور ہم یقیناً وچ ڈاکٹر کے سامنے سرخرو ہوں گے۔ لہٰذا اب ہمیں یہاں سے چلنا چاہئے اور جا کر وچ ڈاکٹر کو خوش خبری سنانی چاہئے۔

اور پھر تمام بیروں کا جتھہ اس جگہ سے چل پڑا..... اور پھر پلک جھپکتے ہی سارے بیر وچ ڈاکٹر مالوتا کے سامنے حاضر ہو گئے۔

مالوتا نے ہر ایک بیر پر بھرپور نظر ڈالی اور اس طرح وہ بیروں کی کارکردگی کو جانچنا چاہتا تھا کہ یہ سب کامیاب ہوئے ہیں یا ناکام۔

تمام بیروں کے چہرے اپنی کامیاب کارکردگی کی بنا پر جیسے چمک رہے تھے۔

لگ بھگ اس جگہ پچاس بیر تھے مالوتا نے ہر ایک کی آنکھوں میں جھانکا مگر ایک کی بھی نظر میں شک کا شائبہ تک نہ تھا پھر سب سے آخر میں بیروں کے سردار کے پاس پہنچا اور مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "ناجونا، اپنی اور اپنے ساتھیوں کی کارکردگی بتا، کیا تم سب نے میرے حکم کے مطابق میرے سب سے بڑے دشمن رولوکا کا کیا واقعی خاتمہ کر دیا، کیا تم سب کامیاب لوٹے ہو یا پھر اس میں کوئی شک شبہ ہے۔ کیا میں یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوں کہ میرے سارے بیر خوشیوں سے لبریز اپنا کام انجام دے کر میرے سامنے آئے ہیں۔

دشمن نے کوئی چھل تو نہیں کیا..... دشمن نے کوئی دھوکہ تو نہیں دیا۔

اور تم سب کان کھول کر سن لو..... اگر ایسا ہوا یعنی دشمن بچ گیا ہوگا تو میں ہر ایک کو جلا کر بھسم کر دوں گا، کیونکہ اگر دشمن بچ گیا ہوگا تو وہ زخمی ناگ کی صورت میں مجھ پر حملہ آور ہوگا اور پھر جو ہوگا اس کا کوئی تصور نہیں کر سکتا۔

میں جانتا ہوں کہ ایک بیر کی زندگی کتنی دیر کی ہوتی ہے مگر وچ ڈاکٹر کی زندگی ناقابل شکست ہوتی ہے وچ ڈاکٹر کی ہار اس کی موت پر ختم ہوتی ہے۔

کیونکہ جب دو وچ ڈاکٹر خطرناک عزائم کے ساتھ ٹکراتے ہیں تو دونوں میں سے ایک پاش پاش ہو کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بکھر جاتا ہے اس کے اتنے ٹوٹے ہو جاتے ہیں کہ کوئی بڑا سے بڑا وچ ڈاکٹر بھی بکھرے ہوئے جسمانی ٹکڑوں کو یکجا نہیں کر سکتا اور نہ ہی وچ ڈاکٹر کی روح کا پتہ چلتا ہے۔

اور یہی تشویش میرے دماغ میں ہلچل مچا رہی ہے ابھی بھی وقت ہے تم سب سچ اگل دو تاکہ اس کا کوئی اپائے کیا جائے اور اگر وقت نکل گیا تو پھر اس کا تدارک نہیں ہو سکتا۔

میں مانتا ہوں کہ میرا دشمن رولوکا میرے مقابلے کا نہیں، میری طاقت کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ دشمن کو کسی بھی حال میں کمزور نہیں سمجھنا چاہئے۔

کیونکہ میری زندگی تجربات کی بھٹی میں سے ہو کر آئی ہے ویسے بھی میری ذرا سی غلطی اور غفلت سے میرے دشمن نے میرے دن کا چین اور رات کا سکون

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk
Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

برباد کردیا ہے یعنی میں مغالطے میں رہا اور دشمن نے وار کردیا، وہ اس طرح کہ میرا ناقابل شکست بیر ناگنا کو مجھ سے چھین لیا بلکہ مجھ سے آزاد کرا کے نہ جانے دنیا کے کس کونے کھدرے میں پہنچا دیا ہے۔

جب سے ناگنا میرے پاس سے غائب ہوا ہے ایک پل کے لئے بھی میں نے پرسکون سانس نہیں لیا، میں پل پل لمحہ لمحہ شکست کی آگ میں جلتا رہتا ہوں، میں نے اپنی تمام کوششیں، تمام تر جنتر منتر اور سینہ بہ سینہ چلتا ہوا خفیہ عمل کو آزما لیا مگر میں ناگنا کا پتہ نہ چلا سکا۔

ناگنا کا حصول میرے لئے چیلنج بن چکا ہے۔

نکلتا چاند ہو، ڈوبتا چاند ہو، پونم کی راتیں ہوں یا پھر اماوس کی راتیں ہوں، میرا عمل اور میرے طاقتور بیر ناکام میرے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں اور میں تلملا کر رہ جاتا ہوں میرے پورے شریر میں جیسے بروقت آگ بھڑکتی رہتی ہے۔

دشمن نے میری غلطی سے فائدہ اٹھالیا اور میری روح تک کو گھائل کردیا..... بس یہ سمجھ لو کہ دشمن نے میرے سارے وجود میں زہریلا سلگتا ہوا کانٹا چبھو دیا ہے اور جس کے پورے جسم میں زہریلا سلگتے ہوئے کانٹے چبھ گئے ہوں وہ کیا آرام وسکون سے رہ سکتا ہے۔

یہ تمام باتیں میں تم سب سے کے سامنے اس لئے کہہ رہا ہوں کہ اب بھی وقت ہے صاف صاف بتادو کہ اس میں کہاں تک صداقت ہے کہاں تک پختگی ہے کہاں تک حقیقت ہے کہاں تک مضبوط ناقابل شکست کارکردگی ہے کہ واقعی میرا دشمن نیست ونابود ہو چکا ہے۔

اگر تم سب اپنی ناکامی کا اعتراف کرلو گے تو میں برا نہیں مانوں گا بلکہ تم سب کے مشورے سے ہی کوئی اور اٹل منصوبہ مرتب دوں گا اور پھر دشمن کو ناکوں چنے چبواؤں گا، دشمن بھی کیا یاد کرے گا کہ کس سے پالا پڑا ہے۔ ناجونا واضح اور تفصیل سے بتا کہ تم سب نے دشمن کو نیست ونابود کردیا۔

مالوتا کی بات سن کر ناجونا بیر بولا۔ ”وچ ڈاکٹر آپ بالکل بھی فکر نہ کریں، ہم تمام بیر اپنی اپنی جگہ مطمئن ہیں وجہ یہ ہے کہ ہم نے منصوبے کے تحت آپ کے دشمن کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے عبرت ناک اذیت سے دوچار کر کے آتش فشاں کے ابلتے اور دہکتے ہوئے لاوا میں ڈال دیا۔“

بلکہ ایک بہت زیادہ وزنی چٹان جو کہ جسامت میں اپنی مثال آپ تھی اسے اٹھا کر دہانہ کے منہ پر رکھ دیا، اب آپ خود اندازہ لگائیں کہ آپ کا دشمن رولو کا کس طرح بچ سکتا ہے، جو کچھ بھی ہوا ہم سب نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

آپ کے حکم کے مطابق ہم سب نے دشمن کی نگرانی شروع کردی تھی، آپ نے بتایا تھا کہ کافی دور رہتے ہوئے نگرانی کرنی ہے تاکہ رولو کا یا پھر اس کے کسی کارندے کو ہم پر شک نہ ہو سکے اور پھر جیسے ہی موقع ملے تو اسے اس طرح قابو کرنا کہ وہ ہر طرف سے بے دست وپا ہو کر رہ جائے اور بالکل اسی طرح ہم نے چاروں طرف ایسا جال بچھایا کہ وہ اپنی چوکڑی بھول گیا اور پلک جھپکتے ہی ہمارے شکنجے میں پھنس گیا۔

لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ آپ کا دشمن تھا بہت شاطر، ویسے تو اس نے ہم سب کو دھوکہ دینے کی کوشش کی اگر ہماری جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ شکار کرنے کے بجائے خود شکار ہو جاتا۔

لیکن ہم بھی آپ کے پیدا کردہ طاقتور بیر ہیں اور آپ کو ہم پر ناز ہے کیونکہ کئی بار آپ ہم سب کی کارکردگی کو آزما چکے ہیں کہیں بھی ہم نے مات نہ کھائی اور آپ کو شرمندہ نہ ہونا پڑا بلکہ آپ ہر محاذ پر سرخرو ہوئے ہیں۔

اب آپ خوشیاں منائیں اب آپ بہت زیادہ طاقتور ہو چکے ہیں ہمارے خیال میں اب آپ کا کوئی دشمن ایسا نہیں جو کہ آپ کے سامنے ٹھہر سکے۔

اور ہاں آپ کو تو یاد ہوگا کہ آپ نے ایک وعدہ کیا تھا؟

”کیسا وعدہ؟“ مالوتا فوراً بول پڑا۔

”وچ ڈاکٹر آپ نے وعدہ کیا تھا کہ ہم کامیاب لوٹیں گے تو آپ ہمیں کنواری لڑکیوں کا تازہ لہو پینے کو دیں گے۔“

”مجھے یاد آ گیا..... میں اپنا وعدہ ضرور پورا کروں گا مگر ذرا چھری کے نیچے دم تو لو۔ دو تین روز اپنے دشمن کا انتظار تو کرلوں..... کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تم سب کو دھوکہ دینے میں کامیاب ہو گیا ہو اور اس صورت میں وہ میرے سامنے آجائے اور پھر ناتلافی نقصان سے دوچار کردے، میں اپنا وعدہ ضرور پورا کروں گا۔ اس سے پہلے بھی میں نے تم سب کو کئی مرتبہ خوش کیا ہے، تم سب میرا حکم بجالاتے ہو تو میں بھی تم لوگوں حسب منشا خوش کرتا ہوں گھبراؤ نہیں زیادہ سے زیادہ تین دن کی بات ہے۔

اگر دشمن کی کسی ہلچل کا پتہ نہ چلا تو میرے آنے پر ناقابل فراموش جشن ہوگا اور اس جشن میں میرے تمام دوست احباب شریک ہوں گے اور میں انہیں اپنی کامیابی کا نقشہ پیش کر کے حیران کردوں گا کہ کس طرح میں ناقابل شکست دشمن کو اذیت سے دوچار کر کے پہلے تو بے دست وپا کیا پھر اس کو شکنجے میں جکڑ کر نیست ونابود کردیا اور پھر میری کارکردگی دیکھ کر میرے سارے وچ اگر دوست یقیناً دنگ رہ جائیں گے۔“

مالوتا یہاں تک کہہ کر خاموش ہی ہوا تھا کہ ایک بیر کی فلک شگاف چیخ سنائی دی اور پھر اس کے موجود سارے بیر اور مالوتا اسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگے۔

چیخنے والے بیر کی دونوں آنکھیں باہر کو ابل رہی تھیں اور یہی نہیں بلکہ اس کے دونوں کانوں سے خطرناک اور بھیانک سانپ کان سے تھوڑا باہر نکل کر اپنی دوشاخہ زبان لہرا رہے تھے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس بیر کا جسم بڑھنے لگا تھا۔ مزید بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

اس کی فلک شگاف چیخ قرب وجوار کو دہلائے دے رہی تھی سارے بیر سہمے ہوئے ٹکٹکی باندھے وچ ڈاکٹر مالوتا کی طرف دیکھ رہے تھے۔

پھر اس بیر کی زبان باہر کو نکلی اور لمبی ہوتی ہوئی کوئی ڈیڑھ فٹ لمبی ہوگئی پھر اس طرح ہوگئی کہ جیسے کسی نے اسے درمیان سے کاٹ کر دو حصوں میں بانٹ دیا ہو، بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اس کی زبان دوشاخہ ہوگئی تھی اور اندر باہر کو لپک رہی تھی بیر کی حالت ڈراؤنی اور خوف ناک ہوگئی تھی۔

وہاں پر جو پچاس بیر موجود تھے، انچاس بیر تو تھے ہی عجیب وغریب خوف ناک شکل کے مگر ان سب سے زیادہ خوف ناک وہ بیر لگ رہا تھا۔

اس بیر کے منہ سے اب آواز ایسی نکل رہی تھی کہ سب سہم گئے تھے، وہ برابر چیخ رہا تھا۔

”آقا..... آقا..... آقا..... میں مر رہا ہوں۔ آقا مجھے بچالو..... ہائے..... اوئے..... ارے میں مر گیا..... اوہ..... میری زبان..... میرے کان..... اوہ میری آنکھیں..... اور نہ جانے کیا کیا بک رہا تھا۔

اور مالوتا اپنی جگہ جیسے ساکت ہو کر رہ گیا تھا..... اس کو کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا..... کہ کیا ہو رہا ہے..... اس نے اپنی زندگی میں ایسا اذیت ناک اور خوف ناک مسئلے سے دوچار نہ ہوا تھا، مالوتا اپنی ساری چوکڑی بھول گیا تھا۔

بیر کا جسم بتدریج آہستہ آہستہ بڑھتا جا رہا تھا۔

کہ اچانک مالوتا نے اپنا سیدھا ہاتھ بیر کی طرف کر کے زور سے چیخا ”جانونا..... جانونا..... جانونا.....“ اور پھر اس کے ہاتھ سے زبردست چنگاریاں نکلنے لگیں..... وہ چنگاریاں اس بیر کی طرف بڑھنے کے بجائے اس کے برابر میں جمع ہونے لگیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے چنگاریوں نے ایک ٹھوس شکل اختیار کرلی۔

اب وہاں ایک روشن ہیولا کھڑا تھا..... وہ اس قدر مہیب، خوف ناک اور دل دہلاتا تھا کہ اگر وہاں پر ہزاروں لاکھوں عام آدمی ہوتے تو سب کا پتا پانی بن کر بہہ جاتا۔

مالوتا کی آواز پھر گونجی۔ ”جانونا..... یہ سب کیا

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

ہورہا ہے...... جلدی بتا...... اورایسا کیوں ہورہا ہے جلدی اور......فوراً بتا۔"

پھر خوف ناک شکل جانونا کے ہونٹ ہلے۔"وچ ڈاکٹر ......تمہاری طرف بے شمار خونی بلائیں بڑھ رہی ہیں......جتنی جلدی ہوسکے اپنے لئے کوئی اپائے کرو...... ورنہ تمہاری جان نہیں بچ سکتی...... یہ بلائیں کیوں آرہی ہیں اور کہاں سے آرہی ہیں یہ میں جاننے سے قاصر ہوں میری خفیہ طاقت وہاں تک نہیں پہنچ رہیں۔"

اور یہ بولتے ہی جانونا نظروں سے غائب ہوگیا۔

پھر وچ ڈاکٹر مالوتا کی کھرکھراتی ہوئی آواز سنائی دی۔"کوئی بات نہیں میرے دشمن میں تجھے پاتال سے بھی کھینچ لاؤں گا۔"

اور پھر اچانک مالوتا کے ذہن میں یہ بات آئی کہ کیوں نہ میں کسی اور بیر سے دشمن رولوکا کے متعلق معلوم کروں...... کہیں ایسا تو نہیں کہ رولوکا ان تمام بیروں کو چکما دینے میں کامیاب ہوگیا ہو اور ان کو شبہ تک نہ ہوا ہو۔

یہ تو مانتا ہوں کہ ان بیروں کے مقابلے میں رولوکا کی روحانی طاقت کئی گناہ زیادہ ہے۔"

اور پھر اس نے منہ ہی منہ میں کوئی منتر پڑھ کر اپنے دونوں ہاتھوں پر پھونک ماری اور ساتھ ہی ساتھ تالی بجانے لگا۔

مالوتا اب بالکل انوکھے انداز میں تالی بجارہا تھا اور اس کے سامنے پچاس بیر سر جھکائے کھڑے تھے، ان میں وہ بیر بھی تھا جس کا جسم کافی بڑھ چکا تھا اور اس کی شکل بہت خوف ناک ہوگئی تھی، تالی بجاتے ہوئے ابھی چند لمحے ہی گزرے تھے کہ فضا کو دہلاتی ہوئی بہت دہشت ناک آواز سنائی دی۔"آقا آپ کا غلام۔ اباشا۔حاضر ہے حکم کریں۔"

یہ سن کر مالوتا بولا۔"اباشا میں اس وقت کشٹ میں پڑ گیا ہوں ایک میرے دشمن نے مجھے ذرا پریشان کردیا ہے، میں نے اس کی سرکوبی کے لئے پچاس بیر بھیجے تھے اور بقول ان کے یہ کامیاب لوٹے ہیں انہوں نے دشمن جس کا نام "رولوکا" ہے اسے اٹھا کر آتش فشاں کے ابلتے اور دہکتے ہوئے لاوا میں ڈال آئے ہیں اور ساتھ ہی آتش فشاں کے کھلے دہانہ پر بہت وزنی چٹان رکھ آئے ہیں۔

"مگر وہ سامنے دیکھ...... ایک بیر کی حالت اچانک دگرگوں ہوگئی ہے اور اس کی حالت مزید خراب سے خراب تر ہوتی جارہی ہے۔

تجھ سے پہلے میں نے ناجونا کو بلایا تھا اور اس سے پوچھا کہ اس بیر کی حالت کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے اور اس کی حالت کیونکر بگڑ رہی ہے، تو اس نے جواب دیا کہ یہ بلائیں ہیں جنہوں نے اس کو دبوچ لیا ہے اور یہ بلائیں کیوں کر اور کہاں سے آئی ہیں یہ میں جاننے سے قاصر ہوں اور ان تک میری خفیہ طاقت نہیں پہنچ رہی ہے۔"اور یہ بول کر ناجونا جاچکا ہے۔

"اباشا۔ میں نے تجھے اس لئے بلایا ہے کہ تو جلدی سے معلوم کر کہ سامنے بیر کی حالت خراب کرنے میں کس کا ہاتھ ہے اور یہ بھی معلوم کر کے بتا کہ میرا دشمن "رولوکا" کس حال میں ہے اور کہاں ہے، یا ایسا تو نہیں کہ اس نے تمام بیروں کو دھوکہ دے کر کہیں روپوش ہوگیا ہو یا پھر ہمارے خلاف کوئی کارروائی کرنے کے لئے کوئی منصوبہ بنا رہا ہو۔ ان باتوں کے متعلق ذرا جلدی سے معلوم کر کے بتا تاکہ میں کوئی مناسب حل تلاش کر کے دشمن کے دانت کھٹے کردوں۔"

اور یہ بول کر مالوتا خاموش ہوگیا۔

اور پھر پلک جھپکتے ہی اباشا وہاں سے غائب ہوگیا۔

پھر اچانک فلک شگاف چیخ اس بیر کے منہ سے نکلی جس کی حالت خوف ناک ہوگئی تھی اور پھر وہ کھڑے کھڑے زمین پر دھنسنے لگا اور کچھ لمحے میں وہ پورے کا پورا زمین میں اس طرح دھنس گیا کہ جیسے کوئی دلدل میں دھنس جاتا ہے اور اس کا نام ونشان مٹ جاتا ہے۔ اور بالکل اس طرح کا واقعہ اس بیر کے ساتھ پیش آیا تھا اور پھر تھوڑی دیر میں وہ فرش اپنی جگہ بالکل

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

ہموار ہوچکا تھا، نہ بیر کے دھنسنے کا کوئی نشان اور نہ ہی زمین کے پھٹنے کا کوئی نشان تھا۔ اس واقعہ نے انچاس بیروں کو دہلا کر رکھ دیا اور ساتھ ہی وچ ڈاکٹر مالوتا پر لرزہ طاری ہوگیا۔

مالوتا کی اپنی اندرونی کیفیت بہت زیادہ دگرگوں تھی اور پھر اس پر شرمندگی کا بھی بوجھ تھا کہ وہ اپنے ایک طاقتور بیر کو بچا نہیں پایا تھا اور وہ بیر بہت ہی اذیت میں مبتلا ہو کر زمین میں دھنس گیا تھا۔

مالوتا اپنی جگہ بہت زیادہ سراسیمہ تھا۔

اتنے میں سامنے گاڑھا گاڑھا دھواں اٹھا اور ایک جگہ جمع ہوگیا پھر جب وہ دھواں چھٹا تو خوف ناک شکل اباشا نظر آیا۔

اسے دیکھ کر مالوتا فوراً اس کی طرف متوجہ ہوگیا اور بولا۔"اباشا جلدی بتا کیا معلوم کر کے آیا ہے، اور خاص طور پر میرے دشمن کے متعلق بتا کہ وہ کس حال میں ہے؟"

یہ سن کر اباشا بولا۔"آقا میری معلومات کے متعلق رولوکا کا اب اس دنیا میں کوئی نام ونشان نہیں...... اور جب وہ کہیں ہے ہی نہیں تو اس کا مطلب کہ اس کا خاتمہ ہوگیا ہے تمام بیروں پر شک کرنا عقلمندی نہیں ان کی کارکردگی صاف وشفاف ہے۔

حقیقت میں انہوں نے رولوکا کو اپنے نرغے میں لیا اور پھر اسے دبوچ کر آتش فشاں تک لاکر اسے ابلتے ہوئے لاوا میں ڈال دیا۔ اور پھر دہانہ کے منہ پر وزنی چٹان رکھ دی۔ اور اس طرح آپ کے دشمن رولوکا کا خاتمہ ہوگیا۔

اور رہا دوسرا معاملہ اس بیر کا جس کی حالت دگرگوں ہوگئی تھی اور جہاں تک مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ اس حالت میں زمین کے اندر دھنس گیا ہے تو اس کے متعلق بھی میری معلومات صفر ہے، کوشش کے باوجود بھی میں معلوم نہ کرسکا کہ وہ اس حال کو کیوں کر پہنچا اور وہ کون سی طاقت ہے جس نے اسے زمین کے اندر دھنسنے پر مجبور کردیا اور زمین میں مکمل دھنس گیا۔

مجھے اس کے بارے میں صرف اتنا ہی معلوم ہوا کہ وہ دھوئیں میں لپٹا پڑا تھا اور مجھے جہاں تک شک ہے کہ جس نے بھی اسے اس حالت تک پہنچایا ہے وہ بہت ہی زیادہ شکتی شالی ہے، آپ سے بھی زیادہ کیونکہ آپ کے سامنے آپ کا طاقتور بیر اس حال کو پہنچا اور آپ اسے بچا نہیں پائے اچھا اب میں چلتا ہوں یہ معاملہ آپ کے لئے بہت ہی غور طلب ہے کہ وہ کون ہے جو آپ کو اذیت دینا چاہتا ہے" اور یہ کہہ کر اباشا غائب ہوگیا۔

اباشا کے غائب ہوتے ہی مالوتا بیروں کی طرف متوجہ ہوا اور بولا۔"اب تم لوگ جاؤ اور میرے حکم کا انتظار کرو۔" یہ سنتے ہی سارے بیر وہاں سے غائب ہوگئے۔

جب تمام بیر غائب ہوگئے تو مالوتا اپنی جگہ بیٹھ گیا اور اپنے ماتھے پر ہاتھ مارنے لگا ایسا لگتا تھا کہ وہ پریشانی کے عالم میں کوئی اہم منصوبہ کے متعلق سوچ رہا ہے۔

پھر وہ لمبے لمبے سانس لینے لگا، اس کی آنکھیں بند تھیں پھر اس نے آنکھیں کھول دیں اور سامنے کسی چیز پر اس کی آنکھیں مرکوز ہوگئیں، سامنے فرش پر ایک فٹ لمبی ایک پتلی کالی لکڑی کی چھڑی پڑی تھی اور اس چھڑی کے سرے پر کوئی دو انچ لمبا چوڑا چمکتا ہوا ستارا موجود تھا، مالوتا نے وہ چھڑی اٹھالی اور بغور اس کا جائزہ لیتا رہا اور پھر اس کی آنکھیں چمکنے لگیں اس نے چھڑی کو اوپر اٹھایا اور پھر منہ ہی منہ میں کوئی منتر پڑھ کر چھڑی پر پھونک ماری تو ستارا میں سے چنگاریاں نکل کر لہرانے لگیں پھر اس نے چھڑی کا رخ سامنے دروازے کی طرف کردی تو لہراتی ہوئی چنگاریاں دروازے سے باہر جانے لگیں چند لمحے ایسا ہوتا رہا۔

اس کے بعد ستارا سے چنگاریاں نکلنا بند ہوگئیں اور پھر ایک بہت ہی خوبرو نوجوان دروازے سے اندر آیا اور مالوتا کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوگیا پھر اس کی آواز سنائی دی۔"آقا آپ نے مجھے یاد کیا...... حکم کریں میرے لائق کوئی خدمت۔"

"منکالا میں نے تجھے ایک بہت اہم کام کے

لئے بلایا ہے..... اور جہاں تک تجھے معلوم ہے کہ تیری حیثیت میرے تمام بیروں میں بہت اہم ہے..... اور تجھے یہ بھی اندازہ ہے کہ تو کس طاقت کا مالک ہے، عام اور چھوٹے معاملات میں تجھے کشٹ نہیں دیا جاتا۔

کچھ ایسا معاملہ درپیش آ گیا ہے کہ تیری ضرورت پڑ گئی ہے۔"

یہ سن کر منکالا بولا۔ "آقا میں اپنی اور آپ کی اہمیت کو بخوبی جانتا ہوں اور یہ بھی مجھے معلوم ہے کہ آپ کی نظر میں، میں کتنا اہم ہوں آپ حکم کریں تاکہ میں وہ حکم بجالاؤں۔"

پھر مالوتا گویا ہوا۔ "منکالا میں ایک کام تیرے سپرد کر رہا ہوں اور امید ہے کہ تو بخوبی اسے سرانجام دے کر مجھے خوش کرے گا، دراصل کام یہ ہے کہ ایک دشمن کی سرکوبی ہے۔

ایک میرے دشمن نے مجھے بہت پریشان کر دیا ہے میں نے پچاس بیر اس کی سرکوبی کے لئے بھیجے تھے اور ان بیروں کا کہنا ہے کہ اس دشمن کا خاتمہ کر دیا گیا ہے۔

ان بیروں کے علاوہ بھی میں نے اپنے ایک اور بیر جو کہ طاقت میں اپنی مثال آپ ہے اسے بھی بلا کر تصدیق کر چکا ہوا اور اس کا کہنا بھی ہے کہ اس کا خاتمہ ہو گیا ہے دنیا کے کسی بھی کونے میں اس دشمن کا وجود نظر نہیں آ رہا ہے۔

اور جب اس دشمن کا خاتمہ ہو گیا ہے تو کچھ نادیدہ قوتیں مجھے پریشان کر رہی ہیں اور میرے سامنے کھڑے ہوئے ایک بیر کی حالت غیر ہوئی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ بیر زمین میں دھنستا چلا گیا۔ اباشا بیر کا کہنا ہے کہ وہ نادیدہ دشمن بہت ہی شکتی شالی ہے اور اس سے بچنے کے لئے مجھے بہت اہم قدم اٹھانا پڑے گا۔

لیکن اباشا بیر یہ بتانے سے قاصر ہے کہ وہ دشمن ہے کون؟ کہاں ہے؟

"اس لئے میں نے تجھے حاضر کیا ہے اور تو نے یہی پتا کرنا ہے کہ وہ کون ہے جو دشمنی پر اتر آیا ہے اور جب میرا دشمن رولوکا جس کا خاتمہ ہو چکا ہے اب اس کے بعد کون سا نیا دشمن سامنے آ گیا ہے جو کہ مجھے چیلنج کر رہا ہے وہ کون ہے اور کہاں ہے؟ تو جا اور فوراً یہ معلوم کر کے آ تاکہ میں کوئی حتمی فیصلہ کر سکوں میں اس دشمن کو کسی بھی حال میں چھوڑوں گا نہیں۔"

مالوتا کی بات سن کر منکالا بولا۔ "آقا میں جا کر معلوم کر کے فوراً آتا ہوں آپ بے فکر رہیں..... میں گیا اور یوں آیا....." اور یہ بول کر منکالا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

منکالا کے غائب ہوتے ہی مالوتا کے ہونٹوں پر گہری مسکراہٹ نمودار ہو گئی اور پھر اس نے لمبا سانس کھینچا اور اس کی آواز سنائی دی۔ "دشمن تیری تو ایسی کی تیسی..... میں تو تجھے پاتال سے بھی نکال لاؤں گا..... دراصل ابھی تجھے میری طاقت کا اندازہ نہیں۔

جس طرح رولوکا کا میں نے خاتمہ کر دیا اس سے بھی بھیانک موت سے تجھے ہمکنار کر دوں گا۔"

ستارا والی چھڑی ابھی بھی اس کے ہاتھ میں تھی اور وہ چھڑی کو گھما رہا تھا ایسا کرنے سے منکالا کو وہ گائیڈ کر رہا تھا کیونکہ منکالا اس چھڑی کے زیر اثر تھا۔

ویسے مالوتا بہت زیادہ ٹینشن میں تھا، اگر دیکھا جائے تو خوف نے اسے اپنے شکنجے میں لے چکا تھا، کیونکہ وہ ایسے ایسے طاقتور اپنے بیروں کو سامنے لے آیا تھا جس کے سامنے بڑے بڑے خوف ناک اور طاقتور بیروں کا پتہ پانی ہو جاتا تھا۔

اور خاص طور سے منکالا بیر ایسا تھا کہ جس کی طاقت اور عروج کا کوئی ثانی نہیں تھا۔

مالوتا نے شیطان آقا کی جان توڑ خدمت کی تھی..... شیطان آقا کو راضی کرنے کے لئے مالوتا نے اکاون لڑکیوں کی بلی دی تھی اور ان لڑکیوں کا خون شیطان آقا کے قدموں میں ڈالا تھا..... اور پھر مالوتا کی خدمت گزاری اور جاپ کی وجہ سے شیطان خوش ہو کر منکالا کی شکل میں بے مثال بیر عطا کیا تھا، منکالا بیر سے زیادہ طاقتور اور شکتی شالی کوئی اور بیر مالوتا کے پاس نہیں تھا۔

منکالا اتنا طاقتور تھا کہ مالوتا کے دیگر سینکڑوں بیر بھی اس کے آگے ہیچ تھے منکالا ویسے دیکھنے میں صاف شکل کا خوبرو نوجوان تھا عام بیروں کی طرح اس کی شکل خوف ناک نہ تھی مگر طاقت میں وہ سب سے بڑا تھا۔

کوئی دو منٹ ہی گزرے تھے کہ مالوتا کے سامنے منکالا حاضر ہو گیا..... اب اس کی شکل بہت ہی بھیانک ہو گئی تھی اور اس پر مردنی چھائی ہوئی تھی..... آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔

منکالا کو دیکھ کر مالوتا خود بھی اندرونی طور پر سہم گیا..... وہ سمجھ گیا کہ منکالا ناکام لوٹا ہے اتنے میں منکالا کی آواز سنائی دی۔ "آقا میں نے دنیا کے چاروں سمت آسمان کی وسعتیں اور زمین کے پاتال میں بھی آپ کے نادیدہ دشمن کو ڈھونڈا مگر آپ کا نادیدہ دشمن نظر نہیں آیا۔

آپ کے دیگر بیروں نے جو خبر دی ہے وہ بالکل ٹھیک ہے۔

رولوکا نام کا دشمن اب کہیں بھی نہیں..... اس کا وجود مٹ چکا ہے۔

اور جو بیر زمین میں دھنس گیا ہے اس کے ساتھ ایسا کیوں ہوا..... کس طاقت کے تحت وہ اس انجام سے دوچار ہوا..... یہ بھی معلوم نہ ہو سکا۔

آپ اس بات کا یقین کر لیں کہ آپ کا دشمن رولوکا کا وجود باقی نہیں ہے۔

جو کچھ بھی، آپ کے ساتھ ہو رہا ہے یہ کسی صورت معلوم نہ ہو سکا لیکن اصل بات یہ ہے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟

میں نے شیطان آقا سے بھی معلوم کیا مگر وہ بھی ان حالات سے بے خبر ہیں انہیں بھی کچھ معلوم نہیں..... شیطان آقا نے کہا ہے کہ "مالوتا کا غرور کہیں مالوتا کو لے نہ ڈوبے۔"

آقا میں چلتا ہوں..... اور میرا مشورہ ہے کہ اب آپ شیطان آقا سے رابطہ کریں ہو سکتا ہے کہ شیطان آقا کوئی موثر تدبیر بتا سکیں۔" اور یہ بول کر منکالا غائب ہو گیا۔

منکالا کی بات سن کر مالوتا چونک اٹھا اور اس نے سوچا منکالا کی بات ٹھیک لگتی ہے میں شیطان آقا کی خدمت میں حاضر ہو کر سارے مسئلے کا حل معلوم کرتا ہوں اور شیطان آقا فٹافٹ سارے مسئلے کا حل بتائیں گے۔

اور پھر دوڑتا ہوا مالوتا تہہ خانے میں پہنچ گیا۔

جہاں شیطان کا بہت بڑا بت ایستادہ تھا شیطان کے بت کے سامنے پہنچتے ہی مالوتا نے اسٹینڈ پر بڑا تیز خنجر اٹھایا اور عمل پڑھتے ہوئے اپنے الٹے ہاتھ کی چھوٹی انگلی پر کٹ لگایا تو انگلی سے بھل بھل خون کے قطرے نکلنے لگے تو اس نے اپنی انگلی کا رخ شیطان کے قدموں کی طرف کر دیا خون کے قطرے شیطان کے قدموں میں گرنے لگے۔

مالوتا ساتھ ہی ساتھ منہ ہی منہ میں کوئی عمل بھی پڑھتا جا رہا تھا، چند لمحے ہی گزرے تھے کہ جہاں انگلی سے خون کے قطرے گرے تھے وہاں شعلہ سا لپکا اور شیطان کے بت کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل کر تہہ خانے میں پھیل گئیں۔

اس کا مقصد یہ تھا کہ شیطان بہ نفس نفیس آ گیا تھا اس کے بعد شیطان کی گونج دار آواز سنائی دی۔ "مالوتا کیا بات ہے کہ تو نے خونی عمل کر کے مجھے میرے آرام میں خلل ڈال کر مجھے آنے پر مجبور کیا..... تو کیا چاہتا ہے اور کیوں آیا ہے؟"

یہ سن کر مالوتا سجدہ ریز ہوا پھر گویا ہوا۔ "آقا..... میں آتا نہیں مگر میری مجبوری آپ کے چرنوں میں کھینچ لائی ہے میرا ایک دشمن جس کا نام رولوکا تھا اسے میرے بیروں نے ختم کر دیا..... جس کی میں نے تصدیق بھی کر لی ہے اور اب رولوکا کا وجود واقعی ختم ہو چکا ہے۔

رولوکا کے بعد میرا اور کوئی دشمن نہیں مگر اب نہ جانے کیا مسئلہ ہے اور وہ کون ہے جو میرے دن کا چین اور رات کا سکون برباد کر رہا ہے میرے تمام بیر دست و پا ہو چکے ہیں اور جس کا ایک زبردست ثبوت یہ ہے کہ میرے سامنے جہاں کہ پورے پچاس بیر موجود تھے ان

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

میں سے اچانک ایک بیر کی حالت ناقابل برداشت ہوگئی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ بیر کھڑے کھڑے زمین میں دھنستا چلا گیا اس بیر کی چیخ وپکار سے سارا آستانہ دہل گیا۔

میں نے اپنی ساری شکتی اسے بچانے پر لگادی مگر اسے بچانے پر کامیاب نہ ہوسکا میرے سامنے میرے انتچاس بیر بھی ہاتھ ملتے رہ گئے..... اور بیر زمین میں دھنس کر غائب ہوگیا۔

اس کے بعد میں نے بڑے بڑے بیر مثلاً جانونا، اباشا اور آپ کا عنایت کردہ بیر منکالا کو یہ جاننے کے لئے روانہ کیا کہ وہ معلوم کریں کہ یہ معاملہ کیا ہے اور ایسا کون کررہا ہے۔

لیکن میرے آقا یہ تینوں بیر بھی اصل حقیقت جاننے سے قاصر ہیں وہ بھی کچھ معلوم نہ کرسکے..... لہٰذا مجبور ہوکر میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ آقا میری مدد کریں اور اس کا کوئی حل بتائیں اور یہ بھی بتائیں کہ ایسا کیوں ہورہا ہے؟ ..... اور وہ کون ہے جو ایسا کررہا ہے؟ ..... اب تو میں بہت پریشان ہوگیا ہوں..... میری جان کے لالے پڑ گئے ہیں۔

میں آپ کی خواہش کے مطابق بلی چڑھاؤں گا..... آپ کا حکم سر آنکھوں پر مجھ پر رحم کریں۔'' اور یہ بول کر مالوتا خاموش ہوگیا۔

شیطان کی آواز گونجی۔'' مالوتا تو نے میری جتنی خدمت کی اس کے بدلے میں نے کہیں اس سے بڑھ کر شیطانی شکتی دی، تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا میری عنایات کا..... مگر میں نے تیرے ساتھ بخل سے کام نہیں لیا۔

جو میری پوجا کرتے ہیں میرے بتائے ہوئے راستے پر چل کر اپنے مذہب سے منہ پھیر لیتے ہیں میں ان کے ساتھ زیادہ مہربانی کرتا ہوں میں انہیں دنیاوی طاقت اتنی عنایت کرتا ہوں کہ وہ اپنے آپ کو بڑا سمجھنے لگتے ہیں اور وہ مغرور ہوجاتے ہیں ان کے دل ودماغ سے رحم وہمدردی ختم ہوجاتی ہے جبکہ میرا یہ سبق نہیں ہوتا کہ مغرور ہوکر ظلم کا بازار گرم کردیں بلکہ ان کے لئے میرا پہلا سبق یہ ہوتا ہے کہ تم لوگوں کو اپنا گرویدہ کرلو ..... اور جو لوگ تمہارے آگے آگے آکر تمہاری باتیں سنتے ہیں تمہارے آگے پیچھے رہتے ہیں اور تمہارے گرویدہ ہوکر تمہاری واہ واہ کرتے ہیں ان کے دماغ سے مذہب کا جنون نکال کر میرا پیروکار بنادو۔

مگر مالوتا تو نے میری دی ہوئی شکتی کے بل بوتے پر میرے سبق اور میری خوشی کا پرچار نہیں کیا بلکہ تو نے اپنی عیاشی شروع کردی اپنی طاقت اور اپنی شکتی کا پرچار شروع کردیا۔

اس کے باوجود بھی میں نے تجھے نہیں روکا..... اگر میں چاہتا تو تجھ سے اپنی دی ہوئی شکتی چھین سکتا تھا مگر میں نے ایسا کچھ نہیں کیا..... تو نے میری جو خدمت کی اور میرا حکم شروع میں مانا تو میں خوش ہوکر اپنا ایک خاص کارندہ تیرے حوالے کردیا وہ کارندہ تھا۔'' منکالا۔''

میں نے تجھے بار بار منع کیا تھا کہ تیرے پاس کالی طاقتیں ہیں تو بھول کر بھی سفید طاقتوں سے نہ ٹکرانا..... بلکہ ہمیشہ کوشش کرنا کہ تجھ پر سفید طاقتوں کی پرچھائیں تک نہ پڑنے پائے۔

مگر طاقت کے غرور میں تو کئی مرتبہ سفید طاقتوں کی راہ میں آیا..... تو فوراً میں نے تجھے ان طاقتوں کے راستے سے ہٹادیا..... اور اس طرح تو بچتا رہا۔

لیکن تو اپنی حرکتوں سے باز نہیں آیا۔

تیرے چکر میں، میں اوروں کا تو ستیاناس نہیں کرسکتا۔

تو اپنی طاقتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنی حفاظت کر..... ابھی تو تیرے پاس بے شمار بیر ہیں..... ان سے کام لے..... مگر جوش سے نہیں بلکہ ہوش سے..... ابھی بھی تو بہت طاقتور ہے..... ٹھنڈا کرکے کھا..... گرم گرم کھائے گا تو منہ جل جائے گا۔

اب کالی راتیں شروع ہونے والی ہیں..... اور یہ تو تجھے معلوم ہے کہ جب کالی راتیں شروع ہوتی ہیں تو میری مصروفیات بڑھ جاتی ہیں۔

ویسے میری آشیر باد تیرے ساتھ ہے..... گھبرا نہیں..... اور اپنے مہابیر ناجونا سے کام لے.....

میرے بیر منکالا کو زیادہ تنگ نہ کرنا۔'' اور یہ بول کر شیطان خاموش ہوگیا۔

جیسے شیطان بت کی آنکھوں سے، چنگاریاں نکلنا بند ہوگئیں تو مالوتا سمجھ گیا کہ شیطان آقا جاچکے ہیں اور پھر وہ تہہ خانے سے باہر آگیا۔

تہہ خانے سے آکر وہ اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھ گیا..... اس کے دماغ میں سوچ کے آندھی طوفان سے بھی بڑھ کر جھکڑ چل رہے تھے اسے کسی پل چین نہیں مل رہا تھا۔ اس کے دماغ میں صرف اور صرف یہ خیال کوندا بن کر کوند رہا تھا کہ یقیناً کوئی نہ کوئی ایسا وجود ہے جو کہ میرے راہ میں رکاوٹ ڈال رہا ہے اور پھر تباہی وپریشانی کے لئے کمربستہ ہورہا ہے..... میرے سامنے میرے بیر کی جو حالت ہوئی اور وہ میرے سامنے زمین میں دھنس گیا اور میں اس کے بچاؤ کے لئے کچھ نہ کرسکا اوہ اب میں کیا کروں۔

ویسے شیطان آقا نے بتا تو دیا ہے کہ میں اپنی شکتی سے بہت کچھ کرسکتا ہوں۔ مگر عقل استعمال کرکے اور شیطان آقا نے جانونا بیر کا نام لیا ہے تو کیوں ناں میں جانونا کو حاضر کروں اور اسے کام پر لگادوں۔

اور جانونا سے یہ بھی بولوں کہ تو اپنے ساتھ سارے بیروں کو لے کر دنیا کے چپے چپے پر پھیل جا اور دشمن کو تلاش کر اور پھر آستانے کے قریب بھی رہ کر اس دشمن پر نظر رکھ تاکہ وہ دشمن یا اس کا کوئی وار آستانے پر کارگر نہ ثابت ہوسکے۔

اور یہ سوچ دماغ میں آتے ہی مالوتا نے ناجونا کو بلانے کا عمل پڑھنا شروع کردیا چند لمحے ہی گزرے تھے کہ آستانے کے ایک کونے میں دھواں اٹھنا شروع ہوا، اور وہ دھواں جمع ہونے لگا پھر دیکھتے ہی دیکھتے دھواں چھٹا تو۔

ناجونا اپنی تمام تر خباثتوں اور خوفناکیوں کے حاضر تھا وہ گویا ہوا۔'' آقا آپ نے مجھے بلایا، آپ حکم کریں.....''

یہ سن کر مالوتا بولا۔'' شیطان آقا نے تیرا نام لیا ہے کہ ناجونا کے ذمہ یہ کام لگادو۔ یہ کام ناجونا کردے گا۔''

مالوتا بولا۔'' ناجونا تو نے یہ کام کرنا ہے..... اور بڑی ذمہ داری سے کرنا ہے اپنے ساتھ تو جتنا چاہے بیروں کو لے جا..... اور پتہ کر کہ وہ دشمنوں کون ہے جس نے ناک میں دم کر رکھا ہے اور یہ تو تو دیکھ ہی چکا ہے کہ تجھ سمیت ہم سب کے سامنے وہ بیر پورے کا پورا زمین میں دھنس گیا۔

اگر دشمن نہیں پکڑا گیا تو یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تم سب کی خیر نہیں اگر تجھے پاتال میں بھی جانا پڑے تو چلا جا اور دشمن کو نیست ونابود کردے۔''

یہ باتیں ہورہی تھیں کہ اچانک ناجونا کے ساتھ آئے ہوئے بیروں میں سے دو بیر اپنا گلا پکڑ کر فلک شگاف آواز میں چیخنے لگے۔ دونوں بیروں کی آنکھیں انگارہ بنی باہر کو ابل پڑی تھیں اور وہ چیخنے میں مصروف تھے ایسا لگتا تھا کہ کوئی نادیدہ قوت ان کے گلے کو دبا رہی ہو۔

دونوں بیروں کے اپنے ہاتھ ان کے گلے پر تھے اور انداز سے لگ رہا تھا کہ اس نادیدہ قوت سے اپنے گلے کو آزاد کرانے کے لئے زور لگا رہے تھے مگر نادیدہ قوت کی گرفت بہت زیادہ سخت تھی۔

پاس کھڑے دیگر بیر اور ناجونا پر جیسے لرزہ طاری تھا وہ سہمے ہوئے اس طرح کھڑے تھے کہ کہیں وہ نادیدہ قوت ان کی گردن ناں دبوچ لے۔

مالوتا کی ٹانگیں کپکپا رہی تھیں اس کی حالت بہت غیر ہورہی تھی..... اس میں اتنی سکت باقی نہ تھی کہ وہ کوئی منتر پڑھتا یا پھر ان بیروں کے بچاؤ کے لئے کوئی اپائے کرتا۔

کہ اتنے میں ان دونوں بیروں کا وجود اپنی اپنی جگہ سکڑنے لگا..... یہ عمل بڑی تیزی سے ہورہا تھا ان کا وجود سکڑتے سکڑتے ایک چھوٹی چڑیا میں تبدیل ہوگیا..... جہاں تھوڑی دیر پہلے دو لحیم شحیم خوف ناک شکل کے بیر کھڑے تھے۔ لیکن ان کی جگہ دو چھوٹی چھوٹی

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

چڑیاں کھڑی سب کوتاسف بھری اور خوف زدہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔

پھر دونوں چڑیوں کے منہ سے ایک ساتھ آواز نکلی..... ''ہاں مالوتا..... اب بول تیرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے..... بول جلدی بول..... تو تو خود کو طرم خان سمجھ بیٹھا تھا۔ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا..... دیکھ لیا تو نے اپنے بیروں کا حشر نشر..... اگر پکڑ سکتا ہے تو پکڑ لے اپنے دشمن کو.....'' اور پھر وہ دونوں چڑیاں مردہ ہوگئیں اور پھر چشم زدن میں دونوں کے وجود میں آگ لگ گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے دونوں راکھ میں تبدیل ہوگئیں۔

یہ دیکھنا تھا کہ مالوتا کا پتا پانی ہونے لگا اس پر بدحواسی طاری ہوتی کہ اچانک اس کے منہ سے نکلا ''شیطان آقا..... میری مدد کریں۔''

اور اس کے ساتھ ہی وہ چیختے ہوئے پھر بولا۔'' جانونا..... اپنے بیروں کو لے کر فوراً آستانے کا گھیراؤ کرلے..... مجھے لگتا ہے کہ ہمارا نادیدہ دشمن ابھی یہیں ہوگا جلدی کر..... دیر ہونے سے کہیں دشمن بھاگ نہ جائے۔''

اور یہ بول کر بابلند آواز ..... منتر پڑھنے لگا۔

اس پر خوف سوار ہو چکا تھا کہ کہیں نادیدہ وجود مجھے نہ دبوچ لے اور میں بے موت مارا جاؤں..... کیونکہ چند لمحے پہلے اپنے دو بیروں کا حال دیکھ چکا تھا کہ اس کے دو بیر راکھ میں تبدیل ہو چکے تھے اور وہ بھی اس کے سامنے اس کے اپنے آستانے میں۔

جس سے ثابت ہو رہا تھا کہ مالوتا کا مدمقابل اس سے کہیں بہت زیادہ شکتی شالی تھا۔ کہ لاکھ کوشش اور تلاش بسیار کے باوجود بھی مالوتا اپنے نادیدہ دشمن کے سایہ تک کو نہ دیکھ سکا تھا۔

مالوتا کا مہابیر ناجونا..... آناً فاناً مالوتا کی بات سنتے ہی آستانے کے گرد اپنے بیروں کے ساتھ پھیل چکا تھا بلکہ یہی نہیں آستانے سے دور تک وہ سارے بیر گردش میں تھے اور مالوتا کے نادیدہ دشمن کو بھنائے ہوئے تلاش کر رہے تھے۔

مگر مالوتا کا نادیدہ دشمن واقعی بہت ہی زیادہ مہان شکتی والا تھا۔

مالوتا کے سینکڑوں بیر آستانے سے باہر مالوتا کے نادیدہ دشمن کو ڈھونڈنے میں سرگرداں تھے، اور اندر آستانے میں مالوتا اپنے آقا شیطان کو گڑگڑا کر اپنی مدد کے لئے آوازیں دے رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ منتر بھی پڑھتا جا رہا تھا جس کے پڑھنے سے آقا شیطان ترنت متوجہ ہوتا تھا مگر آج مالوتا کا کوئی بھی عمل کام نہیں کر رہا تھا۔

ایسا لگتا تھا کہ شیطان آج دانستہ طور پر مالوتا کو نظرانداز کر رہا تھا..... ورنہ کبھی بھی ایسا نہ ہوا تھا کہ مالوتا اپنے آقا شیطان کو متوجہ کرنے کے لئے عمل پڑھا ہو اور شیطان متوجہ نہ ہوا ہو ہمیشہ یہ ہوتا تھا کہ مالوتا کے منہ سے عمل کے الفاظ نکلے اور ادھر شیطان نے فوراً جواب دیا۔

مگر آج مالوتا کے سارے عملیات بے کار ہو رہے تھے عمل پڑھتے پڑھتے اب تو مالوتا چیخنے لگا تھا ..... ''شیطان آقا..... آقا..... آقا..... فوراً میری مدد کریں، آقا مجھے آپ کی مدد کی اشد ضرورت ہے، آقا جلدی آئیں..... ایسا نہ ہو کہ میرا دشمن مجھ پر حاوی ہو جائے اور مجھے ناقابل تلافی نقصان سے دوچار کردے، میں آپ کے چرنوں میں سونا ریوں کی بلی چڑھادوں گا..... آقا مجھے بچالیں..... آقا..... آقا۔''

مگر مالوتا کی اپنی آوازیں دیواروں سے ٹکرا رہی تھیں..... وہاں اس کی سننے والا کوئی بھی نہ تھا..... اس کا شیطان آقا..... لگتا تھا آج اس نے اپنے کانوں کو بند کر چکا ہے۔

پھر سجدے سے مالوتا نے اپنی گردن اوپر اٹھائی تو چونک گیا۔ سامنے دیوار پر ایک سایہ حرکت کرتا نظر آیا..... تو بدحواسی کی حالت میں مالوتا کے منہ سے نکلا۔'' کون..... کون ہے تو۔''

تو سائے نے جواب دیا۔'' رولوکا۔''

(جاری ہے)

بھٹکتی آتما

حافظ محمد بلال اسلم۔ سرگودھا

ٹھاکر کے سامنے رات کے وقت بند کمرے میں مجسم دوشیزہ آن کھڑی ہوئی تو ٹھاکر کا دماغ بھک سے اڑگیا، وہ سوچنے لگا کہ اس نے اس دوشیزہ کو کہاں اور کس حالت میں دیکھا تھا کہ پھر اسے یاد آیا کہ وہ تو مرچکی تھی کہ اچانک گرجدار آواز گونجی.....

دولت کی طاقت میں اندھا ہونے والوں کے لئے عبرتناک واذیت ناک دل برداشتہ کہانی

''**ٹھاکر** صاحب..... ٹھاکر صاحب۔'' ٹھاکر امرت سنگھ کا ملازم تقریباً چیختے ہوئے اسے پکارتا ہوا اندر داخل ہوا۔

ٹھاکر امرت سنگھ اس وقت گاؤں کے دو وڈیروں کے ساتھ اپنے عالیشان گھر کے آنگن میں براجمان چائے پی رہا تھا۔ جب اس کا ملازم رامو چیختا ہوا اندر داخل ہوا۔ وہ بری طرح سے ڈرا اور سہما ہوا تھا۔ شام کے اجالے اپنے پر پھیلا چکے تھے۔ رتن لال اور مہیش دونوں وڈیرے چک میں ٹھاکر امرت سنگھ کے بعد بہت عزت کے حامل تھے۔ وہ دونوں بھی ٹھاکر امرت سنگھ کی طرح جاہ وجلال کے مالک تھے۔ ان کے پاس بھی پیسے کی فراوانی تھی۔ لیکن ٹھاکر امرت سنگھ اپنے گاؤں کا سب سے زیادہ مالدار اور جدی پشتی وڈیرا چلا آرہا تھا۔ ایک طرح سے اسے وہ اس گاؤں کا مالک تھا۔ پورا گاؤں اس کے حکم کا تابعدار تھا۔ کسی کی

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

کیا مجال کہ اس کے حکم کی خلاف ورزی کر سکے۔

ٹھاکر امر سنگھ اپنے باپ کی طرح سنگدل اور ظالم نہ تھا۔ بلکہ وہ ہر کس و ناکس کے لیے ایک رحم دل انسان ثابت ہوا تھا۔ اس کا باپ ٹھاکر وجے سنگھ ایک نہایت ہی ظالم اور بدکردار انسان تھا۔ سب سے زیادہ وہ مسلمانوں کا مخالف تھا۔ مسلمانوں کو تو وہ اپنا سب سے بڑا دشمن گردانتا تھا۔ کتنے ہی مسلمان اس کے ہاتھوں ابدی نیند سو گئے تھے۔ اس کے اس ظلم کی وجہ سے اس کے اپنے ہندو بھی اس سے شدید نفرت کرتے تھے۔ اس کی حیات میں ہی ٹھاکر امر سنگھ نے لوگوں کے دلوں میں اپنی ساکھ بیٹھانی شروع کر دی تھی۔ کہتے ہیں کہ ٹھاکر وجے سنگھ کو رات سوتے میں کسی نے ابدی نیند سلا دیا تھا۔

یہ بات سب کے لیے بہت حیران کن تھی۔ کیونکہ ٹھاکر وجے سنگھ کی حویلی میں بہت سخت پہرہ ہوتا تھا۔ خاص کر اس کے کمرے کے باہر تو چوبیس گھنٹے اس کے حفاظتی ملازم مستعد کھڑے رہتے تھے۔ کسی کو بھی اس کے کمرے میں جانے کی اجازت تک نہ تھی۔ بعد میں یہ افواہیں بھی اٹھیں کہ ٹھاکر وجے سنگھ کو کسی آتما نے ابدی نیند سلا دیا ہے۔ کیا حقیقت تھی اور کیا نہیں یہ تو کوئی بھی نہیں جانتا تھا لیکن باپ کے مرتے ہی ٹھاکر امر سنگھ نے اپنے گاؤں کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں سنبھال لی تھی۔ ٹھاکر امر سنگھ اپنے گاؤں واسیوں کے لیے ایک نہایت ہی مشفق انسان ثابت ہوا۔ یہی نہیں آس پڑوس میں بھی اس کی ایمانداری اور انصاف کے چرچے ہونے لگے تھے۔ غریبوں کی وہ دل کھول کر مدد کرتا تھا۔

بے شک وہ ہندو تھا لیکن اس کے باوجود وہ مسلمانوں کو بھی اتنی ہی عزت دیتا تھا۔ جتنی کہ اپنے دھرم واسیوں کو دیتا تھا۔ اس وقت رتن لال اور مہیش دونوں اس کے پاس کسی ضروری کام سے آئے تھے۔ انہیں آئے زیادہ وقت نہ بیتا تھا کہ ٹھاکر امر سنگھ کا ملازم رام چیختا ہوا اندر داخل ہوا تو سب کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ رامو بھاگتا ہوا آیا اور سیدھا ٹھاکر امر سنگھ کے قدموں میں گر گیا۔

"غضب ہو گیا ٹھاکر جی۔"

"کیا ہوا رامو؟" ٹھاکر امر سنگھ نے اسے کندھوں سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

رامو کی حالت کافی دگرگوں دکھائی دے رہی تھی۔ وہ بری طرح سے ہانپ رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ابھی کے ابھی اس کی سانسیں اس کا ساتھ چھوڑ جائیں گی۔ ٹھاکر امر سنگھ کے ساتھ والی چیئر پر براجمان مہیش نے جلدی سے ایک گلاس پانی کا بھر کر رامو کی طرف بڑھایا۔ جسے اس نے پلک جھپکتے میں حلق میں انڈیل لیا۔ اس نے گلاس مہیش کی طرف بڑھایا اور مزید پانی کی تمنا ظاہر کی تو اس نے ایک اور گلاس بھر کر دیا۔ اسے بھی وہ غٹا غٹ پی گیا۔ تب جا کر اس کی سانس میں کچھ سانس آئی۔ ٹھاکر امر سنگھ نے اسے پاس ہی پڑی خالی کرسی پر بیٹھا دیا۔ تینوں کی سوالیہ نگاہیں اسی پر مرکوز تھیں جبکہ وہ بدستور اپنے حواس درست کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"آخر ہوا کیا ہے کچھ تو بتاؤ؟"

ٹھاکر امر سنگھ کی بات سن کر رامو نے ٹھاکر امر سنگھ کی طرف ترحم آمیز نگاہوں سے دیکھا۔

"ٹھاکر جی کسی نے کھیتوں میں آگ لگا دی ہے۔" رامو نے تقریباً ہکلاتے ہوئے جواب دیا تو اس کی بات سن کر ٹھاکر امر سنگھ سمیت رتن لال اور مہیش بھی حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہو گئے۔

"تم پاگل تو نہیں ہو گئے؟" ٹھاکر امر سنگھ نے اسے کندھے سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا۔

"کس کی اتنی مجال کہ ہمارے کھیتوں کو آگ لگا دے؟"

"ٹھاکر جی میں اس وقت ڈیرے پر حقے میں پانی بھر رہا تھا۔ جب اچانک ہی ایک ساتھ سارے کھیتوں میں ہر طرف آگ بھڑک اٹھی۔" رامو نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔

"یقین مانیے ٹھاکر صاحب وہاں کوئی نہیں تھا۔ اتنا اندھیرا انہیں پھیلا تھا کہ آس پاس کی کوئی جگہ دکھائی نہ

دے۔ ویسے بھی اگر آگ لگائی جائے تو وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتی ہے لیکن آپ میری بات پر وشواس نہیں کریں گے۔ ایک ساتھ ہی سارے کے سارے کھیتوں میں آگ بھڑک اٹھی تھی۔ میری تو سمجھ سے سب کچھ باہر تھا۔ اسی لیے بھاگم بھاگ آپ کے پاس چلا آیا۔"

رامو کی بات سن کر ٹھاکر امر سنگھ سمیت دونوں براجمان بزرگ بھی حیران و ششدر رہ گئے۔ انہیں یقین نہیں ہو رہا تھا کہ رامو جو کچھ کہہ رہا ہے وہ سب کچھ حقیقت پر مبنی ہے۔ انہیں یوں لگ رہا تھا جیسے رامو نے ادھ کھلی آنکھوں سے کوئی سپنا دیکھا ہے اور مارے ڈر کے بھاگا بھاگا یہاں چلا آیا ہے۔

"چلو میرے ساتھ۔" ٹھاکر امر سنگھ نے اپنی چیئر سے کھڑے ہوتے رامو کو مخاطب کر کے کہا۔

"ٹھاکر صاحب اگر آپ برا نہ مانیں تو ہم بھی آپ کے ساتھ چلتے ہیں۔" رتن لال نے ٹھاکر امر سنگھ کے اٹھتے ہی اسے مخاطب کیا۔ تو اس نے ان کی طرف دیکھ کر ہاں میں سر ہلا دیا لیکن منہ سے کچھ نہ بولا۔

جلد ہی چاروں گاڑی میں بیٹھ چکے تھے۔ ٹھاکر امر سنگھ کی گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی اپنے کھیتوں کی طرف اڑی چلی جا رہی تھی۔ ٹھاکر امر سنگھ کی حالت دیدنی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا ابھی کے ابھی ہارٹ فیل ہو جائے گا۔ کئی بار تو گاڑی کا اسٹیئرنگ اس نے گھما دیا۔ مہیش جو اس کے بالکل پیچھے براجمان تھا۔ اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"ٹھاکر صاحب چنتا مت کرو۔ اگر بھگوان نے چاہا تو کچھ بھی غلط نہیں ہوگا۔ اپنے ذہن کو ٹھنڈا رکھو۔ وشواس سے بڑھ کر کچھ نہیں ہوتا۔ ضرور رامو نے کوئی برا سپنا دیکھا ہوگا۔" مہیش نے ٹھاکر امر سنگھ کی ڈھارس بندھانے کی سعی کی تو متواتر اس نے ہاں میں سر ہلا دیا۔

دور سے ہی ٹھاکر امر سنگھ کے کھیت دکھائی دے رہے تھے۔ لیکن یہ دیکھ کر سب گنگ رہ گئے کہ وہاں آگ تو دور روشنی کا بھی نام و نشان تک نہ تھا۔ یہ منظر دیکھ کر رامو کے تو حواس باختہ ہو گئے لیکن ٹھاکر امر سنگھ کی

قبرستان

ایک مولانا گھر پر تھے کہ ایک خاتون ان کی بیوی سے ملنے آئیں۔

خاتون نے پوچھا۔ "کیا آپ کی اہلیہ گھر پر ہیں؟"

"جی نہیں۔"

"کیا میں یہاں بیٹھ کر ان کا انتظار کر سکتی ہوں؟"

"ضرور، تشریف رکھیے۔"

خاتون نے ایک گھنٹہ انتظار کے بعد پوچھا۔

"آپ کی اہلیہ کہاں مرگئی ہیں؟"

"قبرستان گئی ہیں۔"

"وہ کب آئیں گی؟"

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا، لیکن انہیں گئے ہوئے دو برس ہو چکے ہیں۔"

(شاہد۔ کراچی)

سانس میں سانس آئی۔ ٹھاکر امر سنگھ اس بات سے بخوبی آشنا تھا کہ رامو اس کا بہت ہی پرانا ملازم ہے۔ اس کے باپ نے بھی تاحیات ٹھاکر امر سنگھ کے باپ کی سیوا میں اپنی زندگی بیتا دی تھی۔ دروغ گوئی کا کوئی عنصر بھی ان کے اندر موجود نہ تھا۔ عرصہ دراز سے رام کو وہ جانتا تھا لیکن اب اسے رامو کی ذہنی حالت پر کچھ کچھ شک سا ہونے لگا تھا۔ اس نے ابھی تک رامو کی طرف نہیں دیکھا تھا لیکن وہ مکمل طور پر پرسکون ہو چکا تھا۔

"دیکھا مہیش ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔" رتن لال نے مہیش کی حمایت کرتے ہوئے کہا۔

"رامو نے ضرور کوئی برا سپنا دیکھا ہوگا۔ ممکن ہے کام کی زیادتی کے باعث اس کی آنکھ لگ گئی ہو۔ اور اس نے سپنے میں کوئی ایسا منظر دیکھا ہو۔ اگر یہ سب کچھ حقیقت ہوتا تو بھلا اتنی جلدی آگ کیسے بجھ سکتی تھی۔ ایک ساتھ سارے کھیتوں میں آگ لگ

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

جانا سوائے سپنے کے اور کچھ نہیں ہوسکتا۔"

"نن..... نن..... نہیں نہیں..... بھگوان کی سوگند کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے..... میں نے کوئی سپنا نہیں دیکھا بلکہ یہ سب کچھ حقیقت تھی۔" رامو نے اپنی صفائی میں کہا۔

"رامو تم چنتا مت کرو۔" مہیش نے رامو کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"منش تو خطا کا پتلا ہوتا ہے۔ ہم کون سا دودھ کے دھلے ہیں۔ ہر منش اپنی زندگی میں کتنی ہی غلطیاں کر بیٹھتا ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ تم نے ٹھاکر صاحب سے دروغ گوئی کی ہے۔ لیکن ممکن ہے تم نے کوئی بھیانک سپنا دیکھا ہو۔ آخر تم ایک محنتی انسان ہو۔ ٹھاکر صاحب کے ہاں جتنا کام تم ایمانداری اور محنت سے کرتے ہو اتنا کوئی بھی دوسرا ملازم نہیں کرتا۔ اس لیے ہوسکتا ہے کہ تمہیں پتہ نہ چلا ہو اور نیند کا جھونکا آیا ہو۔ تم نے کوئی سپنا دیکھا ہو۔"

"جب میں کہہ رہا ہوں کہ میں نے کوئی سپنا نہیں دیکھا تو آپ لوگ میری بات پر وشواس ہی نہیں کر رہے تھے اب تو وشواس ہوگیا ناں؟" رامو نے بازو کے کف سے آنسو صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

"رامو" رتن لال حیرت زدہ ہو کر بولا۔

"ٹھاکر صاحب یہ کوئی جادوئی کھیل دکھتا ہے مجھے۔ کسی نے تمہارے کھیتوں میں جادو ٹونہ کروادیا ہے۔ دیکھا کبھی آگ بھڑک اٹھتی ہے تو کبھی یوں لگتا ہے جیسے ان کھیتوں کو کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔"

"یقین نہیں ہو رہا یہ سب کچھ دیکھ کر۔" مہیش نے آنکھیں پھاڑ کر اس منظر کو تکتے ہوئے کہا۔

"ایسا کون ہوسکتا ہے جو ہمارے ساتھ دشمنی نکالے۔ ہم نے تو زندگی میں کبھی کسی کے ساتھ زیادتی تک نہیں کی؟" ٹھاکر امر سنگھ تھکے ہوئے لہجے میں بولا۔

ٹھاکر امر سنگھ کے لہجے سے بے بسی اور بے چارگی چھلک رہی تھی۔ ٹھاکر امر سنگھ یہی سمجھ رہا تھا کہ کہیں حقیقت میں اس کے کھیت جھل ہی نہ جائیں اور اب کی بار اپسا ہی ہوا۔ سارے کے سارے کھیت جل گئے تھے۔ ساری فصل کا ستیاناس ہوگیا تھا۔ ٹھاکر امر سنگھ کو کتنا ہی نقصان سہنا پڑا تھا۔ کتنے ہی دن اس کے پریشانیوں کی نذر ہوگئے۔ پھر تو جیسے یہ معمول ہی بن گیا تھا۔ وہ اپنے

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

کھیتوں میں جو بھی فصل بوتا تھا۔ جب وہ فصل اچھی طرح سے تیار ہوجاتی تو پلک جھپکتے میں رات کے اندھیرے میں اسے آگ لگ جاتی اور وہ جل کر بھسم ہوجاتی۔

ٹھاکر امر سنگھ کو کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ آخر اس کے ساتھ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ اس کا من چاہ رہا تھا کہ اپنی بے بسی پر بلک بلک کر رو دے۔ کوئی تو ہے جو اسے نیچا دکھانے کے لیے پر تول رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ ایک بار اس کے سامنے آجائے تو وہ اس کی تکہ بوٹی کر کے رکھ دے۔

اس شام بھی ٹھاکر امر سنگھ اپنے کھیتوں میں گیا تھا۔ اس نے کپاس کی فصل بوئی تھی جسے آگ نے جلا کر بھسم کر دیا تھا۔ حد نگاہ تک اس کے کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ ہر کس و ناکس ٹھاکر امر سنگھ کے غم میں برابر کا شریک تھا لیکن کوئی تو تھا جو اسے پس پشت دھوکہ دیئے جا رہا تھا۔ ممکن ہے وہ انہی میں سے ہو جو اس کے بہت زیادہ ہمدرد بنے ہوئے تھے۔ بہر حال بنا کسی وجہ کے وہ کسی پر الزام بھی تو نہیں تھوپ سکتا تھا۔

آج بھی اس کی حد نگاہ تک پھیلی فصل سر شام ہی جلا دی گئی تھی۔ ٹھاکر امر سنگھ کو پیہم نقصان پہ نقصان ہوئے جا رہا تھا۔ اب مزید نقصان سہنے کی اس میں ہمت نہ بچی تھی۔ وہ اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی اوپائے نکالنا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کوئی اس کی حیثیت چاٹ جانا چاہتا ہے۔ تبھی اس کے ذہن میں نہ چاہتے ہوئے بھی رتن لال اور مہیش کا خیال آیا۔ وہ بھی تقریباً اس کے جیسے ہی امیر زادے تھے۔ ان کے پاس بھی پیسے کی فراوانی تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہی اس کے پیروں تلے سے زمین کھینچ رہے ہوں۔ اسے اس بات پر وشواس تو نہیں ہو رہا تھا لیکن نجانے کیوں نہ چاہتے ہوئے بھی بار بار اس کا ذہن انہی دونوں کی طرف جا رہا تھا۔ جب وہ کسی مرحلہ خیز نتیجے پر نہ پہنچ پایا تو سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ عین اسی وقت اس کا منشی گروبندر اس کے پاس آیا۔ منشی گروبندر جانتا تھا کہ ٹھاکر امر سنگھ پے در پے ہونے والے نقصانات کی وجہ سے بہت زیادہ مضطرب ہے۔

"ٹھاکر صاحب۔" اس نے ٹھاکر امر سنگھ کے سامنے کھڑے ہو کر اسے پکارا۔ تو سر تھامے ٹھاکر نے اسے چونک کر دیکھا۔

"ہوں۔" ٹھاکر امر سنگھ نے پریشان کن لہجے میں اس کی طرف دیکھا۔

"چنتا مت کیجئے ٹھاکر جی۔" منشی گروبندر نے ٹھاکر امر سنگھ کی ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا۔

"میں نے ایک سادھو سے بات کی ہے۔ اس کے بارے میں بہت کچھ سنا ہوا تھا۔ اس نے آج شام حویلی میں آنا تھا۔ اسے میں نے سارا پتہ بتا دیا تھا۔ ممکن ہے وہ حویلی میں پہنچ چکا ہو۔ اگر آپ اجازت مرحمت فرمائیں تو میں اسے یہاں لے آؤں۔ جو کوئی بھی یہ سب کچھ کر رہا ہے دیکھنا اگر وہ سامنے نہ آجائے تو کہنا ٹھاکر جی۔ ان کے بارے میں بہت سی باتیں سنی ہیں۔ وہ بہت شکتی شالی سادھو ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" ٹھاکر امر سنگھ نے مختصر سا جواب دیا۔ اور دوسرے ہی لمحے منشی گروبندر ٹھاکر امر سنگھ کی اجازت سے اس کی گاڑی لیے ٹھاکر امر سنگھ کی عالیشان حویلی کی طرف چل دیا۔

ٹھاکر امر سنگھ پریشانی کے عالم میں ادھر ادھر چکر کاٹ رہا تھا۔ آگ بجھ چکی تھی لیکن ٹھاکر امر سنگھ کی پریشانی تھی کہ ختم ہونے کا نام تک نہ لے رہی تھی۔ ٹھاکر امر سنگھ کو سمجھ نہیں آرہی تھی کہ کون اس کے ساتھ یہ سب کچھ کر رہا ہے؟ جتنا اسے یاد تھا اس نے آج تک کسی کے ساتھ بھی جانے انجانے میں بھی کوئی زیادتی تک نہ کی تھی۔ پھر نجانے کون اور کیوں اس کے ساتھ یہ سب کچھ کر رہا تھا۔ وہ اس بات سے بھی آشنا تھا کہ یہ سادھو اور جادو گر وغیرہ سوائے پیسے بٹورنے کے اور کرتے کچھ نہیں لیکن ڈوبتے کو تنکے کا سہارہ کے موافق ٹھاکر امر سنگھ اس سادھو کو آزمانا چاہتا تھا۔ اس نے یہ بھی تہیہ کر لیا تھا کہ اگر اس سادھو نے پیسے بٹورنے یا کوئی ایسے ویسے تانے بانے میں الجھانے کی کوشش کی تو وہ اس کا سر تن سے جدا کر دے گا۔

انہی سوچوں میں غرق وہ کتنی ہی دیر منشی گروبندر اور اس کے ساتھ آنے والے سادھو کے انتظار میں چکر کاٹتا رہا۔ تبھی اس کو گاڑی کے ہارن کی بازگشت سنائی دی۔ وہ سرعت سے پاس پڑی چارپائی پر براجمان ہوگیا۔ اس کی نگاہیں پیہم گاڑی پر ہی جمی ہوئی تھیں۔ جلد ہی گاڑی ڈیرے کے باہر رکی اور منشی گروبندر کے ساتھ لمبی داڑھی والا میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس ایک عجیب ہی طرز کا انسان اترا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی ٹھاکر امر سنگھ کی نگاہیں اس سے ہٹ نہ پائیں۔ اس شخص کی آنکھوں میں نجانے کیا کشش تھی کہ ٹھاکر امر سنگھ اس سے نگاہیں نہ ملا پا رہا تھا۔

اس کے گلے میں ایک ساتھ کئی پتھروں کی مالائیں پڑی ہوئی تھیں۔ اس کے ہاتھوں کی انگلیاں مختلف نگینوں سے سجی انگوٹھیوں سے بھری ہوئی تھیں۔ ٹھاکر امر سنگھ نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی جگہ پر کھڑا ہوگیا۔ وہ سادھو اس کے عین سامنے آکر کھڑا ہوگیا اور بغور ٹھاکر امر سنگھ کو تکنے لگا۔ ٹھاکر امر سنگھ کو اس کا یوں ٹکٹکی باندھ کر تکنا کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ لیکن باوجود کوشش کے وہ اسے یوں تکنے سے روک نہ پا رہا تھا۔

"بیٹھیے مہاراج۔" منشی گروبندر نے خوشامدانہ لہجے میں اس سادھو سے کہا تو وہ بنا کوئی جواب دیئے چارپائی پر براجمان ہوگیا۔

ٹھاکر امر سنگھ اس کے سامنے والی چارپائی پر براجمان ہوگیا تھا لیکن باوجود کوشش کے وہ اس سے نگاہیں نہ ملا پا رہا تھا۔

"کسی نے غلط نہیں کہا کہ ماتا پتا کے کرموں کی سزا اکثر اولادوں کو ہی بھگتنا پڑتی ہے۔" اس سادھو نے ٹھاکر امر سنگھ کو متواتر تکتے ہوئے کہا۔

ٹھاکر امر سنگھ نے پہلی بار پرتشویش نگاہوں سے اسے دیکھا۔ سادھو نے اسے نظر انداز کرتے ہوئے منشی گروبندر کو ہاتھ کے اشارے سے وہاں سے چلے جانے کو کہا تو منشی گروبندر فوراً ہی وہاں سے کھسک گیا۔

"حالات کا مقابلہ کرنے کی بے شک تم میں ہمت ہے لیکن بلاوجہ دوسروں کو نردوشی مت سمجھو۔ یہ سب کچھ کیا کرنا تمہارے اپنوں کا ہی ہے۔ جو کچھ کرنا تھا وہ کر گئے لیکن بھگت تم رہے ہو۔"

سادھو ایک بار پھر گویا ہوا تو ٹھاکر امر سنگھ نے متواتر اسے پریشان کن نگاہوں سے گھورا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ یہ سادھو اسے کہنا کیا چاہتا ہے۔ بات کو سیدھی طرح کرنے کی بجائے تانوں بانوں میں الجھائے جا رہا ہے۔

"مہاراج آپ کو جو کچھ بھی کہنا ہے کھل کے کہیے۔" بالآخر ٹھاکر امر سنگھ نے تنگ ہو کر کہا۔

ٹھاکر امر سنگھ کی بات سن کر اس سادھو نے چہار سو نگاہ دوڑائی جیسے اطمینان کر لینا چاہتا ہو کہ ان دونوں کے علاوہ وہاں کوئی اور موجود نہیں ہے۔ جب اسے اچھی طرح سے یقین ہوگیا تو وہ ٹھاکر امر سنگھ کے مزید قریب ہوگیا اور سرگوشیانہ لہجے میں بولا:

"میں جو کچھ کہنے جا رہا ہوں اسے غور سے سننا۔"

ٹھاکر امر سنگھ نے اس کی بات سن کر ہاں میں سر ہلایا۔ تو وہ پھر گویا ہوا اور ایک لمبی کہانی سناتا گیا جس کا ہر لفظ ٹھاکر امر سنگھ کو حیرت کے سمندر میں غوطہ زن کرنے کے لیے کافی تھا۔ اسے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ سادھو جو کچھ کہہ رہا ہے وہ سب کچھ حقیقت پر مبنی ہے یا اس کی من گھڑت کہانی لیکن جو کچھ بھی تھا وہ ہمہ تن گوش سنے جا رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

"ٹھاکر جی۔" وریم دیش نے ٹھاکر کو مخاطب کیا تو اس نے چونک کر اسے دیکھا۔

ٹھاکر وجے سنگھ اپنی محل جیسی حویلی کے لان میں وہیل چیئر پر براجمان کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔ اس نے آنکھیں بند کی ہوئی تھیں اور چیئر کو پیہم جھلائے جا رہا تھا۔ جب یکبارگی اس کی سماعت سے وریم دیش کی بازگشت ٹکرائی تو اس نے چونک کر اسے کھا جانے والی آنکھوں سے گھورا۔ وریم دیش کو اپنی رگوں میں لہو منجمد ہوتا ہوا دکھائی دینے لگا۔

"کہو کیا بات ہے؟" ٹھاکر وجے سنگھ نے ناگواری سے پوچھا۔

"ٹھاکر جی ہماری پتنی کی طبیعت اچانک ہی بہت زیادہ خراب ہوگئی تو تھوڑی دیر کے لیے....." ابھی وریم دیش نے اتنا ہی کہا تھا کہ ٹھاکر نے اسے ٹوک دیا۔

"تو کیا تھوڑی دیر کے لیے؟" ٹھاکر وجے سنگھ نے تقریباً دھاڑتے ہوئے پوچھا تو وریم دیش کے پسینے چھوٹ گئے۔

اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ ٹھاکر وجے سنگھ کو کیا جواب دے۔ وہ ٹھاکر وجے سنگھ کے غضب سے آشنا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ٹھاکر وجے سنگھ ملازموں کی چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر مار مار کر ان کا کچومر نکال دیتا تھا۔ اس کے سینے میں دل نہیں پتھر تھا۔ احساس نام کی کوئی چیز جیسے اس کے اندر تھی ہی نہیں۔

"تنخواہ حرام خوری کی لیتے ہو..... جس وقت دیکھو کوئی نہ کوئی بہانہ لے کر آجاتے ہو..... کبھی کسی کی ماں بیمار ہے تو کسی کا باپ مر رہا ہے..... کسی کی پتنی کی طبیعت خراب ہے تو کسی کی اولاد مرنے کے قریب ہے..... جا دفع ہو جا اور کام کر دوبارہ میری طرف آیا مار مار کر بھرکس نکال دوں گا۔"

ٹھاکر وجے سنگھ کی بات سن کر وریم دیش خون کے آنسو پی کر رہ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ ٹھاکر وجے سنگھ سے مزید بات کرنا خود کو مصیبت میں ڈالنے کے موافق ہے۔ چار و ناچار اسے وہاں سے کھسکنا پڑا تھا۔ اسے کام کرتے ہوئے تھوڑی ہی دیر بیتی تھی کہ اسے پتہ چلا کہ طبیعت زیادہ خراب ہونے کی وجہ سے اس کی پتنی سورگ باش ہوگئی ہے۔ اس کے قدموں تلے سے زمین سرک گئی۔ اسے ٹھاکر وجے سنگھ پر شدید تاؤ چڑھ رہا تھا۔

اس نے اسی وقت کام وہیں چھوڑا اور ٹھاکر وجے سنگھ سے بنا اجازت لیے گھر کی اور چل دیا۔ ٹھاکر وجے سنگھ کو جب اس بات کا علم ہوا تو غصے سے آگ بگولہ ہو کر رہ گیا۔ ایک دو نکمے کے ملازم نے اس سے اجازت تک لینا گوارہ نہ کی تھی۔ اس نے اسی وقت اپنی لمبی نال والی بندوق اٹھائی اور گاڑی میں بیٹھ کر وریم دیش کے گھر کی اور چل دیا۔

وریم دیش کی صرف ایک بیٹی تھی۔ وہ بھی جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکی تھی۔ حسن تو جیسے اس پر ٹوٹ کر برسا تھا۔ اس کے کتنے ہی طلبگار تھے لیکن وریم دیش کے پاس بیٹی کے ہاتھ پیلے کرنے کے لیے پائی تک نہ تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ بیٹی کو بیاہ گھر جلدی بھیجے لیکن جو بھی اسے دیکھنے آتا تھا ساتھ میں جہیز کی لمبی رسید بھی لکھ کرا لاتا تھا۔ بیٹی کو بیاہنے کی خواہش ایک سپنا ہی بن کر رہ گئی تھی۔ دوسری طرف وریم دیش کی بیٹی سولیتا ایک باعزت لڑکی تھی۔ گھر سے باہر وہ قدم نہ رکھتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ معاشرے میں کتنا بگاڑ پیدا ہو چکا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اگر عورت کی عزت ایک بار مٹی میں مل جائے تو پھر دوبارہ وہ کبھی باعزت نہیں بن پاتی۔ اسے اپنی خوشیوں سے زیادہ اپنے والدین پیارے تھے۔ وہ اپنے والدین پر جان نچھاور کرتی تھی۔ اپنے والدین سے علیحدہ ہونے کا تصور ہی اس کے لیے مرغِ بسمل کی طرح تھا۔

وریم دیش اس وقت اپنی پتنی کی لاش کے پاس بیٹھا اپنی بیٹی کو سینے سے چپکائے دھواں دھار رو رہا تھا جب ٹھاکر وجے سنگھ اس کے گھر میں داخل ہوا۔ محلے کی کچھ عورتیں رسمی طور پر وریم دیش کے میں مجتمع ہوگئی تھیں۔ جوان کے غم میں برابر کی شریک تھیں۔ ٹھاکر وجے سنگھ نے اندر داخل ہوتے ساتھ ہی سب کو وہاں سے کھسک جانے کا اشارہ کیا تو یکے بعد دیگرے وہ سب وہاں سے کھسک گئیں۔ وریم دیش نے کھا جانے والی آنکھوں سے ٹھاکر وجے سنگھ کو گھورا۔

"ٹھاکر وجے سنگھ۔" وریم دیش نے اسے دانت پیستے ہوئے مخاطب کیا تو ٹھاکر، وریم دیش کو پھٹی پھٹی نگاہوں سے گھورنے لگا۔

"تو اتنا بڑا خبیث ہے کہ دنیا میں تجھ سے زیادہ بڑا کوئی خبیث نہیں ہوگا..... دیکھ اسے پتنی کی لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے..... اگر تو مجھے آنے دیتا تو ممکن ہے میں اسے ہسپتال تک لے

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

جاتا اور شاید..... شاید یہ بچ جاتی لیکن..... لیکن تجھ کمینے کی وجہ سے یہ ابدی نیند سو گئی ہے۔"

ٹھاکر وجے سنگھ ویرم دیش کی بات سن کر غصے سے پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ اسے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ اس کا ایک دو ٹکے کا نوکر اسے اس انداز میں مخاطب کر سکتا ہے۔ قبل اس کے ویرم دیش مزید بات جاری رکھتا۔ ٹھاکر کے ہاتھ میں پکڑی بندوق نے آگ اگلی اور ویرم دیش زمین پر گر کر تڑپنے گا۔ جلد ہی وہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ سولیتا اپنے پتا کی میت سے چپک گئی۔

"پتا جی..... پتا جی آنکھیں کھولو..... بھگوان کے لیے آنکھیں کھولو پتا جی۔" سولیتا دھواں دھار رو بھی رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ ویرم دیش کے مردہ جسم کو ہلا بھی رہی تھی۔

"واہ رے ویرم دیش تو نے کیسا گوہر ہائے آبدار گھر میں چھپا کر رکھا تھا۔" ٹھاکر وجے سنگھ نے شیطانیت بھرے انداز میں دل ہی دل میں کہا۔

دوسرے ہی لمحے ٹھاکر وجے سنگھ نے آگے بڑھ کر سولیتا کو ہاتھ سے پکڑ کر اپنی اور کھینچ لیا۔ سولیتا اس سب کے لیے تیار نہ تھی۔ وہ یکدم اپنی جگہ سے تقریباً فضا میں اچھلی اور اس کے سنبھلنے تک ٹھاکر وجے سنگھ اسے اپنے سینے سے چپکا چکا تھا۔

"چھوڑ مجھے خبیث انسان۔" سولیتا نے اس کی گرفت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیئے۔

"تیری کسی بھی بات کا میں غصہ نہیں کروں گا۔ آج تو تجھے مجھ سے دنیا کی کوئی بھی طاقت چھڑا نہیں پائے گی۔" ٹھاکر وجے سنگھ اس کی بات سن کر شیطانیت بھرے انداز میں مسکراتے ہوئے کہا اور اسے کھینچتا ہوا باہر کھڑی اپنی گاڑی کی طرف لے آیا۔

گاؤں والے باہر مجتمع تھے جو ٹھاکر وجے سنگھ کے ایک ہاتھ میں بندوق اور دوسرے میں سولیتا کو دیکھ کر ٹھاکر وجے سنگھ کی نیت بھانپ گئے تھے۔ کوئی بھی سولیتا کی مدد کے لیے آگے نہ بڑھا کیونکہ وہ سب جانتے تھے کہ ایسا کرنے کا انجام کیا ہو سکتا ہے۔ ٹھاکر وجے سنگھ ان سب کے سامنے سولیتا کو پکڑ کر لے گیا وہ بے چاری اپنی آبرو بچانے کے لیے ان سب کو پکارتی رہ گئی لیکن ان نامردوں میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا جو اس کی مدد کے لیے آگے بڑھتا۔ جیسے ہی ٹھاکر کی گاڑی آنکھوں سے اوجھل ہوئی سب لوگ پلک جھپکتے میں دوڑ کر ویرم دیش کے گھر کے اندر داخل ہوئے لیکن اگلا منظر دیکھ کر سب کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی۔

ٹھاکر وجے سنگھ سولیتا کو لیے سیدھا اپنے ڈیرے پر جا پہنچا۔ وہ جانتا تھا کہ سولیتا کو گھر لے جانا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ اس کی بنتی قیامت برپا کر دیتی۔ اس کے کھیت حد نگاہ تک پھیلے ہوئے تھے۔ جس وقت ٹھاکر وجے سنگھ ڈیرے پر پہنچا اس وقت اس کے دو نوکر ڈیرے پر موجود تھے جو ٹھاکر کے ساتھ ایک نہایت ہی حسین و جمیل دوشیزہ کو دیکھ کر گنگ رہ گئے تھے۔ وہ ٹھاکر کی نیت سے بخوبی آشنا تھے۔ بے شک اس سے قبل ٹھاکر وجے سنگھ نے ایسی کوئی حرکت نہ کی تھی۔ پہلے تو اس کا ظلم صرف اپنی رعایا پر ظلم و ستم پر ختم ہو جاتا تھا لیکن اب تو اس نے رعایا کی عزتوں کی پامالی شروع کر دی تھی۔ وہ پیہم اسے گھورے جا رہے تھے۔

"اے کیا منہ اٹھائے کھڑے ہو۔ جاؤ اور کھیت میں اندر جا کر ایک گہرا گڑھا کھودو۔" ٹھاکر وجے سنگھ نے تحکمانہ لہجے میں کہا تو دونوں اس کی بات سن کر حیران و ششدر رہ گئے۔

لیکن دونوں کے اندر اتنی جسارت نہ تھی کہ اس گڑھے کے کھودنے کی وجہ معلوم کر سکیں۔ دونوں سرعت سے اوزار اٹھائے کھیت کی طرف دوڑے اور گڑھا کھودنا شروع کر دیا۔ کتنی ہی دیر تک ان کی سماعت سے سولیتا کی چیخوں کی بازگشت ٹکراتی رہی۔ ان کا ضمیر انہیں ملامت کرتا رہا لیکن موت کے خوف نے ان کے جیسے پیروں میں زنجیریں ڈال دی تھیں۔ وہ چاہ کر بھی کچھ نہ کر پا رہے تھے۔ بالآخر انہوں نے ٹھاکر کو باہر نکلتے دیکھا جس نے اس حسین و جمیل دوشیزہ کو کپڑوں سے عاری کیا ہوا تھا۔ وہ حسین و جمیل

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

دوشیزہ نیم بے ہوشی کی حالت میں تھی۔ اس کی حالت زار پر دونوں کو رونا آ رہا تھا۔ ٹھاکر وجے سنگھ نے اسے دائیں بازو سے پکڑا ہوا تھا اور پیہم دھکیلتا ہوا یوں لیے آ رہا تھا جیسے وہ کوئی فالتو چیز ہو۔

دونوں کم و بیش دس فٹ گہرا اور سات فٹ لمبا گڑھا کھود چکے تھے۔ ٹھاکر نے سولیتا کو اچھال کر زور سے اس گڑھے کے اندر پھینکا تو سولیتا کے منہ سے درد کی شدت کے باعث سماعت شکن چیخیں نکلیں۔ دونوں نے حیرت کے بت بن کر ٹھاکر وجے سنگھ کو سوالیہ نگاہوں سے گھورا۔

"میرے منہ پر کیا لکھا ہے جلدی کرو مٹی ڈالو اس کمینی پر۔" ٹھاکر وجے سنگھ نے دھاڑتے ہوئے کہا تو دونوں اس کی بات سن کر انگشت بدنداں رہ گئے۔

"ٹھاکر صاحب یہ آپ....." ان میں سے ایک نے ٹھاکر وجے سنگھ کی بات سن کر اسے مخاطب کیا تو ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر پڑا۔

دوسرے نے آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً ہی مٹی ڈالنا شروع کر دی۔ سولیتا ان سے زندگی کی بھیک مانگتی رہی لیکن ٹھاکر وجے سنگھ ان کے سر پر موت کی پرچھائی بن کر کھڑا تھا۔ انہیں اپنی زندگی کی چنتا ہوئے جا رہی تھی۔ سولیتا کے لیے ان کے قلب و ذہن میں نرمی کے تاثرات عیاں ہوئے تھے لیکن وہ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ تبھی سولیتا کو انہوں نے منوں مٹی تلے دبا دیا۔

"یاد رکھنا اگر کسی کو بھنک بھی پڑی تو تم دونوں کو بھی اسی طرح دبوا دوں گا۔ تمہارے پچھلے ساری زندگی بھی ڈھونڈتے رہے تو تم دونوں کو نہیں ڈھونڈھ پائیں گے۔" ٹھاکر کی دھمکی نے ان دونوں کے ہوش اڑا دیئے تھے۔ دونوں کا دل کر رہا تھا کہ بلک بلک کر رو دیں لیکن رونے سے کچھ ہونے والا نہیں تھا۔ یوں ایک لمبا عرصہ گزر گیا اور یہ واقعہ سب کی یادداشت سے ماند پڑ گیا۔ سولیتا کے والدین کو جہاں منوں مٹی تلے دبا دیا گیا تھا۔ وہاں کسی میں اتنی جسارت نہ پیدا ہو پائی تھی کہ کوئی اس کے خلاف کسی کو بتا سکے۔ ہر کس و ناکس

مشعل راہ

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جو کوئی بندہ کسی دوسرے بندے کی پردہ پوشی کرتا ہے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی پردہ پوشی فرمائیں گے۔ (صحیح مسلم)

حضرت عقبہ بن عامرؓ روایت کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "جو شخص کسی کا کوئی عیب دیکھے اور اسے چھپا لے تو اس کا یہ عمل ایسا ہے جیسے کوئی زندہ درگور کی جانے والی لڑکی کو بچا لے۔" (ابوداؤد)

حضرت ابو مسعود انصاریؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جو شخص کسی نیک کام کی طرف کسی کی رہنمائی کرے، اس کو اتنا ہی ثواب ملے گا جتنا اس کے کرنے والے کو ملے گا۔" (صحیح مسلم)

حضرت ابو الدرداؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جس کسی شخص کے جسم کو کوئی تکلیف پہنچائی جائے اور وہ اس کو معاف کر دے تو اللہ تعالیٰ اس کا درجہ بلند فرما دیتے ہیں اور اس عمل کی وجہ سے اس کے گناہ بھی معاف فرماتے ہیں۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "اللہ تعالیٰ نرمی کا معاملہ کرنے والے ہیں اور نرمی کے معاملے کو پسند فرماتے ہیں اور نرم خوئی پر وہ اجر عطا فرماتے ہیں۔" (صحیح مسلم)

(پرنس بابر علی خان رند بلوچ - ساہیوال)

کے دل و دماغ پر ٹھاکروجے سنگھ کو خوف چھایا ہوا تھا۔ ٹھاکر سے دشمنی مول لینے کا کوئی رسک نہ لے رہا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اگر انہوں نے منہ کھول بھی دیا تو دوسرے دن ٹھاکروجے سنگھ حوالات سے باہر آجائے گا اور پھر ان کو تہس نہس کر کے رکھ دے گا۔

ایک لمبا سمے بیت گیا۔ ایک شام ٹھاکروجے سنگھ کے دل پر عجیب سا بوجھ بیٹھ گیا۔ اسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ آخر اس کے ساتھ ہو کیا رہا ہے۔ کتنی ہی دیر تک وہ کھلی فضا میں ٹہلتا رہا لیکن اس کے قلب بے قرار کو قرار میسر نہیں آرہا تھا۔ اس کا من چاہ رہا تھا کہ کہیں دور کسی ایسی پرسکون جگہ چلا جائے جہاں اس کا من لگے۔ اس کے قلب پر پڑا بوجھ ہٹ جائے لیکن اسے کوئی اوپائے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کتنی ہی دیر تک ٹھاکروجے سنگھ ادھر ادھر ٹہلتا رہا اور بالآخر جب رات کے سائے گہرے ہو گئے تو وہ اپنے کمرے میں آگیا۔

بستر مرگ پر لیٹتے ہی نیند کی دیوی اس پر مہربان ہو گئی۔ اس کے دل پر دھرا بوجھ یک لخت ہی ختم ہو گیا اور ٹھاکروجے سنگھ کو اتنا سکون ملا کہ اتنا سکون اسے تازیست نہ ملا ہو۔ مگر وہ کہاں جانتا تھا کہ یہ آخری سکون ہے۔ اس کے بعد اس کی آتما ہمیشہ کے لیے نرک میں جلے گی۔

ابھی ٹھاکروجے سنگھ کو سوئے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ اچانک اس کے منہ پر کسی نے اتنی زور سے تھپڑ مارا کہ خواب خرگوش کے مزے لوٹتے ٹھاکر کے منہ سے گھٹی گھٹی سی چیخ نکلی۔ عین اسی وقت اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے جلدی سے اٹھ کر مشعل روشن کی۔ اسے اپنے گال پر بہت زیادہ تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے ابھی کے ابھی اس کے گالوں سے گوشت گر جائے گا۔ جب تکلیف حد سے زیادہ بڑھی تو وہ سرعت سے قدآدم آئینے کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا لیکن یہ دیکھ کر اس کی حیرت ہویدا ہو گئی کہ اس کے گال پر نہ تو کوئی زخم کا نشان تھا نہ ہی کوئی اور تاثرات مگر اسے پیہم یہ لگے جا رہا تھا کہ اس کے منہ کا گوشت نیچے کی طرف سرک رہا تھا۔ شدت [illegible] کے باعث اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

اس کا داہنا ہاتھ داہنے گال پر موجود تھا۔ [illegible] لخت اس نے ایک نہایت ہی بھیانک اور نا قابل [illegible] منظر دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ اس دیو قامت آ[illegible] اس کے پیچھے کوئی دوشیزہ کھڑی ہے۔ جس [illegible] بکھرے بالوں نے اس کے چہرے کو پوری طرح [illegible] ڈھکا ہوا تھا۔ اس کے بال اس کے چہرے [illegible] یوں جھوم رہے تھے جیسے بدمستی کے عالم میں [illegible] جھومتا ہے۔

ٹھاکروجے سنگھ کو اپنی بینائی پر وشواس [illegible] رہا تھا۔ اس نے فوراً ہی پلٹ کر دیکھا تو [illegible] حواس باختہ ہو گئے کہ اس کے پیچھے کوئی [illegible] حیرت ہویدا ہو گئی تھی۔ اسے یقین نہیں [illegible] جو کچھ اس نے دیکھا ہے وہ سب کچھ اس [illegible] کا دھوکہ ہے۔ بھلا وہ سب کچھ نظروں کا [illegible] ہو سکتا ہے۔ اسے اپنے پیچھے مترنم [illegible] دکھائی دی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس [illegible] بار پھر اس آئینے میں دیکھا۔ اگلا منظر [illegible] اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس [illegible] گئی۔ وہ دوشیزہ متواتر اپنی جگہ پر [illegible] بار اس کے چہرے کو بالوں نے ڈھکا [illegible] اس کا معصوم چہرہ اس کے سامنے تھا۔ اس [illegible] پر غصے کے تاثرات عیاں تھے۔ اس دوشیزہ [illegible] میں اسے اپنے لیے نفرت کے سلگتے [illegible] رہے تھے۔ ٹھاکروجے سنگھ اس دوشیزہ کو [illegible] کے سمندر میں غوطہ زن ہو گیا۔ اس نے [illegible] سے پہلے بھی دیکھی تھی لیکن کہاں......؟

اس سوال نے اسے سوچنے پر مجبور کر [illegible] اسے یاد آیا کہ اس دوشیزہ کو اس نے کہاں [illegible] کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ وہ کوئی اور نہیں سولیتا [illegible] وہی سولیتا جس کی عزت لوٹنے کے [illegible] اپنی آنکھوں کے سامنے اسے [illegible]

[illegible] ہو گئی تھی؟ کہیں اس کے [illegible] دھوکہ تو نہیں دیا تھا۔ اس کی [illegible] اس گڑھے سے نکالا ہو اور اس کی [illegible] جہاں ٹھاکروجے سنگھ سولیتا کو اپنے [illegible] کے سمندر میں غوطہ زن تھا وہیں [illegible] بھی چڑھ رہا تھا جنہوں نے [illegible] نمک حرامی کی تھی۔ نمک حرامی کی [illegible] تھی۔ ٹھاکروجے سنگھ کے پاس [illegible] اور صرف موت تھی۔

[illegible] سے پیچ وتاب کھا کر آناً فاناً [illegible] اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ [illegible] میں دھڑکتا دل پسلیاں توڑ کر [illegible] نے لگا۔ اسے اپنی بینائی پر وشواس [illegible] اس لڑکی کو دوبارہ بھی اس نے [illegible] وہ اس کے پیچھے موجود نہ [illegible] اسے یقین ہو گیا تھا کہ ضرور دال [illegible] اتنی جلدی کوئی بھی نگاہوں سے اوجھل [illegible] جگہ اس نے [illegible] کوئی ایسی چیز بھی نہ تھی کہ جس [illegible]

[illegible] پیشانی عرق آلود ہو چکی [illegible] کی روانی بے ترتیب ہونے لگی تھی۔

[illegible] بھاری کمرے کی سکوت زدہ [illegible] تو ٹھاکروجے سنگھ چونک اٹھا۔ [illegible] چاروں طرف دیکھا لیکن اسے [illegible] دی۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آرہی [illegible] ساتھ آخر ہو کیا رہا ہے۔ سولیتا آئینے [illegible] تو ظاہر میں کہیں دکھائی نہیں [illegible] کہ اس مری ہوئی لڑکی کی آتما اس [illegible]

[illegible]

[illegible] کمرے کی خاموش فضا میں لڑکی کی [illegible] سنگھ کو اپنا حلق سوکھتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ ٹھاکروجے سنگھ کا شریر بری طرح سے وائبریٹ کر رہا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے ابھی کے ابھی اس کی آتما اس کے جسم سے پرواز کر جائے گی۔

''تمہارے مرنے کا وقت آن پہنچا ہے۔''

اب کی بار کمرے میں گونجنے والی آواز نے ٹھاکروجے سنگھ کے پیروں تلے سے زمین کھینچ لی۔

بے شک وہ ٹھاکروں کے خاندان سے تھا۔ جس خاندان میں ڈر نام کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔ وہ خاندان جو شروع سے ہی ہندو دھرم کا عظیم خاندان تصور کیا جاتا رہا۔ حکمرانی جس کے سر کا تاج سمجھی جاتی تھی۔ لیکن موت کے لفظ نے ٹھاکروجے سنگھ کی سٹی گم کر دی تھی۔

ٹھاکروجے سنگھ پڑھا لکھا انسان تھا۔ اس نے کتنے ہی اچھے اچھے ادیبوں کی کتابیں پڑھی تھیں۔ ہر قسم کی کتابوں میں اس نے خوفناک کہانیوں کی کتابیں بھی پڑھی تھیں جس میں اس نے یہ بھی پڑھا تھا کہ آتمائیں انسان کا پیچھا اس وقت تک نہیں چھوڑتیں جب تک اسے ابدی نیند نہ سلا دیں۔ یہی نہیں ایسی آتما تو نرک میں بھی انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتی جس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہو۔ زیادتی کرنے والے منش کو وہ ایسی موت دیتی ہیں کہ اس کی آتما نرک میں بھی اس آتما سے خوف کھاتی پھرتی ہے۔

دوسرے ہی لمحے ٹھاکروجے سنگھ کا شریر خود بخود فضا میں معلق ہوا اور دھڑام سے فرش پر جا گرا۔ ٹھاکر وجے سنگھ کی آنکھوں کے آگے تارے ناچنے لگے تھے۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے لیکن وہ اتنا جان چکا تھا کہ اس کی موت ہونے والی ہے۔ وہ آتما اس سے انتقام لینے پر تل چکی ہے۔

''پھر اس آتما نے رات کے سمے میں ہی ٹھاکر وجے سنگھ کی ہتھیا کر دی۔'' سادھو اتنی کہانی سنانے کے بعد چپ ہو گیا جبکہ اس کی کہانی سننے کے بعد ٹھاکر امر سنگھ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

''اس آتما کا شریر انہیں کھیتوں میں دفن ہے۔ جب تک اس کے شریر کو نکال کر اس کی چتا کو آگ نہ لگائی جائے اس کی آتما کو شانتی ملنا ممکن نہیں ہے۔''

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

''میں نے کبھی تخیل میں بھی پتاجی کے بارے میں ایسا نہیں سوچا تھا۔'' ٹھاکر امر سنگھ نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا تو سادھو نے اس کی بات سن کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

''ٹھاکر پتر ایسے مت سوچو۔'' سادھو نے اس کی ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا۔

''کوئی بھی منش کسی بھی وقت بہک سکتا ہے۔ تمہارے پتا نے پاپ کیا کہ لوگوں کو ابدی نیند سلا دیا لیکن اب تمہیں اپنے پتا کے گناہوں کو یاد کرنے کی بجائے ان کی آتما کی شانتی کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔ انہوں نے جو کچھ بویا وہ اس کا پھل کاٹ رہے ہیں۔ اب تمہیں ان کی آتما کو شانتی بخشنے کے لیے اس بھٹکی آتما کا کوئی اوپائے کرنا ہے۔''

''ہوں۔'' ٹھاکر امر سنگھ نے سادھو کی بات سن کر سر ہلاتے ہوئے اس کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے جواب دیا۔

''ہمیں کیا کرنا ہوگا؟''

''ابھی اور اسی وقت اس جگہ کو کھدوانا ہوگا جہاں اس آتما کا شریر دفن ہے۔ بے شک برسوں گزر جانے کے بعد اس کے آثار ملنا بھی ممکن نہیں ہیں لیکن پھر بھی ہمیں اس کی بچی کھچی ہڈیوں کو بھی شمشان گھاٹ میں جا کر نذر آتش کرنا ہوگا۔ تبھی اس آتما کو شانتی ملے گی اور تبھی وہ تم کو بھی شانتی سے جینے دے گی۔''

''ٹھیک ہے۔'' ٹھاکر امر سنگھ نے جواب دیا اور منشی گروبندر کو پکارا۔

منشی گروبندر جو باہر گاڑی کے پاس کھڑا کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔ ٹھاکر امر سنگھ کی آواز اس کی سماعت سے کیا ٹکرائی۔ وہ چونکا اور تقریباً بھاگتے ہوئے اس کے سامنے آن پہنچا۔

''جی ٹھاکر صاحب؟'' منشی گروبندر نے آتے ساتھ ہی پوچھا۔

''دو چار ملازموں کو بلا کے لاؤ اور اوزار بھی لیتے آنا، زمین کی کھدائی کرنی ہے۔'' ٹھاکر امر سنگھ نے تحکمانہ لہجے میں کہا تو منشی گروبندر ''جی ٹھاکر صاحب'' کہتا ہوا وہاں سے کھسک گیا۔

کتنی ہی دیر کھدائی ہوتی رہی۔ اور پھر یکدم ایک ملازم کی کسی چیز سے ٹکرائی تو وہ چونک اٹھا۔

''یہاں کچھ ہے۔'' اس ملازم نے اونچی آواز میں کہا۔

''آرام سے کھدائی کرو۔'' ٹھاکر امر سنگھ نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

تین ملازم پیہم کھدائی کر رہے تھے۔ ٹھاکر امر سنگھ نے صرف انہیں اتنا ہی بتایا تھا کہ کسی نے ان کے کھیتوں میں کسی کا شریر دبا دیا ہے۔ سادھو نے اپنے منتروں کے زور سے اس کا پتہ لگایا ہے۔ جب تک اسے یہاں سے نکال کر نذر آتش نہ کیا جائے اس وقت تک ان کھیتوں میں ہریالی نہیں آسکتی۔ اصل بات ٹھاکر امر سنگھ نے منشی گروبندر سے بھی چھپالی تھی۔

جلد ہی تینوں ملازموں نے ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ باہر نکال لیا۔ سادھو کے کہنے پر اسے شمشان گھاٹ لے جا کر نذر آتش کر دیا گیا۔ اس دن کے بعد کبھی بھی ٹھاکر امر سنگھ کے کھیتوں میں کوئی نقصان نہیں ہوا۔ بے شک ٹھاکر وجے سنگھ اس کا پتا تھا لیکن اندر ہی اندر اسے اپنے پتا کے اس کام کی وجہ سے افسوس تھا۔ وہ اپنے پتا کو دنیا کا مہان پتا گردانتا تھا لیکن جب اس کے پتا کی اصلیت اس کے سامنے کھل کر آئی تو اسے اپنی سوچ پر افسوس ہونے لگا۔

ٹھاکر امر سنگھ پہلے سے بھی زیادہ احساس مند انسان بن گیا تھا۔ وہ اپنے ملازموں کے ساتھ خود مل کر کام کرتا تھا۔ اس نے کبھی بھی اپنے اور ملازموں کے درمیان کوئی فرق روا نہ رکھا تھا۔

عاجزی انسان کو سب کی نظروں میں بلند کر دیتی ہے جبکہ غرور و تکبر انسان کی شناخت بھی ختم کر دیتا ہے۔ مغرور انسان کو لوگ جلد بھلا دیتے ہیں لیکن اچھے، احساس مند اور عاجز بندے کو تا قیامت نہیں بھلایا جا سکتا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

لال جوڑا

سنبل عروج طٰہٰ - راولپنڈی

ٹورسٹ وین آگے نکل چکی تھی اور علاقے کی ویرانیت اور پراسراریت انہیں الوداع کہہ رہی تھی دو منزلہ مکان پر دونوخیز لڑکیاں کھڑی مسکرا رہی تھیں مگر تعجب کی بات یہ تھی کہ وہ دونوں لڑکیاں سیکڑوں سال پہلے مرچکی تھیں۔

کیا یہ حقیقت ہے کہ مرنے والے کو زیادہ یاد کیا جائے تو یاد کرنے والے کو مرنے والا اپنے ساتھ لے جاتا ہے

کالی رات کو بھیڑیے کی آواز مزید خوفناک بنا رہی تھی۔ چرند پرند بھیڑیے کی آواز سے سہم سے گئے تھے۔ حتیٰ کہ چاند بھی بادلوں میں جا چھپا تھا۔ ہرے بھرے درخت نیند میں جیسے سر جھکائے افسردہ تھے۔

اماوس کی رات میں وہ دیوہیکل گھر اور بھی خوفناک لگ رہا تھا۔ اس کے باسی نیند کی وادیوں میں گم تھے، اس بات سے قطع نظر کہ سب سے اوپر فلور کے ٹیرس پر اسی گھر کی ایک نازک سی مکین، رات کے اس پراسرار منظر میں ڈوبی ہوئی تھی، رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی اور وہ دونوں ہاتھ ریلنگ پر ٹکائے جانے کہاں کھوئی ہوئی تھی۔ سرد ہوا اس کے شانوں تک آتے بالوں کو دائیں سے بائیں لہرا رہی تھی۔ اسے وقت گزرنے کا جیسے احساس تک نہ تھا۔ اور پھر وہ اپنے بستر پر لیٹ گئی تو نیند کی دیوی نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

پرتیبھا بٹیا اٹھ بھی جاؤ اور کتنا سونا ہے، ناشتہ تیار ہے۔" شنکر کاکا کب سے دروازہ ناک کررہے تھے لیکن اندر سے جواب ندارد تھا، شنکر کاکا مایوس ہوکر لوٹنے لگے تو کنڈی سرکنے کی آواز آئی۔

نیلی پنک کلر کی خوب صورت باریک نائٹی میں وہ اور بھی پیاری لگ رہی تھی۔ شانوں پر موجود بال آپس میں الجھے ہوئے تھے۔ سبز آنکھوں میں چھائی نیند پوری نہ ہونے کی چغلی کھا رہی تھی۔ چہرے پر بھی تھکن کے آثار تھے۔ پاؤں، جوتوں سے مکمل طور پر آزاد تھے۔

"تم رات بھر نہیں سوئی بٹیا؟" شنکر کاکا متفکر ہوئے۔

"اب کون سوسکتا ہے کاکا۔" وہ لاپرواہی سے کہتی کمرے سے باہر نکل آئی اور ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ گئی۔

"ایسا مت کرو بٹیا، اشوک صاحب کی آتما کو سکون نہیں ملے گا۔" شنکر کاکا کپ میں گرم چائے انڈیلنے لگے پھر اچانک ہی چونک گئے۔

"سلائس کہاں گئے؟ ابھی تو پلیٹ لاکے رکھی تھی یہیں۔" خودکلامی کرتے ہوئے وہ دوبارہ کچن میں چلے گئے۔

پرتیبھا اپنے دونوں ہاتھوں میں سر تھامے بیٹھی تھی کہ اچانک اسے اپنے بالوں پر کسی کے لمس کا احساس ہوا، چونک کر سر اٹھایا تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

لائٹ فرائنڈ سلائس کی پلیٹ ہاتھوں میں تھامے جب شنکر کاکا لوٹے تو پرتیبھا کو نہ پاکر سخت حیران ہوئے، حیرت کا شدید جھٹکا تو انہیں تب لگا جب ڈائننگ ٹیبل پر ایک کے بجائے دو کپوں میں چائے پڑی تھی، جیسے عموماً لوگ چائے پی کر باقی تھوڑی سی، کپ کے پیندے میں بچا دیتے ہیں۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے دو لوگ یہاں سے چائے پینے کے بعد اٹھ کر گئے ہوں۔

"دوسرا کپ آیا کہاں سے؟" شنکر کاکا کے ماتھے پر سلوٹ ابھر آئی مگر اچانک ہی ٹیبل کے سینٹر پر نظر پڑتے ہی جیسے سارا کا سارا معاملہ حل ہوگیا ہو۔

ٹیبل کے سینٹر میں انتہائی قیمتی ٹی سیٹ ہر وقت پڑا رہتا۔ "پرتیبھا بٹیا کو چائے گرم لگی ہوگی، اسی لئے دو پیالیوں میں ٹھنڈی کرکے پی ہے۔" شنکر کاکا مسکراتے ہوئے کھڑکی کے پردے ہٹانے لگے۔ بھاری پردے ہٹتے ہی سورج کی روشنی چھن چھن کر اندر آنے لگی۔ اتنے میں ڈور بیل ہوئی اور شنکر کاکا دروازہ کھولنے چلے گئے، ٹیبل پر دونوں کپ جوں کے توں موجود تھے۔

بڑھتی عمر بھی نظر کو کمزور کرکے رکھ دیتی ہے۔ ستر برس کے شنکر کاکا اتنا بھی فرق نہ کرسکے کہ ٹیبل پر موجود، ان دو کپوں میں سے ایک کپ، جسے وہ گولڈن اور فیروزی رنگ کے ٹی سیٹ کا حصہ سمجھے تھے۔ اس کپ کا رنگ گولڈن اور فیروزی کے بجائے گولڈن اور لال تھا۔ "گولڈن اور لال" ان دو رنگوں کے امتزاج کا سیٹ ان کے پورے گھر میں کہیں نہیں تھا۔ کہیں بھی نہیں......

☆......☆......☆

"کی سمجھائیے سجنا، ایہنا نین کملیا نوں......

کہندے تینوں دیکھے بنا گزارہ نئیں ہوندا۔" ہینڈز فری کانوں میں لگائے اس کا سر مسلسل جھوم رہا تھا۔ تیل میں لتھڑے ہوئے بال اتنی سختی سے چپکے ہوئے تھے کہ بری طرح سر ہلانے کے باوجود بھی نہیں ہل رہے تھے۔ میل سے اٹے سیاہ پیر بھی بری طرح تھرک رہے تھے۔ کئی بار کی پہنی ہوئی سستی سی ساڑھی کا بوسیدہ سا پلو بھی لہرانے کی ناکام سی کوشش کررہا تھا۔ گانے میں مگن پوری طرح سے وہ محو رقصاں تھی کہ اتنے میں کسی نے آکر زور سے اس کی کمر پر ہاتھ مارا۔

"اری او نحوست ماری...... تیری یہی کرتوت ہیں، جن کا غم لگا کر تیری ماں یہ جہاں چھوڑ گئی۔ اور تجھے میرے سینے پر مونگ دلنے کے لئے چھوڑ گئی۔ تجھے موت کا درندہ بھی تو نہیں کھا جاتا۔ منحوس ماری پتہ نہیں کہاں سے آ گئی تھی میرا یہ جنم برباد کرنے۔" شکنتلا کی صرف زبان ہی نہیں چل رہی تھی بلکہ اس کے ہاتھ بھی مسلسل چل رہے تھے۔ وہ جب بھی آروہی کو مارتی یوں ہی بے رحمی سے مارتی، پاس ہوتی تو تھپڑوں اور مکوں سے اس کا جسم لال کردیتی اور اگر ذرا سا فاصلہ ہوتا تو جو چیز فی الوقت دستیاب ہوتی نشانہ باندھ کر اس پر اچھال پھینکتی اور

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

اس طرح اس کا جسم لہولہان ہوجایا کرتا۔

غصے کی آگ ٹھنڈی ہونے پر شکنتلا کمرے سے باہر جا چکی تھی۔ آروہی کے تیل میں اٹے بال اب بکھر کر الجھے پر آگئے تھے۔ اب کمرے میں گانے کے بجائے آروہی کی سسکیاں گونج رہی تھیں۔ شکنتلا کے بڑھے ہوئے ناخنوں نے اس کے چہرے پر ایک دو خراش ڈال دی تھی۔ جہاں سے اب خون رس رہا تھا، اس کے کپکپاتے لب کتنی سے بھنچے پڑے تھے۔ آنکھوں سے تیزی سے بہتے آنسو، خون کے ساتھ مکس ہوکر عجیب سا تاثر دے رہے تھے اور وہ لرزتے ہاتھوں سے زمین پر گرے ہینڈز فری کی ٹوٹی ہوئی تاریں اٹھا رہی تھی جیسے شکنتلا نے نوچ کر کئی حصوں میں تقسیم کردیا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے ہینڈز فری کی تاریں نہ ہوں بلکہ اس کے دل کے ٹوٹے ہوئے حصے ہوں۔ وہ بری طرح سے بلک بلک کر رونے لگی۔ کتنے ترلوں سے اس نے سوتیلی ماں کے پیسے چرا کر یہ ایم پی تھری منگوائی تھی۔ ایم پی تھری پہلے ہی ناقص کوالٹی کی تھی۔ زمین پر گرتے ہی اس کے سارے پرزے الگ ہوگئے تھے، آروہی کے ارمان آج ایک بار پھر ٹوٹ کے بکھرے تھے۔ آروہی کا پتا راجیش شام کو کھیتی باڑی کرکے گھر لوٹا تو شکنتلا نے آروہی کی شکایتوں کے گٹھر کھول دیئے۔ جواب میں راجیش خاموش رہا۔

"یوں ہی چپ کرکے سنتے رہنا بس، جب وہ گھر سے اپنے کسی عاشق کے ساتھ فرار ہوکے تمہاری پگڑی کو پاؤں تلے روند دے گی، اس دن چلے گی تمہاری زبان۔"

"لیکن تب کوئی فائدہ نہ ہوگا۔" راجیش بابو۔ شکنتلا غصے سے لال پیلی ہورہی تھی۔ اگر یہ کوئی کارٹون فلم ہوتی تو اس وقت اس کے کانوں سے دھواں ضرور نکلتا۔

"تو کیا چاہتی ہے پھندا لگا کر پھانسی دے دوں کیا اسے؟ بن ماں کی بچی ہے، کچھ دیا کرلیا کر اس پر۔" راجیش دھوتی سنبھالتا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

آروہی کے آنسو ابھی تک خشک نہیں ہورہے تھے۔ رو رو کر اس کا حلق خشک ہوچکا تھا۔ بڑی چاؤ سے بھر بھر کر لگایا گیا کاجل پھیل کر اسے اور بدصورت بنا رہا تھا۔ وہ مسلسل روئے جارہی تھی اور ستم ظریفی یہ کہ کوئی چپ کروانے والا بھی نہ تھا، اتنے میں اس کی نظر کمرے کے کونے میں رکھے دیار کی لکڑی کے بنے قدیم صندوق پر پڑی، جس میں اس کی سوتیلی ماں "شکنتلا" کے جہیز کے نام پر لائے گئے دو چار جوڑے پڑے تھے، صندوق میں سے شیفون کا باریک سا دوپٹہ جھانک رہا تھا۔ وہ آنسو صاف کرتی ہوئی بجلی کی سی تیزی سے اٹھی اور صندوق کھول کر وہ دوپٹہ نکالا۔ اسے دل بہلانے کا ایک نیا سرا ہاتھ آگیا تھا، بائیس سالہ آروہی ذہنی طور پر ابھی بھی پندرہ سال کی ایک شوخ لڑکی تھی۔ سوتیلی ماں کے ظلم وستم نے بھی اس کی شوخیاں کم نہیں کی تھیں، وہ دوپٹہ لہرا لہرا کر پورے کمرے میں گھومنے لگی، اس کے پسندیدہ رنگ کا دوپٹہ تھا، بالآخر وہ بڑے آئینہ کے سامنے آگئی اور دوپٹہ اپنے سر پر دلہن کے سے انداز میں لے لیا۔

"آروہی......" عین اسی پل کمرے میں راجیش کی آواز گونجی، جو اسے سمجھانے کی غرض سے آیا تھا اور اب اس کا یہ نیا کارنامہ دیکھ رہا تھا۔ گھبرا کر اس نے دوپٹہ اتار کر دونوں ہاتھوں سے اپنے پیچھے چھپالیا۔

"بٹی کیوں اپ شگون کرتی ہے اپنے ساتھ؟ ہماری ریت ہے کہ اس رنگ کا کوئی کپڑا لڑکیاں بیاہ سے پہلے نہیں پہنتی ہیں، یہ رنگ کنیا کو بیاہ کے بعد ہی جچتا ہے۔ اس سے پہلے یہ رنگ پہنیں تو گگن سے کالی بلائیں اترنے لگتی ہیں اس کنیا پر۔" راجیش غصے کو مکمل دبائے دھیرے دھیرے اسے سمجھا رہا تھا کیوں کہ اس کے خیال میں شکنتلا نے پہلے ہی اس کی کافی درگت بنادی تھی۔

"پر بابو...... رادھا بھی تو یہ رنگ آرام سے پہن لیتی ہے۔" باپ کا پیار دیکھ کر آروہی بھی اپنا ڈر بھول کر لاڈ پر اتر آئی۔

"اوہ پتر...... رادھا بے شک ہمارے دھرم کی ہے لیکن ایک دھرم کے بھگتوں میں بھی فرق ہوتا ہے۔ ہم جس ذات سے ہیں، جس کے بھگت ہیں، وہ ہماری کنواری کنیاؤں کو یہ رنگ پہننے کا ادھیکار نہیں دیتا۔" راجیش نے اس کے ہاتھ سے دوپٹہ واپس لے لیا۔ اور صندوق میں

واپس رکھ دیا، تاہم ابھی بھی دوپٹے کا ایک کونا صندوق سے باہر جھانک رہا تھا۔ رابعیش اسے سمجھا بجھا کر واپس چلا گیا۔ آروہی نے ایک بار پھر صندوق کی طرف دیوانگی سے دیکھا۔ صندوق سے نظر آنے والے "لال" رنگ کے دوپٹے کا کونا اسے ابھی بھی اپنی طرف متوجہ کر رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

رات کا ایک بج رہا تھا۔ چرند پرند اپنے آشیانوں میں دبکے سو رہے تھے، چاند بادلوں سے آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔ پرتیبھا کے کمرے کی کھڑکی کے دونوں پٹ خود بخود ہوا سے کھل گئے۔ باریک پردہ تیز ہوا سے سرسرانے لگا۔

پرتیبھا اپنے بستر میں دھنسی نیند کی وادیوں میں گم تھی۔ اسے یکسر پتہ نہیں تھا کہ اس کے کمرے کی کھڑکی کے پٹ کھل چکے ہیں اور تیز ہوا پورے کمرے میں دندناتی پھر رہی ہے۔ دفعتاً ہوا نے اس کے اوپر موجود کمبل ہٹانا شروع کر دیا۔ وہ آنکھیں بند کئے سوئی ہوئی شہزادی لگ رہی تھی۔ کمبل اس کے اوپر سے ہٹا تو اس کی سیاہ زلفیں ہوا کے دوش پر لہرانے لگیں۔ اس کے کمرے میں دو کھڑکیاں تھیں۔ جن پر پردے لگے ہوئے تھے۔ ہوا کے دوش پر لہراتے ادھر سے ادھر ہو رہے تھے۔

وہ سینے پر کوئی تصویر رکھے سو رہی تھی، غالباً اس تصویر سے باتیں کرتے کرتے سو گئی تھی۔ تصویر جوں کی توں اس کے سینے پر دھری تھی۔ ہوا کی مسلسل تیزی سے بالآخر اس کی آنکھ کھل گئی۔ گھبرا کر اس نے کھلی کھڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ ایکدم اٹھی اور تصویر سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر کھڑکی بند کرنے کے لئے اٹھی، ہوا ابھی بھی زوروں پر تھی، سائیڈ ٹیبل پر رکھی تصویر میں اشوک صاحب مسلسل مسکرا رہے تھے۔ بالکل جیتے جاگتے لگ رہے تھے، کوئی اس تصویر کو دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ ان کی راکھ اب گنگا جل میں بہہ رہی ہوگی۔

وہ کھڑکی جوں ہی بند کرنے لگی، اس کی نظر نیچے لان پر پڑی، جس کا زیادہ تر حصہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا، مگر پھر بھی چاند کی ہلکی سی روشنی میں وہ واضح محسوس کر سکتی تھی کہ لان کے وسط میں کوئی ذی روح موجود ہے، وہ ابھی اس انسان کو پہچاننے کی کوشش ہی کر رہی تھی کہ اس ذی روح نے اپنا ہاتھ بلند کیا اور اسے اپنی طرف آنے کا اشارہ کرنے لگا۔

"پتا جی....." پرتیبھا کی سانس اٹکنے لگی اور اس کی آنکھیں مارے خوشی اور حیرت کے پھیل گئیں۔ معاً اس نے کھڑکی بند کی اور بجلی کی سی تیزی سے اپنے قدم نیچے سیڑھیوں کی جانب بڑھا دیئے، وہ ننگے پیروں بھاگ رہی تھی اور جلد از جلد لان تک پہنچ جانا چاہتی تھی۔ اسے لان کی طرف بڑھتا دیکھ کر ہوا مزید جوش میں آ رہی تھی اور ناگ کی طرح پھنکارے جا رہی تھی۔

ادھر لاعلم شنکر کاکا نیند میں کھوئے ہوئے تھے۔ وہ منزلہ اس گھر میں رہتا ہی کون تھا۔ بس اشوک صاحب، ان کی بیٹی پرتیبھا اور ان کا خاندانی ملازم شنکر کاکا یہ تین افراد اس گھر میں بہت سکون سے رہتے تھے۔ پھر اچانک ان کی پرسکون زندگی میں ایک طلاطم آ گیا۔ جب چاند کی پورن ماشی کی رات اشوک صاحب اپنے کمرے میں مردہ حالت میں پائے گئے۔ کوئی نہیں جانتا تھا ان کی موت کیسے واقع ہوئی۔ زرد رنگ اور سیاہ ہونٹوں والے اشوک صاحب کی میت ایک سوالیہ نشان تھی۔ سب لاعلم تھے، ڈاکٹرز کے مطابق ان کی موت کسی غیر ماورائی مخلوق کو دیکھنے کے سبب ہوئی تھی۔

بالآخر وہ لان تک پہنچ گئی، وہ ذی روح ابھی تک وہیں موجود تھا۔ جیسے اس کے آنے کا منتظر ہو۔ وہ تیزی سے اس کی جانب بڑھی۔ اگر چاند کی روشنی اس کا ساتھ نہ دیتی تو اسے سمت کا تعین کرنے میں بہت مشکل ہو جاتی۔

"پاپا....." اس ذی روح کے قریب آ کر وہ ایک جھٹکے سے رکی۔ وہ بڑھ کر اپنے باپ کے گلے لگنا چاہتی تھی۔ مگر اشوک صاحب نے اسے وہیں رکنے کا اشارہ کر دیا۔ اور اپنے کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک تیز رنگ کے کپڑے کی پٹی نکالی، پرتیبھا کے پشت پر چاند تھا، پرتیبھا کا سفید چہرہ بہت ہی معصوم لگ رہا تھا جبکہ اشوک صاحب چاند کی طرف کھڑے تھے، جس کی

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

روشنی سے اس کا عکس خاصا دھندلا رہا تھا اور یہی وجہ تھی کہ ان کے ہاتھ میں موجود پٹی کے رنگ کا تعین نہ ہو سکا تھا۔ پٹی لہرا کر وہ آگے بڑھے۔ پرتیبھا نے انہیں آگے بڑھتا دیکھ کر اپنے دونوں بازو کھول دیئے، باپ کی محبت کی ماری وہ اتنا بھی نہ سمجھ سکی کہ اس کے سامنے کھڑا یہ شخص زندہ نہیں بلکہ "مردہ" ہے۔

اشوک صاحب پٹی لے کر پرتیبھا کے قریب آئے اور اس کے بازوؤں میں آنے کے بجائے اس کو کراس کرتے ہوئے اس کی پشت کی طرف چلے گئے، پرتیبھا کے چہرے پر الجھن کی لکیریں نمودار ہونے لگیں۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتی۔ اشوک صاحب نے وہ پٹی دھیرے سے اس کی آنکھوں پر باندھ دی۔

عین اسی لمحے بھیڑیا اپنی مکروہ آواز میں چیخا تھا۔ لان میں لگے صنوبر کے درخت پر گھونسلے میں موجود چڑیا کے بچے ایک دم جاگ گئے تھے اور چوں چوں کرنے لگے تھے۔ چڑیا کی خوفزدہ ننھی منی آنکھیں نیچے اشوک صاحب پر گڑی تھیں، ننھے بچوں کے چوں چوں کرنے پر چڑیا نے پھیلا کر انہیں پروں میں سمو لیا۔ جیسے بچوں کو اشوک صاحب سے چھپا لینا چاہتی ہو۔ پروں میں سماتے ہی ننھے بچے پھر دبک گئے۔ ماحول پر ایک بار پھر سناٹا چھا گیا۔

اشوک صاحب پٹی باندھ چکے تھے۔ اب انہوں نے اپنا ہاتھ پرتیبھا کے ہاتھ پر رکھا اور اسے اپنی ہمراہی میں لے کر آگے چلنے لگے۔

سفید چہرے پر لال پٹی چاند کی روشنی میں اب نمایاں ہو رہی تھی۔ پرتیبھا اشوک کا ہاتھ تھامے کسی روبوٹ کی مانند نامعلوم سمت کی جانب بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ دور درخت پر گھونسلے میں موجود چڑیا کی ننھی آنکھوں میں نمی واضح تھی۔ وہ بہت بے چین لگ رہی تھی۔ پرتیبھا نے کئی بار اسے دانہ کھلایا تھا۔ پرندے انسان تھوڑی ہوتے ہیں جو انسان کو بھول جائیں۔

☆.....☆.....☆

"میں نے ایک بات سوچ لی ہے اور اس سے مجھے کوئی پیچھے نہیں ہٹا سکتا۔" آروہی نے کاجل سے لبریز آنکھوں میں پختہ عزم کو ظاہر کرتے ہوئے اپنی سہیلی سے کہا۔

"کیا بات ہے.....؟" رادھا مزے سے کیری کھاتے ہوئے بولی۔

"میں بیاہ رچاؤں گی۔" آروہی خلا میں گھورنے لگی جبکہ اس کی بات پر رادھا کے منہ میں کیری ایک دم پھنس گئی اور اسے کھانسی ہونے لگی۔

"پر کس نال.....؟" رادھا بمشکل بولی۔

"کسی کے بھی ساتھ.....بس میرے کو تو لال رنگ کا لہنگا پہننا ہے جس کا ایک ہی حل ہے اور وہ ہے بیاہ۔" آروہی بھی اب کیری کھانے لگی تھی۔

"لیکن آروہی.....تو اپنے ماتا پتا کو تو بتا دے، ان کی جان کاری میں بھی تو یہ بات آنی چاہئے۔" رادھا نے کیری کھا کر ڈکار لیتے ہوئے کہا۔

"اونہہ.....میرا بیاہ کبھی نہیں کریں گے ماتا اور پتا.....اچھی بھلی نوکرانی جو ہاتھ سے نکل جائے گی۔" آروہی نخوت سے بولی۔

"اروہی.....تیرا ستیاناس.....کدھر مر گئی، پانی پلا مجھے۔" شکنتلا باہر سے سبزی لے کر آئی تھی۔ آتے ہی شاپر چارپائی پر رکھ کر چلانے لگ گئی، شکنتلا کو دیکھ کر رادھا سر پر پیر رکھ کر بری بلا کی طرح بھاگی، جبکہ آروہی پانی کا گلاس بھر کر شکنتلا کی طرف بڑھی۔ پھر شاپر اٹھا کر سبزی نکالی اور شام کے لئے بنانے لگی۔

شام کے سائے ڈھلنے کے بعد رات تیزی سے اپنے اندھیرے کو ہر سو مسلط کرنے کے لئے دھیرے دھیرے کامیاب ہو رہی تھی۔ ننھے منھے تارے سیاہ آسمان پر جگمگا رہے تھے۔

سارا گھرانہ کھانا کھا کر سو چکا تھا، کچن میں آروہی رات کے کھانے کے برتن دھو رہی تھی۔ برتن دھو کر وہ اپنے کمرے میں آئی۔ کمرہ کیا تھا بس مٹی کا ایک چھوٹا سا ڈربہ تھا اور وہ اپنے کمرے میں مگن سے رہتی تھی۔

ابھی وہ سونے ہی لگی تھی کہ اسے گلی میں کسی کے گنگنانے کی آواز سنائی دی۔ آواز سے اس نے اندازہ

کیا کہ وہ کوئی شرابی ہے۔ ابھی وہ آواز پر غور کر ہی رہی تھی کہ اچانک اسے شرابی کی گھٹی گھٹی چیخ سنائی دی۔ اس کے بعد کسی چیز کے گرنے کی آواز آئی، تاریک اور سناٹے سے بھری تنگ گلی میں کوئی چیز گر کر دور تک لڑھکتی گئی تھی۔ اس سے مزید برداشت نہ ہوا، فوراً اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ اپنے ماتا پتا کے کمرے کی طرف دیکھا تو ادھر لائٹ آف تھی، شاید وہ لوگ سو چکے تھے، انہیں تنگ کرنا مناسب نہ سمجھا اور چلتی ہوئی ڈیوڑھی میں آ گئی، کچھ ہی دیر میں وہ دروازہ کھول کر باہر تاریک گلی میں آ چکی تھی۔

گلی میں مکمل سناٹا طاری تھا، ہاتھ کو ہاتھ دکھائی نہ دے رہا تھا۔ وہ نجس کے مارے آگے بڑھتی گئی، آسمان پر سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے۔ جانے کب بارش آ جائے۔ اس خیال سے وہ ایک دم بڑبڑا کر گھر واپس جانے کے لئے مڑی، مگر راستے میں پڑی کسی چیز سے ٹکرا کر ایک دم زمین پر گری، ابھی وہ سنبھلنے ہی لگی تھی کہ اسے اندازہ ہوا، وہ کسی انسانی وجود کے اوپر گری ہے، وہ فوراً سنبھل کر پیچھے ہوئی اور اسے ٹٹول ٹٹول کر اس میں زندگی کے آثار تلاش کرنے لگی۔ یہ وجود یقیناً اسی شرابی کا تھا۔

''اٹھ بابو..... کون ہے تو؟ کیا ہوا ہے تجھے؟''

اس نے نامعلوم اجنبی کے دھڑ کو اپنا سہارا دینے کی کوشش کی۔ بالآخر اسے اٹھا کر بیٹھا دیا، شرابی بے ہوش تھا غالباً، کیونکہ وہ آروہی کے سہارے پر ہی بیٹھا تھا۔ عین اسی لمحے بادل زور سے گرجے اور آسمانی بجلی کی چمک پل بھر کے لئے پوری گلی کو روشن کر گئی۔

آروہی کے تو جیسے کاٹو تو بدن میں لہو نہیں..... اس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ زبان جیسے حلق میں ہی گم ہوگئی۔ اس کے سہارے بیٹھا شخص کا سر دھڑ سے غائب تھا۔ وہ صرف ایک دھڑ تھا اور گردن کے مقام سے خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ یقیناً ابھی ابھی اس کا سر نہایت ہی بے دردی سے کاٹا گیا ہوگا۔ گھٹی گھٹی چیخوں کے ساتھ آروہی نے اس سر کٹے انسان کے وجود سے اپنے ہاتھ ہٹائے تو وہ دوبارہ زمین پر لڑھک گیا۔

اگلے قدموں اٹھتے ہوئے وہ پیچھے کو ہٹی اور سرپٹ بھاگنے لگی۔ ابھی وہ دو چار قدم ہی بھاگی تھی کہ کوئی چیز اس کے پیروں سے ٹکرا کر آگے کو ہوئی۔ وہ ڈر کے پیچھے کو ہٹی، آسمانی بجلی بار بار کڑک رہی تھی، بارش بس ہونے کو ہی تھی۔

عین اسی وقت بجلی کا لشکارا پڑا۔ اس کے اوسان خطا ہوگئے۔ وہ اسی شرابی کا کٹا ہوا سر تھا۔

آروہی تو جیسے کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ وہ اندھا دھند گلی میں بھاگنے لگی۔ وہ چیخنے کی کوشش کر رہی تھی مگر آواز گلے میں ہی گم ہوگئی تھی، خوف کی زیادتی کے سبب اکثر یونہی ہوتا ہے۔ آروہی کی آواز بھی یونہی نہیں نکل پا رہی تھی، ڈر خوف اور گھبراہٹ میں اسے اتنا بھی دھیان نہ رہا کہ گھر کا دروازہ وہ بہت پیچھے چھوڑ آئی ہے، بھاگتے بھاگتے بالآخر وہ گلی کے نکڑ تک آ گئی۔ جہاں ایک بوڑھی عورت لاٹھی لے کر خراماں خراماں چل رہی تھی۔ اس کی کمر جھکی ہوئی تھی۔

آروہی بھاگتی ہوئی بڑھیا کا راستہ روک کر اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی اور پیچھے شرابی کی لاش کی طرف اشارہ کر کے اسے بتانے کی ناکام کوشش کرنے لگی، آنسو اس کی آنکھوں سے رواں دواں تھے۔

''چپ کر جا بیٹی! یہ کھیل اس گلی میں پہلی بار نہیں ہوا۔ تو چل میرے ساتھ۔'' بڑھیا اسے کہہ کر لاٹھی ٹیکتی ہوئی آگے کی جانب چل پڑی۔

''آروہی بھی سحر زدہ کیفیت میں اس کے پیچھے چلنے لگی، لمحے گزرتے رہے، کتنے ہی گھنٹے ہوگئے، اب آروہی کے پیر دکھنے لگے تھے۔ لیکن بوڑھی عورت اپنی سابقہ قوت سے ہی رواں دواں تھی۔

ٹنڈ منڈ درختوں کا ایک سلسلہ سا شروع ہو چکا تھا بالآخر وہ ایک ایسی گلی میں داخل ہوئیں جہاں شامیانے لگے تھے۔ تازہ تازہ پکنے والے گرما گرم زردہ، پلاؤ اور مرغ قورمے کی خوشبو دور سے ہی محسوس ہو رہی تھی۔ عوام کا ایک جم غفیر وہاں موجود تھا۔ سبھی زرق برق کپڑوں میں ملبوس تھے۔

آروہی مارے حیرت کے وہیں رک گئی۔ اس کی نظروں کے عین سامنے بڑا سا اسٹیج لگا تھا، جہاں ایک

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

آدمی گولڈن لڑیوں والا سہرا سجائے صوفے پر بیٹھا لوگوں سے سلامی وصول کر رہا تھا۔

جیسے ہی آروہی ہجوم میں داخل ہوئی، سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ سب مڑ مڑ کر اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ تین چار خوب صورت سی لڑکیاں اس کی جانب بڑھیں اور اسے بازو سے پکڑ کر دائیں طرف بنے ایک کمرے میں لے گئیں، کمرے میں اسے چھوڑ کر انہوں نے باہر سے کنڈی لگا دی، کمرہ کیا تھا، محل لگتا تھا، وہ ابھی حیرت سے کمرہ دیکھ ہی رہی تھی کہ اس کی نظر جہازی سائز کے بنے بیڈ پر پڑی، جہاں بے انتہا قیمتی لال رنگ کا ایک جوڑا پڑا تھا، اس نے بے تابی سے اسے اٹھایا، وہ ایک بے انتہا خوب صورت لہنگا تھا۔ سونے چاندی کی باریک تاروں سے جڑاؤ کیا گیا تھا، اس لہنگے اور چھوٹی سی چولی کے دامن پر بڑے بڑے یاقوت جڑے تھے، باریک سے لال دوپٹے پر سونے کی تاروں سے بھاری کام کیا گیا تھا، اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا، معاً اس نے دوپٹا اتار کر ایک سائیڈ پر پھینکا اور دس منٹ بعد ہی وہ اس ہوشربا سرخ لہنگے میں ملبوس اپنے آپ کو رشک بھری نظروں سے تک رہی تھی، کمرے میں کوئی شیشہ وغیرہ تو تھا نہیں، اس لئے اپنے آپ کو جی بھر کے دیکھنے کا چاؤ ابھی تشنگی لئے ہوئے تھا۔

☆.....☆.....☆

صبح کا اجالا پھیلنے میں ابھی کچھ وقت باقی تھا۔ ایک دم ہی موسم نے رخ بدلا اور چھما چھم بارش برسنے لگی۔ ہر چیز پانی میں نہا رہی تھی۔ ہواؤں نے ایک دم زور پکڑا تھا، بڑے بڑے دیوہیکل درخت ہواؤں کے آگے سر تسلیم خم کر کے جھومنے لگے تھے۔ اتنے خراب موسم سے گھبرا کر چاند نے بھی اپنا رخ روشن گھنیرے بادلوں میں چھپا لیا۔ ہر چیز تاریکی میں ڈوب گئی۔ لیکن اتنے خوفناک موسم کا ہیبت ناک طلسم اس تقریب میں شامل کسی فرد پر نہ تھا۔ زرق برق کپڑوں میں ملبوس نازک اندام لڑکیاں..... خوشبودار کلف لگے لباس پہنے وجاہت مرد..... اور گولڈن سہرے میں سجا دراز قد دولہا..... سبھی میں ایک بات مشترک تھی۔ جب وہ بات کرتے تھے تو ان سب کی زبانیں بے انتہا پتلی اور دوشاخہ اور برف کی طرح جمی بے تاثیر آنکھیں تھیں، تقریب میں شامل حسیناؤں کے گلاب کی پتیوں جیسے ہونٹ ''سرخ'' رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ جیسے ابھی کسی کا خون پینے کو بے تاب ہوں۔

☆.....☆.....☆

''شنکر کا کا غم سے نڈھال تھے۔ دو بار چکرا کر گر چکے تھے، شمشان گھاٹ میں ہو کا عالم تھا۔ بس جسم جلنے کی بو اور آگ بھڑکنے کی آواز گونج رہی تھی۔

''کہا تھا نا بیٹا! مرنے والوں کو اتنا یاد نہیں کرتے، خصوصاً جب ان کو مرے، ہوئے کچھ ہی دن ہوئے ہوں، آتما اپنے یاد کرنے والے کو ساتھ لے جاتی ہے۔ آتما کا نام لینے سے، ان کا بار بار ذکر کرنے سے انہیں شکتی ملتی ہے، پر تم نہ مانی۔'' شنکر کا کا اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے اور اچانک چیخنے لگے۔ شمشان گھاٹ کا سکوت ایک دم شور و غل میں بدل گیا۔

پنڈت نے شنکر کا کا کو شمشان گھاٹ سے باہر لے جانے کا اشارہ کیا۔ دو چار لوگ آگے بڑھے اور شنکر کا کا کو پکڑ کر باہر لے گئے، پرتیبھا کی چتا دھڑا دھڑ آگ میں جل رہی تھی۔ شام کے سائے گہرے ہو چلے تھے۔ دو منزلہ گھر میں شنکر کا کا بالکل تنہا، سکتے کی سی کیفیت میں تھے۔

''اری او مونیکا اپنے گھر کی بتی تو جلا دے، گلی میں بڑا ہی اندھیرا ہے۔'' ایک موٹی عورت چنری کی ساڑھی پہنے گلی میں کھڑی چلا رہی تھی اور اچانک گلی میں بلب کی پیلی روشنی جگمگا اٹھی اور اس گھر سے باہر ایک عورت نکلی، غالباً وہی مونیکا تھی۔

''شنکر زندہ بھی ہے یا نہیں؟ آج بتی نہیں جلائی اس نے باہر کی۔'' مونیکا باہر آتے ہی بولی کیونکہ اسے اپنا بجلی کا بل بڑھنے کا خدشہ تھا۔

''اری بے چارے کا اب بچا ہی کون ہے؟ جس کے لئے روشنی کرتا پھرے۔'' موٹی عورت آزردگی سے بولی۔

''پرتیبھا کی جوان موت پر ہر آنکھ اشکبار ہے، نہ جانے کس نے جان لی اس کی؟ یا اس نے خود ہی آتما

ہتھیا کی؟ رام جانے۔" مونیکا اپنے گھر کے سامنے بنے چبوترے پر بیٹھ گئی، گرمی کا موسم تھا، گلی میں ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔

"کہتے ہیں اس کی ماں پہلے سے سہاگن تھی اور بچی کی ماں بھی تھی۔ اشوک اسے گاؤں سے بھگا لایا تھا، یہ پریم کا مرض بھی کسی کو نہ لاگے، پتی اور بچہ چھوڑ آئی اشوک کے پیچھے، بھگوان نے بھی صحیح بدلہ لیا، بیاہ کے تین سال بعد ہی چل بسی۔" موٹی عورت جانے کون سے جلے دل کے پھپھولے پھوڑ رہی تھی۔

"نہ شوبتا ناں..... مرگئی بیچاری، ایسی باتیں نہ کر اب اس کے بارے میں۔" مونیکا نے جھرجھری لے کر کہا۔ غالباً موٹی عورت کا نام شوبتا تھا۔

"اری مونیکا! دیکھا تھا؟ منڈپ میں پھیرے کے وقت سادہ سے جامنی رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھے، حالانکہ دلہن تو سجتی ہی لال رنگ کے جوڑے میں ہے۔" شوبتا بھی کسی صورت چھوڑنے کو تیار نہ تھی۔

"بھاگ کے بیاہ کیا تھا انہوں نے، جلدی میں تو پھیرے یوں ہی ہوتے ہیں آئے ہائے..... نہ ماں نے سہاگ کا لال جوڑا پہنا، نہ بیٹی کو نصیب ہوا۔" مونیکا بھی شوبتا کی باتوں میں آ گئی تھی اور دونوں ہاتھ ملتے ہوئے کف افسوس کرنے لگیں۔

"وہ یاد آیا..... اس پرتیما کی لاش جب گلی کے کونے سے ملی تھی، تو اس کے ماتھے پر سندور لگا ہوا تھا۔ سہاگ کی علامت سندور..... کہیں وہ بھی ماں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے بھاگ کے بیاہ تو نہیں کر رہی تھی؟ منڈے نے سارا روپیہ پیسہ اینٹھ کر اس کو مار ڈالا ہو۔" شوبتا کو مصنوعی فکر لاحق ہوئی۔ دنیا کتنی ظالم ہوتی ہے، نہ زندوں کو چھوڑتی ہے، نہ مردوں کو..... اپنے انجام سے نہیں ڈرتی، خاص طور پر عورت کی ذات..... غیبت، بہتان، الزام تراشی جیسی بدی کے بگولے میں زیادہ آسانی سے آ جاتی ہے۔" شوبتا اور مونیکا بھی ایسی ہی عورتیں تھیں، جو دوسروں کی فکر میں رہتی تھیں۔

شوبتا اور مونیکا بھی کچھ ایسی ہی عورتیں تھیں۔ وہ پرتیما کی باتوں میں اتنی مگن تھیں کہ انہیں احساس تک نہ ہوا کہ شوبتا کا پتی اپنی دھوتی سنبھالتا ہوا ان کے پاس آ کھڑا ہوا، ان کی باتوں کا مآخذ وہ جان چکا تھا۔

"پرتیما کی باتیں چھوڑ دو تم دونوں..... جیسے اشوک اپنے حد سے زیادہ یاد کیے جانے کے کارن، پرتیما کو آ کر لے گئے تھے، اسی طرح تمہاری باتوں میں اپنا ذکر سن کر اس کی آتما آ کر تمہیں لے جائے گی۔ یاد نہیں؟ جب پرتیما کی سندور لگی لاش ملی تھی تو پنڈت جی نے دیکھتے ہی کہا تھا کہ اس کی موت کا کارن ایک ایسی آتما ہے جسے وہ حد سے زیادہ پیار کرتی تھی اور ہر وقت یاد کرتی رہتی تھی۔" کالی داس دھیرے دھیرے سمجھا رہا تھا۔

"مگر کالی داس جی..... پرتیما کی ہتھیا سے ایک دن پہلے، بلکہ اگر مجھے پکا یاد ہو تو کچھ ہی گھنٹوں پہلے میں نے اسے دیکھا تھا۔ وہ باپ کی تصویر کو سینے سے لگائے گم صم تھی، تب تو سندور کا نام و نشان تک نہ تھا۔ پھر جب رات کاسے گزار کر صبح اس کا شریر ملا تو سہاگن کی طرح سندور لگائے ہوئے تھی۔ یہ کیا ماجرا تھا آخر؟"

شوبتا کو یہ گتھی سلجھتی نظر نہ آ رہی تھی۔ مگر کالی داس نے اسے سختی سے کہا۔

"چل بس اٹھ..... تجھے کیا پڑی ہے پرائی آگ میں جلنے کی۔ بھگوان جانے اصل ماجرا کیا ہوا ہے، شنکر بھی بھگوان دیا کرے۔ وہ بھی پرتیما والی غلطی کر رہا ہے۔ جیسے وہ اپنے باپ اشوک کو یاد کرتی تھی، ویسے ہی شنکر اب اپنے مالک اشوک اور پرتیما کو یاد کر رہا ہے۔" کالی داس نے متفکر ہو کر اندھیرے میں ڈوبے دو منزلہ گھر کی طرف دیکھا اور اس کے بعد اپنی پتنی کے ہمراہ گھر کے اندر چلا گیا۔ مونیکا بھی اپنے گھر چلی گئی۔ اس کے بھی پتی کے آنے کا ٹائم ہو چلا تھا۔

اماوس کی کالی رات تھی، گھپ اندھیرے میں ڈوبی دو منزلہ عمارت کے واحد مکین شنکر کا کا زمین پر آڑے ترچھے گرے پڑے تھے۔ ان کی آنکھیں کھلی ہوئی اور ساکت تھیں۔ تین چار بڑے بڑے کاکروچ ان کے بے جان وجود پر عیاشی سے گھوم پھر رہے تھے۔ پنڈت جی اور کالی داس کا ڈر اور وسوسہ سچ ثابت ہو چلا تھا۔

"بھگوان تیری آتما کو کبھی شکتی نہ دے آروہی..... اپنے باپ کا نام ڈبو گئی، عزت خاک میں ملا گئی۔ ارے کیا تاؤں زمانے والوں کو، تجھے بیاہ ہی کرنا تھا تو منہ سے پھوٹ دیتی، ہم خود کوئی لڑکا دیکھ کر تیرے ہاتھ پیلے کر دیتے۔ کیا جواب دوں لوگوں کو؟ منحوس ماری کے بے جان ماتھے پر پھیلا سندور..... جی کر رہا تھا کہ کھوپڑی اڑا دوں....." آروہی کو مرے آج ایک ہفتہ ہو چلا تھا لیکن شکنتلا ابھی تک ہاتھ مل مل کر اسے کوسے جا رہی تھی۔

"یوں مت برا کہہ اسے..... آتما بے چین ہو گی اس کی اور سندور سہاگ کی علامت ہوتا ہے شرمندگی کی نہیں..... اس کا سندور ہی تو اس کے پوتر ہونے کا ثبوت ہے۔ مانتا ہوں اس نے بیاہ ہمارے علم میں لا کر نہیں اور یوں گھر سے فرار ہو کر غلطی کی۔ لیکن میری بچی پوتر ہے۔ وہ بدکردار نہیں۔ اس نے پھیرے لئے ہونگے۔ ماتھے پر سجا سندور میری بچی کے پوتر ہونے کا ثبوت ہے۔ بھگوان اس کو شکتی دے، اس کی آتما کو شانت کرے اور اس کے ظالم پتی، جو میری بچی کو یوں اس حالت میں چھوڑ کر چلا گیا، اس کو عبرت کا نشان بنائے۔" راجیش کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

پھر اچانک ہی اس نے اپنے آنسو صاف کیے اور اٹھ کر آروہی کے کمرے میں آ گیا۔ یہاں آ کر اس نے دروازہ بند کر لیا اور پھٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ "آروہی میری بچی..... مجھے معاف کر دینا، کاش میں شکنتلا سے شادی نہ کرتا، تو تیرا یہ حال نہ ہوتا آج، لیکن قصوروار تیری ماں بھی ہے آروہی..... میں دھرم پتی تھا اس کا..... اس کے باوجود وہ ایک شہری بابو کے ساتھ بھاگ گئی۔ نہ تیرا سوچا..... نہ میرا سوچا....." راجیش کے آنسو تواتر سے گر رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

عاشی، طٰہٰ، ماہین، فرحان..... سب کی زبانیں گنگ تھیں اور آنکھوں میں بے پناہ حیرت..... وہ بے یقینی سے اپنے سامنے گرد آلود کرسی پر بیٹھے جوزف ایڈورڈ کو دیکھ رہے تھے، ان کے ہاتھ میں ایک زمانہ قدیم کی گرد آلود پھٹی پرانی کتاب تھی، جس میں سے وہ کچھ داستان پڑھ کر ان چاروں کو سنا رہے تھے، جوزف ایڈورڈ تاریخ دان تھے۔

طٰہٰ، عاشی، ماہین، فرحان آکسفورڈ یونیورسٹی کے اسٹوڈنٹس تھے اور اپنے اسٹڈی ٹور کے سلسلے میں "نان میڈول" آئے تھے۔ یونیورسٹی کی انتظامیہ نے جوزف ایڈورڈ کو ان کے ہمراہ کیا تھا تاکہ تاریخی زبانیں سمجھ کر وہ ان کا Concept کلیئر کر سکے۔

مائیکرونیشیا، بحرالکاہل میں آسٹریلیا اور انڈونیشیا کے درمیان جزیرہ ہوائی سے پانچ ہزار کلومیٹر کے فاصلے پر واقع چھوٹے چھوٹے جزائر پر مشتمل ایک علاقہ اور اس کے ایک جزیرہ پونپٹی (پوناپے) کے جنوب میں بھی نان میڈول شہر آباد تھا، نان میڈول کا مطلب "خالی جگہیں" ہیں۔ یہ شہر انسان ساختہ جزیروں اور نہروں کا نہایت ہی حیران کن جال ہے۔ جسے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال قبل پونپٹی کے نایاب پتھریلے ساحل پر تعمیر کیا گیا تھا۔

اٹھارہویں صدی کے یورپی ملاح نے اسے دریافت کیا۔ وہ اسے دیکھ کر اس قدر حیران ہوئے کہ انہوں نے اس شہر کو جنوبی سمندر کے وینس کا نام دیا، تاہم ان ملاحوں نے بھی نان میڈول کی پوری شان و شوکت نہیں دیکھی تھی، کیونکہ ان کی آمد سے کوئی ایک صدی پہلے اسے پراسرار طور پر ویران چھوڑ دیا گیا تھا، یہاں تقریباً ہر مذاہب کے لوگ بستے تھے۔

"تو کیا پرتیما اور آروہی آپس میں سسٹرز تھیں؟" ماہین کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"یس، آف کورس....." جوزف نے تاریخی کتاب بند کی اور اس کے بعد گرد آلود الماریوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"میرے خیال میں یہ ساری کتابیں نان میڈول کے متعلق ہی ہیں۔ یہاں کے قدیم باشندوں کی کہانیاں درج ہوں گی ان میں۔"

"پر اس لال جوڑے اور سندور کا کیا چکر تھا؟" طٰہٰ نے دریافت کیا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"آئی ڈونٹ نو....." جوزف نے لاعلمی سے کندھے اچکائے اور کتاب ایک طرف رکھ دی تو اچانک کتاب میں سے ایک بوسیدہ کاغذ برآمد ہو کر نیچے گرا، سب بھونچکا رہ گئے، جوزف نے بجلی کی سی تیزی سے کاغذ اٹھایا جو جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ لفظ سمجھ کر پڑھنے میں کافی مشکل ہو رہی تھی، پھر بھی اس نے ٹوٹے پھوٹے لفظوں کو جوڑ کر پڑھنا شروع کیا۔

"آتما کو حد سے زیادہ یاد کرنا، انہیں واپس اس دنیا میں لے آتا ہے، جو اس دنیا سے چلا گیا، بس وہ چلا گیا، عشق اور جنون ہر چیز کا برا ہے۔ ایک سچے بھگت (پیروکار) کو جو میسر ہے، وہ اسی پر اکتفا کرے، کسی انسان، چیز یا رنگ کا جنون "تباہی" ہے۔ میں پنڈت نارائن اچاریہ، یہ سویکار کرتا ہوں اور سب بھگتوں کو بتاتا ہوں کہ پرتیبھا اشوک اور آروہی راجیش، دونوں کنیائیں ایک ہی ماں سے تھیں۔ ان کے باپ الگ الگ تھے۔ پرتیبھا کو آتما کے یاد کرنے نے مارا اور آروہی کو رنگ کے جنون نے..... لال جوڑے کے عشق نے.....

دونوں بہنوں کی آتماؤں کو ان کے شریر سے نکالنے کے بعد ان کی شادی کی گئی۔ آروہی کو مٹی کے کمرے میں، اپنی سوتیلی ماں کا لال آنچل اوڑھے دیکھ کر ایک ناگ راجا نے پسند کر لیا تھا۔ جو اس وقت اس کے کمرے کی کچی نالی میں سمٹا بیٹھا تھا۔

اور پرتیبھا کو اس کے باپ اشوک نے تین ہزار سال پرانی ایک آتما سے بیاہ دیا تھا۔ میرا وچار ہے کہ ایک خاص چاپ کے تحت اگر ایک آتما، کسی انسان کے شریر سے اس کی آتما نکال کر، دونوں آپس میں بیاہ رچالیں تو انہیں اور ان سے منسلک ہر آتما کو شکتی ملتی ہے۔"

جوزف ایڈورڈ نے پڑھ کر کاغذ کو واپس بوسیدہ کتاب میں رکھ دیا۔

"ہمیں واپس چلنا ہے۔" فرحان کافی سہما سہما لگ رہا تھا۔

"ہاں ہمیں یہاں سے چلنا چاہئے۔" عاشی نے بھی تائید کی۔

پانچوں افراد گاڑی میں آ کر بیٹھ گئے اور گاڑی رواں دواں ہو گئی۔ جوزف ایڈورڈ گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے انہیں مزید بتانے لگا۔

"نان میڈول کا کل رقبہ 200 ایکڑ ہے، شہر کے اردگرد بلند فصیلیں تو دیکھ ہی رہے ہو، آپ لوگ، یہ بسالٹ کے بڑے بڑے ستونوں چلیپائی انداز میں رکھنے سے تعمیر کی گئی ہے اور یہ جو اردگرد نہریں دیکھ رہے ناں، ان کے جال کے اردگرد 92 تعمیرات میں سے ہر ایک کا خاص مقصد ہے۔ بعض رہائشی مراکز تھے جبکہ دیگر غذائی تیاری، کشتی سازی اور روایتی رقص کے لئے مختص تھے۔ بعض تعمیرات کا رقبہ تو فٹ بال کے گراؤنڈ کے برابر ہے۔ ان تعمیرات کی بنیاد مرجانی پتھروں پر کی گئی ہے۔ اسے بسالٹ (آتش فشانی سنگ سیاہ) کے لمبے ستونوں سے تعمیر کیا گیا تھا۔ ہر ستون کی شکل قدرتی طور پر منشور جیسی ہے اور ہر ایک کے پانچ سے آٹھ کنارے ہیں۔"

"لیکن سر! چھوٹے سے اس شہر کی تعمیر میں ہزاروں کی تعداد میں ٹنوں وزنی مونولتھ Monolith استعمال ہوئے ہیں۔ یہ ستون یہاں لائے کیسے گئے؟ اور یہ ستون 18 فٹ لمبے اور 5 ٹن سے زیادہ وزنی لگ رہے ہیں۔ بنیاد کے لئے استعمال ہونے والے پتھروں کا وزن بھی 50 ٹن تو ضرور ہے۔" گاڑی میں بیٹھی ماہین تفصیل سے اردگرد دوڑتے مناظر کو دیکھ رہی تھی۔

"ایک خیال تو یہ ہے کہ بہت سارے تختوں یا کشتی پر پتھر لائے گئے ہوں۔ مگر اس خیال کی تائید میں یہ قباحت ہے کہ کسی نان میڈول کے اردگرد کم پانی اور سطح سمندر کے مرجانی پتھروں کی وجہ سے کوئی بھی بڑی کشتی اور جہاز اندر داخل نہیں ہو سکتا۔ رہی بات چھوٹی کشتی اور لکڑی کے تختوں پر تیرا کر لانے کی تو اتنے زیادہ وزن سے یہ تختہ پانی میں ڈوب جاتا ہے، اس لئے ماہرین یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ اتنے بڑے بڑے پتھر نان میڈول کیسے لائے گئے؟ اور انہیں اٹھا کر ان کی مخصوص جگہ کیسے رکھا گیا؟" جوزف ایڈورڈ نے تفصیل سے بتایا۔ "لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ نان میڈول کو بہت بڑی افرادی

قوت سے تعمیر کیا گیا ہو۔ غالباً بسالٹ کے پتھروں کو افقی سمت سے جھکے ہوئے کھجور کے تنوں کی مدد سے اٹھا کر ان کی موزوں جگہ رکھا گیا ہو۔" عاشی نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ نان میڈول کے ہمسایہ جزائر میں اتنی انسانی آبادی نہیں تھی کہ وہ انجینئرنگ کے اس قدر حیرا کن کارنامے کو پورا کرنے کے لئے کافی ہوں۔" جوزف ایڈورڈ حتمی انداز میں بولا۔

"یس سر..... لیکن میں نے ایسی دیومالائی کہانی بھی پڑھی ہے کہ نان میڈول کے بارے میں کئی صدیاں پہلے دو بھائیوں کو دیوتاؤں نے جادوئی طاقت بخشی۔ اس جادوئی طاقت سے، وہ بھاری پتھروں کو "اڑا" کر اس مقام پر لائے تھے۔" طٰہٰ نے اپنا خیال پیش کیا۔

"ہوں..... ایک اور داستان کے مطابق، کبھی پونا پے میں ایسے ترقی یافتہ لوگ آباد تھے جو صوتی لہروں کو قابو میں رکھنے کا راز جانتے تھے۔ جس کی وجہ سے وہ بھاری پتھروں کو اڑا کر یہاں تک لانے میں کامیاب تھے۔" جوزف ایڈورڈ بلاشبہ بہت علم رکھتا تھا۔ "یعنی ہم کہہ سکتے ہیں کہ کسی کو بھی نان میڈول کی تعمیر اور تباہ کاری کی بابت کچھ پتہ نہیں، بیشتر کے خیال میں اس پر قبضہ کیا گیا تھا۔ کچھ کے خیال میں بعض اجنبیوں کے ساتھ وارد ہونے والی بیماری اس کی تباہی کا سبب بنی۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ سخت طوفان کی وجہ سے اس جزیرے کے غذائی وسائل تباہ ہو گئے تھے۔ جس سے لوگ ہجرت پر مجبور ہو گئے تھے۔" جوزف ایڈورڈ کی تاریخی معلومات بلاشبہ قابل ستائش تھیں۔

"کبھی پرتیبھا اور آروہی یہاں چلتی پھرتی ہوں گی، جب یہ جزیرہ آباد ہوتا ہوگا۔" ماہین نے شیشے کے آر پار دیکھتے ہوئے کہا۔

"ویسے بطور مسلمان ہمیں یہ بات ماننی نہیں چاہئے کہ روحوں کی مرنے کے بعد شادی ہوتی ہوگی۔ یا پھر کسی خاص رنگ کا جنون اسے موت تک لے جائے۔" عاشی نے استفسار طلب نظروں سے اپنے کلاس فیلوز کی طرف دیکھا۔

"جی ہاں..... لیکن بطور انسان ہمیں حقیقت پسند ہونا چاہئے اور اس تاریخی کتاب پر یقین کرنا چاہئے کیونکہ مذہب ایک پیچیدہ چیز ہوتا ہے جس کے کافی داؤ پیچ ہوتے ہیں۔ تمام ہندومت کے فرقوں میں ایسا نہیں ہوتا ہوگا یہ تو کئی ہزار پرانی تاریخ کا کوئی خاص ہندو فرقہ ہوگا، جس کا یہ اعتقاد ہوگا اور اور اس فرقے کا کوئی وجود بھی نہیں ہوگا۔" جوزف ایڈورڈ نے وضاحت کی۔

شام کے سائے گہرے ہونے لگے تھے۔ اب ان کی گاڑی ایک قدیم دو منزلہ مکان کے سامنے سے گزر رہی تھی۔ جو جگہ جگہ سے ٹوٹ چکا تھا۔ پرندے اور دیگر جانوروں نے اپنے مسکن بنا رکھے تھے۔ اس گھر کے آثار اب تقریباً مٹنے والے تھے۔ اس پر وحشت کے سائے لہرا رہے تھے۔

"اتنی لمبی باتوں میں اتنے گھنٹے گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ ہم بس آدھ گھنٹے بعد نان میڈول سے باہر ہونگے۔" جوزف ایڈورڈ نے کہا۔

گاڑی ایک زنانے سے اس دو منزلہ مکان کے پاس سے گزری تھی۔ سورج ڈوب رہا تھا۔ اس مکان کی دوسری منزل پر واقع ٹوٹی پھوٹی ٹیرس پر، لال رنگ کا بے انتہا قیمتی جوڑا پہنے سانولے رنگ کی ایک لڑکی کھڑی دور جاتی گاڑی کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی کالی آنکھوں میں نیلے رنگ کی آمیزش نمایاں تھی۔ سورج اب ڈھلنے کو تھا۔ شام کی کالی پریاں زمین پر اتر رہی تھیں۔ عین اس کے برابر میں بے انتہا سفید رنگت کی مالک ایک لڑکی کھڑی تھی، جس کے شولڈر کٹ بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ دونوں نے نزاکت سے ایک دوسرے کے ہاتھ تھام رکھے تھے۔

ٹورسٹ وین اب بہت آگے نکل چکی تھی۔ نان میڈول کی ویرانیت اور پراسراریت اب انہیں الوداع کہہ رہی تھیں۔ دو منزلہ مکان پر موجود دونوں نوخیز لڑکیوں کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ کون جانتا تھا کہ یہ دونوں لڑکیاں پرتیبھا اور آروہی تھیں۔ دونوں کو ایک ہی چیز نے گھیرے رکھا۔ "لال جوڑے" کے "لال طلسم" نے۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

فرعون کے سپاہی

ضرغام محمود۔ کراچی

نوجوان اپنے ساتھ گزرے واقعات کو خواب سمجھ رہا تھا مگر جب اس کی نظر اپنے ہاتھ پر پڑی تو وہ حواس باختہ ہوگیا کیونکہ اس کی انگلی میں جو انگوٹھی تھی وہ ہزاروں سال پہلے کا پتہ دے رہی تھی اور پھر.....

کیا ایسا ممکن ہے کہ کوئی پلک جھپکتے ہی ہزاروں سال گزرے زمانے میں پہنچ جائے، کہانی پڑھ کر دیکھیں

"وہ لوگ مجھے ڈھونڈ نکالیں گے۔۔۔ وہ مجھے قتل کردیں گے۔ آخر میں کب تک ان لوگوں سے چھپتا رہوں گا۔" میرا ذہن مسلسل سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا۔

کوئی میری بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں ہے حتیٰ کہ میری اپنی بیوی بھی میری بات نہیں مان رہی ہے سب کی طرح وہ بھی یہ سمجھتی ہے کہ میں کسی نفسیاتی عارضے میں مبتلا ہوگیا ہوں اسی لئے وہ مجھے اس نفسیاتی ہسپتال میں داخل کروا کر چلی گئی ہے۔ اس ہسپتال کے ڈاکٹرز اور نرسز بہت اچھی ہیں اور وہ سب میرے ساتھ نہایت پیار اور مہربانی سے پیش آتے ہیں میری بات توجہ سے سنتے ہیں۔۔۔ مگر میں جانتا ہوں کہ وہ سب بھی میری کسی بات پر یقین نہیں کرتے وہ سب بھی مجھے ایک نفسیاتی مریض سمجھ کر مجھ سے پیار و محبت سے پیش آتے ہیں شاید یہ پیار و محبت ان کی ڈیوٹی کا حصہ ہے۔

"وہ۔۔۔ وہ آگئے۔۔۔" میں جلدی سے اپنے بستر سے نیچے اترا اور پلنگ کے نیچے چھپ گیا اگر وہ مجھے دیکھ لیں گے۔ تو میری گردن اسی طرح میرے دھڑ سے الگ کردیں گے جیسے انہوں نے میرے ساتھی کی گردن دھڑ سے الگ کر دی تھی۔۔۔ ان تینوں قاتلوں کے ہاتھ میں ننگی تلواریں ہیں انہوں نے لمبے کالے چغے پہن رکھے ہیں، ابھی میں نے ان کی جھلک اپنے کمرے کی کھڑکی سے دیکھی ہے۔ انہیں شاید میرے کمرے کا علم نہیں ہے اس لئے وہ پورے ہسپتال میں مجھے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔

میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے کہ میں کیا کروں میں جب کسی کو بتاتا ہوں کہ یہ تینوں میری جان کے دشمن ہیں تو وہ ہنستے ہیں اور مجھے پاگل سمجھتے ہیں۔۔۔ آخر لوگ میری بات پر کیوں یقین نہیں کررہے ہیں۔ میں۔۔۔ میں پاگل نہیں ہوں۔۔۔ یہ تینوں قاتل مجھے مار ڈالیں گے۔۔۔ کیونکہ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ میں ان کی ریاست کا بھاگا ہوا ایک قیدی ہوں۔۔۔ خدارا انہیں سمجھائیں کہ میں ان کی ریاست کا نہیں بلکہ اس مملکتِ خداداد کا باسی ہوں۔ مہربانی فرما کر۔۔۔ آپ لوگ میری مدد کیجئے۔۔۔ میں۔۔۔ میں آپ کو پوری داستان سناتا ہوں۔۔۔۔

وہ مئی کی ایک گرم صبح تھی، میں اپنے کام پر جانے کے لئے گھر سے نکلا، میں ایک معروف کمپنی میں سیلز آفیسر ہوں اس دن جب میں صبح گھر سے کام پر جانے کے لئے نکلا تو میری کھٹارا موٹر سائیکل نے اسٹارٹ ہونے سے انکار کردیا جب میں مسلسل موٹر سائیکل کو کک لگا لگا کر تھک گیا اور موٹر سائیکل نے اسٹارٹ نہ ہو کر دیا تو میں نے پلگ وغیرہ صاف کر کے دوبارہ موٹر سائیکل کو کک لگائی مگر موٹر سائیکل اسٹارٹ نہ ہوئی لہٰذا تھک ہار کر میں موٹر سائیکل گھسیٹ کر مکینک کی دکان تک پہنچا۔ مکینک نے میری موٹر سائیکل کو ہلا جلا کر دیکھا اور پھر موٹر سائیکل کے انجن میں خرابی بتائی۔ جس کو ٹھیک ہونے میں کم از کم چار گھنٹے لگیں گے، لہٰذا مجبوراً موٹر سائیکل مکینک کی دکان پر چھوڑ کر میں بس کے ذریعے دفتر روانہ ہوا، بس میں گنجائش سے تین گنا زیادہ مسافر سوار

تھے، بس تقریباً تر چھی ہو کر محوِ سفر تھی، بس کی ہر چیز باوا آدم کے زمانے کی تھی کوئی چیز ثابت و سالم نہ تھی سیٹوں کی گدیاں پھٹی ہوئی تھیں اور سارے شیشے ندارد تھے بس کی لوہے کی چادریں جگہ جگہ سے ٹوٹ کر خطرناک انداز میں مڑی ہوئی تھیں جو کپڑے ہی نہیں انسانی گوشت کو بھی باآسانی پھاڑ سکتی تھیں، میں جب دفتر پہنچا تو بری طرح تھک چکا تھا اور دفتر پہنچتے ہی باس نے مجھے حکم دیا کہ میں مرکزی بازار جاؤں اور وہاں کی دکانوں سے آرڈر لوں۔

شدید گرمی میں اور وہ بھی مرکزی بازار تک بنا موٹر سائیکل کے جانا بڑا جوکھم بھرا کام تھا مگر۔۔۔ حکمِ حاکم مرگ مفاجات۔۔۔ آخر بازار پہنچا اور آرڈر وغیرہ لئے۔ آرڈر وغیرہ لے کر جب میں بازار سے باہر نکلا تو دوپہر ہو چکی تھی، سورج سوا نیزے پر کھڑا آگ کے گولے برسا رہا تھا ایسا لگتا تھا جیسے سورج کو شدید غصہ آیا ہوا ہے۔۔۔

انتہائی شدید گرمی میں، میں پیدل فٹ پاتھ پر چلا جارہا تھا میرے ایڑی سے چوٹی تک پسینہ بہہ رہا تھا میرے حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے میں نے ایک ہوٹل پر پانی پینا چاہا تو پانی منہ میں رکھتے ہی میں نے کلی کردی پانی انتہائی گرم تھا۔

"پانی تو ٹھنڈا رکھا کرو۔۔۔" میں نے گلاس میز پر رکھتے ہوئے ہوٹل کے مالک سے کہا جو کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھا پیسے گن رہا تھا۔

"پچاس روپے کی منرل واٹر کی ٹھنڈی بوتل ہے وہ لیکر پی لو۔۔۔ مفت کا پانی تو ایسا ہی ملے گا۔۔۔" ہوٹل کے مالک نے ترنت جواب دیا۔

میں دل ہی دل میں ہوٹل کے مالک کو کوستا ہوا ہوٹل سے باہر نکلا، پچاس روپے کی منرل واٹر کی بوتل خریدنا میرے بجٹ سے باہر تھا، ویسے بھی یہ منرل واٹر کی عیاشی ہم جیسے غریبوں کے لئے نہیں۔ ہوٹل سے باہر نکل کر میں نے رومال سے پسینہ پونچھا اور فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر چاروں طرف نظر دوڑائی تو مجھے سڑک کے دوسری جانب ایک آرٹ گیلری کا بورڈ نظر آیا، تن بدن کو جھلسا دینے والی گرمی سے عارضی طور پر مفت نجات حاصل کرنے کا ایک طریقہ میری سمجھ میں آیا۔ آرٹ گیلریاں عموماً سنڈلی ایئر کنڈیشنڈ ہوتی ہیں لہٰذا میں نے کچھ وقت آرٹ گیلری میں گزارنے کا فیصلہ کیا۔ ویسے گرمی سے قطع نظر مجھے آرٹ سے دلچسپی بھی ہے اور میں نے اس سے پہلے کئی نمائشیں دیکھی ہیں لہٰذا میرے قدم آرٹ گیلری کے مرکزی دروازے کی جانب بڑھنے لگے۔

مرکزی دروازے سے گزر کے جب میں آرٹ

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

گیلری میں داخل ہوا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے میں جنت میں آ گیا۔ آرٹ گیلری کا ماحول باہر کے مقابلے میں کافی ٹھنڈا تھا، میں نے آرٹ گیلری کی ٹھنڈی فضا میں دو تین گہری سانسیں لیں اور باہر کی ٹھنڈی فضا کو اپنے اندر اتارنا چاہا، جب میں نے اپنے آپ کو اندر کے ٹھنڈے ماحول سے ہم آہنگ کر لیا تو میں آرٹ گیلری میں لگی تصویروں کی جانب متوجہ ہوا کسی غیر معروف آرٹسٹ کی تصاویر کی نمائش تھی اس لئے آرٹ گیلری میں لوگ بہت کم تھے میں تصاویر دیکھتا ہوا گیلری کے کونے میں چلا گیا۔ گیلری کے آخر میں ایک بڑی سی پینٹنگ لگی ہوئی تھی جس میں قرون وسطی کا زمانہ دیکھایا گیا تھا اس پینٹنگ میں ایک بادشاہ بڑے کروفر سے بیٹھا ہوا ہے اور اس کے سامنے جلاد لوگوں کو پھانسی چڑھا رہا ہے پھانسی پانے والے لوگوں کے چہروں پر موت کا خوف نمایاں ہیں جبکہ بادشاہ اور اس کے درباری نہایت رعونت کے ساتھ یہ خونی کھیل دیکھ رہے ہیں۔

پینٹنگ اتنی سحر انگیز تھی اور اتنی مہارت سے بنائی گئی تھی کہ چند منٹوں کے لئے میں پینٹنگ کے سحر میں کھو گیا، اسی وقت کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا، ہاتھ کا دباؤ محسوس کرتے ہی میں نے گھوم کر اپنے کندھے پر ہاتھ رکھنے والے کو دیکھا۔۔۔ وہ عجیب سا شخص تھا اس کا چہرہ سرخ تھا اور اس کی کھال اس طرح کھنچی ہوئی تھی جیسے کسی شخص نے اپنے سائز سے چھوٹا سوئیٹر پہن لیا ہو تو جس طرح سوئیٹر کھنچ جاتا ہے اسی طرح اس شخص کے چہرے کی کھال بھی کھنچی ہوئی تھی پھر اس شخص نے لباس بھی عجیب سا پہنا ہوا تھا ایک لمبا چغہ تھا اس کے اوپر گرم کوٹ پہنا ہوا تھا اور اس شخص کے پاس سے بڑی نامانوس سی بو آ رہی تھی جیسے۔۔۔ جیسے کافور کی گولیوں سے آتی ہیں۔

وہ شخص مجھے بہت عجیب لگا پھر بھی میں نے دنیاداری نبھاتے ہوئے اسے سلام کیا اور مصافحے کے لئے اپنا ہاتھ اس کی جانب بڑھایا مگر اس شخص نے مصافحے کے لئے بڑھا ہوا میرا ہاتھ نظر انداز کر دیا، میں نے خجالت سے اپنا ہاتھ واپس کیا اور مسکرا کر کہا۔

"آج گرمی بہت ہے، باہر کے مقابلے میں اندر کتنا اچھا لگ رہا ہے۔۔۔" میں نے بظاہر یہ جملے مسکرا کر ادا کئے تھے مگر میرا مقصد اس شخص کے لباس کا مذاق اڑانا تھا کیونکہ اس نے مصافحے کے لئے میرا بڑھا ہوا ہاتھ نظر انداز کیا تھا لہٰذا میں نے بھی اس کے لباس پر چوٹ کی۔ میرا مقصد اپنی انا کی تسکین تھا۔

"تم صرف اس لئے یہاں آئے ہو کہ باہر کی نسبت یہاں ٹھنڈک ہے۔۔۔" اس شخص نے مجھے گہری نظروں سے ٹٹولتے ہوئے پوچھا۔

"بظاہر تو بات یہی ہے۔۔۔ مگر اس سے یہ نہ سمجھ لینا کہ مجھے آرٹ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میرا چھوٹا بھائی بہت اچھا مصور ہے اس کی پینٹنگز کی کئی نمائشیں ملک اور بیرونِ ملک ہو چکی ہیں۔" میں نے اس شخص کو جواب دیا۔

"ضروری نہیں کہ اچھے مصور کے بھائی کو بھی مصوری کی سمجھ ہو۔۔۔" وہ شخص مسلسل مجھے ذلیل کر رہا تھا، اب میں بیزار ہو چکا تھا اور اس شخص سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔

"میرا نام جوزنا ہے۔۔۔" تھوڑی دیر خاموش رہ کر وہ شخص دوبارہ بولا۔۔۔ "میں قدیم مصر سے آیا ہوں۔۔۔" اتنا کہہ کر جوزنا نے اپنا ہاتھ بڑھا کے میرا ہاتھ پکڑ لیا جوزنا کا ہاتھ انتہائی ٹھنڈا تھا مجھے اپنے بدن میں ٹھنڈک کی لہر دوڑتی محسوس ہونے لگی۔

"میرا نام وجاہت ہاشمی ہے۔۔۔" میں نے جلدی سے اپنا تعارف کرایا اور جوزنا سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا کیونکہ جوزنا کے اس طرح میرا ہاتھ پکڑے رہنے سے مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میرے اندر ٹھنڈک اترتی جا رہی ہے اور اگر میں تھوڑی دیر اور جوزنا سے ہاتھ نہ چھڑاتا تو۔۔ تو شائد میرا خون ٹھنڈک کی وجہ سے جم جائے۔

"آپ نے کیا بتایا آپ قدیم مصر سے آئے ہیں۔۔۔" تھوڑی دیر بعد مجھے یاد آیا کہ جوزنا نے اپنے تعارف کے ساتھ یہ بھی کہا تھا کہ وہ قدیم مصر سے آیا ہے۔۔

"تم کسی تصویر میں کیا دیکھتے ہو۔۔؟" جوزنا نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا اور اپنی جانب سے ایک سوال داغ دیا۔

جوزنا کے اس اچانک سوال سے میں گھبرا گیا کیونکہ

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

مجھے تصویروں کے بارے میں خاص جانکاری نہیں ہے بس جو تصویر میری آنکھوں کو اچھی لگتی ہے وہ میرے لئے اچھی تصویر ہوتی ہے پھر بھی میں نے اپنا بھرم رکھنے کے لئے فلسفیانہ انداز میں اپنی ٹھوڑی پر ہاتھ پھیرا اور دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

"میں۔۔۔ میں کسی تصویر میں سب سے پہلے تو یہ دیکھتا ہوں کہ بنایا کیا گیا ہے۔۔۔ پھر یہ دیکھتا ہوں کہ مصور تصویر کے ذریعے جو پیغام دینا چاہتا تھا وہ پیغام صحیح طریقے سے لوگوں تک پہنچا ہے یا نہیں۔۔۔"

"بس یہی کچھ دیکھتے ہو تم۔۔۔" جوزنا کا لہجہ عجیب تھا۔

"ہاں۔۔۔ اور تصویر میں کیا ہوتا ہے۔۔؟" میں نے جواباً پوچھا۔

"اچھا اس تصویر میں تمہیں کیا نظر آ رہا ہے۔۔۔" جوزنا نے ایک تصویر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا، وہ تصویر قدیم مصر کے زمانے کی عکاسی کر رہی تھی جہاں ایک بادشاہ بڑے کروفر سے اپنے ہیرے جواہرات سے مزین تخت پر بیٹھا ہے اس کے سامنے پھانسی گھاٹ لگا ہوا ہے جہاں جلاد انسانوں کو پھانسی لگا رہا ہے بادشاہ کے چہرے پر مکارانہ مسکراہٹ ہے۔

"اس تصویر میں ایک بادشاہ لوگوں کو پھانسی لگوا رہا ہے۔۔۔ اور کیا ہے اس تصویر میں۔۔۔" میں نے اپنے لہجے کی تلخی چھپا نہ سکا۔

"ہاں۔۔۔ ایک سطحی سوچ کے آدمی کو اس تصویر میں یہی کچھ نظر آئے گا۔۔۔ تمہاری ذہنی سطح بہت پست ہے ورنہ یہ تصویر ایک شاہکار ہے۔۔۔" جوزنا تاسف سے سر ہلاتے ہوئے بولا

جوزنا کا جواب سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی

"تمہیں کچھ اور بھی نظر آ رہا کیا۔۔۔" میں نے انتہائی تلخ لہجے میں اس سے پوچھا تو وہ تاسف بھری نظروں سے مجھے دیکھتا رہا پھر اچانک ہنسنے لگا۔

"ناراض مت ہو میرے دوست۔۔۔ میں اس تصویر کا باسی ہوں۔۔۔ میں یہاں کی ہر تصویر دیکھ چکا ہوں۔۔۔ اس تصویر میں اصل چیز ان بے چارے پھانسی پانے والوں کے چہرے کی بے بسی ہے جو بے گناہ پھانسی پر چڑھائے جا رہے ہیں۔۔۔"

"تمہیں کیسے معلوم کہ وہ بے گناہ نہیں۔۔۔ شائد وہ گناہ گار ہوں۔۔۔" میں نے جوزنا کو زچ کرنا چاہا۔

"میں نے کہا نا کہ میں اس تصویر کا باسی ہوں۔۔۔ میں اسی تصویر کے اندر سے آیا ہوں۔۔۔ میں بخوبی جانتا ہوں کہ وہ سب بے گناہ ہیں۔۔۔" جوزنا تاسف سے سر ہلاتے ہوئے بولا

جوزنا کی بات سن کر میں ایک قدم پیچھے ہٹ گیا کیونکہ اس کی یہ بات سن کر مجھے لگ رہا تھا کہ وہ کوئی دماغی طور پر کھسکا ہوا شخص ہے۔۔ اور ایسے لوگ اکثر اوقات بہت خطرناک ہو جاتے ہیں لہٰذا اب میں سنجیدگی سے اس سے پیچھا چھڑانے کا سوچنے لگا۔

"تمہیں میری بات پر یقین نہیں ہو رہا ہے۔۔۔" جوزنا نے سختی کے ساتھ میری کلائی پکڑتے ہوئے کہا اس کی آنکھوں میں وحشت اتر آئی تھی مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی دوڑتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔

"نہیں۔۔۔ نہیں آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔۔۔ آپ اس تصویر سے ہی آئے ہو نگے۔۔۔ بس تھوڑا عجیب لگ رہا ہے یہ سن کر۔۔۔" میں نے جلدی سے جواب دیا۔۔ مجھے ڈر تھا کہیں وہ پاگل مجھ سے ناراض نہ ہو جائے کیونکہ میں نے سن رکھا تھا کہ اس طرح کے پاگل اگر ناراض ہو جائیں تو بہت خطرناک ہو جاتے ہیں۔

"ہوں۔۔۔" جوزنا نے ایک لمبی ہنکار بھری۔۔ تمہارا لہجہ چغلی کھا رہا ہے کہ تمہیں مجھ پر یقین نہیں ہے۔۔ تم مجھے دماغی طور پر کھسکا ہوا انسان سمجھ رہے ہو۔۔"

"نہیں۔۔ نہیں جوزنا بھائی۔۔۔ ایسی بات نہیں ہے مجھے آپ پر پورا یقین ہے آپ جو کہہ رہے وہ سچ ہے۔" میں نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔

"ٹھیک ہے۔۔۔ آؤ میں تمہیں اس تصویر کی سیر کرواتا ہوں۔۔۔" اتنا کہہ کر جوزنا نے میرا رخ اس تصویر کی

جانب کر دیا جہاں ایک بادشاہ انسانوں کو پھانسی پر لٹکتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ پھر جوزنا میرے برابر آ کر کھڑا ہو گیا اور میرا ہاتھ اپنے ٹھنڈے ہاتھ میں لے کر بولا

"اس تصویر کو غور سے دیکھتے رہو اور اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑ دو۔۔"

میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور اپنے بدن کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور تصویر کو غور سے دیکھنے لگا، اچانک مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا ہو۔۔ایک لمحہ۔۔صرف ایک لمحے کو ایسا محسوس ہوا پھر میں دھڑام سے زمین پر گر پڑا زمین پر گرتے ہی میں پھرتی کے ساتھ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔۔۔اب مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میرے پیروں کے نیچے گیلری کا پکا فرش نہیں ہے بلکہ میں کسی نرم زمین پر کھڑا ہوں، میں نے فوراً چاروں جانب گھوم کے دیکھا تو۔۔تو میں حیران رہ گیا میں ایک ایسے میدان میں کھڑا تھا جہاں جا بجا جھاڑیاں اور درخت اُگے ہوئے تھے، میرے پیچھے ایک بڑا سا درخت تھا جس کا تنا غیر معمولی بڑا تھا اسی وقت میں نے دیکھا کے اس درخت کے تنے میں ایک سوراخ نمودار ہوا اور اس سوراخ سے جوزنا باہر نکل کر زمین پر گر پڑا۔

"یہ۔۔۔یہ ہم کہاں آ گئے۔۔۔" میں نے بوکھلا کر جوزنا سے پوچھا۔

"ہم تصویر میں آ چکے ہیں۔۔۔آؤ میں تمہیں دکھاؤں کہ وہ ظالم بادشاہ کس طرح بے گناہوں کو پھانسی پر لٹکوا رہا ہے۔۔" جوزنا بولا

"کیا!!" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا

"ہاں۔۔ہم اس تصویر کے ذریعے قرونِ وسطیٰ کے مصر میں آ چکے ہیں، یہ وہ دور ہے جب فرعون بادشاہ بے گناہوں کو پھانسی پر لٹکواتا تھا۔

"مم۔۔۔میرا خیال ہے ہمیں فوراً واپس چلنا چاہئے کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم اسی دور میں پھنس کر رہ جائیں۔۔۔" میں نے مضبوطی کے ساتھ جوزنا کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا

"بے فکر رہو۔۔۔ہم جب چاہیں گے اس درخت کے تنے میں بنے اس سوراخ کے ذریعے بیسویں صدی میں جا سکتے ہیں۔۔"

"مم۔۔۔میں تو سمجھ رہا تھا کہ آپ۔۔۔آپ مذاق کر رہے ہیں۔ ہم سچ مچ قبل مسیح کے دور میں آ چکے ہیں۔۔۔مم۔۔مجھے ڈر لگ رہا ہے۔۔۔" میں نے خوفزدہ لہجے میں جوزنا سے کہا، میں اپنی پوری زندگی میں کبھی اتنا خوفزدہ نہیں ہوا تھا جتنا خوف مجھے اس وقت محسوس ہو رہا تھا۔

"بس ذرا فرعون بادشاہ کو دیکھ لیں کہ وہ کیا کر رہا ہے۔۔۔پھر واپس چلتے ہیں۔۔۔" اتنا کہہ کر جوزنا آگے بڑھ گیا مجھے بھی مجبوراً اس کا ساتھ دینا پڑا تھوڑی دور چلنے کے بعد میں نے دیکھا کہ فرعون بادشاہ بڑے غرور کے ساتھ ایک تخت پر براجمان ہے وہ تخت سونے کا بنا ہوا ہے جس پر ہیرے جواہرات جڑے ہوئے ہیں، فرعون بادشاہ کے دائیں اور بائیں دو خوبصورت لڑکیاں کھڑی ہوئی ہیں جنہوں نے انتہائی مختصر لباس پہنا ہوا ہے، فرعون بادشاہ کے سامنے اس کے درباری وزیر و مشیر ہاتھ باندھے ادب سے کھڑے ہوئے ہیں اور کچھ قیدی بھی کھڑے ہوئے ہیں، ان قیدیوں کے ہاتھ ان کی کمر پر بندھے ہوئے ہیں۔

میں اور جوزنا ایک جھاڑی کی آڑ میں کھڑے ہو گئے اور سامنے کا منظر دیکھنے لگے۔ ہمارے سامنے ایک جلاد نے ایک قیدی کو سر کے بالوں سے پکڑا اور اسے پھانسی گھاٹ پر لے گیا پھر اس نے قیدی کے گلے میں پھانسی کا پھندہ ڈالا، قیدی زور زور سے رو رہا تھا اور فریاد کر رہا تھا مگر وہاں اس کی فریاد سننے والا کوئی نہیں تھا جلاد نے قیدی کے گلے میں پھانسی کا پھندہ ڈالا اور بادشاہ کی جانب دیکھا، بادشاہ نے سر ہلا کر اپنی رضامندی کا اظہار کیا تو جلاد نے قیدی کے قدموں کے نیچے سے تختہ کھینچ لیا، تختہ کھینچتے ہی قیدی کے منہ سے ایک بھیانک چیخ نکلی اس کے قدم ہوا میں لہرانے لگے، پھانسی کا پھندہ اس کے گلے میں پھنس گیا قیدی کے منہ سے خرخراہٹ نکلنے لگی اس کی آنکھیں تکلیف کے مارے اپنے حلقوں سے باہر نکل آئیں وہ بری طرح تڑپ رہا تھا اس کے چہرے پر اذیت کے آثار نمایاں تھے اس کے جسم کا سارا خون اس کے چہرے پر نمودار ہو گیا تھا، سرخ چہرے کے ساتھ اس قیدی کی زبان اس کے منہ سے باہر آ گئی اس قیدی

کی ٹانگیں فضا میں زمین کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ مگر زمین اس سے دو فٹ نیچے تھی، آخر دیکھتے ہی دیکھتے اس قیدی نے دم توڑ دیا۔

"کتنا ظالم بادشاہ ہے۔۔۔"

"یہ فرعون ہے۔۔۔" جوزنا نے مجھے بتایا۔

"قدیم زمانے میں مصر کے ہر بادشاہ کو فرعون کہا جاتا تھا یہ کونسا فرعون ہے۔۔۔" میں نے ہسٹری کو یاد کرتے ہوئے جوزنا سے پوچھا۔

"رمسیس ہے۔۔" جوزنا نے مجھے بادشاہ کا نام بتایا۔

"رمسیس تو وہ فرعون تھا جس کے زمانے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے تھے۔۔۔" میں نے جوزنا سے پھر پوچھا۔

"ہاں ہم اسی دور میں ہیں۔۔۔وہ سامنے جو ٹھاٹھیں مارتا دریا بہہ رہا ہے وہ دریائے نیل ہے۔۔۔"

"وہ۔۔۔وہ دریائے نیل ہے۔۔۔" میں نے جوزنا سے پوچھا میرے لہجے میں دبا دبا جوش تھا۔

"ہاں۔۔۔"

"تو۔۔۔تو ہم حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بھی مل سکتے ہیں۔۔" میرے لہجے میں اشتیاق تھا۔

"نہیں۔۔ہم حضرت موسیٰ علیہ السلام سے نہیں مل سکتے۔۔" جوزنا بولا۔

"کیوں۔۔۔؟"

"کیونکہ ہم حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے کے دور میں آئے ہیں۔۔۔" جوزنا نے مجھے بتایا۔

"اوہ۔۔۔" میرے منہ سے نکلا۔

"یہ کون لوگ ہیں جنہیں فرعون پھانسی لگا رہا ہے۔۔" تھوڑی دیر خاموش رہ کر میں نے پھر پوچھا۔

"یہ بنی اسرائیل کے افراد ہیں۔۔۔فرعون کو اس کے نجومیوں نے بتایا ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک بچہ پیدا ہو گا جو اس کی بادشاہت کے لئے خطرہ بن جائے گا لہٰذا فرعون بنی اسرائیل کے تمام جوان افراد کو موت کے گھاٹ اتار رہا ہے۔۔۔" جوزنا نے تفصیل بتائی۔

"لیکن۔۔۔لیکن ہسٹری میں تو میں نے پڑھا ہے کہ فرعون نے بنی اسرائیل کے بچوں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔۔" میں نے ہسٹری یاد کرتے ہوئے جوزنا سے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔ان جوانوں کے بعد معصوم بچوں کی باری آئے گی۔۔" جوزنا بولا اور سامنے کی جانب دیکھنے لگا۔

"کیا۔۔۔تم بھی بنی اسرائیل سے ہو؟۔۔۔" میں نے جوزنا سے پوچھا۔

"میں ہی نہیں تم بھی بنی اسرائیل سے ہو۔۔" جوزنا بولا۔

"نہیں تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے میرا تعلق بنی اسرائیل سے نہیں ہے بلکہ میں تو راجپوت ہوں۔۔۔" میں نے جوزنا کی غلط فہمی دور کرنی چاہی

"میں تمہارا جد امجد ہوں۔۔۔بہت بعد میں تمہارے ابا واجداد نے یہاں سے ہجرت کر لی تھی۔۔۔" جوزنا بولا تو میں حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

"سامنے دیکھو۔۔" جوزنا تھوڑی دیر بعد بولا تو میں سامنے کی جانب دیکھنے لگا جہاں تمام قیدیوں کو ایک ایک کر کے پھانسی دے دی گئی تھی اور ان کی لاشیں دریائے نیل میں پھینک دی گئی تھیں، سب قیدیوں کے مرنے کے بعد اب چاروں طرف ہولناک سناٹا چھایا ہوا تھا فرعون اور اس کے درباریوں کے چہروں پر شیطانی مسکراہٹ کھیل رہی تھی

"دریائے نیل کے پار۔۔۔وہ دھند میں لپٹا سفید محل نظر آ رہا ہے تمہیں۔۔۔" تھوڑی دیر بعد جوزنا نے مجھے اشارے سے دریائے نیل کے پار ایک سفید محل کی جانب متوجہ کرتے ہوئے کہا تو میں نے غور سے اس جانب دیکھا جہاں جوزنا نے اشارہ کیا تھا۔

"ہاں۔۔۔نظر آیا۔۔بڑا شاندار محل ہے۔۔کس کا محل ہے؟" میں نے دریائے نیل کے پار دیکھتے ہوئے جوزنا سے پوچھا۔

"فرعون کا محل ہے۔۔"

"اچھا۔۔یہ وہ محل ہے جہاں سے فرعون کی بیوی آسیہ نے ننھے موسیٰ علیہ السلام کو دریائے نیل میں بہتا ہوا دیکھ کر انہیں دریا سے نکالا تھا" میں نے ایک بار پھر جوزنا سے پوچھا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"ہاں۔۔۔غور سے دیکھو تمہیں وہ جھروکا بھی نظر آئے گا جہاں سے فرعون کی بیوی آسیہ جھانک رہی تھی جب اسے ایک صندوق بہتا ہوا دکھا تھا اور اس نے جب صندوق کھولا تو حضرت موسیٰ اس صندوق میں موجود تھے۔۔" جوزنا نے مجھے بتایا تو میں نے غور سے محل کو دیکھا محل کی اوپری منزل پر مجھے وہ جھروکا نظر آیا جہاں سے فرعون کی بیوی آسیہ دریائے نیل کا نظارہ کیا کرتی تھی۔

اب میرا خوف زائل ہو چکا تھا خوف کی جگہ تجسس نے لے لی تھی میں اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھ رہا تھا کہ میں اپنی آنکھوں سے قدیم مصر کو دیکھ رہا ہوں۔

اسی وقت سامنے سے آہ وبکا کی آوازیں تیز ہو گئیں میں نے غور سے سامنے دیکھا تو لرز اٹھا فرعون کے آدمی ننھے ننھے بچوں کو اپنے ہاتھوں میں اٹھائے ہوئے چلے آرہے ہیں اور ان آدمیوں کے پیچھے ان معصوم بچوں کی مائیں روتی بلکتی چلی آرہی ہیں فرعون کے آدمیوں نے تمام بچوں کو فرعون کے سامنے میدان میں لاکر لیٹا دیا جلاد بچوں کی ماؤں کو کوڑے سے مار مار کر انہیں بچوں سے دور کر رہا تھا بچوں کی مائیں رو رہی تھیں التجائیں کر رہی تھیں مگر ظالم فرعون کا دل پتھر کا تھا اس پر ان ماؤں کی آہ وبکا کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ معصوم بچے فرعون کے سامنے زمین پر پڑے تھے ان بچوں کی معصوم چیخوں سے آسمان تک سرخ ہو گیا تھا مگر فرعون اور اس کے درباریوں کو رحم نہیں آیا ان کے چہروں پر شیطانی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

جب سب بچوں کو فرعون کے سامنے زمین پر لیٹا دیا گیا تو بائیں جانب سے ایک ہاتھی نمودار ہوا وہ بلند و بالا وحشی ہاتھی اپنی گردن دائیں بائیں ہلاتے ہوئے فرعون کے پاس آیا اس ہاتھی کے اوپر ایک شخص بیٹھا تھا فرعون کے قریب آکر وہ شخص ہاتھی سے اترا اور فرعون کے سامنے سجدے میں گر گیا فرعون نے اپنے گلے سے سچے موتیوں کی مالا نکالی اور اس شخص کی جانب اچھال دی اس شخص نے اس مالا کو کیچ کیا اور فرعون کے سامنے سجدے میں گرتے ہوئے کچھ کہنے لگا تمام درباری بھی اس کا ساتھ دے رہے تھے وہ لوگ ایسی زبان بول رہے تھے جو میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی میں نے جوزنا سے پوچھا یہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں۔

"یہ سب فرعون کی تعریفیں کر رہے ہیں۔۔" جوزنا نے مجھے بتایا پھر وہ شخص سجدے سے اٹھا اور ہاتھی کے اوپر جا بیٹھا اور وہ ہاتھی کو میدان میں لیٹے بچوں کے قریب لیکر آیا اور پھر اس نے ہاتھی کے سر پر زور سے ہاتھ مارا تو ہاتھی نے میدان میں لیٹے ایک معصوم بچے کے اوپر اپنا بھاری پیر رکھ دیا۔

"اف۔۔۔" میرے منہ سے تکلیف دہ آواز نکلی ہاتھی اپنے بھاری پیروں سے ننھے ننھے معصوم بچوں کو روندرہا تھا۔

"یہ۔۔۔یہ ظلم ہے۔۔۔" میں نے دبے لفظوں میں جوزنا سے کہا۔

"تاریخ میں اس سے بڑھ کر بھی مظالم ہو چکے ہیں۔۔" جوزنا بولا۔

"تمہیں کیسے پتا۔۔؟" میں نے جوزنا سے پوچھا۔

"میں تاریخ کے ہر دور میں جا چکا ہوں۔۔۔" جوزنا بولا۔

میں نے حیران ہو کر جوزنا کو دیکھا ادھر میدان میں ہاتھی معصوم بچوں کو پیروں تلے روندرہا تھا اور میدان کے باہر ان معصوم بچوں کے بے بس اور مجبور مائیں رو رہی تھیں اور فریاد کر رہی تھیں فرعون اور اس کے درباری قہقہے لگا رہے تھے ساتھ ہی جام بھی لٹائے جا رہے تھے مجھے سے یہ سب نہیں دیکھا جا رہا تھا مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی میرے دل کو اپنی مٹھی میں لیکر دبا رہا ہو حالانکہ ہسٹری کے مضمون میں، میں یہ سب کچھ پڑھ چکا تھا۔۔۔مگر پڑھنے اور اپنی آنکھ سے دیکھنے میں بہت فرق ہوتا ہے آج یہ سب دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ فرعون کتنا ظالم بادشاہ تھا جب ہی اللہ تعالیٰ نے فرعون کو رہتی دنیا تک کے لئے نشانِ عبرت بنا دیا ہے۔

"مجھ سے یہ سب نہیں دیکھا جا رہا ہے۔۔۔چلو یہاں سے۔۔۔" میں نے جوزنا سے کہا مگر اس سے پہلے کہ جوزنا مجھے جواب دیتا ایک کرخت آواز ابھری آواز ہمارے پیچھے سے آئی تھی ہم دونوں چونک اٹھے اور جلدی سے مڑ کر دیکھا۔۔تو ہم دھک سے رہ گئے ہم سے کچھ فاصلے پر فرعون کے تین سپاہی ہاتھوں میں تلواریں پکڑے قہر آلود نظروں سے ہمیں گھور رہے تھے۔

"بھاگو۔۔۔اگر ان سپاہیوں کے ہتھے چڑھ گئے تو موت یقینی ہے۔۔۔" جوزنا زور سے چیخا اور میرا ہاتھ پکڑ کر بھاگ کھڑا ہوا میں نے بھی جوزنا کی تقلید کی اور تیزی سے بھاگنے لگا۔

"تمہیں وہ درخت یاد ہے نا جہاں سے۔۔ہم اس دور میں آئے تھے۔۔" جوزنا نے بھاگتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

"ہاں۔۔" میں بھاگتے ہوئے اسے جواب دیا اور تیزی کے ساتھ درخت کی جانب بھاگنے لگا۔ میں بچپن میں اپنے کالج کا رننگ چیمپئن رہ چکا ہوں لہٰذا میں کافی تیز بھاگ رہا تھا مگر جوزنا کی رفتار زیادہ تیز نہ تھی میں بھاگتے ہوئے درخت کے قریب پہنچ گیا اس درخت کے تنے میں بنا ہوا سوراخ مجھے صاف نظر آرہا تھا میں سوراخ کے قریب پہنچ کر رکا اور میں نے مڑ کر دیکھا فرعون کے سپاہی جوزنا کے بہت قریب پہنچ چکے تھے۔

"جوزنا۔۔اپنا ہاتھ دو۔۔" میں نے سوراخ میں اترتے ہوئے جوزنا سے کہا تو جوزنا نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا میں نے اس کا ہاتھ تھاما اور اسے گھسیٹنا ہی چاہتا تھا کہ فرعون کے ایک سپاہی نے اپنی تلوار زور سے جوزنا کی گردن پر ماری جوزنا کی گردن اس کے دھڑ سے الگ ہو کر زمین پر گر پڑی اور جوزنا کا ہاتھ میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور میں دھڑام سے نیچے گر پڑا۔

نیچے گرتے ہی میں جلدی سے اٹھا۔۔تو میں حیران رہ گیا۔۔میں۔۔میں آرٹ گیلری کے فرش پر پڑا تھا میں نے نظر اٹھا کر دیوار پر بنی پینٹنگ کی جانب دیکھا جس کے ذریعے میں مصر کے قدیم دور میں گیا تھا۔۔تو میں ششدر رہ گیا کیونکہ اب اس پینٹنگ میں جوزنا کی لاش بھی نظر آرہی تھی جس کی کٹی ہوئی گردن اس کے دھڑ سے تھوڑے فاصلے پر زمین پر پڑی ہوئی تھی اور فرعون کے تینوں سپاہی اس کی لاش کے گرد جمع تھے۔

یہ دیکھ کر میں لرز اٹھا اور فوراً وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا، لمبی راہداری کے آخری سرے پر رک کر میں نے مڑ کر دیکھا۔۔تو خوف سے میں ایک بار پھر لرز اٹھا کیونکہ فرعون کے تینوں سپاہی پینٹنگ سے نکل کر آرٹ گیلری کے فرش پر کھڑے تھے، مجھے اپنی جانب دیکھتا پا کر ان تینوں نے اپنے دانت نکوسے اور چیختے ہوئے میرے پیچھے بھاگے، میں بھی چیختا ہوا وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔

مجھے یقین ہے کہ جلد یا بدیر فرعون کے سپاہی مجھے ڈھونڈ نکالیں گے اور پھر وہ اپنی تلواروں سے میرا سر میرے دھڑ سے الگ کر دیں گے۔۔۔۔۔۔میں جب یہ داستان کسی کو سناتا ہوں تو سب مجھے پاگل سمجھتے ہیں حتیٰ کہ میری بیوی بھی میری بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں ہے، ڈاکٹر بھی کہتے ہیں کہ میں نے کوئی خواب دیکھا ہے، جس کا اثر میرے دماغ پر ہو گیا ہے۔۔میں

لوگوں کو کیسے یقین دلاؤں۔۔۔اکثر میں سوچتا ہوں شائد ڈاکٹر صحیح کہہ رہے ہوں یہ سب میرا خیال ہو، میں نے واقعی کوئی خواب دیکھا ہو۔۔۔

مگر مجھے وہ انگوٹھی یقین دلاتی ہے کہ میں جوزنا کے ساتھ فرعون کے دور میں جا چکا ہوں، وہ انگوٹھی جوزنا کی ہے جب جوزنا نے درخت کے سوراخ میں داخل ہونے کے لئے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دیا تھا تو وہ انگوٹھی جوزنا کی انگلی سے نکل کر میرے ہاتھ میں آگئی تھی، قدیم مصری تہذیب کی وہ انگوٹھی نہایت قیمتی ہے۔مگر میں نے اس انگوٹھی کے بارے میں کسی کو نہیں بتایا ورنہ کہیں لوگ مجھے چور نہ سمجھ بیٹھیں۔

فرعون کے سپاہی مجھے کئی بار نظر آئے وہ ہاتھ میں ننگی تلوار لئے مجھے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔آخر میں ان سے کب تک بچوں گا۔

ایک نہ ایک دن وہ مجھے ڈھونڈ نکالیں گے پھر ۔۔۔پھر کیا ہو گا۔۔۔۔۔اوہ۔۔۔کوئی تو میری بات سمجھے اور مجھ پر یقین کرے۔

مجھے امید ہے آپ۔۔۔آپ لوگ میری بات پر یقین کریں گے اور میری مدد کریں گے۔۔۔پلیز! پلیز! جلدی کرے فرعون کے سپاہیوں نے مجھے دیکھ لیا ہے۔۔وہ۔۔میری جانب بڑھے چلے آرہے ہیں۔۔پلیز جلدی کیجئے۔۔۔۔ورنہ۔۔ورنہ وہ مجھے مار ڈالیں گے۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

حقیقی رنگ

مریم فاطمہ۔کراچی

اپنے دام میں خود صیاد آگیا، اسی کے مصداق یہ کہانی اپنے پڑھنے والوں کو ہولے ہولے دل گداز اور دل فریب لمحات سے یقینا دو چار کرکے انہونی ہونے کا پرچار کرے گی اور پھر.....

خراماں خراماں دل و دماغ پر فرحت بخشتی چاہت و خلوص کی خوبصورت انمٹ کہانی

شازیہ گاڑی کا دروازہ بند کرکے باہر نکلی اور سامنے آرٹ گیلری میں داخل ہوئی تو گیلری میں لگی ایک سے بڑھ کر ایک تصویریں دیکھ کر حیران رہ گئی، حیرانی کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہاں موجود ساری تصویریں اپنی مثال آپ تھیں، تصویروں میں مار دھاڑ کے مناظر زیادہ تھے، جیسے ایک تصویر میں دکھایا گیا تھا کہ ایک لڑکا جو کہ قیدی ہے اسے رسیوں سے باندھ کر پیا سا رکھا ہوا ہے، تصویروں کے نیچے کیپشن بھی موجود تھا، ایسی ہی بے شمار تصویریں تھیں، شازیہ کو تصویریں بنانے والی مصورہ کی سوچ پر حیرت ہو رہی تھی جب وہ ساری تصویریں دیکھ چکی تو سب سے آخر میں وہ ان شاہکار تصویریں بنانے والی مصورہ سے ملی، اس کے آٹو گراف لئے اور مصورہ سے بات کرکے وہ پھولی نہ سما رہی تھی۔

''مس رینا بڑا پیارا نام ہے آپ کا۔ اس کا مطلب کیا ہے؟''

رینا ہنستے ہوئے بولی۔ ''اس کا مطلب ملکہ ہے۔''

یہ سن کر شازیہ اور بھی خوش ہوئی۔ ''آپ نے یہ سب کیسے کیا؟ میرا مطلب آپ کے کام میں حقیقت جھلکتی ہے جیسی تصویریں آپ نے بنائی ہیں، ان تصویریوں میں جیسے جان پڑ گئی ہے بالکل منفرد سوچ ہے آپ کی کنتاہٹ کر سوچتی ہیں آپ۔'' شازیہ نے کہا۔

''بہت بہت شکریہ اور ویسے بھی یہ عام پینٹنگز جو مصور بناتے ہیں، کلیوں کی پھولوں کی، باغات کی، بھلا انہیں دیکھنے کا آج کل کسے شوق رہا ہے۔'' رینا نے کہا۔

''مس رینا ایک خاص بات جو آپ کی تصویروں میں نظر آتی ہے وہ یہ کہ آپ کی تصویریں بالکل حقیقی لگتی ہیں۔'' شازیہ نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔

رینا دھیرے سے ہنسی پھر بولی۔ ''کسی ماہر اور فینس مصور کی بنائی ہوئی تصویر ہمیشہ حقیقی لگتی ہیں، یہ تو اس پر ہے کہ مصور کی سوچ کتنی اچھی ہے اور اس کے ہاتھ میں کتنی پختگی ہے۔''

''آپ صحیح کہتی ہیں مس رینا، میں بھی مستقبل میں آپ جیسی ہی مصورہ بننا چاہتی ہوں، لہٰذا مجھے بھی پینٹنگز کا وہ جادو جو آپ کے پاس ہے سکھا دیں۔'' شازیہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''رینا ہنسنے لگی۔ ''ویسے تو ایسا کوئی جادو نہیں ہوتا لیکن خوش قسمتی سے میرے پاس ہے۔''

شازیہ نے چونک کر پلکیں اٹھائیں۔ ''کیا سچ میں؟''

''ہاں بالکل سچ۔''

''دکھایئے مجھے بھی وہ جادو پلیز! جلدی، میں

دیکھنا چاہتی ہوں۔'' شازیہ بچوں کی طرح ضد کرنے لگی۔

''ارے بھئی اتنی جلدی کیا ہے۔ اس کے لئے سب سے پہلے تو تمہیں میرے گھر چلنا ہوگا یہاں سے بہت دور ہے، ڈرائیو کرکے جائیں گے تو ایک گھنٹہ لگے گا۔ وہیں تمہیں سکھاؤں گی وہ جادو۔'' رینا بول کر چپ ہوئی تو شازیہ فوراً سے بولی۔ ''ٹھہریئے میں ذرا اپنے منگیتر کو فون کرلوں، اسے بتادوں کہ میں آپ کے ساتھ جا رہی ہوں، آج رات اس کے ساتھ ڈنر نہیں کرسکوں گی۔''

''ٹھیک ہے جیسے مناسب سمجھو۔'' رینا نے کہا۔

پھر شازیہ نے اپنے منگیتر کو فون کیا اسے ساری کہانی سنائی پھر فون بند کرکے وہ رینا کے ساتھ اس کی گاڑی میں بیٹھ کر انجان منزل کی طرف چل پڑی۔ کافی لمبی ڈرائیونگ کے بعد وہ دونوں ایک بنگلے کے سامنے رکیں یہاں آس پاس آبادی بالکل نہیں تھی رینا اسے لے کر اندر بنگلے میں آ گئی، وہاں پہنچتے ہی وہ اسے سیدھا ایک کمرے میں لے گئی، وہاں پر ایک اسٹریچر ٹائپ میز بچھی تھی جس میں بیلٹیں وغیرہ لگی ہوئی تھیں۔

''یہ کیا ہے؟'' شازیہ نے فوراً سوال کیا۔

رینا قہقہہ لگا کر ہنسنے لگی۔ ''ہر کوئی یہی پوچھتا ہے کہ یہ کیا ہے۔'' پھر اچانک اس نے ہنسنا بند کردیا پھر بولی۔ ''ایسا کرتے ہیں کہ گرمی زیادہ ہے پہلے ٹھنڈا وغیرہ پیتے ہیں اس کے بعد تمہارا سبق شروع ہوگا، تم یہاں بیٹھو میں کولڈ رنگ لے کر آتی ہوں۔'' اور رینا وہاں سے چلی گئی جب واپس آئی تو ٹرے میں دو گلاس میں سرخ رنگ کا مشروب تھا اس نے ایک گلاس شازیہ کی طرف بڑھا دیا اور دوسرا گلاس خود لے کر بیٹھ گئی۔ ٹھنڈا پیتے ہی شازیہ پر غنودگی طاری ہونے لگی اور وہ بے سدھ ہوگئی تو رینا نے اسے اٹھایا اور اسٹریچر پر لٹا کر بیلٹیں باندھ دیں۔

جب شازیہ کو ہوش آیا تو وہ اسٹریچر پر جکڑی پڑی تھی وہ ہل جل بھی نہیں سکتی تھی اسے بیلٹوں سے جکڑ کر باندھ دیا گیا تھا۔

شازیہ نیم بے ہوشی کی حالت میں کچھ بڑبڑا رہی تھی۔ ''اٹھو نیند میں کیا بکے جا رہی ہو؟''

شازیہ کی آنکھوں کے سامنے سے آہستہ آہستہ کرکے اندھیرا چھٹ گیا اور اسے سب کچھ نظر آنے لگا۔ ''یہ میں کہاں ہوں؟ مجھے کیا ہوا ہے؟'' اس نے بوکھلا کر پوچھا۔

''تم نے میرے ساتھ کیا کیا؟'' اب کی بار وہ روتے ہوئے بولی۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk
Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

''گھبراتی کیوں ہو؟ جادو سیکھنا ہے تو اذیت برداشت کرنی پڑے گی۔''

''ذلیل کمینی!'' اس سے پہلے کہ شازیہ مزید گالیاں دیتی ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے منہ پر پڑا۔ ''اپنا منہ بند رکھو سمجھی؟ یہ میرا گھر ہے کچھ اندازہ ہے تمہیں اس وقت کس سے بات کر رہی ہو۔ یہ میں ہوں رینا، اس ملک کی سب سے مشہور مصورہ، لوگ مجھ سے پیار کرتے ہیں، میری عزت کرتے ہیں۔'' رینا اپنے جاہ وجلال میں آ گئی تھی۔

''پلیز! مجھے جانے دو، میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔ کہ یہاں کیا ہوا۔ بس تم مجھے جانے دو۔'' شازیہ روتے ہوئے بولی۔

''چلی جانا۔ لیکن اس سے پہلے میں تمہیں دکھاؤں گی کہ میں تصویر کیسے بناتی ہوں۔'' اتنا کہہ کر رینا نے ایک بلیڈ لے کر شازیہ کی کلائیاں کاٹیں تو خون نکلنے لگا۔

اس خون کو اس نے ایک برتن میں جمع کر لیا پھر کینوس پر تصویر بنائی جس میں یہ دکھایا گیا تھا کہ ''ایک لڑکی کے سینے میں چھرا گھونپا جا رہا ہے۔'' جہاں جہاں سرخ رنگ استعمال ہوا تھا وہاں رینا نے شازیہ کا خون استعمال کیا تھا۔

جب تصویر بن چکی تو وہ حیرت انگیز طور پر بالکل حقیقی لگ رہی تھی۔ ''کیوں؟ لگ رہی ہے نہ بالکل اصلی، لیکن یہ سب یونہی نہیں ہو گیا یہ کمال ہے اس منتر کا جو میں نے تمہارے خون پر پڑھ کر پھونکا تھا۔ اسی کی بدولت یہ تصویر ایسی بن سکی ہے ورنہ کوئی دنیا کا بڑے سے بڑا جادوگر بھی اس تصویر میں حقیقت کا رنگ نہیں بھر سکتا، اب یہ جادو مجھے کہاں سے پتہ چلا یہ جاننے کے لئے تم ابھی بہت چھوٹی ہو تھوڑی بڑی ہو جاؤ پھر بتاؤں گی۔'' رینا نے آخری جملہ ہنس کر کہا اور اٹھ کر چلی گئی۔

وہ رات شازیہ نے کانٹوں پر گزاری، طرح طرح کے وسوسے اور اندیشے اس کے ذہن میں آتے رہے۔ ''یہ لڑکی آخر کرنا کیا چاہتی ہے اس کا مقصد کیا ہے؟'' خوف کے مارے وہ اسٹریچر پر خون کے آنسو روتی رہی، وہ ماہی بے آب رہی۔ اگلی صبح رینا وہیں اس کے سامنے بیٹھ کر ناشتہ کرنے لگی پھر اس نے شازیہ کو بھی کھلانا چاہا لیکن اس نے کھانے سے صاف انکار کر دیا۔ ''مجھے بھوک نہیں ہے۔''

''کھالو میری پیاری اس طرح سے تو تمہارے جسم سے خون کم ہو جائے گا اور مجھے اس کی بے حد شدید ضرورت ہے۔'' رینا بڑی اپنائیت سے بولی۔

''بکواس بند کرو کیوں چاہئے تمہیں میرا خون؟ کیا چاہتی ہو تم؟'' شازیہ چیخی۔

رینا ہنسنے لگی۔ ''اب بھی نہیں سمجھیں بڑی بھولی ہو، مطلب صاف ظاہر ہے، اپنی تصویریں بنانے کے لئے مجھے تمہارا خون درکار ہے۔'' رینا بولی تو اچانک ہی شازیہ کی نظر اپنی کلائیوں پر پڑی۔ وہ زخم حیرت انگیز طور پر بھر چکے تھے اسے حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا۔

رینا نے اسے اس طرح حیران ہوتے ہوئے دیکھا تو پراسرار انداز میں ہنسنے لگی۔ ''یہ بھی ایک جادو ہے۔ لیکن تم نہیں سمجھو گی۔''

''مجھے کب تک یہاں رہنا ہوگا؟'' شازیہ نے پوچھا۔

رینا مسکرائی۔ ''دیکھو جب تک کوئی دوسرا قربانی کا بکرا نہیں مل جاتا۔'' اس نے کندھے اچکائے۔

''بڑی کمینی ہو تم۔'' شازیہ نے غصے سے دانت بھینچے۔

''زیادہ غصہ مت دکھاؤ شازیہ۔ غصہ کرنا مجھے بھی آتا ہے۔ مگر ایک بار میں غصے، میں آ گئی تو اس وقت تم ایسی حالت میں نہیں ہو کہ مجھے سنبھال پاؤ گی۔'' رینا نے کرخت لہجے میں کہا۔

''لیکن تم ایسا کیوں کر رہی ہو، اس کے بغیر بھی تم بہت اچھی مصورہ ہو۔ میں نے جب سے تمہارے کام کو دیکھا ہے اس کی تعریف کی ہے پورا ملک تمہیں جانتا ہے۔ کل کو پوری دنیا تمہارے کام کو مانے گی مجھے جانے دو، رینا سچ کہے دیتی ہوں تمہیں یہ سب کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' شازیہ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

لیکن الٹا اثر ہوا۔ ''کیا کرنے کی ضرورت ہے

اور کیا نہیں یہ تم مجھے مت سکھاؤ، بس اتنا یاد رکھو کہ تمہاری ان فضول باتوں کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوگا اگر اپنی سلامتی چاہتی ہو تو اپنا منہ بند رکھو۔'' رینا نے گھور کر کہا۔

''تم پوری پاگل ہو اگر تمہیں لگتا ہے کہ اس طریقے سے تم ایک اچھی مصورہ بن سکتی ہو تو یہ تمہاری بھول ہے جس طریقے سے تم تصویریں بنا رہی ہو اس سے کچھ حاصل نہیں ہے! بڑی بے وقوف تھی میں جو تمہاری بنائی ہوئی پینٹنگز کی تعریف کی، تم سے لاکھ درجے اچھی تصویریں تو کوئی بچہ ہی بنائے گا کم از کم وہ پیار سے تو بنائی گئی ہوں گی۔'' شازیہ نے تیز لہجے میں جواب دیا۔

''بس بہت ہو گیا۔ اس سے آگے اب ایک لفظ مت بولنا ورنہ تمہاری زبان کھینچ لوں گی میں نے اپنی برائی سننا سیکھا ہے اور نہ ہی مجھ میں اپنی برائی سننے کی عادت ہے سمجھیں۔''

رینا غصے سے کھولتے ہوئے بولی اور پلٹ کر باہر نکل گئی۔

شازیہ نے اندازہ لگا لیا تھا کہ رینا وہ لڑکی ہے جو اپنی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے کوئی بھی غلط کام کر سکتی ہے وہ واقعی پوری طرح شیطانی سوچ رکھنے والی لڑکی تھی بظاہر سب سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے والی لڑکی اندر سے ایسی ہوگی یہ اس نے سوچا بھی نہیں تھا واقعی دنیا کتنی ظالم ہے۔

پھر اچانک اسے اپنے منگیتر کا خیال آ گیا تو آنکھیں بھیگ گئیں، پھر وہ وہاں سے فرار کا کوئی راستہ ڈھونڈنے لگی۔

بڑی دیر تک وہ خود کو اس اسٹریچر سے چھڑانے کی کوشش کرتی رہی لیکن بے سود، تھک ہار کر اس کی آنکھ لگ گئی۔

دوسری طرف شازیہ کے گھر والے بہت پریشان تھے وہ کل دوپہر سے غائب تھی اور اب شام ہونے لگی تھی اس کے گھر میں تو جیسے قیامت ہی آ گئی تھی۔ پولیس میں بھی رپورٹ درج کروائی لیکن پولیس بھی اب تک اس کا کچھ پتہ نہ لگا سکی تھی۔

☆.....☆.....☆

بچوں کی اسلامی کتابیں

حضرت محمد ﷺ	اسلم راہی	25/-
حضرت آدم علیہ السلام	اسلم راہی	25/-
حضرت ایوب علیہ السلام	اسلم راہی	25/-
حضرت داؤد علیہ السلام	اسلم راہی	25/-
حضرت عیسیٰ علیہ السلام	اسلم راہی	25/-
حضرت ابراہیم علیہ السلام	اسلم راہی	25/-
حضرت اسماعیل علیہ السلام	اسلم راہی	25/-
حضرت لوط علیہ السلام	اسلم راہی	25/-
حضرت موسیٰ علیہ السلام	اسلم راہی	25/-
حضرت نوح علیہ السلام	اسلم راہی	25/-
حضرت سلیمان علیہ السلام	اسلم راہی	25/-
حضرت یوسف علیہ السلام	اسلم راہی	25/-
حضرت عزیر علیہ السلام	اسلم راہی	25/-
حضرت ہود علیہ السلام	اسلم راہی	25/-
حضرت الیاس علیہ السلام	اسلم راہی	25/-
حضرت یونس علیہ السلام	اسلم راہی	25/-
حضرت صالح علیہ السلام	اسلم راہی	25/-
حضرت شعیب علیہ السلام	اسلم راہی	25/-
حضرت زکریا علیہ السلام	اسلم راہی	25/-
حضرت یحییٰ علیہ السلام	اسلم راہی	25/-

دعا بک کارنر منشی محلہ امین پور بازار گلی نمبر 5 فیصل آباد
فون نمبر: 041-2640013

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

شام تک رینا گھر پہنچی اس نے آتے ہی اپنا پرس ایک طرف اچھالا اور تیزی سے چلتی ہوئی شازیہ کے کمرے میں آئی۔ ''گڈ ایوننگ! کیا ہو رہا ہے؟ لگتا ہے کافی جدوجہد کرتی رہی ہو تم خود کو اس اسٹریچر سے آزاد کرانے کی جب ہی تو اس کی ایک بیلٹ لوز ہو رہی ہے۔'' رینا نے آگے بڑھ کر بیلٹ دوبارہ سے کس دی۔ ''دیکھو میری بات سنو اپنی یہ بچوں کی سی کوشش چھوڑ دو۔ اس طرح تم کبھی یہاں سے نہیں نکل پاؤ گی۔ لوشاباش کچھ کھالو ورنہ کمزور ہو جاؤ گی۔''

شازیہ پر اب نقاہت اور غنودگی طاری ہونے لگی تھی اس نے تھوڑا سا کھا ہی لیا۔

اس کے بعد رینا نے وہی بلیڈ نکالا اور ایک بار پھر شازیہ کی کلائیوں پر کٹ لگایا اور ایک برتن میں خون جمع کیا اور اس خون سے کینوس پر تصویر بنانے لگی تصویر بہت زبردست تھی اس کے بعد اس نے اس میں رنگ بھرے سرخ رنگ ڈالتے ہی اس تصویر میں جیسے جان سی پڑ گئی۔

وہ تصویر وحشی پن کا ثبوت لگ رہی تھی، رینا نے شازیہ کی طرف مسکرا کر دیکھا جیسے پوچھنا چاہ رہی ہو کہ تصویر کیسی لگی؟ لیکن شازیہ بغیر پلک جھپکائے اسے ہی دیکھتی رہی۔

جب کافی دیر گزر گئی تو رینا کو فکر سی ہوئی وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور جا کر شازیہ کو دیکھنے لگی وہ جیسے ہی اس پر جھکی شازیہ نے بڑے زور سے اپنا سر اس کے سر سے ٹکرا دیا۔ جس کے نتیجے میں دونوں کے سروں سے خون نکل آیا۔

رینا بری طرح چکرا کر رہ گئی اس کے ساتھ ہی شازیہ نے اپنا ایک ہاتھ بیلٹ سے نکال لیا جسے وہ بڑی دیر سے کوشش کر کے ڈھیلا کر چکی تھی اور پھر اس نے رینا کے سنبھلنے سے پہلے جلدی جلدی اپنا دوسرا ہاتھ بھی آزاد کر لیا اور پھر اپنے پاؤں بھی کھولنے لگی۔ عجیب بدحواسی کا عالم تھا، وہ جلدی سے اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی کہ اچانک رینا اس پر جھپٹ پڑی۔ ''چڑیل، ڈائن۔'' وہ غصے سے چیخی۔

''ڈائن میں نہیں تم ہو۔'' شازیہ نے دوبدو جواب دیا۔

دونوں ایک دوسرے سے بری طرح لڑ رہی تھیں، رینا کی برداشت بس یہیں تک تھی اس نے پوری قوت سے شازیہ کو زمین پر دھکا دیا تو شازیہ کا پاؤں مڑ گیا اور وہ ایک چیخ کے ساتھ اپنا پیر پکڑنے لگی اس سے اب مزید چلا نہ جاتا تھا سو وہ زمین پر پڑی کراہتی رہی۔

رینا نے اسے اٹھا کر دوبارہ اسٹریچر پر ڈال دیا اور کس کر بیلٹیں باندھ دیں۔

شازیہ اپنی قسمت کو رونے لگی رینا کا موڈ الگ سخت خراب ہو گیا تھا۔ ''بہت نرمی کر لی میں نے تمہارے ساتھ، اب تمہیں اپنا اصل روپ دکھانا پڑے گا۔'' اس کے ساتھ ہی رینا نے اس کے رونے کی آوازیں بند کرنے کے لئے کلوروفارم اسے سونگھا دیا اور پھر دھب دھب کرتی اپنے کمرے میں چلی گئی اس کا مارے غصے کے برا حال تھا یہ لڑکی شازیہ اس کی سوچ سے بڑھ کر تیز نکلی تھی۔ وہ اس سارے جھمیلے سے تھک گئی تھی سو جلد ہی وہ نیند کی آغوش میں چلی گئی۔

اگلی صبح بیدار ہوئی تو رات والا واقعہ یاد کر کے غصہ ایک بار پھر آنے لگا، اس کا اس وقت شازیہ کے پاس جانے کا بالکل دل نہیں کر رہا تھا، سو اس نے وہاں نہ جانے میں ہی عافیت سمجھی۔

رینا جلدی جلدی تیار ہو کر آرٹ گیلری پہنچی وہاں ڈھیروں لوگ اس کی پینٹنگز دیکھ رہے تھے، وہ اپنی مخصوص جگہ جا کر بیٹھ گئی۔ اتنے میں ایک بہت ہینڈسم سا نوجوان چلتا ہوا اس کے پاس آیا اور اسے دیکھتے ہی بولا۔ ''آپ کا کام واقعی لاجواب ہے۔''

رینا اپنے مخصوص انداز میں ہنستے ہوئے بولی۔ ''شکریہ۔''

''ارے نہیں نہیں اس میں شکریہ کی کیا بات ہے میں نے آپ کی بنائی ہوئی پینٹنگز کو دیکھا اور آپ کو دیکھا اور آپ کو معلوم ہے؟ مجھے آپ زیادہ خوب صورت لگیں میں آپ کو پسند کرنے لگا ہوں۔'' اس نوجوان نے ذرا ڈرتے ہوئے کہا۔

''پسند کرنے لگے ہو اور ڈرتے بھی ہو، تم سے

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

پہلے بھی کتنے فلرٹ دیکھے ہیں میں نے۔'' رینا عجیب کھوئے ہوئے لہجے میں بولی۔

''نہیں نہیں ایسا کچھ نہیں ہے، آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔'' وہ جلدی سے صفائی پیش کرنے لگا۔

''میں کیا سمجھ رہی ہوں وہ تو میں تمہیں ابھی بتاتی ہوں گارڈ۔'' اس نے آواز لگائی۔

اب تو وہ نوجوان بوکھلایا اور رینا پیار سے ہنس دی۔ ''ارے مرد ہو کر لڑکی سے ڈر گئے، میں تو مذاق کر رہی تھی یہاں دور دور تک کوئی گارڈ نہیں ہے۔''

وہ لڑکا تھوڑا سا شرمندہ دکھائی دینے لگا تو رینا اور بھی لگاوٹ سے بولی۔ ''کوئی بات نہیں مجھے بھی تم اچھے لگے ہو، تھوڑے بدھو ہو لیکن چلے گا۔'' رینا خوش ہو گئی تھی۔ اسے وہ لڑکا پہلی بار میں ہی پسند آ گیا تھا اس کی وجہ ہی کچھ ایسی تھی اسے زندگی میں کبھی پیار نہیں مل سکا تھا اس کے ماں باپ خودغرضی کے ساتھ ساتھ ظالم بھی تھے وہ ہر وقت آپس میں لڑائی جھگڑا کرتے رہتے اور اس پر کوئی توجہ نہ دیتے۔ اس کی ماں اسے بلاوجہ مارتی پیٹتی رہتی باپ بھی ہر وقت برا بھلا کہتا رہتا۔

رینا ایسی زندگی سے تنگ تھی پھر ایک دن جب وہ سترہ سال کی ہوئی تو اسے ایک عورت ملی اس نے اسے یہ شیطانی کھیل سکھایا تو رینا نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ایک مصورہ بنے گی، سب سے پہلے تو اس نے اپنے ماں باپ سے، بدلہ لینے کی ٹھانی لیکن پھر یہ سوچ کر رک گئی کہ چلو جیسے بھی سہی وہ ہیں تو اس کے ماں باپ ہی ناں! اور ان ہی کی بدولت وہ اس دنیا میں آئی ہے لیکن نہیں اس دنیا میں آ کر اس نے کتنی تکلیفیں جھیلی ہیں وہ بھی صرف ان کی وجہ سے وہ انہیں کبھی معاف نہیں کرے گی اور پھر اس پر ایک جنون سا سوار ہو گیا لیکن وہ اپنے والدین کے ساتھ کچھ برا کرتی کہ اتفاق سے وہ ایکسیڈنٹ میں ہلاک ہو گئے۔

آج جب اس لڑکے نے اتنے پیار سے اس سے بات کی تو وہ اس کی طرف کھنچی چلی گئی شاید کوئی جادو اس لڑکے کے پاس بھی تھا۔ اچانک ہی رینا پرانی یادوں سے باہر آئی اور بولی۔ ''اور اب میں تمہارا نام پوچھ سکتی ہوں؟'' اس نے ایک ادا سے پوچھا۔

''میرا نام یاسر ہے۔ مس رینا یہ تو بتائیے کہ آپ کے کام میں اتنی حقیقت جھلکتی ہے آخر یہ سب کیسے؟'' یاسر نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

رینا ہنسنے لگی پھر بولی۔ ''پہلے تو تم مجھے اب سے مس رینا کہنے کی بجائے صرف رینا کہو گے ٹھیک ہے۔''

''جی ٹھیک ہے۔'' اس نے بالکل لڑکیوں کی طرح شرماتے ہوئے کہا۔

رینا نے زور کا قہقہہ لگایا۔ ''ارے بس کرو یار کیسے لڑکیوں کی طرح شرماتے ہو تم لڑکیوں کے کام لڑکیوں پر ہی چھوڑ دو تو زیادہ اچھا ہے۔''

یاسر مسکرانے لگا۔ ''مگر اب تک آپ نے اپنا وہ جادو نہیں سکھایا جس سے آپ اتنی شاندار پینٹنگز بنا لیتی ہیں۔'' یاسر نے کہا۔

تو رینا نے ایک سرد آہ بھری اور بولی۔ ''یاسر وعدہ کرو کہ تم وہ جادو جاننے کے بعد بھی مجھے نہیں چھوڑو گے۔ وعدہ کرو پلیز۔'' پہلی بار رینا کے لہجے میں التجا در آئی۔

''وعدہ کرتا ہوں۔'' یاسر نے اس کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے تھام لئے۔

''تو بس پھر ٹھیک ہے۔ میں بھی فارغ ہوں اور تم بھی شاید فارغ ہو گے، میرے گھر چلو۔''

''آپ کے لئے تو میں ہر وقت حاضر ہوں۔'' یاسر نے کہا۔

''اوہ گاڈ: میں تمہارا سر پھاڑ دوں گی پھر وہی مس اور مجھے آپ نہیں تم کہو۔'' رینا نے کھلکھلاتے ہوئے کہا۔

''جی جیسے آپ کی مرضی۔'' یاسر بڑی فرمانبرداری سے بولا۔

''اف اللہ یہ لڑکا تو مجھے پاگل کر کے ہی چھوڑے گا۔ ارے بھئی یہ کیا آپ جناب لگا رکھی ہے جیسے میں کہتی ہوں ویسے بات کرو، ورنہ میں تو تراخ پراتر آؤں گی سمجھے۔'' رینا ہنستے چلی جا رہی تھی اس کے ساتھ ہی رینا

نے یاسر کا ہاتھ پکڑا اور اسے لے کر اپنے گھر تک آ گئی۔

گھر میں آ کر اس نے اسے سب کچھ بتا دیا پہلے تو رینا کا خیال تھا کہ یہ سب کچھ سننے کے بعد وہ شاید اسے مزید پسند نہ کرے لیکن یہاں تو الٹا حساب تھا یا سر کے لبوں پر شیطانی مسکراہٹ رقص کرنے لگی اور پھر وہ بولا۔

''جلدی سے دکھاؤ وہ جادو۔'' رینا تو یہ سنتے ہی جیسے خوشی سے دیوانی ہوگئی اور یاسر کو لے کر وہاں آئی جہاں شازیہ اسٹریچر پر پڑی تھی۔

شازیہ کی آنکھیں بند تھیں اور اس کے منہ پر ٹیپ چپکی ہوئی تھی۔

رینا نے اس کے گال پر تھپکی دی تو شازیہ نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں اور پھر یاسر پر نگاہ پڑتے ہی گھٹی گھٹی سی آوازیں نکالنے لگی جیسے مدد کے لئے بلا رہی ہو۔

یاسر نے شازیہ کی طرف دیکھا اور پھر بولا۔ ''رینا میں بھی ایک تصویر بنانا چاہتا ہوں۔''

رینا نے اسے کینوس دیا اور اس نے تصویر بنائی پھر شازیہ کی طرف طنزیہ انداز میں دیکھا اور کہنے لگا۔ ''رینا مجھے رنگ بھرنے کے لئے بلیڈ چاہئے۔'' رینا نے جھٹ اسے بلیڈ نکال کر دیا۔

یاسر نے رینا کے ہاتھ سے بلیڈ لیا اور پھر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ''رینا کیا تم مجھے کبھی بھی کسی تکلیف میں دیکھنا چاہتی ہو؟''

''بالکل نہیں۔'' رینا نے قدرے جذباتی ہو کر جواب دیا۔

''لیکن میں تمہیں تکلیف میں دیکھنا چاہتا ہوں۔'' اس کے ساتھ ہی یاسر نے رینا کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور اسے بے بس کر کے اس کی کلائیاں کاٹ کر خون ایک برتن میں جمع کیا اور پھر اسے ایک دوسرے اسٹریچر پر لٹا کر بیلٹ باندھ دیا۔

''یاسر یہ تم کیا کر رہے ہو؟ کون ہو تم؟' رینا خوف زدہ لہجے میں بولی۔

''میں اس لڑکی کا منگیتر ہوں جس دن یہ آرٹ گیلری سے غائب ہوئی تھی میں وہاں باہر ہی کھڑا تھا اور میں بھی اس کی طرح تمہارا چاہنے والا تھا۔ لیکن جب اس دن میں نے اسے وہاں سے تمہارے ساتھ نکلتے دیکھا تو میں بھی اپنی گاڑی لے کر تمہارے پیچھے پیچھے آیا اور باہر کھڑکی میں سے میں نے وہ سب دیکھا جو تم نے اس کے ساتھ کیا پھر میں نے فیصلہ کر لیا کہ تمہیں پکڑ کر ہی دم لوں گا۔''

پھر یاسر نے جلدی سے شازیہ کو کھولا اور اس نے اس کو گلے سے لگا لیا۔ ''مجھے معاف کر دو شازیہ میں نے آنے میں دیر کر دی۔''

''کوئی بات نہیں یاسر۔'' شازیہ نے محبت سے چور لہجے میں کہا۔ ''یاسر ہمیں اس کو پولیس کے حوالے کرنا ہوگا۔'' شازیہ بولی۔

''نہیں اس کے لئے تو میں نے کچھ اور ہی سوچ رکھا ہے۔ چلو اس وقت گھر چلیں۔'' اور وہ دونوں گھر چلے آئے۔

تین دن بعد شہر میں ایک جگہ یاسر کی پینٹنگز کی آرٹ گیلری میں نمائش لگی ہوئی تھی، یاسر ایک جگہ بیٹھا اپنے مداحوں کو آٹو گراف دے رہا تھا کہ ایک نوجوان چلتا ہوا آیا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ''سر آپ کی تصویریں اتنی حقیقی لگتی ہیں اس میں کیا راز ہے؟''

یاسر ہنس دیا جبکہ شازیہ جو کہ اس کے قریب تھی بولی۔ ''بعض باتیں راز ہی رہیں تو اچھا ہے۔ بس اتنا سمجھ لیجیے کہ یہ پورے جادوگر ہیں۔''

وہ لڑکا مسکرایا اور جانے لگا پھر پلٹ کر واپس آیا اور بولا۔ ''مجھے خاص طور سے آپ کی وہ تصویر بہت پسند آئی جس میں ایک لڑکی اسٹریچر پر بندھی ہوئی ہے اور جیسے کسی کو مدد کے لئے بلا رہی ہے بالکل یوں لگتا ہے جیسے اسے کسی کی بے وفائی کا دکھ ہو۔'' وہ بول کر چپ ہوا تو یاسر مسکرا دیا۔

''ہاں اسے دکھ ہے میری بے وفائی کا۔'' وہ لڑکا مسکرانے لگا، اس نے جلدی سے آٹو گراف لیا اور چلا گیا۔

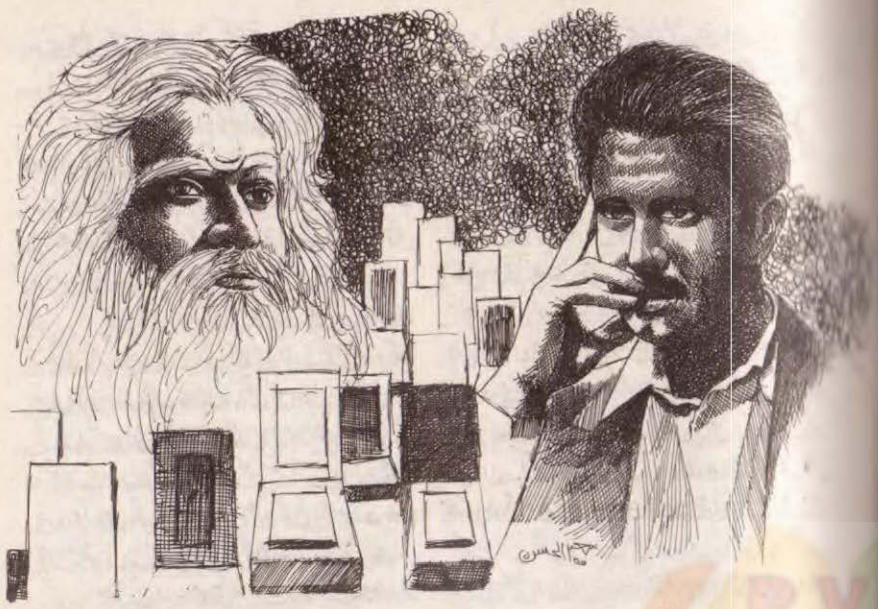

نادیدہ قوت

طارق محمود۔ کامرہ اٹک

دریا میں کشتی خراماں خراماں آگے بڑھ رہی تھی اور کشتی میں بہت سارے لوگ سوار تھے کہ اچانک ایک بہت بڑا سانپ کشتی میں آکر گرا کہ لوگوں کی چیخیں نکل گئیں پھر دیکھتے ہی دیکھتے ایک انوکھا منظر رونما ہوا۔

کہنے والے کہتے ہیں کہ اللہ مہربان اور بندہ پہلوان، اسی کو احاطہ کرتی ایک دلچسپ کہانی

''**انسپکٹر** صاحب ان قیدیوں پر اتنا ظلم نہ کیا کرو بلکہ درگزر اور ان لوگوں کی اصلاح کیا کرو اور جہاں تک ہو سکے ان لوگوں کا خیال رکھو اللہ تمہیں نرینہ اولاد سے نوازے۔'' چالیس سالہ باریش چاق و چوبند آدمی نے تدبر سے کہا۔

انسپکٹر جو کہ ایک قیدی کو زمین پر گرائے ٹھڈے مار رہا تھا اس نے غصہ سے اس آدمی کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا لیکن اپنے سامنے کھڑے اس باریش پر نظر پڑتے ہی اس نے احترام سے سر جھکا دیا اور چپ چاپ ایک طرف چل دیا۔ یعقوب سامنے ہی دھوبی گھاٹ پر کپڑے دھو رہا تھا اس نے اس آدمی پر ایک نظر ڈالی اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا، اسے چار سال ہونے کو آئے تھے اس جیل میں اس نے ارشاد نامی اس آدمی کے بارے میں لوگوں سے بہت کچھ سنا تھا اور خود اس نے بھی اس کی

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk
Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

دو تین پیشن گوئیاں سچ ہوتی دیکھی تھیں۔

ارشاد نے کتنی ہی دفعہ یعقوب کی طرف اس طرح دیکھا تھا کہ جیسے وہ یعقوب کو بھی کچھ بتانا چاہتا ہو لیکن یعقوب کو اس سے کچھ دلچسپی نہ تھی ارشاد اپنی بیوی کے قتل کے جرم میں عمر قید کاٹ رہا تھا لیکن اپنے رویہ اور معمولات سے وہ قاتل لگتا نہیں تھا پانچ وقت کا نمازی اور ہر وقت وعظ اور نصیحت کرنے والا شخص تھا۔

کسی نے یعقوب کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو چونک کر سوچوں سے باہر نکلا اور پلٹ کر پیچھے دیکھا جہاں اس کے بیرک کا ایک ساتھی کھڑا تھا۔ ''تم بھی کبھی اپنے بارے میں ارشاد سے کچھ پوچھ لو۔'' اس آدمی نے مسکراتے ہوئے کہا تو یعقوب بھی مسکرا کر سر ہلانے لگا۔ ''ضرور اگر اس دفعہ ارشاد کی یہ پیشن گوئی سچ ثابت ہوئی تو۔'' یعقوب نے سوچا لیکن اونچی آواز سے نہ کہہ سکا۔

یعقوب بہت چھوٹی عمر سے غلط صحبت کا شکار تھا وہ بارہ سال کا تھا جب اس کے والدین ایک ایکسیڈنٹ میں دنیا چھوڑ گئے، تب یعقوب کی کفالت اس کی شادی شدہ بہن اور بہنوئی نسیم نے شروع کی لیکن ان کے اپنے بھی دو بچے تھے جو کہ توجہ کے زیادہ مستحق تھے اسی لئے یعقوب کی طرف سے وہ غفلت برتنے لگے اور یعقوب کو اپنے شرارتی دوستوں کے ساتھ ایک راہ گیر کو لوٹتے ہوئے گشتی پولیس نے گرفتار کر لیا۔ اس کے بہنوئی نسیم نے بہت کوشش کی کہ اسے سزا سے بچا سکے لیکن یعقوب کو سات ماہ کی سزا ہو گئی، ایسے ہی ایک دو اور چھوٹے چھوٹے کیسوں میں جب وہ گرفتار ہوا تو وہ اس علاقہ کے ایک با اثر شخصیت ملک فیضان کی نظروں میں آ گیا اور پھر کچھ ہی عرصہ بعد یعقوب ملک فیضان کا خاص آدمی بن گیا، ملک فیضان جو کہ مختلف ہتھکنڈوں سے کام لے کر الیکشن میں اپنی کرسی جیت جاتا تھا اس کے لئے یعقوب بہت ہی کام کا آدمی نکلا، مخالف لوگوں کو ڈرانا دھمکانا یہاں تک کہ کبھی کبھی قتل اور اغوا وغیرہ بھی۔

اس علاقے کے لوگ ملک فیضان اور یعقوب سے نالاں تھے لیکن کچھ نہیں کر سکتے تھے کیونکہ ملک فیضان کی پارٹی برسر اقتدار تھی حکومتیں بدلتی رہتی ہیں۔

وقت پورا ہونے پر الیکشن ہوئے تو ملک فیضان کی پارٹی بری طرح سے شکست کھا گئی قسمت کی ستم ظریفی کے ملک بھی ہار گیا، اس کے بعد وہ اپنی فیملی کو لے کر باہر ممالک کی سیاحت پر چلا گیا۔

یعقوب اور اس جیسے لوگ جن کی پشت پر اب کوئی نہ تھا، پولیس کی گرفت میں آ گئے یعقوب پر کچھ کیس ڈال کر اسے پانچ سال کے لئے اندر کر دیا گیا اس نے یہ قید بغیر کسی دنگے فساد کے گزار دی تو اسے چار ماہ پہلے ہی رہا کر دیا گیا اس کے دل میں بہن کے پاس جانے کا خیال آیا لیکن وہ اس پر عمل نہ کر سکا کیونکہ وہ بہن کے گھر سے کافی عرصہ کا نکلا ہوا تھا حالانکہ بہن اور بہنوئی اسے کئی مرتبہ لینے آ چکے تھے اس نے جیل کے گیٹ سے نکل کر جب کھلی ہوا میں سانس لیا تو اسے فرحت بخش احساس ہوا وہ دو قدم چلا ہی تھا کہ ایک سفید گاڑی اسکے پاس آ رکی جسے دیکھ کر اس کے چہرے پر ناگواری سی چھا گئی لیکن وہ اس گاڑی میں جا بیٹھا کیونکہ وہ گاڑی ملک فیضان کی تھی، یعقوب کو اس بات کا پتہ تھا کہ وہ جرم و گناہ کی جس دلدل میں دھنس چکا تھا اس سے چھٹکارا پانا بہت ہی مشکل تھا آدھے گھنٹے بعد ہی وہ ملک کے بنگلہ میں اس کے سامنے موجود تھا۔

''یعقوب کیا حال ہے تمہارا مجھے بہت افسوس ہے کہ میری غیر موجودگی میں تمہیں جیل کی ہوا کھانا پڑی۔''

یعقوب کے دل میں آیا کہ کہہ دے تم مطلب کے لوگ ہو لیکن وہ کہہ نہ سکا کیونکہ یہ کچھ لے اور کچھ دے کا سودا تھا، وہ ملک کے لئے کام کرتا تھا، بدلہ میں ملک اسے نوازتا رہتا تھا اور دوسری بار یہ کہ یعقوب کو ملک سے ڈر لگتا تھا کہ کہیں وہ اس کے کام نہ کرنے سے خفا ہو کر اس کے بہن کے خاندان کو نقصان بھی پہنچا سکتا تھا۔

''اب میں واپس آ گیا ہوں پھر سے ہماری حکومت ہو گی اور تم لوگوں کی عیاشی'' ملک فیضان کی

آواز اسے سوچوں کے بھنور سے کھینچ لائی۔

''نہر کے ساتھ والے گاؤں میں ایک مسجد کا امام ہے وہ لوگوں کو ہمارے خلاف ورغلا رہا ہے اس کا کچھ ایسا بندوبست کرو کہ وہ خود ہی چپ کر جائے۔''

ملک نے نوٹوں کی اک گڈی اسے پکڑتے ہوئے کہا تو یعقوب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

یعقوب جب واپس اپنے گھر آیا تو اس کے لفنگے ساتھی پہلے ہی اس کے منتظر تھے اس نے ان کے ذمہ امام کی کوئی کمزوری تلاشی کرنے کا کام سونپا۔ دوسرے دن ہی اس کے ساتھیوں نے امام کی کمزوری جو کہ اس کی بیٹی تھی کے بارے میں یعقوب کو بتایا جسے سن کر اس کے چہرے پر خباثت بھری مسکراہٹ آ گئی۔

''لیکن استاد ایک مسئلہ ہے .....'' اس کے ساتھیوں میں سے ایک نے کہا۔

''وہ کیا؟.....'' یعقوب نے بے تابی سے پوچھا۔

''ہمیں پتہ چلا ہے کہ لڑکی عمل وغیرہ کرتی ہے اور اس کے پاس جنات بھی ہیں۔'' اس کی بات سن کر یعقوب نے ایک قہقہہ لگایا ''ابے ان باتوں پر اب کون یقین کرتا ہے..... جاؤ آج رات اسے لے آؤ۔'' اس کے ساتھی لڑکی کو اغوا کرنے چلے گئے اور وہ ان کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔

رات ایک بجے وہ لوگ لڑکی کو بے ہوشی کی حالت میں لے آئے اور یعقوب خوشی سے بانچھیں پھیلاتا ہوا اس کمرہ میں جا گھسا جہاں لڑکی رکھی گئی تھی، لڑکی کو ہوش آ گیا تھا اور اس نے چارپائی کی چادر اٹھا کر اوڑھ لی تھی، جس سے اس کا پورا جسم اور چہرہ تک چھپ گیا تھا، وہ ہنستے ہوئے لڑکی کی طرف بڑھنے لگا وہ قریب پہنچا تو اسے ایک جھٹکا لگا، اس کے سامنے لڑکی کی بجائے ایک شیرنی کھڑی تھی جو کہ بہت بپھری ہوئی لگ رہی تھی۔

یعقوب نے وہم سمجھتے ہوئے ہتھیلیوں کی پشت سے اپنی آنکھیں ملیں لیکن یہ اس کا وہم نہ تھا بلکہ شیرنی اب بھی موجود تھی اس نے بروقت فیصلہ کیا اور ایک لمبی چھلانگ لگا کر کھڑکی تک پہنچا اور پھر اگلے ہی لمحہ وہ کھڑکی سے باہر تھا، اس کے پیچھے شیرنی کی گرج دار آواز گونج کر رہ گئی، وہ آواز سن کر جلدی سے اٹھا تاتا کہ بھاگ سکے۔

لیکن اب ایک اور حیرت و پریشانی اس کی منتظر تھی کھڑکی کے باہر گلی ہونی چاہئے تھی لیکن گلی تو گلی یہاں تو کسی آبادی کا نام و نشان نہ تھا بلکہ کھلا ایریا تھا اور چاروں طرف برف ہی برف پڑی تھی، اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اپنے آپ کو زور سے چٹکی کاٹی لیکن یہ کوئی خواب نہ تھا بلکہ ایک جیتی جاگتی حقیقت اس کے سامنے تھی اسے پریشانی نے آ گھیرا، اسی وقت اس کی نظر اپنے کپڑوں پر پڑی جو کہ خاکی رنگ کے ٹاٹ زدہ کپڑے تھے جو کہ اسے سردی سے کافی حد تک بچا رہے تھے کچھ دیر وہ کھڑا اپنی حالت کے بارے میں سوچتا رہا تو اسے سردی لگنے لگی اور سردی سے بچنے کے لئے اس نے ایک سمت تیز قدموں سے چلنے لگا جس طرف دور پہاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔

جو کچھ ہو رہا تھا اس کے ذہن سے ماورا تھا اب سے تھوڑی دیر پہلے وہ اپنے گھر ایک نوجوان لڑکی کے ساتھ عیاشی کرنے والا تھا اور اب وہ اس برف زار میں تھا چلتے چلتے وہ دوڑنے لگتا آخر وہ پہاڑیاں قریب آ گئیں اس سے کچھ ہی قدم آگے ایک سڑک تھی جو کہ پہاڑوں کے ساتھ ساتھ دور تک جاری تھی، دائیں طرف سے چار گھوڑے اپنے سواروں کو لئے بھاگتے چلے آ رہے تھے جنہیں دیکھ کر یعقوب کی جان میں کچھ جان آئی اور وہ ان لوگوں سے اس انجان جگہ کے بارے میں پوچھنے کا سوچنے لگا۔

گھوڑے اس کے پاس پہنچ گئے اس سے پہلے کہ وہ انہیں روکتا وہ اسے دیکھ کر خود ہی رک گئے یعقوب کو وہ لوگ اپنے لباس سے پولیس والے لگے ان کی وردیاں پولیس جیسی لیکن کچھ پرانے طرز کی تھیں۔

''ارے یہ تو خسرو ہے مفرور قیدی۔'' اس سے پہلے کہ یعقوب کچھ پوچھتا ایک پولیس والے نے اونچی آواز میں کہا اور پھر وہ سب گھوڑوں سے اتر کر اتنی تیزی

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

سے حرکت میں آئے کہ یعقوب کو بات کرنے کا موقع تک نہ ملا اور انہوں نے اسے پکڑ کر ہاتھ پیچھے کر کے ہتھکڑی لگادی وہ سب گھوڑوں پر بیٹھے اور یعقوب کو پیدل ساتھ چلانے لگے، پورا راستہ وہ ان لوگوں سے بات کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن اسے ایسا لگا کہ وہ جیسے گونگا ہو گیا ہو، سامنے ہی آبادی دیکھتے ہی اس نے سکھ کا سانس لیا وہ بہت زیادہ تھکا ہوا تھا وہ آبادی میں داخل ہو گئے، مکانات دیکھ کر وہ حیران ہونے لگا کیونکہ زیادہ تر مکان پتھر اور مٹی سے بنے تھے یہ قافلہ ایک بڑے سے قلعہ کے دیو قامت گیٹ کے سامنے جا کھڑا ہوا گیٹ کی کھڑکی کھلی اور پھر پولیس والوں کو شناخت کے بعد اندر جانے دیا گیا اندر جا کر یعقوب نے سر پیٹ لیا کیونکہ وہ ایک جیل تھی وہ ایک مفرور قیدی تھا جس کا نام خسرو تھا اور وہ زبان سے محروم تھا اسے اندر بند کر دیا گیا، پوری رات وہ پریشان رہا اور سو نہ سکا وہ کسی سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن۔ ''ہوں ہاں'' کر کے رہ جاتا تھا۔

صبح صبح انہیں اٹھا دیا گیا ناشتہ میں کالے چنے اور خشک روٹی تھی اس کے بعد یعقوب اور دو قیدیوں کو جھاڑو اور بیلچے پکڑا کر ان کے پیچھے دو ہٹے کٹے سپاہی ہاتھوں میں کوڑے پکڑے انہیں شہر میں لے گئے، پورا دن وہ شہر کی نالیاں اور گلیاں صاف کراتے رہے، جب وہ ہاتھ نرم گرتے پیچھے سے کوڑا بردار، ان پر کوڑے برساتے پھر یہ روز کا معمول بن گیا۔

یعقوب ایک بدمعاش تھا، لیکن یہاں آ کر اس میں کافی نسوانیت سی آ گئی تھی جیسے کہ ہیجڑوں میں ہوتی ہے، وہ اپنی اس کایا پلٹ پر بہت ہی حیران و پریشان تھا، اسے وہ تمام لوگ یاد آنے لگے جن کے ساتھ اس نے ظلم و زیادتی کی تھی، دن بھر کام کر کے وہ اتنا تھک جاتا کہ رات میں اسے ہوش ہی نہ رہتا۔

ایک رات جبکہ اسے سوتے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ اس کی پیٹھ پر ایک زوردار لات پڑی وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ ''چل اٹھ آج رات سے تیری ایک اور ڈیوٹی لگ گئی ہے۔'' وہ پریشان ہو گیا ایک اور ڈیوٹی کا سن کر اسے اٹھا کر نہلایا گیا اور نئے کپڑے پہننے کے لئے دیئے گئے اور پھر گھوڑا گاڑی میں بیٹھا کر ایک چھوٹے سے قلعہ میں لے جایا گیا۔

''یہ گورنر صاحب کا گھر ہے تم اب یہی رہو گے وہ جو کہیں تمہارا کام ان کے حکم کی تعمیل کرنا ہے۔'' ایک موٹے سے سپاہی نے یعقوب کی پیٹھ پر کوڑا مارتے ہوئے کہا۔ یعقوب ''سی'' کر کے رہ گیا۔

گورنر ایک عیاش آدمی تھا ہفتہ میں تین دن اس کے گھر رات کو کوئی نہ کوئی نوجوان لڑکی لائی جاتی یعقوب کا کام تھا گورنر کی خوب مالش کرنا مالش کرواتے وقت وہ کپڑے اتار دیتا اور اس کے جسم پر صرف انڈرویئر رہ جاتا اور مالش کے دوران وہ یعقوب سے نازیبا باتیں کرتا اور چھیڑ چھاڑ بھی کرتا۔ ایک ہفتہ تک یہ سلسلہ چلتا رہا یعقوب جس کو کہ خسرو کے نام سے پکارہ جاتا تھا اسے غصہ تو بہت آتا لیکن وہ جب سے اس جگہ آیا تھا بہت ڈرا ہوا تھا۔

آخر ایک دن وہ بہت ہی تنگ ہوا اور اس نے مالش کرتے کرتے گورنر کا گلہ دبا دیا گورنر نے بہت ہاتھ پاؤں مارے لیکن اپنے آپ کو یعقوب کی گرفت سے آزاد نہ کرا سکا۔ یعقوب گورنر کی لاش کے پاس بیٹھا غصہ سے کانپ رہا تھا لیکن جب اس کا غصہ اترا تو اسے اپنی اس شدید غلطی کا احساس ہوا وہ تو پہلے ہی زیر عتاب تھا وہ قلعہ کی پچھلی طرف سے نکل بھاگا۔

اسے راستوں کا علم نہ تھا اسی لئے وہ پکڑا گیا کیونکہ گورنر کی لاش ملتے ہی اس کی تلاش شروع ہو گئی تھی گورنر کے قتل کرنے کی سزا اسے سزائے موت ملی، وہ بہت ہی افسردہ اور ملول تھا، پھانسی کا پھندا گلے میں ڈالتے ہی اس نے سچے دل سے اپنے گناہوں کی اللہ کے حضور گڑگڑا کر معافی مانگی اور اپنے گناہوں پر توبہ تائب ہوا۔ ''یا اللہ مجھے آخری وقت میں معاف کر دے یا اللہ مجھے معاف کر دے۔''

اس کے منہ سے بار بار یہ ہی الفاظ نکل رہے تھے اسی وقت اسے ایک جھٹکا لگا اس کے نیچے سے تختہ

جیسے ہی نکلا تو رسی اسے اپنے گلے میں تنگ ہوتی محسوس ہوئی اس کا سانس بند ہونے لگا، بہت زیادہ درد اور ایک طویل بے ہوشی۔

یعقوب کی آنکھ جھٹکے سے کھلی وہ اپنے کمرہ میں اپنے بستر پر پڑا تھا اس نے حیرت سے ادھر ادھر دیکھا، کیا وہ کوئی خواب دیکھ رہا تھا لیکن نہیں اسے اپنے گلے میں درد ہوتا محسوس ہوا، وہ جلدی سے باتھ روم میں جا گھسا جہاں بڑا سا آئینہ لگا ہوا تھا اس آئینہ میں اسے اپنے گلے پر رسی کے لپٹنے کے نشان صاف نظر آ رہے تھے پھر اس نے اپنے آپ کو اس زاویہ سے آئینہ کے سامنے کیا کہ اسے اپنی پیٹھ نظر آنے لگی جس پر کوڑوں کے بے شمار نشان تھے۔ جس کا مطلب تھا کہ اس کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ سب سچ تھا جانے وہ کون سا علاقہ تھا جہاں وہ خود بخود جا نکلا اور پھر واپس بھی آ گیا اور پھانسی پا کر کیسے بچ گیا۔

وہ سوچنے لگا کہ اللہ نے اسے سدھرنے کا ایک موقع دیا ہے، صبح ہونے والی تھی اس نے ہمت کر کے ایک فیصلہ کیا اور دن دس بجے جیل میں ارشاد سے ملنے جا پہنچا جہاں جا کر اسے پتہ چلا کہ اس انسپکٹر کے ہاں اللہ نے نرینہ اولاد دی تھی جس کے بعد وہ پانچ وقت کا نمازی اور قیدیوں سے اچھا سلوک کرنے لگا تھا، ارشاد کے چہرہ پر یعقوب کو دیکھتے ہی شفقت بھری مسکراہٹ آ گئی یعقوب نے سلام کیا جس کا جواب ارشاد نے خندہ پیشانی سے دیا۔

''ارشاد بھائی میں بہت گنہگار ہوں میں ایسا راستہ چاہتا ہوں کہ جس پر چل کر اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ سکوں۔''

''کیوں نہیں ایسا راستہ ہے ایک جسے صراط مستقیم کہتے ہیں، میں ایک عاجز سا بندہ ہوں تمہیں رہنمائی کے لئے نہر کے پار ایک گاؤں ہے۔ ''جام شاہ'' نام کا وہاں ایک بزرگ ہیں مختار شاہ، تمہیں ان کی رہنمائی کی ضرورت ہے اور یہ بات ذہن میں رکھو کہ اللہ کی رحمت ہر وقت جوش میں رہتی ہے بس اسے کوئی حاصل کرنے والا ہو۔''

ان کی ملاقات ختم ہوئی یعقوب تشنہ لب تھا وہ بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن ارشاد نے اسے مزید کچھ نہ بتایا اس کے بعد یعقوب ملک فیضان کے بنگلہ میں پہنچا ملک نے اسے ڈرائنگ روم میں بلوا لیا اس سے پہلے کہ ملک اس سے اپنے کام کے بارے میں پوچھتا۔ ''ملک صاحب اب میں یہ سب کام نہیں کر سکتا۔'' ملک فیضان جو کہ یعقوب کو دیکھ کر مسکرا رہا تھا اس کے چہرے پر غصہ نظر آنے لگا لیکن وہ بولا کچھ نہیں، کچھ دیر یونہی چپ چاپ کھڑے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور پھر ''او کے یعقوب جیسے تمہاری مرضی..... اگر تمہارا دل ان کاموں سے اکتا گیا ہے تو کچھ دن آرام کر لو.....''

''نہیں ملک صاحب میں نے پکا ارادہ کر لیا ہے کہ اب یہ کام نہیں کروں گا۔'' یعقوب نے ملک کی بات کاٹتے ہوئے کہا تو ملک کو بہت ہی برا لگا لیکن اس نے کچھ سوچتے ہوئے یعقوب کو جانے دیا جس پر یعقوب کو یقین نہ آیا کہ ملک نے اتنی آسانی سے اس کی جان چھوڑ دی۔ اسے گیٹ تک پہنچتے ہوئے دھڑکا سا تھا کہ پیچھے سے کوئی گولی آئے گی اور اس کے پار ہو جائے گی لیکن ایسا کچھ نہ ہوا۔

اسی شام یعقوب اپنی ضرورت کا سامان ایک بیگ میں ڈال کر چل پڑا، رات اس نے نہر کے قریب ایک بستی میں گزارنے کا سوچا۔

بستی میں داخل ہوتے ہی یعقوب کو ایک چھوٹی سی مسجد نظر آئی جس کو دیکھ کر اس کی طبیعت کو کچھ ہونے لگا اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی اس نے تو کب سے نماز بھی نہیں پڑھی تھی اس کے قدم مسجد کی طرف اٹھ گئے۔ مغرب کا وقت ہو چکا تھا لوگ مسجد کے باہر کنویں سے پانی نکال کر وضو کر رہے تھے اس نے بھی وضو کیا اور خوب سیر ہو کر پانی پیا۔

نماز ادا کرنے کے بعد امام مسجد اور یعقوب کے علاوہ سارے نمازی چلے گئے تو امام صاحب نے یعقوب کو اپنے پاس مسجد کے ایک کونے میں بلا لیا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"مسافر ہو اور تھکے ہوئے بھی لگتے ہو۔" امام صاحب نے اس سے کہا تو اس نے سر کو ہاں میں ہلا دیا جب امام کے گھر سے کھانا آیا تو انہوں نے یعقوب کو بھی ساتھ کھلایا۔ کھانا کھانے کے بعد امام صاحب خود ہی برتن چھوڑنے گھر چلے گئے اور یعقوب سوچنے لگا کہ "شاہ صاحب کے پاس جانے سے پہلے اسے دین کے بارے میں کچھ تو جان لینا چاہئے نماز اس نے پڑھی تو تھی لیکن دوسروں کے ساتھ نماز اسے یاد نہیں تھی اسے تو دین اسلام کے بنیادی ارکان بھی یاد نہ تھے۔

وہ کچھ دن تک امام صاحب کے پاس رہا جنہوں نے اسے بنیادی باتیں کافی حد تک بتا دی تھیں بلکہ نماز وغیرہ اس نے سیکھ لی تھی۔

رات ایک بجے اس کی آنکھ کھلی اس کا دل چاہنے لگا کہ تہجد کی نماز پڑھے ابھی وہ اٹھ کر مسجد کے دروازے تک پہنچا ہی تھا کہ باہر دھڑا دھڑ گولیاں چلیں پہلے فائر رائفل کے تھے اور پھر کچھ وقفہ کے بعد پستول کے تین فائر ہوئے، چاندنی رات تھی وہ احتیاط سے چھپتا چھپاتا باہر نکلا تا کہ صورت حال جان سکے مسجد کے بالکل سامنے کچھ ہی فاصلہ پر جیپ کھڑی تھی جس کی ہیڈ لائٹس میں سے ایک آن تھی، مسجد سے دائیں طرف گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سے اسے ایسا لگا جیسے گھوڑے دوڑتے ہوئے دور جا رہے ہوں یعقوب کے ذہن میں فوراً آیا کہ گھوڑے والوں نے ضرور اس جیپ پر فائرنگ کی ہوگی جس سے اس کی ایک لائٹ بھی ٹوٹ گئی۔

یعقوب بھاگ کر اس جیپ تک پہنچا جس کی اگلی سیٹوں پر پڑے دو آدمی بے حس و حرکت تھے جس سے ان کی موت کا اندازہ ہوتا تھا جبکہ پیچھے بیٹھا ہوا آدمی ہل جل رہا تھا اور جیپ سے باہر آنے کی کوشش کر رہا تھا یعقوب لپک کر اس تک پہنچا۔

"تم جو کوئی بھی ہو تمہیں خدا کا واسطہ میری جوان بیٹی کو بچا لو ڈاکو اسے لئے جا رہے ہیں۔"

یعقوب کو اس آدمی کی بات سن کر ایک جھٹکا لگا اس نے اگلی سیٹ پر پڑے ایک آدمی کی جھولی سے رائفل اٹھالی جو ٹھنڈی تھی جس کا مطلب تھا کہ اس بے چارے کو فائر کرنے کا موقع تک نہ مل سکا، یعقوب گھوڑوں کی ٹاپوں کی آنے والی آواز کی سمت بھاگا تب اس کی نظر درختوں میں ٹہلتے ایک گھوڑے پر پڑی جو کہ یقیناً کسی ڈاکو ہی کا تھا جو کہ جیپ والوں کی جوابی فائرنگ سے وہ ڈاکو مرا ہوگا، یعقوب گھوڑے کو قابو کر کے اس پر سوار ہوا ڈاکو جس طرف جا رہے تھے اس طرف آگے ایک جنگل تھا۔ "اگر وہ جنگل میں گھس گئے تو انہیں پکڑنا مشکل ہو جائے گا۔"

اس نے سوچا اور پھر گھوڑے کو دائیں سمت موڑ کر بھگا دیا اس کے اندر کا پرانا یعقوب جاگ اٹھا تھا۔

ڈاکو جو کہ تعداد میں چار تھے اگلے والے نے گھوڑے پر اپنے آگے ایک لڑکی بھی بیٹھائی ہوئی تھی، جنگل سے چند گز کے فاصلہ پر تھے کہ اچانک ان کے سامنے ایک آدمی گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا نمودار ہوا اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتے اس آدمی جو کہ یعقوب تھا کے ہاتھوں میں پکڑی رائفل سے تین فائر ہوئے تین گھوڑسوار بغیر کوئی حرکت کئے گرتے چلے گئے، ایک رہ جانے والے کو صورت حال کی نزاکت کا احساس ہوتے ہی بائیں سمت گھوڑے کو موڑ کر نکل گیا یعقوب نے پیچھے سے فائر کئے جس سے گھوڑسوار کی رفتار پہلے سے تیز ہوگئی، یعقوب نے اس کے پیچھے گھوڑا دوڑاتے ہوئے شور مچایا تو وہ اکیلا رہ جانے والا ڈاکو آندھی طوفان کی طرح درختوں میں غائب ہوگیا۔

یعقوب نے واپس آ کر لڑکی کو چیک کیا جو کہ بے ہوش تھی پھر تینوں ڈاکوؤں کو دیکھا تینوں ہی مرے پڑے تھے اس نے لڑکی کو اٹھایا اور اپنے ساتھ گھوڑے پر لاد کر واپس تیزی سے جیپ تک پہنچا اس نے آتے ہی زخمی کی نبض چیک کی جو کہ بہت آہستہ چل رہی تھی، اس نے لڑکی کو جیپ میں ڈالا اور ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا، گاؤں کے لوگ جاگ اٹھے تھے جنہیں صورت حال کا پتہ چل چکا تھا۔

امام صاحب نے یعقوب کو جو کہ ان زخمیوں کو اسپتال لے جانے کی کوشش کر رہا تھا سمجھا بجھا کر منع کر دیا کیونکہ وہ یعقوب سے اس کی کہانی سن چکے تھے گاؤں کے دو آدمیوں نے زخمیوں کو جلدی سے اسپتال پہنچانے کی ذمہ داری لی اور جیپ لے کر چلے گئے۔

"یعقوب تم ابھی یہاں سے نکل جاؤ نہر کے پار تمہاری منزل ہے، ابھی یہاں پولیس آئے گی ہم کہہ دیں گے کہ وہ ایک مسافر تھا جس نے ڈاکوؤں کو مارا اور لڑکی کو چھڑا لیا۔" امام صاحب نے یعقوب کو سمجھایا۔

یعقوب خود بھی سمجھتا تھا کہ وہ پھر سے پھنس سکتا ہے اسی لئے اس نے اپنا سامان اٹھایا اور امام صاحب کا شکریہ ادا کر کے وہاں سے چل پڑا۔

صبح کی نماز اس نے نہر کے پاس پڑھی اور پھر نہر پر بنے لکڑی کے پل سے پار چلا گیا جام شاہ گاؤں پہنچ کر اس نے مختار شاہ کے بارے میں پتہ کیا تو اسے پتہ چلا کہ وہ دریا پار چلے گئے ہیں جہاں انہوں نے مستقل رہائش رکھ لی ہے پھر یعقوب رکا نہیں بلکہ وہاں سے سیدھا دریا کے گھاٹ پر پہنچا جہاں کشتیاں مسافروں کو پار لے جا رہی تھیں، اس نے ایک بزرگ سفید باریش سے بابا مختار شاہ کی رہائش کے بارے میں پوچھا جس پر بزرگ نے اسے غور سے دیکھا۔ "تمہارے چہرے پر مجھے زمانے کی بہت دھول مٹی نظر آ رہی ہے تمہیں واقعی کسی رہنما کی ضرورت ہے۔" بزرگ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

یعقوب ان کی بات سن کر تھوڑا حیران ہوا۔ "بابا آپ....."

"نہیں میں تو ایک عام سا بندہ ہوں۔ ہاں تمہیں لے جاؤں گا شاہ بابا کے پاس۔"

کشتی دریا کے درمیان میں تھی کہ اچانک پانی میں ہلچل مچ گئی کشتی ڈگمگانے لگی کچھ مسافروں کی چیخیں نکل گئیں۔ "پانی میں کچھ ہے..... کشتی کے نیچے۔" ملاح نے چیختے ہوئے کہا۔

"کشتی کے کناروں کو زور سے پکڑ لو۔" اسی وقت کشتی کے عین سامنے ایک بہت بڑا سانپ پانی سے سر نکالے نظر آیا، بزرگ کے علاوہ تمام مسافروں کی گھگھی بندھ گئی یعقوب بھی ڈر کر پیچھے ہٹا، بزرگ منہ ہی منہ کچھ پڑھنے لگے، سانپ نے اچانک چھلانگ لگائی اور ہوا میں اڑتا ہوا کشتی کے اوپر آیا یعقوب میں ایک دم طاقت سی آ گئی اس نے ملاح سے جو کہ سانپ کو دیکھ کر گم صم سا ہو گیا تھا چپو چھین لیا اور سنبھل کر کشتی میں پاؤں جما کر کھڑا ہو گیا۔

ادھر سانپ کشتی میں گرنے لگا تھا کہ یعقوب نے چپو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر پوری قوت سے گھمایا کہ سانپ کو بھرپور چوٹ لگی اور وہ ہوا میں اڑتا ہوا دوبارہ پانی میں جا گرا۔

بزرگ بھی کھڑے ہو گئے تھے اب وہ اونچی آواز سے عربی میں کچھ پڑھ رہے تھے مسافروں کو یقین نہ آیا کہ وہ سانپ سے بچ گئے ان سب نے شکر کا کلمہ پڑھا ئی نے تو یعقوب کے ہاتھ تک چوم لئے یعقوب بے پناہ مسرت محسوس کر رہا تھا۔

آبادی سے تھوڑا ہٹ کر کچی مٹی اور اینٹوں سے بنا ہوا تین کمروں پر مشتمل صاف ستھرا اور بناوٹ میں ایک خوب صورت سا گھر جس میں پہنچتے ہی یعقوب کو ایک سکون سا ملا یعقوب کو ساتھ لانے والے بزرگ کا نام احتشام الدین تھا۔

بابا مختار شاہ کی شخصیت مرعوب کر دینے والی تھی نکلتا قد گورا چٹا چہرہ جس پر سفید لمبی گھنی داڑھی۔ "جرم و گناہ کے بعد آدمی بے چین سا رہتا ہے اور نیکی کر کے آدمی کو کتنا سکون ملتا ہے اس بات کا تمہیں مشاہدہ ہو گیا ہوگا۔"

یعقوب ان کے سامنے بیٹھا ان کی باتیں بغور سن رہا تھا بہت ہی مطمئن اور خوش تھا۔ اس راستے پر چل کر لیکن اسے اپنے بہن و بہنوئی اور ان کے بچوں کی فکر ہو رہی تھی۔ "تم جس کے راستے پر چل رہے ہو تمہارے گھر والوں کی حفاظت اسی کے ذمہ ہیں تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" شاہ بابا نے جیسے اس کا ذہن پڑھ لیا۔

یعقوب نے انہیں اپنی کہانی سنائی، وہ واقعہ بھی کہ وہ کیسے ایک برفانی آبادی میں پہنچا اور اس کے

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

ساتھ وہاں کیا ہوا۔

”یعقوب وہ کوئی خواب نہ تھا بلکہ ایک حقیقی دنیا ہے اس گورنر کو تمہارے ہاتھوں ختم ہونا تھا جس نے کہ مظلوم لوگوں پر ظلم کے پہاڑ توڑ ڈالے تھے اور ساتھ ہی تمہیں بھی عبرت حاصل ہوئی، تمہاری بہن کا خاندان محفوظ ہے لیکن ابھی تک مجھے تمہارے بارے میں کوئی واضح اشارہ نہیں ہوا کہ تمہارا اگلا لائحہ عمل کیا ہوگا۔ اس لئے تم آرام کرو۔“

دو دن مزید گزر گئے تیسرے دن شام کی نماز کے بعد یقوب کو تیار رہنے کا کہا گیا پھر شاہ بابا عشاء کی نماز پڑھتے ہی اسے اپنے ساتھ لے کر دریا کی سمت چل پڑے آبادی سے بہت دور دریا کے کنارے پہنچتے ہی بابا بولے۔ ”یعقوب آج تمہارا ایک بہت بڑا امتحان ہے اس علاقہ میں ایک خوف ناک بلا ہے جو کہ معصوم لوگوں کو تنگ کرتی ہے اس سے میری کب کی جنگ شروع ہے اس دن تم لوگوں کے ساتھ کشتی میں جو کچھ ہوا یہ بھی اسی کا ایک شعبدہ تھا۔ وہ مجھے تو کچھ نہیں کہہ سکتی لیکن مجھ سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتی رہتی ہے اور آج اس کے ساتھ میرا آخری مقابلہ ہوگا جو کچھ قسمت میں لکھا ہو وہ ہو کر رہنا ہے، تم نے مجھے اور میرے اشاروں کو خوب غور سے دیکھنا اور سمجھنا ہے۔“

یعقوب بلا کا سن کر ڈر گیا تھا لیکن اس نے سیدھا راستہ پانا تھا اسی لئے بابا کے ساتھ ہی ڈٹ گیا۔

شاہ بابا نے حصار کھینچا جس میں آگے خود اور تھوڑا پیچھے یعقوب کو بیٹھا کر قرآن کی آیات کا ورد شروع کر دیا، تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ آندھی چلنے لگی اتنی زوردار آندھی کہ درخت تڑخ تڑخ کر گرنے لگے، یعقوب ڈر سے کانپنے لگا۔ اس نے شاہ بابا کی طرف دیکھا لیکن وہ اس آندھی سے بے خبر ورد کرنے میں مشغول تھے۔

اچانک آندھی رک گئی یعقوب کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں جو درخت ٹوٹ کر گرے تھے وہ سب اسی طرح کھڑے تھے۔ اس کے بعد ایک دم سناٹا پھیل گیا جس سے کہ یعقوب کا دل دہلنے لگا اور پھر اچانک اتنا زور کا دھماکہ ہوا کہ یعقوب کے کان سائیں سائیں کرنے لگے وہ جلدی سے اٹھا اسے لگا زمین دریا کے پانی کی سمت چلنے لگی ہو اس نے وہاں سے بھاگنے کا سوچا اور پیچھے پلٹا، شاہ بابا حصار سے غائب تھے اس کے قدم ڈگمگا گئے وہ گرنے لگا لیکن اس سے پہلے کہ وہ گرتا اس کے دماغ سے جیسے دھند سی چھٹنے لگی۔

شاہ بابا سامنے ہی آنکھیں بند کئے اور کرنے میں منہمک تھے اسے لگا کہ اس کی نظر دھوکا کھا گئی تھی بابا تو ادھر ہی موجود تھے وہ پھر سے بابا کے ساتھ بیٹھ گیا اب پھر سناٹا ہو گیا لیکن ذہن سے سفید سفید دھواں اٹھنے لگا تھا جو کہ آہستہ آہستہ مجسم روپ میں آنے لگا، یعقوب ذہنی طور پر تیار ہو گیا کیونکہ وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کے امتحان کا وقت آ گیا ہے اس نے شاہ بابا کی طرف دیکھا جو آنکھیں کھولے زمین سے اٹھتے دھوئیں کی طرف دیکھ رہے تھے ان کی آنکھیں اندھیرے میں بھی ایک خاص قسم کی چمک لئے ہوئی تھیں۔

اندھیرا ہونے کی وجہ سے یعقوب ان کے چہرے کے تاثرات کا اندازہ نہ لگا سکا لیکن اسے یقین سا تھا کہ شاہ بابا کا چہرہ پر جلال ہوگا۔

دھواں جسم میں ڈھل چکا تھا جسے دیکھ کر یعقوب کے رونگٹے کھڑے ہو گئے شاہ بابا دراز قد تھے لیکن اس بلا کے سامنے وہ بھی بونے لگ رہے تھے بلا کا چہرہ بہت ہی خطرناک تھا لمبے لمبے دانت سرخ انگارہ آنکھیں جیسے کہ ان سے آگ نکل رہی ہو۔

”تم جو کوئی بھی ہو ایک بات جان لو، میں تمہیں یہاں سے بھگانے آیا ہوں اگر تم آسانی سے مان جاؤ تو تمہارے لئے بہتر ہوگا ورنہ میں تمہیں جلا کر راکھ کر دوں گا۔“ بابا کی جلالی آواز سے پورا علاقہ گونج اٹھا۔

ماحول کو ایک فلک شگاف قہقہہ نے جھنجھوڑ دیا۔

”تم نے دو چار عمل کیا سیکھ لئے خود کو بہت بڑا عامل سمجھنا شروع کر دیا، میں تمہیں ابھی بتاتی ہوں۔“

یہ سنتے ہی شاہ بابا نے یعقوب کے ہاتھ میں پانی سے بھرا ایک برتن پکڑا دیا، یعقوب سوچنے لگا کہ وہ اس

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

پانی کا کیا کرے اسی وقت اس بلا نے اپنے لمبے لمبے ہاتھ ہوا میں ہلائے تو شعلہ بھڑکا، اور ہوا میں آگ لگ گئی۔

یعقوب کو شاہ بابا نے ہلکا سا دھکہ دے کر حصار سے باہر نکال دیا، پہلے تو اسے سمجھ نہ آئی کہ کرنا کیا ہے؟

”بلا پر پانی ڈالو جلدی سے۔“ شاہ بابا کی سرگوشی سنائی دی یعقوب نے ایک چھلانگ لگائی اور بلا تک جا پہنچا اس نے ہاتھ میں پکڑے برتن کا منہ بلا کی طرف کر کے جھٹکا دیا ادھر آگ نے اس پورے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لیا اور ادھر پانی بلا پر جا پڑا تو اس کی کریہہ چیخوں سے علاقہ گونج اٹھا، یعقوب آگ کی لپیٹ میں آ گیا تھا آگ کی جلن بہت شدید تھی اس کے منہ سے بھی برداشت کے باوجود چیخیں نکلنے لگیں۔ ”اسے پکڑو جلدی۔“

بابا نے اپنی تسبیح پھینکتے ہوئے کہا تو یعقوب نے اوپر کو ہاتھ اٹھایا تو تسبیح اس کے ہاتھ میں پھنس گئی لیکن تکلیف کی شدت نے اسے بے ہوش کر دیا تھا۔

جب اسے ہوش آیا تو وہ ایک چارپائی پر کمرہ میں لیٹا ہوا تھا، جسم کی جلن بالکل ختم ہو گئی تھی۔

دو دن بعد۔ ”اب تمہارے ایک اور لمبے سفر کا وقت آ گیا ہے جو کہ یقیناً تمہاری منزل ہے اور امید رکھو کہ تمہارے گناہ ضرور اللہ رب العزت معاف کرے گا۔“ شاہ بابا کی ہدایت کے مطابق وہ تیار ہو گیا اسے ایک ٹرک پر ڈرائیور کے ساتھ ہی بیٹھا دیا گیا ڈرائیور باریش نوجوان تھا جس کے چہرہ پر داڑھی بہت ہی اچھی لگ رہی تھی ڈرائیور کا نام جانان تھا جو کہ پورا راستہ یعقوب کو نیک لوگوں کے قصے سناتا رہا۔ یقوب کا یہ سفر ایک بندرگاہ پر ختم ہوا جہاں ایک جہاز تیاری کی حالت میں تھا، جانان خان جہاز پر اکیلا گیا اور تھوڑی دیر بعد واپس آ کر یعقوب کو بھی ساتھ لے کر دوبارہ جہاز پر جا چڑھا۔ اور یعقوب کو ایک آدمی کے حوالے کر دیا جو کہ وردی پوش تھا جس نے جانان کو الوداع کہہ دیا اور یعقوب کو لے کر جہاز کے عرشہ پر ایک طرف بڑھ گیا۔ ”یعقوب یہ جہاز سعودی عربیہ جا رہا ہے زیادہ تر مسافر حج کے لئے جا رہے ہیں۔“ یہ سن کر یعقوب کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔

یعقوب ایک سچے راستے کا مسافر بن گیا، جہاز نے لنگر اٹھایا تو یعقوب کے دل سے دعا نکلی۔ ”یا اللہ میرے گھر والوں کو اپنے حفظ و امان میں رکھنا۔“

☆......☆......☆

ملک فیضان الیکشن بہت بری طرح سے ہار گیا اس بات پر اسے بہت ہی زیادہ غصہ تھا اور اپنا غصہ اس نے یعقوب کی بہن پر نکالنے کا سوچا کیونکہ وہ اپنی ہار کا ذمہ دار یعقوب کو ہی سمجھتا تھا۔

”جاؤ یعقوب کے بہنوئی اور اس کے بیٹوں کو ختم کر دو اور اس کی بہن کو اٹھا لاؤ۔“ ملک نے اپنے آدمیوں سے کہا اس کے چار آدمی وین لے کر تیزی سے نکل گئے ملک غصہ سے کھولتے ہوئے بنگلہ کے چھوٹے سے باغیچہ میں ٹہل رہا تھا۔

ملک کے آدمیوں نے وین یعقوب کی بہن کے گھر کے سامنے کھڑی کی اور منہ پر ڈھاٹے باندھے خطرناک ارادوں سے گاڑی سے باہر نکلے اور بھاگتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھے لیکن اسی وقت وہ سب اپنی جگہ جیسے پتھر کے ہو کر رہ گئے اچانک دو بڑے بڑے شیر ہوا میں نمودار ہوئے اور یعقوب کی بہن کے گھر کے دروازے کے سامنے آ کر بیٹھ گئے، ملک کے آدمی جن کے پاس اسلحہ بھی تھا لیکن وہ شیروں کو دیکھتے ہی ڈر گئے ان کے قدم اپنی جگہ سے ہل تک نہیں رہے تھے بہت مشکل سے ہمت کر کے وہ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹے اور وین میں بیٹھ کر رفو چکر ہو گئے۔

ملک فیضان ٹہلتے ہوئے ایک درخت کے پاس پہنچا تو اچانک ایک زبردست پھنکار کی آواز سنائی دی اور ایک کالے ناگ نے اس کے پاؤں پر کاٹا ملک کو حیران ہونے کا موقع بھی نہ ملا، اس کا سانس رک گیا اور وہ زمین پر گرتا چلا گیا۔

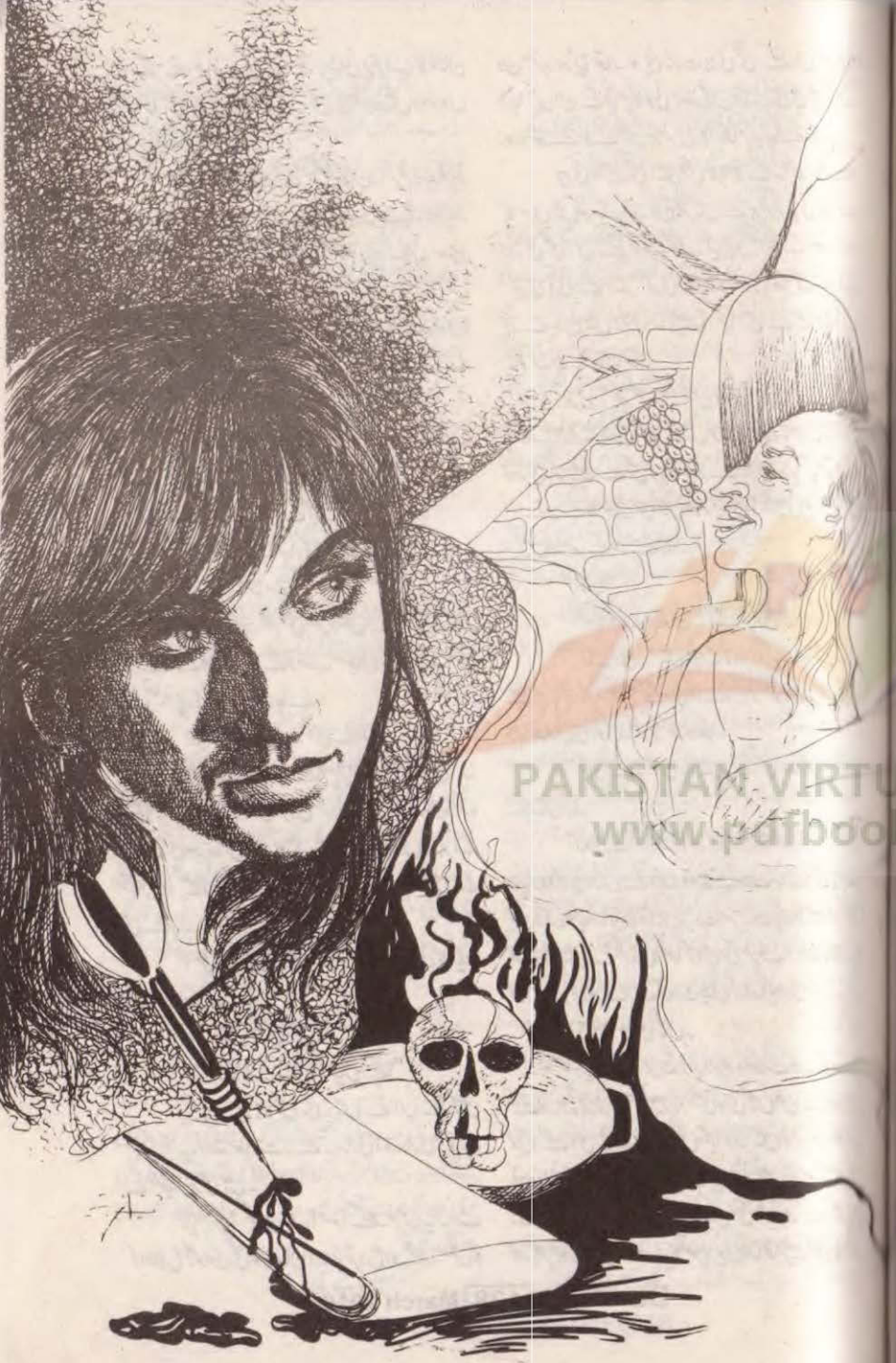

دشمن روحیں

ایم اے راحت

قسط نمبر:2

ظلم و جبر کی داستان حیرت جو کہ خراماں خراماں اپنے پڑھنے والوں کے رؤیں رؤیں میں خوف کی لہر سرایت کرتی رات کے گھٹا ٹوپ پرہیبت اندھیرے میں روحوں کی دنیا میں لے جائے گی، جہاں کہ اذیت سے دو چار روحیں سبک رفتاری سے پڑھنے والوں پر سکتہ طاری کردیں گی۔

ڈر کے لبادے میں پوشیدہ ذہن سے محو نہ ہونے والی رائٹر کے زور قلم سے لکھی شاہکار کہانی

زندگی میں بڑے بڑے اہم کردار ہوتے ہیں یوں لگتا ہے کہ ہم انہیں کے معیار سے زندہ ہیں اگر وہ ہمارے ساتھ نہ ہوتے تو ایک پل بھی نہیں جیا جاسکتا۔ اچانک وہ ہم سے بچھڑ جاتے ہیں اور ہم تاریکی میں آ کھڑے ہوتے ہیں لیکن آہستہ آہستہ وقت گزرتا ہے ہم وقت سے سمجھوتہ کرتے ہیں وہ کردار صرف ایک یاد کی حیثیت سے رہ جاتے ہیں اور بس۔

دادا ابو تو اس وقت چلے گئے تھے جب مکمل ہوش قائم نہیں ہوئے تھے۔ دادی کی موت کی سنسنی طویل عرصہ محسوس کی تھی۔ پھوپھی اور پھوپا جی کی موت ایک دلدوز حادثہ تھی۔ پھوپا جی بڑے خوش مزاج اور لطیفہ گو تھے۔ ہر وقت ہنساتے رہتے تھے۔ کہتے تھے کہ سونی بے وقوف تھی جو ہیوال جیسے نکمے سے عشق کرتی تھی اگر میرے دور میں پیدا ہوتی تو میں اسے لے کر سوئٹزلینڈ میں آباد ہو جاتا۔

یہ سب چلے گئے تھے سب سے زیادہ غم ناک جدائی ابو کی تھی۔ ان کی زندگی میں کبھی کسی دوست کی ضرورت نہیں محسوس ہوئی تھی۔ وہ میرے بہترین دوست تھے ان کے بغیر میں سونا سونا ہو گیا تھا۔ بڑوں نے مجھ پر ذمہ داریاں نہیں پڑنے دی تھیں۔ تایا چاچا اور پھوپیاں اپنے حصے الگ ..... کر چکے تھے ان کی مالی حیثیت کیا تھیں میں نہیں جانتا تھا لیکن ہماری زمینیں اور باغات سب سے زیادہ تھے اور آمدنی زبردست تھی۔ عظمت صاحب اپنی زندگی میں سارے حسابات خود رکھتے تھے۔ زمینوں کے دورے کرتے تھے ان کے رکھوالوں سے میٹنگیں کرتے رہتے تھے اور سب سے زیادہ ترقی ہم نے کی تھی۔

لیکن وہ اچانک سب کچھ چھوڑ کر چلے گئے تھے۔

ان کی المناک موت کے پراسرار عوامل کے سحر سے آزاد ہو کر تایا ابو، بڑی پھوپھی اور منجھلے چچا نے ہمارے کاروبار اور زمینوں اور باغوں پر توجہ کی۔ یہ سب کچھ میرا تھا اور میں اس کا بلا شرکت غیرے مالک تھا۔ ہمارے سب سے چھوٹے چچا کچھ غلط آدمی تھے۔ دولت اور جائیداد میں انہیں بھی پورا حصہ ملا تھا لیکن ان کے مشاغل ذرا مختلف تھے جن میں انہوں نے اپنی دولت دونوں ہاتھوں سے لٹائی تھی اور قلاش ہو گئے تھے۔ دولت ختم ہونے کے بعد انہیں ہوش آیا تھا اور انہوں نے برائیوں سے توبہ کر لی تھی۔

دادی اماں نے اپنی زندگی میں بڑی کوشش کی تھی کہ ان کی بھی شادی ہو جائے مگر وہ کسی قیمت پر تیار نہیں ہوئے تھے اور اپنی رنگ رلیوں میں مصروف رہے تھے وہ دادا جان کے مزاج والے نہیں تھے دادا جان تو بزرگ تھے اور ڈنکے کی چوٹ پر برائیاں کرتے تھے لیکن چھوٹے چچا چوری چھپے آوارگی کرتے تھے۔ غرض یہ کہ اپنا سب کچھ لٹا کہ وہ بھائیوں کے رحم و کرم پر آ پڑے تھے اور وہ مولوی صاحب

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

بن گئے تھے، عبادت کرتے تھے پیشانی پر محراب کا نشان پڑ گیا تھا ہلکی داڑھی رکھ لی تھی۔ ان کی ضرورتیں دوسروں سے پوری ہوتی تھیں۔

تایا ابو نے امی سے کہا۔ "منجھلی دلہن۔ اگر تم پسند کرو تو تمہارے کاروبار کی ذمہ داری فرید خان کو دیدی جائے۔ وہ بیکار بھی ہے اور اب جیسا کہ تم سب کو معلوم ہے کہ کافی سدھر گیا ہے۔ اس کے لئے ایک معاوضہ مقرر کر دیا جائے جس سے اس کی کفالت بھی ہو جائے گی۔ مفت میں اسے کچھ دینا سب ہی کو برا لگتا ہے۔ کچھ کرے گا تو کچھ دینا برا نہیں لے گا۔"

"مجھ سے کیوں پوچھتے ہیں بڑے بھائی۔ آپ ہمارے بڑے ہیں اگر آپ کوئی فیصلہ کریں گے تو کسے انکار کی جرأت ہو سکتی ہے۔" امی نے کہا۔

"نہیں دلہن بیٹی۔ تمہاری منظوری ضروری ہے۔"

"آپ جیسا مناسب سمجھیں۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم بھی نظر رکھیں گے۔" ماشاء اللہ اشرف بڑے ہو جائیں گے تو سب سنبھال لیں گے۔ ابھی انہیں تعلیم پوری کرنے دی جائے۔

"جو آپ پسند کریں۔" امی نے کہا۔

تایا ابو نے سمجھ داری سے کام لیا اور تھوڑی تھوڑی ذمہ داری چھوٹے چچا پر ڈالنی شروع کر دی۔ اس بات کا تذکرہ کرنے کی وجہ خاص ہے جو میں بتانے جا رہا ہوں۔ ابو کے انتقال کو دیکھتے ہی دیکھتے برس بیت گیا۔ بڑی پھوپھی نے امی سے کہا۔

"ذہبی بھابھی۔ اگلے منگل کو بھیا کی جدائی کا ایک سال پورا ہو جائے گا۔"

"ہاں۔ میں جانتی ہوں۔"

"برسی کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"کرنی ہے بھابھی جی۔ میں نے اس لئے نہیں کہا کہ آپ کو اللہ سلامت رکھے۔ ساری ذمہ داری تو آپ نے سنبھال رکھی ہیں۔"

تایا ابو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ غرض یہ کہ سب کو اطلاع بھجوا دی گئی اور مہمان آنے شروع ہو گئے۔ منگل کا دن مقرر ہو گیا تھا۔ حویلی بہت بڑی تھی کتنے ہی مہمان آ جائیں ان کے قیام کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ برسی کی تیاریاں زور و شور سے ہونے لگیں ہر طرح کا انتظام کیا جانے لگا۔

پیر کی رات تھی، میں بھی تایا ابو کے ساتھ سارے کاموں میں شریک تھا۔ دن بھر میں نے ہر طرح کی بھاگ دوڑ کی تھی اس لئے خوب تھک گیا تھا تھکن کے بعد نیند گہری آتی ہے، میں گہری نیند میں سو رہا تھا کہ اچانک پورے بدن میں زلزلہ سا جیسے آ گیا کسی نے میرا پاؤں پکڑ کر زور سے ہلایا تھا۔

میری آنکھ کھل گئی لیکن ذہن پوری طرح نہیں جاگا۔ پہلے تو میں یہی سمجھا کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ لیکن دوسری بار پہلے سے بھی زیادہ زور سے پاؤں ہلایا گیا تو اب سوتے رہنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ میری آنکھیں پوری کھل گئیں اور میرے منہ سے نکلا۔

"کون؟"

"اٹھو چھوٹے مہاراج۔" ایک سرگوشی سنائی دی۔

"کک کون۔" میں خوف زدہ ہو گیا۔ اور میں نے سینے پر ہاتھ مار کر تعویز کو محسوس کرنے کی کوشش کی۔ پھر ایک دم دھڑام سی ہو گئی۔ تعویز موجود تھا۔

"کون ہے۔" اس بار میں نے کسی حد تک مضبوط لہجے میں کہا۔

"زور سے آواز نہ نکالو۔ میرے ساتھ آؤ۔" سرگوشی دوبارہ ابھری، میں نے ایک دھندلے سے سائے کو دیکھا۔ بس ایک ملگجا سا ہیولا تھا جو میرے بستر سے کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔ پھر میں نے گردن گھما کر امی کی طرف دیکھا جو اپنے بستر پر میری طرف سے کروٹ بدل کر اور دیوار کی طرف منہ کر کے گہری نیند سو رہی تھیں۔

حویلی میں جس قدر پراسرار واقعات ہوتے رہتے تھے اور جو کچھ میری آنکھیں دیکھتی رہتی تھیں، اس سے میرے دل سے اسی فیصد خوف نکل گیا تھا۔ میں نو عمر تھا، خوف تو انسانی فطرت کا حصہ ہوتا ہے یہ بات نہیں کہ میرے دل سے خوف کا گزر ہی نہیں تھا۔ لیکن اتنی شدت سے نہیں۔ اور پھر محبوب الٰہی صاحب کا تعویز یوں لگتا تھا جیسے کوئی طاقتور

محافظ میرے ساتھ ہو۔

میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ تبھی وہی سرگوشی ابھری۔

"جوتی مت پہنو، میرے پیچھے آ جاؤ۔"

"کیا؟" میں نے سوال کیا۔

"آ جاؤ چھوٹے مہاراج۔ آ جاؤ۔ میں تمہاری دوست ہوں۔" سرگوشی نے کہا۔ اور مدھم ہیولا دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اب میرے حواس پوری طرح جاگ گئے تھے۔ چنانچہ میں دبے پاؤں دروازے سے باہر نکل آیا۔ باہر مدھم سی روشنی تھی۔ اور اس میں سایہ کسی قدر صاف نظر آ رہا تھا وہ سلک کے سفید لبادے میں ملبوس تھا لبادہ سر سے پاؤں تک تھا اور خوب ڈھیلا ڈھالا تھا۔ سایہ پاؤں نہیں اٹھا رہا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے وہ ہوا میں تیرتا آگے بڑھ رہا تھا۔

تھوڑے فاصلے پر ایک جگہ روشنی آ رہی تھی۔ یہ چھوٹے چچا فرید خان کا کمرہ تھا اور روشنی اس کمرے کی کھڑکی سے آ رہی تھی سایہ وہاں رک گیا اور سرگوشی پھر ابھری۔

"اپنا خیال رکھنا چھوٹے مہاراج۔ اندر دیکھو۔"

سائے نے سرگوشی کی۔ اور میری نظریں بے اختیار کھڑکی سے اندر اٹھ گئیں اندر سے آوازیں آ رہی تھیں۔ یہی یہ پہلی حیرت کی بات تھی کیونکہ چھوٹے چچا اس کمرے میں اکیلے ہوتے تھے۔ اس وقت ان کے پاس کون ہے؟ میں نے غور سے دیکھا اور اسے پہچان لیا۔ یہ کمالو تھا گجر کھٹ کا بدنام ترین آدمی۔ اس کے دین دھرم کا کوئی پتہ نہیں تھا چرسی موالی تھا۔ چھوٹی موٹی چوریاں بھی کر لیتا تھا دو تین بار پولیس بھی پکڑ کر لے گئی تھی پتہ نہیں کیسے بچ کر آ جاتا تھا۔ سب سے برا کام اس نے یہ کیا تھا کہ اپنی خوب صورت بیوی کو جوئے میں ہار گیا تھا۔

کمالو کو کئی بار فرید خان کے ساتھ دیکھا گیا تھا لیکن اس وقت یہ یہاں کیا کر رہا ہے۔ میں نے پوری توجہ ان دونوں کی باتوں پر مرکوز کر دی۔ رات کے سناٹے میں ان کی آواز صاف میرے کانوں میں آ رہی تھی۔

"تو اتنا بزدل کب سے ہو گیا ہے کمالو۔ پہلے تو بڑے سے بڑے کام کی حامی بھر لیتا تھا۔ اشرف میں جان ہی کتنی ہے ایک منٹ میں۔ "ٹیں" ہو جائے گا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے ملکھان جی۔ ہم نے چوری چکاری کی ہے۔ چھوٹی موٹی مار پیٹ کی ہے پر کسی کی جان نہیں لی آج تک۔ آپ کو پتہ نہیں پولیس بال کی کھال نکال لیتی ہے۔"

"گدھا ہے تو۔ اصل بات ہی نہیں سمجھ رہا۔" چچا نے کہا۔ میرا نام لیا گیا تھا اس لئے میرے کان کھڑے ہو گئے تھے۔ میرے چچا کمالو کو میری جان لینے کے لئے اکسا رہے تھے اور کمالو ڈر رہا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے خاص طور سے وہ پراسرار سایہ جگا کر یہاں لایا تھا کہ میں اس سازش سے باخبر ہو جاؤں۔

"مگر ملکھان جی۔" کمالو نے کہا۔

"میں کہہ رہا تھا کہ تو اصل بات نہیں سمجھ رہا۔"

"اصل بات کیا۔" ملکھان جی۔

"اشرف کے راستے سے ہٹ جانے کے بعد کروڑوں روپے کی جائیداد کا گھپلا کیا جا سکتا ہے۔ میں نے اس کے لئے پلان تیار کر لیا ہے۔ تجھے بھی لاکھوں روپے دوں گا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر ہم کہہ رہے تھے۔"

"بے وقوف کے بچے، بک بک کئے جا رہا ہے۔ میں نے تجھ پر کتنا بھروسہ کیا ہے۔ تو تو بالکل غیر متعلق آدمی ہے تجھ پر شبہ کون کرے گا تجھے معلوم ہے کہ حویلی آسیبوں کے قبضے میں ہے۔ ابا جی، پھر بہن بہنوئی، پھر اماں جی پھر بھائی صاحب سب کو بدروحوں نے مار دیا ہے اور پھر اشرف تو خاص طور سے انکا نشانہ ہے کیونکہ ابا جی کا ہم شکل ہے تجھے بس اتنا کرنا پڑے گا کہ پھندا اس کی گردن میں ڈال کر کھینچ دبچیو۔ منٹوں میں کام ہو جائے گا۔"

"ارے ملکھانے جی۔ بڑا پیارا بچہ ہے۔" کمالو نے کہا۔

"سب یہی سمجھیں گے کہ اسے بھی دشمن روحوں نے مار دیا۔ تیری طرف کسی کا دھیان بھی نہیں جائے گا۔ کل برسی کا ہنگامہ ہے، تو اشرف کے پیچھے لگے رہنا اور جیسے ہی موقع ملے۔"

"مگر ملکھانے جی۔"

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

تایا جان کا لہجہ حتمی تھا۔ کسی نے بھی کچھ نہ کہا۔ چائے کے بعد سب منتشر ہوگئے۔ میں مسلسل چھوٹے چچا کا جائزہ لیتا رہا تھا وہ بری طرح مضطرب نظر آرہے تھے۔ چائے انہوں نے سب کے ساتھ پی تھی اور پھر سب سے پہلے اٹھ گئے۔

"میں چلتا ہوں بھائی میاں۔ میرے سر میں شدید درد ہے۔" انہوں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"سر درد کی گولی لے لو۔ کل مصروف رہنا ہے۔ تایا جان نے کہا اور وہ باہر نکل گئے۔ اس شخص کی طرف سے دل بہت خراب ہوگیا تھا۔ آنکھوں سے دیکھا تھا کانوں سے سنا تھا کسی شک کی گنجائش نہیں تھی۔ مجھے اس کی سوچ کا رنج بھی تھا۔ چھوٹے چچا چھوٹے چچا کہتے منہ سوکھتا تھا اور چھوٹے چچا میری زندگی کے گاہک نکلے۔

امی کمرے میں آکر سوگئی تھیں لیکن میں صبح تک جاگتا رہا۔ اگر میں چھوٹے چچا کے بارے میں امی کو بتا دیتا تو حویلی میں بھونچال آجاتا۔ نتیجہ کسی بھی شکل میں برا ہی نکلتا۔ ممکن ہے بات الٹ کر ہم پر ہی آپڑتی۔ لوگ میری بات کا یقین نہ کرتے۔ ویسے مجھے اب بھی تعجب تھا۔ اس پراسرار سائے نے جس طرح مجھے اپنے خلاف ہونے والی سازش سے آگاہ کیا تھا وہ بڑی حیران کن بات تھی۔ گنگا سری اور اس کا خاندان تو خاص طور سے میری زندگی کا دشمن تھا کیونکہ میں مامون خان کا ہم شکل تھا۔

حالانکہ رات کو سب کی نیند خراب ہوچکی تھی۔ لیکن پھر بھی صبح صبح سب جاگ گئے۔ قرآن خوانی کا بندوبست ہوچکا تھا۔ گجر گھاٹ کے دوسرے لوگ بھی شریک ہوئے تھے۔ گھر والے بھی کافی تھے۔ میں بھی سب کے ساتھ موجود تھا۔ لیکن فرید خان موجود نہیں تھے۔

بہت دیر تک میں وہاں موجود رہا۔ پھر اپنا سپارہ ختم کر کے اٹھ گیا۔ اور امی کے پاس چل پڑا۔ ابھی راہداری کے سرے پر ہی پہنچا تھا کہ میں نے چھوٹے چچا کو دیکھا جو میرے کمرے کے دروازے کے پاس کھڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے بھی مجھے دور سے ہی دیکھ لیا اور فوراً پلٹ کر دوسری طرف چل پڑے۔

میرے قدم ٹھٹھک کر رک گئے۔ کیا چھوٹے چچا میرے کمرے میں گئے تھے۔ سو فیصدی ایسی ہی بات تھی لیکن کیوں؟ صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ میرے کمرے سے نکلے تھے اور ان کا رخ اسی طرف تھا لیکن مجھے دیکھ کر وہ دوسری طرف مڑ گئے تھے۔ کیا امی کمرے میں موجود ہیں۔

اور میں نے بے اختیار کمرے کی طرف دوڑ لگا دی۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں اندر گھس گیا۔ امی اندر موجود نہیں تھیں۔ لیکن میری الماری کھلی پڑی تھی۔ باقی تمام چیزیں ٹھیک تھیں صرف میری الماری کھولی گئی تھی۔ میری الماری میں کوئی خاص چیز نہیں تھی سوائے میرے کپڑوں کے۔ البتہ تجوری میں وہ تعویز ضرر تھا جو میرے لئے دنیا کا سب سے قیمتی خزانہ تھا۔ کیونکہ اس نے ہمیشہ میری مدد کی تھی۔ میں اسکا بڑا احترام کرتا تھا۔ آج بھی نہاتے ہوئے میں اسے احترام سے تجوری میں رکھ گیا تھا۔ اور بعد میں وہاں سے اٹھایا نہیں تھا۔

میں نے بے اختیار تعویز تلاش کیا۔ پھر سکون کی گہری سانس لی۔ تعویز اپنی جگہ موجود تھا۔ میں نے اسے اٹھا کر سینے کے پاس جیب میں رکھ لیا۔ اور دوسری چیزوں کا جائزہ لینے لگا۔ پتہ نہیں چچا صاحب میری الماری میں کیا تلاش کر رہے تھے۔

مجھے الجھن ہوگئی تھی۔ کبھی خواب میں بھی ان پر کوئی شک نہیں کرسکتا تھا۔ لیکن جو کچھ دیکھا اور سنا تھا اس کے بعد چچا کی طرف سے ہوشیار رہنا ہی زندگی کی ضمانت تھی۔ بہت دیر تک کمرے میں رکا لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ چچا صاحب میرے کمرے میں کیوں داخل ہوئے تھے۔

ذہن کمالو کی طرف گیا۔ اس کے سپرد جو کام کیا گیا ہے وہ اسے کب سرانجام دے گا۔ مجھے ہر لمحے ہوشیار رہنا ہوگا۔ بغیر کسی ثبوت کے فرید خان پر الزام لگانا سخت خطرناک ہوگا۔ میں کمرے سے واپس نکل آیا۔ امی خواتین کے ساتھ قرآن خوانی میں شریک تھیں۔

دوپہر کے تین بجے تھے۔ سب لوگ کھانے وغیرہ سے فارغ ہوئے تھے۔ باہر سے قرآن خوانی اور فاتحہ میں شریک ہونے والے واپس جاچکے تھے کہ شمشان گھاٹ کی

طرف سے کچھ لوگ آتے نظر آئے۔ شمشان گھاٹ میں ہندو برادری کے لوگ شاید کوئی مردہ جلانے آئے تھے۔ وہاں دھواں اٹھ رہا تھا۔ شمشان گھاٹ سے آنے والے ہماری ہی طرف آرہے تھے۔ وہ ایک بڑی سفید چادر میں کوئی چیز لے کر آرہے تھے۔

سب حیرت سے انہیں دیکھنے لگے۔ آنے والے قریب آگئے ان کے چہرے عجیب ہو رہے تھے۔ تایا جان آگے آئے انہوں نے کہا۔ "کیا بات ہے تیرتھ رام..... اس چادر میں کیا ہے۔ اور کون مرگیا ہے؟" تایا جان نے اپنی پہچان والے سے کہا۔

"تلک چندی کی موسی کا دھیانت ہوگیا ہے میاں جی۔ اور یہ لاش ہمیں برگد کے پیڑ کے نیچے ملی ہے یہ بدمعاش کمالو کی ہے۔ اسے ناگ مہاراج نے ڈس لیا ہے۔"

"ایں..... کمالو۔ لاش۔" تایا جان حیرت سے بولے۔

"جی مہاراج۔ دیکھیں....." انہوں نے چادر زمین پر رکھ دی۔ بڑا خوف ناک منظر تھا۔ کمالو کی لاش نیلی سیاہی کی طرح نیلی پڑی ہوئی تھی۔ اس کے منہ سے نیلے جھاگ لپٹے ہوئے تھے۔ اور چہرہ بے حد بھیانک نظر آرہا تھا۔ سب لوگوں کے منہ سے کلمہ طیبہ جاری ہوگیا۔ کمالو کو بھی سب جانتے تھے۔ یہ بھی لوگوں کو معلوم تھا کہ کمالو اکثر فرید خان کے پاس آتا رہتا ہے۔

"چھوٹے چچا صاحب بھی موجود تھے۔ میں نے ان کا چہرہ دیکھا۔ ان کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ میرے ذہن میں پھلجھڑیاں چل رہی تھیں۔ رات کی چیخ میرے ذہن میں گونج رہی تھی۔ وہ چیخ سو فیصدی کمالو ہی کی تھی اور اسے میری دشمن، میری دوست گنگا سری نے ڈسا تھا جس نے اس سازش کو میرے سامنے طشت از بام کیا تھا۔

گنگا سری۔ میری دوست۔

لوگ طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے کسی نے کہا۔ "آج تیرہ تاریخ ہے۔ یہ سب کچھ تو ہونا ہی تھا۔ منحوس تاریخ نے آج بھی اپنا کام کر دکھایا۔"

کمالو کی لاش اس کے گھر بھجوانے کا بندوبست کیا جانے لگا۔ شدید سنسنی پھیل گئی تھی۔ کمالو کا تعلق اس خاندان سے نہیں تھا لیکن یہ میں جانتا تھا کہ کمالو کی موت کا تعلق کہاں سے تھا۔ کمالو مجھے ہلاک کرنے آیا تھا لیکن گنگا سری نے اسے ختم کر دیا تھا۔

آج تیرہ تاریخ تھی۔ میں گنگا سری کا احسان مند تھا۔ اس سے ملنا چاہتا تھا۔ اس کا زیور اسے دینا چاہتا تھا کیوں نہ اس کا اب سمادھی کے نمودار ہونے کا انتظار کیا جائے۔ میں اسے پیشکش کرنا چاہتا تھا کہ اگر وہ چاہے تو میں اس کے محبوب کی لاش تلاش کرنے میں اس کی مدد کروں۔ لیکن یہ کام گھر کے دوسرے لوگوں سے بچ کر کرنا تھا۔ بڑی میں شریک ہونے والے کچھ لوگ چلے گئے تھے۔ کچھ موجود تھے۔ سارے دن کی تھکن تھی اس لئے امی بھی جلدی سوگئیں۔ لیکن میں جاگ رہا تھا۔ نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

جب ہر طرف سناٹا چھا گیا تو میں باہر نکل آیا۔ اور پوری احتیاط سے پرانی حویلی کی طرف چل پڑا۔ ہر طرف گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ شمشان گھاٹ بھی سنسان پڑا تھا۔ آج جس مردے کو جلایا گیا تھا اس کی چتا بھی بجھ چکی تھی دھواں تک نہیں تھا۔

میں نے اپنے آپ پر غور کیا۔ بچپن سے اب تک کبھی پرانی حویلی میں داخل ہونے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس کے بارے میں بڑی بھیانک داستانیں سن رکھی تھیں لیکن میں بہادر تھا۔ مجھے اس حویلی میں داخل ہوتے ہوئے کوئی خوف نہیں تھا۔ ابو نے سمادھی کے بارے میں جو بتایا تھا وہ مجھے یاد تھا۔ میں نے تعویز جیب میں رکھ لیا تھا۔ حویلی میں داخل ہو کر میں نے ایک نگاہ چاروں طرف دوڑائی اور دل میں سوچا کہ کیا شاندار عمارت ہے۔ نئی حویلی تو اس کے سامنے کچھ بھی نہیں ہے۔ اس کا طرز تعمیر قدیم اور نہایت پرسکون تھا۔ گھر کے لوگ تو مجھے کبھی اس حویلی میں نہیں آنے دیں گے لیکن میں کسی وقت چوری چھپے یہاں آکر حویلی کو خوب اچھی طرح دیکھوں گا۔

ابھی میں حویلی کے مشرقی حصے میں یہ باتیں سوچ رہا تھا کہ اچانک مجھے اپنے پیچھے ایک خوف ناک پھنکار سنائی

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

دی۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ اس وقت میں خوف زدہ ہوگیا تھا۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا سفید ناگن تیزی سے میری طرف آرہی تھی۔ میں نے اسے غور سے دیکھا تو مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا سفید ناگن کی سرخ آنکھیں آگ کی طرح دہک رہی تھیں ان میں غصہ پایا جاتا تھا۔

وہ مجھ سے تھوڑے فاصلے پر آکر رک گئی۔ پھر اس کا پھن بند ہونے لگا۔ میں نے بے خوفی سے کہا۔ ”گنگا سری، میں تمہارے احسان کا۔“ ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ گنگا سری نے بڑی چالاکی سے مجھ پر حملہ کردیا۔ بس ذرا سی کسر رہ گئی تھی کہ میں پیچھے ہٹ گیا۔ ورنہ گنگا سری نے مجھے ڈس لیا ہوتا۔ پہلے حملے کی ناکامی کے بعد اس نے دوسرا حملہ کیا پھر تیسرا میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے بدن میں برف جیسی لہریں دوڑنے لگیں۔

میرے منہ سے نکل رہا تھا۔ ”گنگا سری رک جاؤ۔ رک جاؤ۔ تمہیں کیا ہوگیا تم تو میری دوست ہو۔ تم نے تو..... تم نے تو.....“ مگر سفید ناگن پاگل ہوگئی تھی۔ وہ مجھ پر تابڑ توڑ حملے کررہی تھی اور ہر قیمت پر مجھے کاٹ لینا چاہتی تھی۔ بس تقدیر ہی تھی جو میں بچ رہا تھا۔

پھر اچانک ایک اور حیرت ناک واقعہ رونما ہوا۔ اچانک ہی ایک اور پھنکار سنائی دی اور دوسرے لمحے ایک اور سفید ناگ یا ناگن نمودار ہوگئی اس نے ایک لمبی چھلانگ لگائی اور فضا میں اڑتی ہوئی گنگا سری پر آپڑی۔ گنگا سری اس دوسری ناگن کی ٹکر سے گر پڑی پھر جلدی سے اٹھ کر پیچھے ہٹنے لگی کئی قدم ہٹ کر وہ سیدھی کھڑی ہونے لگی اور پھر اچانک اس کے بدن سے دھواں خارج ہونے لگا۔ نہایت لطیف پانی جیسے رنگ کا دھواں۔ اور دھویں سے ایک انسانی بدن نمودار ہونے لگا۔

میں دنیا کا سب سے خوف ناک منظر دیکھ رہا تھا دوسری طرف دوسری ناگن نے بھی ہی عمل کیا تھا پھر دونوں ہی انسانی شکل میں آگئیں۔ وہ دوسری ناگن جس نے گنگا سری پر حملہ کیا تھا وہی لڑکی تھی جسے میں نے اس رات لہنگے اور چولی میں دیکھا تھا اور جو گنگا سری کی حیثیت سے مجھے یاد آرہی تھی اور میں ایک انوکھی کشمکش کا شکار ہوگیا تھا۔

اسی وقت مجھے دوسری ناگن کی مدھر آواز سنائی دی۔ ”میں نے تجھ سے کہا تھا گنگا سری کہ میرے مہاراج کو نقصان مت پہنچانا۔“

میں اس تحمے میں تھا کہ پتہ نہیں ان میں گنگا سری کون سی ہے۔ لیکن اس دوسری ناگن نے مجھ پر حملہ کرنے والی ناگن کو گنگا سری کہہ کر یہ عقدہ حل کردیا تھا۔ تب میں نے گنگا سری کو دیکھا وہ بھی بے حد خوب صورت تھی، لیکن اس وقت اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہورہا تھا۔

”چلی جا یہاں سے منیکا۔ چلی جا اس وقت۔ مجھ سے دشمنی مول مت لے۔ میں تجھے فنا کردوں گی۔ میں نے آج تک تجھے شہ دے رکھی ہے کبھی تجھ پر توجہ نہیں دی لیکن کسی دن تو اس طرح میرا سامنا کرے گی مجھے اندازہ نہیں تھا۔“

”تو غلط کررہی ہے۔ دوسرے سب بے گناہ ہیں۔“

”کون گناہ گار ہے کون بے گناہ۔ یہ فیصلہ کرنے کا حق تجھے کس نے دیا ہے۔ میں اس پریوار کے ایک ایک منش کو ختم کردوں گی۔“

”نہیں گنگا سری۔ تو ایسا نہیں کرسکے گی۔ کان کھول کر سن لے۔ میرے چھوٹے مہاراج کو کوئی نقصان پہنچا تو میں تجھے مزہ چکھادوں گی۔“ یہ کہہ کر اچانک دوسری لڑکی گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔ اس نے دونوں ہاتھ آگے رکھے اور اس کا بدن چھوٹا ہونے لگا۔ چھوٹا، چھوٹا اور چھوٹا۔ پھر اس نے ایک نیولے کی شکل اختیار کرلیا۔ اور اچانک گنگا سری خوف زدہ ہوگئی اس کے چہرے پر خوف کے آثار نظر آئے اور دوسرے لمحے اس نے پیچھے دوڑ لگادی۔ دوسری لڑکی نے نیولے کی شکل میں اسے پھکی دی تو وہ اور تیز بھاگی اور حویلی کے ایک ستون کے پیچھے روپوش ہوگئی۔

میں سحر زدہ سا کھڑا ہوا تھا مجھے یہ سب کچھ ایک ڈرامہ سا لگ رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میرا دماغ خراب ہوگیا ہو۔ میری آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی ہیں وہ صرف میرے دماغ کی خرابی ہے۔

کچھ لمحوں کے بعد گنگا سری غائب ہوگئی۔ میری نظریں اس دوران اس کا تعاقب کرتی رہی تھیں اس کے

ستون کی آڑ میں گم ہونے کے بعد میں نے اس نیولے کی طرف دیکھا لیکن اب نیولا وہاں نہیں تھا بلکہ اس کی جگہ وہ بے مثال حسن کی مالک لڑکی کھڑی تھی۔

میں نے شکر گزار نظروں سے اسے دیکھ کر کہا۔ ”آج مجھ پر یہ انکشاف ہوا ہے کہ میری مدد کرنے والی گنگا سری نہیں بلکہ تم ہو۔“

”گنگا سری تو آپ کی دشمن ہے چھوٹے مہاراج۔“ اس نے خوب صورت آواز میں کہا۔

”میں کچھ بھی نہیں سمجھا تھا۔ مجھے یہی بتایا گیا تھا کہ چونکہ میرے دادا مامون خان نے گنگا سری کے ساتھ بہت برا سلوک کیا تھا اس نے اس کے پتا اور وہ ان کے دشمن بن گئے اور انہوں نے انہیں ہلاک کردیا چونکہ میں بدقسمتی سے ان کا ہم شکل ہوں اس لئے گنگا سری میری بھی دشمن بن گئی جبکہ میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ ان دشمن روحوں نے میرے خاندان کے دوسرے لوگوں کو بھی ختم کردیا جس میں میرے ابو بھی ہیں۔ جبکہ میرے ابا اپنے والد کے عمل سے بہت شرمندہ تھے۔ انہوں نے گنگا سری کے پاؤں کی ایک پازیب بھی مجھے دے کر کہا تھا کہ میں یہ زیور اسے واپس کردوں۔ وہ تیرہ تاریخ کو حویلی کے باغ میں اپنی سمادھی سے باہر آتی ہے۔ میں آج اسی لئے یہاں آیا تھا۔ میں تو اس سے یہ بھی کہنے والا تھا کہ اگر وہ چاہے تو میں اس کے محبوب کی لاش کی تلاش میں بھی اس کی مدد کرنے کے لئے تیار ہوں چاہے مجھے حویلی کھدوانی پڑے۔ لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ میرے ساتھ یہ سلوک کرے گی۔

”وہ کبھی آپ کی دوست نہیں بن سکتی چھوٹے مہاراج۔“ اس نے ہی ہمیں اس کے پتا اور اس کے سارے پریوار نے کو گن کھدوانی کے بت کے سامنے سوگند کھائی ہے کہ جب تک آپ کے پریوار کا ایک بھی منش جیتا ہے وہ سورگ میں قدم نہیں رکھیں گے۔

”کو گن کھدوانی کیا ہے۔؟“ میں نے پوچھا۔

”جادو کا دیوتا۔ گندی اور بھٹکتی آتمائیں جب کچھ کرنا چاہتی ہیں اور سوگند کھاتی ہیں کہ جب تک وہ اپنا کام پورا نہیں کرلیں گی سورگ میں نہیں جائیں گی تو کو گن کھدوانی ان کو آشیر باد دیتا ہے، اور انہیں اپنے جادو کا وردان دیتا ہے۔ اگر وہ اپنا مقصد پانے میں ناکام رہتی ہیں تو بھٹکتی رہتی ہیں اور شانت نہیں ہوتیں جب تک نیا جنم نہ لے لیں۔“

”ارے واہ۔ یہ تو بڑی دلچسپ کہانی ہے۔“ میں نے کہا۔

”کہانی نہیں چھوٹے مہاراج یہ ہمارا دھرم ہے۔“

”مگر ہمیں اپنے خدا پر بھروسہ ہے اور ہم جانتے ہیں کہ خدا کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہوتا۔“ میں نے کہا۔ وہ خاموش رہی تھی۔

اچانک مجھے یاد آیا تو میں نے کہا۔

”ایک بات بتاؤ میری محسن۔“

”میرے ان الفاظ سے اس کا چہرہ کھل اٹھا۔“ وہ بولی۔

”جی چھوٹے مہاراج۔“

”پہلے یہ بتاؤ تمہارا نام کیا ہے۔“

”منیکا۔“

”منیکا۔ ایک دن میں اپنے کمرے کی کھڑکی پر کھڑا تھا تو تم ہی میرے سامنے آئی تھیں۔“

”جی مہاراج۔“ اس نے نظریں جھکا کر کہا۔

”میں تمہیں آج تک یاد کرتا رہا ہوں۔ میرا دل تم سے ملنے کو تڑپتا رہا ہے۔“ اور میں تمہیں گنگا سری سمجھتا رہا ہوں۔“

”جی چھوٹے مہاراج۔“

”تم نے ہی مجھے جگا کر میرے چچا کے کمرے تک پہنچایا تھا اور مجھے اس سازش سے آگاہ کیا تھا۔“

”جی۔“

”کیا تم نے ہی کمالو کو ختم کیا تھا۔“

”ہاں۔ وہ کامیاب ہونے والا تھا۔ میں اپنے مہاراج کو کوئی نقصان پہنچنے کیسے دیکھ سکتی تھی۔“

”اسے وہاں شمشان گھاٹ میں کس نے پھینکا تھا۔“

”فرید خان نے۔“

”منیکا۔ تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہوجاتا ہے۔ مجھے

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

معاف کرنا کیا تم بھی روح ہو۔ کیا تم جسمانی طور پر اس دنیا سے جا چکی ہو۔" میرے اس سوال پر وہ خاموش ہوگئی۔ پھر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولی۔

"ابھی یہ سوال نہ کریں چھوٹے مہاراج۔"

"کیوں؟"

"پھر بتاؤں گی۔"

"ابھی نہیں بتاؤ گی۔"

"بنتی کرتی ہوں مہاراج۔ ابھی نہ پوچھیں۔" اس نے بڑی عاجزی سے کہا۔ وہ میری محسن تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ اس نے میری جان بچائی تھی ورنہ میرے سگے چچا نے تو جائیداد کے لئے مجھے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ میں منیکا سے بہت متاثر ہوا تھا اس انکشاف سے میرے ذہن کی ایک الجھن بھی دور ہوگئی تھی کہ جسے میں گنگا سری سمجھتا تھا وہ گنگا سری نہیں منیکا ہے ورنہ میرا ذہن اس الجھن کا شکار تھا کہ اگر گنگا سری مجھ پر یہ احسانات کر رہی ہے تو آخر کیوں۔ وہ اور اس کے رشتہ داروں کی روحیں تو میرے پورے خاندان کی دشمن تھیں اور انہوں نے اپنی دشمنی نکالنے کے لئے ہی اس خاندان کے کئی افراد ہلاک کر دیئے تھے۔ یہاں تک کہ میرے بہت ہی پیارے ابو بھی مجھ سے چھین لئے تھے۔ وہ گنگا سری میری دوست کیسے ہوگئی جبکہ اس کا ایک محبوب تھا۔ اس خیال نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے اسے آواز دی۔

"منیکا۔"

"جی چھوٹے مہاراج۔"

"مجھے ایک بات بتاؤ گی۔"

"بھگوان کرے ہم وہ بات بتا سکیں۔" اس نے کہا۔

"تم بہت اچھی ہو منیکا۔" اب تم میری دوست ہو، محسن ہو۔

"چرنوں کی دھول ہیں چھوٹے مہاراج کی۔" اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر سر جھکاتے ہوئے کہا۔

"گنگا سری کا محبوب کون تھا؟"

"یہی پوچھنا چاہتے تھے آپ مہاراج۔"

"ہاں۔"

"یہ تو ایسی بات نہیں ہے جو ہم نہ بتا سکیں۔ اس کا نام رام سروپ تھا۔ کاٹھی کا جاٹ تھا گنگا سری کی اس سے سگائی ہو چکی تھی بیساکھ میں ان کے پھیرے ہونے والے تھے ..... کہ....." وہ خاموش ہوگئی تو میں نے بے چینی سے کہا۔

"ہاں تو پھر؟"

"گنگا سری بری نہیں تھی مہاراج۔ ہری بھری ارمانوں میں ڈوبی ہوئی۔ بڑے مہاراج نے اسے دیکھ لیا اور۔ گنگا سری کے برے دن آ گئے۔"

"بڑے مہاراج سے تمہارا مطلب مامون خان ہے۔"

"ہاں۔"

"اچھا تو پھر۔"

"انہوں نے گنگا سری کو حاصل کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ بہت سے واقعات ہوئے۔ ہیرالعل نے ہاتھ جوڑ کر اور چرن چھو کر بنتی کی کہ اس کی بیٹی کی عزت نہ لوٹی جائے پر بڑے مہاراج نے ہیرالعل کو پکڑوا کر اس کے جوتے لگوائے۔ گنگا سری نے یہ بات اپنے پریمی اور منگیتر کو بتائی تو رام سروپ دیوانہ ہوگیا۔ پرانی حویلی میں وہ بڑے مہاراج کی بنتی کرنے گیا تھا کہ اس کی منگیتر کو پریشان نہ کریں جس پر وہ جیتا نہ آیا مہاراج نے وہیں اس کا خاتمہ کرا دیا اور اس کی لاش غائب کرا دی۔"

"اوہ....." میں نے افسوس سے کہا۔

"گنگا سری نے آتما ہتھیا کر لی۔ ہیرالعل اس کے غم میں پاگل ہوگیا اور اسی پاگل پن میں مرگیا۔ اور پھر۔ پھر مہاراج ان کی آتمائیں بھٹکنے لگیں۔ ہیرالعل کے کٹم نے بڑے مہاراج کے خلاف مقدمے کئے مگر مہاراج کے ہاتھ لمبے تھے۔ انہوں نے الٹے انہیں ہی سزائیں کرا دیں۔ تب ہیرالعل کے کٹم نے مل کر کوگن کھدوانی کے بت کے سامنے سوگند کھائی کہ وہ ملکھانی پریوار کے کسی بھی منش کو جیتا نہیں چھوڑیں گے۔"

"کوگن کھدوانی کا بت کس مندر میں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں چھوٹے مہاراج۔"

"پھر وہ کہاں ہوتا ہے۔"

"اسے جاپ کر کے بلایا جاتا ہے۔"

"بلایا جاتا ہے۔ کیا مطلب؟"

"جیسے بیروں کو جگایا جاتا ہے اسی طرح کوگن کھدوانی، جادو کا دیوتا، جاپ کرنے سے آتا ہے۔ اور وہ اپنی مرضی سے کوئی بھی وردان دیتا ہے۔"

"اوہ یہ جاپ کس نے کیا تھا۔"

"بتایا نا میں نے۔ یہ جاپ گنگا سری اور ہیرالعل کے پورے پریوار نے کیا تھا۔ وہ گنگا سری کی موت سے بہت اداس تھے جلتی پر تیل کا کام مامون خان مہاراج نے ان کا اپمان کر کے کیا اور وہ سارے اپنی آن بان کے لئے پران دینے پر تیار ہوگئے۔"

"او مائی گاڈ۔ اس طرح تو یہ ایک قومی مسئلہ بن گیا۔" میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ مجھے احساس ہوا کہ بات معمولی نہیں ہے اور یہ چند دروحوں کا کھیل نہیں ہے بلکہ باقاعدہ ایک روحانی دشمنی ہے۔

میں نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اور میرے دل کو ایک سرور کا سا احساس ہوا، وہ بڑے پیار سے مجھے دیکھ رہی تھی مجھ سے نظریں ملیں تو شرما گئی اور آنکھیں نیچی کر لیں۔ اس عالم میں وہ مجھے بہت پیاری لگی تھی لیکن پھر میرے دل پر افسردگی طاری ہوگئی اس خیال سے کہ وہ بھی ایک روح ہے اور اس کی کوئی مادی حیثیت نہیں ہے اس کا ثبوت اس کا انسان سے ناگن بن جانا تھا۔

کچھ لمحوں کے بعد میں نے کہا۔

"بہت سی باتیں سمجھ میں نہیں آئیں منیکا۔ مثلاً یہ کہ رام سروپ، گنگا سری کے محبوب کا یہی نام بتایا تھا نا تم نے۔"

"جی مہاراج۔"

"وہ خود آتما بن کر کیوں نہیں آیا۔ وہ خود بھی تو بتا سکتا تھا کہ اس کی لاش کہاں چھپائی گئی ہے۔ جبکہ اس کی محبوبہ پاگلوں کی طرح اسے تلاش کرتی پھرتی ہے۔"

"جی مہاراج۔ اس کا کارن ہے۔"

"کیا؟" میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

"آتمائیں اچھا والی ہوتی ہیں۔ شریر کے راکھ ہونے کے بعد شریر باقی نہیں رہتا جب تک دوسرا جنم نہ ہو۔ لیکن اگر کسی کے کرم ادھورے رہ جائیں تو وہ ہوا کی شکل میں سنسار میں آ سکتا ہے۔ اس کے کچھ نقصان ہوتے ہیں اسے ادھار کا جیون ملتا ہے پر بہت سی پابندیوں کے ساتھ۔ سو رام سروپ نے سنسار میں جانے کی اچھا نہیں کی ہوگی۔" اس نے تفصیل بتائی۔

میرا ذہن اس کی باتیں قبول نہیں کر رہا تھا۔ ہم ان باتوں کو نہیں مانتے، زندگی ایک بار ملتی ہے پھر اللہ کے حکم سے چلی جاتی ہے اور پھر روز قیامت دوبارہ زندگی ملے گی۔ یہ ہمارا ایمان ہے۔ دوسرے مذاہب کی جو بھی کہانیاں ہوں ہم آوا گون کو تسلیم نہیں کرتے۔ پتہ نہیں وہ یہ کہانی کیوں سنا رہی ہے۔ اور خود..... وہ کیا ہے، کوئی زندہ وجود..... یا پھر خود بھی کوئی روح۔ لیکن اس نے اپنے بارے میں بتانے سے گریز کیا تھا۔ پتہ نہیں کیوں..... پتہ نہیں اس گریز میں کیا اسرار تھا وہ خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی، پھر بولی۔

"ہم تم سے کچھ مانگیں تو دے دو گے جھوٹے مہاراج۔"

میں نے حیرت سے کہا۔ وہ اپنی حسین ترین آنکھوں سے سوالیہ انداز میں مجھے دیکھ رہی تھی۔

"میں تمہیں کیا دے سکتا ہوں منیکا۔"

"چھوٹے مہاراج۔ تم ہمیں گنگا سری کی پازیب دے دو۔"

"ایں.....؟" میں چونک پڑا۔ پھر میں نے کہا۔ "وہ تو ایک ہے منیکا۔"

"ہم جانتے ہیں پر وہ ہمیں پہننے کے لئے نہیں چاہئے۔"

"تو پھر؟"

"یہ بھی ہم آپ کو نہیں بتا سکتے۔"

"اوہ!" میں نے گہری سانس لی۔ پھر میں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے، میں تمہیں دے دوں گا۔"

"ہم اسے لینے آپ کے پاس آئیں گے۔ اب ہم

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

چلتے ہیں۔ آپ بھی جائیں ایک بات اور کہیں۔ وہ یہ ہے کہ اب آپ اکیلے کبھی پرانی حویلی میں نہ آئیں اول تو اب آپ کا یہاں کوئی کام نہیں ہے دوسرے آپ کو اگر کبھی آنا ہی ہو تو ہمیں بتا دیں ہم آپ کے ساتھ یہاں آئیں گے۔ چلیں۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ پھر میں اور منیکا ساتھ ہی حویلی سے باہر نکل آئے۔ اس نے پیار بھری نظروں سے مجھے دیکھا اپنا ہاتھ ہونٹوں سے لگایا اور پھر ملیں گے"..... بول کر چل پڑی۔ میں خاموشی سے اسے جاتے دیکھتا رہا تھا۔ پھر میں نے حیرت سے دیکھا کہ مجھ سے چند گز دور جا کر اس کا وجود دھندلا پڑ گیا اور وہ جیسے ہوا میں تحلیل ہو گئی۔

اپنے کمرے میں آ کر میں نڈھال سا بستر پر پڑ گیا۔ آج کی رات جو کچھ ہوا تھا وہ ایک پوری کہانی تھی۔ جتنے راز مجھ پر منکشف ہوئے تھے شاید برسوں میں بھی نہ ہوتے۔ لیکن ساری باتیں حیران کن تھیں۔ وہ لڑکی گنگا سری نہیں بلکہ منیکا تھی جو مجھے اس رات نظر آئی تھی۔ اور جو میرے ذہن پر ایک عجیب نقش چھوڑ گئی تھی۔ میں حیران بھی تھا کہ میرے دادا جان کے ہم شکل ہونے کے باوجود اس نے مجھ پر مہربانیاں کیوں کی تھیں جبکہ گھر کے دوسرے افراد جیسے پھوپا، پھوپی، ابو پر پوری طرح ظلم کیا گیا تھا لیکن مسئلہ دوسرا نکلا۔ منیکا، میں نے اسے ناگن کے روپ میں دیکھا تھا کیا وہ بھی ایک روح ہے۔ اس کے علاوہ اور کیا سوچا جا سکتا تھا۔ اور اس نے کمالو کو بھی ہلاک کر دیا تھا۔

چنی رو فرید خان کی طرف ہو گئی۔ مجھے بے حد افسوس تھا۔ میرے چچا میری زندگی کے درپے تھے۔ پھر ایک اور خیال آیا۔ پرانی حویلی میں اگر منیکا میری مدد نہ کرتی تو پتہ نہیں کیا ہو جاتا۔ صاف ظاہر تھا کہ میری لاش بھی حویلی میں پڑی سڑ رہی ہوتی۔ حالانکہ تعویز میرے پاس تھا اور اس تعویز کی مدد سے میں ہمیشہ ان بدروحوں سے محفوظ رہا تھا۔ لیکن گنگا سری اس وقت مجھ پر حاوی ہو گئی تھی۔

"کیوں.....؟" میرے ذہن نے مجھ سے سوال کیا۔

"اس لئے کہ تعویز اصلی نہیں ہے۔" ایک نامانوس آواز میرے کانوں میں ابھری۔ یہ مردانہ آواز تھی اور میں نے پہلی بار سنی تھی۔ میں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھا۔ یہ کون بولا تھا۔ اور جو کچھ اس آواز نے کہا تھا وہ بھی شدید سنسنی خیز تھا لیکن یہ کہا کس نے۔"

"کون ہیں آپ۔ اور یہ کیا کہہ رہے ہیں؟" میں نے مدھم لہجے میں کہا۔ لیکن مجھے کوئی جواب نہیں ملا۔ میں نے مدھم لہجے میں یہ سوال کئی بار دوہرایا۔ لیکن پھر کوئی آواز نہیں سنائی دی۔ امی بدستور گہری نیند سو رہی تھیں کیا واقعی تعویز نقلی ہے۔ یقیناً ایسا ہی ہے۔ اوہ میرے خدا، اگر منیکا نہ آتی تو گنگا سری نے آج میرا بھی خاتمہ کر دیا تھا۔ منیکا نے دوبارہ میری جان بچائی تھی پہلے کمالو سے پھر گنگا سری سے۔

میں نے جلدی سے تعویز نکال کر دیکھا غور سے دیکھنے پر اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ یہ تعویز جعلی ہے۔ پہلے تعویز کو میں نے عقیدت سے دیکھا تھا اور دوبارہ اسے کبھی نکال کر نہیں دیکھا تھا لیکن مجھے اس کی اصل ہیئت یاد تھی یہ پہلے جیسا نہیں تھا اسے تبدیل کیا گیا تھا۔

لیکن کس نے۔

اور جواب بھی فوراً مل گیا۔ اس وقت میں نے چچا صاحب کو اپنے کمرے کے دروازے پر دیکھا تھا۔ وہ اس طرف آ رہے تھے جدھر سے میں اچانک نمودار ہوا تھا اور انہوں نے فوراً رخ دوسری طرف کر دیا تھا۔ یقیناً وہ اس وقت میرے کمرے سے نکلے تھے۔ اور انہوں نے میرا تعویز لے کر اس کی جگہ یہ تعویز رکھ دیا تھا۔

لیکن انہیں میرے تعویز کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ انہیں کیسے پتہ چلا کہ ایسا کوئی تعویز میرے پاس ہے۔ ایک دم میرے دل میں شعلہ سا بھڑکا۔ چچا صاحب حد سے گزر چکے ہیں۔ وہ ہر قیمت پر میری زندگی لینے کے درپے ہیں۔ اور رشتے ناتے شیشے کے کھلونے کی طرح توڑ چکے ہیں اگر میرا دماغ الٹ گیا تو انہیں پناہ لینا مشکل ہو جائے گا۔ وہ میرے ایک وار کی تاب نہیں لا سکیں گے۔ یہ خیال بھی دل میں آیا کہ امی کو پوری تفصیل بتا کر ان سے مشورہ کروں اور تایا ابو اور بڑی پھوپی جان کو بتا دوں کہ کم از کم میری دشمن صرف گنگا سری یا ہیرا لعل نہیں ہیں بلکہ ایک اپنا مجھے قتل کر دینے کے خواب دیکھ رہا ہے اور چاہتا ہے کہ مجھے

اس طرح قتل کروائے کہ معلوم ہو کہ یہ کام گنگا سری نے کیا ہے۔

دیر تک میں غم و غصے کا شکار رہا۔ پھر میں نے تعویز کھول کر دیکھا۔ بالکل سادہ کاغذ تھا۔ میں اسے گھورتا رہا۔ اب کیا کروں۔ ایک دم دل میں خیال آیا کہ محترم بزرگ محبوب الٰہی سے ملوں اور انہیں ساری صورت حال بتا کر درخواست کروں کہ مجھے دوسرا تعویز دے دیں۔

میں نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ اس وقت کسی شریف آدمی کو پریشان کرنا مناسب نہیں تھا حالانکہ دل چاہ رہا تھا کہ ابھی اسی وقت انکل نیاز علی کو فون کر کے محبوب الٰہی صاحب کے بارے میں پوچھوں۔ لیکن یہ ٹھیک نہیں۔ البتہ دوسرے دن ناشتے کے بعد میں نے نیاز علی صاحب کو فون کیا۔ ان کا سیل نمبر ابو کے پاس موجود تھا اور مجھے معلوم تھا کہ ابو کی فون انڈیکس کہاں ہوتی ہے کوئی دس بارہ کالیں کیں۔ آخری کال پر آپریٹر کی آواز ابھری۔

"معاف کیجیے آپ کا مطلوبہ نمبر کسی کے استعمال میں نہیں ہے۔"

مجھے حیرت ہوئی تھی۔ میں نے پھر انڈیکس میں دیکھ کر اس نمبر کی تصدیق کی۔ میں نے ٹھیک نمبر ملایا تھا۔ ممکن ہے نیاز انکل نے سم بدل دی ہو۔ اب کیا کروں۔ نیاز علی کے پاس جاؤں۔ کوئی بہانہ کرنا پڑے گا امی کو بتانا ضروری ہے کہ میں چار گڑھی جا رہا ہوں لیکن اس کی وجہ وہ ضرور پوچھیں گی میں ان سے جھوٹ نہیں بولنا چاہتا تھا کیونکہ امی کو فرید چاچا کے بارے میں بتا کر پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں دیکھتا تھا کہ وہ فرید خان کو بھی میری طرح چاہتی ہوں۔ وہ اکثر کہتی تھیں کہ "فرید خان میرا دیور نہیں میرا سب سے بڑا بیٹا ہے۔"

غرض یہ کہ میں امی کے سامنے پہنچ گیا۔

"امی۔ میں چار گڑھی جانا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا تو وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگیں۔ پھر انہوں نے تعجب سے کہا۔

"کیوں۔ بیٹے؟"

"آپ کو یاد ہو کہ ابو مجھے چار گڑھی لے گئے تھے۔ وہاں انہوں نے مجھے چچا نیاز علی سے ملایا تھا نیاز چچا مجھ سے بہت پیار سے ملے تھے۔ میرا دل ان سے ملنے کو چاہ رہا ہے۔"

"اکیلے جاؤ گے؟ یا تایا ابو ساتھ جا رہے ہیں۔ میرا مطلب ہے کوئی کاروباری بات کے لئے تو تایا ابو نے نہیں کہا۔"

"نہیں امی۔" ڈرائیور کے ساتھ جاؤں گا۔

"کب جاؤ گے؟"

"بس آج ہی..... تھوڑی دیر کے بعد۔"

"واپسی کب تک ہو گی۔"

"آج ہی۔ ویسے اگر نیاز علی صاحب نے روکا تو زیادہ سے زیادہ کل۔"

"ٹھیک ہے چلے جاؤ۔ لیکن احتیاط رکھنا ہم مشکلوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ اللہ ہم سب کی حفاظت کرے۔"

امی نے میری روانگی کے لئے تیاریاں کیں۔ پھر ابرار احمد ڈرائیور کو ہدایات دیں اور میں چار گڑھی گاؤں روانہ ہو گیا۔ راستے میں ابرار احمد سے باتیں کرتا رہا پھر چار گڑھی پہنچ گیا۔ نیاز علی موجود تھے مجھ سے بہت ہی پیار اور اپنائیت سے ملے، گلے لگا لیا۔ "میں نے کہا۔

"میں آپ کو مسلسل کال کرتا رہا۔ لیکن رابطہ نہیں ہو سکا۔"

"اوہو اچھا۔ اصل میں میرا موبائل پانی میں گر پڑا تھا۔ نیا موبائل لاہور سے منگوایا اس میں سم بھی نئی پڑی ہے۔ لاہور جا کر پرانی سم نکلوانی ہے۔"

"ویسے تو سب خیریت ہے چچا جان۔"

"ہاں بیٹے۔" میں خود بھی گھر گھاٹ آنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کچھ حسابات کرنے تھے فرید خاں صاحب سے۔"

میں نے اس بات پر کچھ دیر سوچا۔ ابو کی موت کے بعد چونکہ سب کی متفقہ رائے سے ہمارے کاروبار کا حساب فرید چچا کرنے لگے تھے اس لئے سب سارے کام چچا کرتے تھے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ نیاز علی کو راز دار بنا لیا جائے وہ بے حد مخلص آدمی تھے اور سب سے بڑی بات یہ تھی

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

کہ ابو کے گہرے دوست تھے۔ میں نے کہا۔

"نیاز چچا ۔ میں مرشد محبوب الٰہی سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"اوہو۔ وہ تو سیلانی آدمی ہیں۔ میرے پاس آئے ہوئے بھی کافی دن ہوگئے۔ آخری بار عظمت بھائی کے انتقال سے پہلے آئے تھے۔ اس وقت کہہ رہے تھے کہ انڈیا جارہا ہوں ۔ پہلے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے مزار مبارک کی زیارت کروں گا۔ پھر دہلی جاکر حضرت نظام الدین اولیاؒ کے مزار پر جاؤں گا پھر کلیر شریف اور پھر آگرہ، سلیم الدین چشتیؒ کی قدم بوسی کروں گا۔"

"اوہ۔ یہ تو بڑی پریشانی کی بات ہے۔" میں نے مایوسی سے کہا۔ بہت بڑی غلطی ہوگئی تھی۔ میں نے اس تعویز کی صحیح طور پر حفاظت نہ کی جو میرے لئے بہت بڑی ڈھال تھا۔

نیاز علی غور سے میرا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ کہنے لگے۔

"بیٹے ۔ عظمت خاں صاحب سے میرا کاروبار ہی نہیں تھا بلکہ وہ میرے لئے بھائیوں جیسا درجہ رکھتے تھے۔ تمہیں کوئی پریشانی ہو تو مجھے بتاؤ۔"

"جی۔ میں پریشان ہوں چچا جان۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"ارے میرا بچہ۔ کیا بات ہے مجھے بتاؤ۔"

"حویلی کے حالات کا تو آپ کو علم ہوگا۔"

"پوری طرح۔"

"دادا جان کی کہانی بھی۔"

"ہاں وہ تو گجر گھاٹ کے آس پاس جتنی آبادیاں ہیں سب کو معلوم ہے۔"

"آپ مجھے ایک بات بتائیں گے نیاز چچا۔"

"ضرور اور یہ بھی درخواست کروں گا کہ میرے کسی سچ کا برا نہیں مناؤ گے۔"

"جو ہورہا ہے دنیا دیکھ رہی ہے۔ میرے برا ماننے یا نہ ماننے سے کیا ہوگا۔" میں نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔

"مجھ میں اور دنیا میں فرق ہے۔ خیر تم بتاؤ کیا پوچھنا چاہتے ہو؟"

"کیا دادا جان اتنے ہی برے تھے جتنا لوگ کہتے ہیں۔" میں نے سوال کیا اور نیاز علی سوچ میں ڈوب گئے پھر صاف لہجے میں بولے۔

"اس سے بھی زیادہ برے جتنا لوگ کہتے ہیں۔ اصل میں گنگا سری ہندو لڑکی تھی۔ پاکستان میں اقلیتوں کو پورا تحفظ اصل ہے اس لئے ہندوؤں نے بھرپور احتجاج کیا یہ اور بات ہے کہ وہ مامون خان کا کچھ نہیں بگاڑ سکے۔ کیونکہ ان کے ہاتھ بہت لمبے تھے۔ ان کی زندگی میں تو ہر ہفتے لاہور، کراچی اور اسلام آباد کے سرکاری افسر حویلی آتے رہتے تھے۔ مجرے ہوتے تھے۔ اور خوب رنگ رلیاں منائی جاتی تھیں۔ تو میں بتا رہا تھا کہ گنگا سری ہندو لڑکی تھی اس لئے بات زیادہ اچھل گئی۔ لیکن انہوں نے کئی خاندانوں کو زخمی کیا ہے۔ کئی نوجوان لڑکیوں نے خودکشی کی ہے اور کئی انہوں نے خود قتل کرائی ہیں۔ ان کے اہل خاندان اپنی بستیاں چھوڑ کر کہیں سے کہیں جا کر آباد ہوگئے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ مامون خان کا کچھ نہیں بگاڑ پائیں گے بلکہ دوسرے پیاروں کی جان بھی مفت میں جائے گی۔"

"اوہ میرے خدا۔" میں نے غم سے سر پکڑ لیا۔

نیاز علی کے چہرے پر بھی افسردگی تھی۔ کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد میں نے کہا۔ "یقیناً حویلی کے سارے حالات بھی آپ کے علم میں ہوں گے۔"

"جیسا کہ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ عظمت خان مرحوم سے صرف میرا کاروباری رشتہ نہیں تھا۔ بلکہ وہ میرے لئے بھائیوں جیسے تھے۔ وہ جب بھی پریشان ہوتے میرے پاس آجاتے اور اپنی ہر مشکل کے بارے میں مجھے بتاتے۔"

"تیرہ تاریخ کی کہانی بھی انہوں نے سنائی ہوگی۔"

"ہاں بالکل۔"

"وہ تو روحوں کی کہانی ہے۔ نیاز چچا جان۔ لیکن اس حویلی میں ایک زندہ آسیب بھی موجود ہے۔"

"زندہ آسیب۔" نیاز چچا حیرت سے بولے۔

"ہاں۔ میں آپ کو اس کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں۔"

"بتاؤ۔" انہوں نے کہا اور میں نے انہیں پوری کہانی سنادی میں نے فرید خان کے بارے میں انہیں بتاتے ہوئے کہا۔

"حالانکہ۔ میں انہیں صرف چچا نہیں سمجھتا تھا بلکہ امی میری طرح ہی انہیں چاہتی تھیں اور اپنا بڑا بیٹا مانتی تھیں۔ لیکن انہوں نے۔"

میری آواز رندھ گئی۔ نیاز چچا بھی افسردہ ہوگئے۔ پھر بولے۔ "یہ تو واقعی سخت پریشانی کی بات ہے۔ ابھی ایک ہفتے پہلے ہی فرید خان صاحب میرے پاس آئے تھے۔"

"آپ کے پاس؟"

"ہاں۔" انہوں نے رحمت خان صاحب سے فون پر میری بات بھی کرائی تھی۔ بڑے ملکھانے صاحب نے کہا تھا کہ عظمت خان مرحوم کے تمام کاروبار کی انتظامی ذمہ داری فرید خان کو دے دی گئی ہے چنانچہ میں اپنے تمام حسابات انہیں چیک کرادوں اور واجب رقم انہیں دے دوں۔ دو دن قیام کیا تھا انہوں نے اور سارے حسابات چیک کئے تھے۔ جاتے ہوئے میں نے انہیں پانچ لاکھ کا چیک بھی دے دیا تھا۔

"پانچ لاکھ؟" میں نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ دیں۔

"ہاں۔ میری طرف نکلتے تھے۔"

"اوہ۔ اس کا مطلب ہے کہ انہوں نے اپنا جال مکمل کرلیا ہے۔"

"میں تو بہت پریشان ہوگیا۔" نیاز علی نے پیشانی مسلتے ہوئے کہا۔

"اب مجھے مشورہ دیں چچا جان۔ میں کیا کروں۔" میں نے کہا۔ نیاز علی دیر تک سوچتے رہے پھر بولے۔

"ایک بات بتاؤ بیٹے۔"

"جی چچا جان۔"

"تمہیں آگے کی تعلیم کے لئے لاہور بھیجنے کی بات بھی تو ہو رہی تھی۔ ایک بار عظمت خان نے بتایا تھا۔"

"جی بالکل۔"

"پھر اس کا کیا ہوا۔"

"ابو ہی اس دنیا سے چلے گئے۔ اس کے بعد بات آگے نہیں بڑھ سکی۔"

"تمہاری والدہ تمہیں لاہور بھیجنے کے حق میں ہیں؟"

"میں نے عرض کیا نا کہ بات ہی آگے نہیں بڑھ سکی۔"

"ہوں۔ میری رائے ہے اشرف میاں کہ تم تعلیم کے لئے لاہور چلے جاؤ۔ وہاں ہاسٹل میں قیام کرو، اس کام میں جتنی جلدی ہو زیادہ اچھا ہے۔ تم وہاں جاؤ تو کچھ ہی وقت کے بعد میں تمہارے پاس آجاؤں گا۔ طارق چغتائی صاحب عظمت صاحب کے قانونی مشیر ہیں۔ ہم ان کے سامنے پورا کیس رکھیں گے ان سے بہتر مشورہ کوئی نہیں دے سکے گا۔ بلکہ وہ فوری طور پر تمہاری جائیداد کے لئے فرید خان کے اختیارات ختم کردیں گے اور عارضی طور پر خود انٹارنی جنرل بن جائیں گے۔"

"اس سے ہمیں فائدہ ہوگا۔" میں نے معصومیت سے کہا۔

"بہت زیادہ۔ فرید خان کے سارے منصوبے فیل ہوجائیں گے۔ اس کے علاوہ اگر بات زیادہ آگے بڑھی تو تمہیں فرید خان کے خلاف پولیس کی مدد بھی حاصل ہوجائے گی۔ تم لاہور میں رہو، میں یہاں کی خبر گیری کرتا رہوں گا اور تمہیں حالات سے آگاہ رکھوں گا۔"

"میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔ اور مجھے خوشی ہے کہ میں آپ کے پاس آگیا۔ آپ سے بات کرکے مجھے بہت تسلی ہوگئی ہے ورنہ میں بہت پریشان تھا۔"

"میری خوش نصیبی ہے کہ میں تمہارے کسی کام آؤں۔"

"میں سب سے زیادہ پریشان اس تعویز کے گم ہوجانے سے ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ فرید خان نے اسے اڑا کر اس کی جگہ کاغذ کا وہ سادہ ٹکڑا رکھ دیا ہے۔ کاش مرشد مل جائیں۔"

"میرا وعدہ ہے کہ جیسے ہی مجھے ان کے بارے میں خبر ملی میں تمہیں آگاہ کروں گا اور خود بھی انہیں تمہارے

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk
Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

بارے میں بتاؤں گا۔"

"میرے دل میں ایک اور خیال ہے نیاز چچا۔"

"کیا بیٹے؟"

"میں پراسرار علوم سیکھوں۔ اور پراسرار طاقتیں حاصل کر کے ان دشمن روحوں سے اپنے ابو پھوپھی اور پھوپا کا انتقام لوں۔"

"ارے نہیں بیٹے۔ ان خیالات کو اپنے دل میں جگہ نہ دو۔ دنیاوی زندگی میں ایسی کسی خواہش کا کوئی مقام نہیں ہے۔ سب سے زیادہ پراسرار علم اعلیٰ تعلیم ہے خدا نے تمہیں اتنا کچھ دیا ہے کہ تمہاری نسلیں آرام سے جی سکیں۔ بس تم اپنے اطراف سے ہوشیار رہنے کا علم سیکھو۔"

"لیکن گنگا سری، ہیرالعل اور اس کے خاندان نے قسم کھائی ہے کہ وہ ہمارے گھرانے کے کسی فرد کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ اور وہ اس کا مظاہرہ بھی کر چکے ہیں۔"

"اللہ سے بڑی طاقت کوئی بھی نہیں ہے۔ مامون خان نے واقعی لوگوں پر ظلم کئے تھے۔ انہیں سزا ملی اور کیوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے عظمت خاں اور تمہارے پھوپا پھوپی بھی مارے گئے۔ لیکن انشاء اللہ اب ہیرالعل اور اس کی بیٹی تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ ہاں تم ان دشمن روحوں سے زیادہ ان دشمن انسانوں سے ہوشیار رہو جو ان روحوں سے زیادہ خطرناک ہیں۔"

"جی چچا جان۔"

"خیر فکر مت کرو۔ میں فون پر بھی طارق چغتائی صاحب سے بات کرتا ہوں۔"

نیاز علی نے میری خوب خاطر مدارت کی۔ پھر میں نے ان سے اجازت طلب کی تو وہ بولے۔ "دل گھبرایا کرے تو والدہ سے اجازت لے کر آجایا کرو، اور سب سے پہلے تایا ابو سے لاہور جانے کی بات کرو۔"

"جی۔ میں کرتا ہوں۔" میں نے کہا اور پھر ان سے رخصت ہو کر چل پڑا۔

جب میں چارگڑھی سے باہر نکلا تو آسمان ابر آلود تھا۔ لیکن تھوڑا ہی آگے بڑھا تھا کہ ابر گہرا ہوتا چلا گیا۔ ڈرائیور ابرار احمد بدستور مجھ سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ راجی پور کی باتیں کر رہا تھا جہاں سے اس کے ماں باپ کا تعلق تھا راجی پور بارشوں کے لئے مشہور تھا۔ وہاں ہر موسم میں بارشیں ہوتی رہتی تھیں۔

کار مناسب رفتار سے دوڑ رہی تھی اور ہمیں موسم کی کوئی فکر نہیں تھی لیکن ابھی آدھے راستے پر بھی نہیں پہنچے تھے کہ اچانک تیز ہوا چلنے لگی۔ ابرار احمد بڑے اطمینان سے گاڑی چلا رہا تھا کہ اچانک آسمان سے سیاہی نیچے اترنے لگی ساتھ ہی ہوا کے جھکڑ تیز آندھی کی شکل اختیار کرنے لگے تب ہی ابرار احمد کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"کالی آندھی۔ چھوٹے مالک، کالی آندھی۔"

"کیا بات ہے ابرار بھائی؟"

"کالی آندھی ہے۔ وہی ہے۔" ابرار کے لہجے میں خوف تھا۔

"تو پھر؟"

"بڑی خوفناک ہوتی ہے یہ۔ ایک بار دیکھی ہے اللہ کرے ویسی نہ ہو۔ بڑے بڑے درخت جڑ سے اکھڑ کر....."

ابرار نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا ایک لمحے رک کر دوبارہ بولا۔ "چھوٹے مالک، گاڑی کسی کھلے میدان میں کھڑی کرتا ہوں یہاں پیڑ زیادہ ہیں گاڑی کو نقصان پہنچ سکتا ہے اسی حالت میں گاڑی چلانا بھی۔"

ابرار نے پھر جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور گاڑی روکی۔ پھر اس نے بڑا خطرناک کام کیا۔ اس نے ایک سیدھے ڈھلان میں گاڑی اتار دی۔ سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا تھا۔ لیکن اس نے بڑی مہارت کا ثبوت دیا تھا۔ گاڑی نیچے جا کر سیدھی ہو گئی۔ وہ تھوڑا سا اور آگے بڑھا اور پھر اس نے گاڑی روک دی۔

"معافی چاہتا ہوں چھوٹے مالک ابھی گہری کالی آندھی سارے ماحول کو کالی رات میں بدل دے گی مجھے یہ میدان نظر آ گیا تھا یہاں درخت بھی نہیں ہیں آپ دیکھیں کیا ہوتا ہے۔" ابرار احمد نے کہا۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور دلچسپ نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگا سارا ماحول آنکھوں سے غروب ہو گیا تھا۔ اب ہر طرف تاریکی چھا گئی تھی۔ دور دور سے چھوٹے درخت، خودرو جھاڑیاں اکھڑ

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

اکھڑ کر آ رہی تھیں بڑے درخت بھی اکھڑ رہے تھے ان کے تنوں کے ٹوٹنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

"جگہ بڑی اچھی مل گئی مالک جی۔ بڑے درخت بہت دور ہیں اڑ کر اتنی دور نہیں آ سکتے۔" ابرار احمد نے کہا۔

"یہ ہے کیا ابرار بھائی؟"

"کالی اندھی کہتے ہیں اسے مالک۔"

"مگر میں نے پہلے ایسی آندھی نہیں دیکھی۔"

"دس بیس سالوں میں کبھی آتی ہے ہم نے کوئی بیس سال پہلے ایک بار دیکھی تھی اس وقت بھی ہم ایسے ہی جنگل سے گزر رہے تھے ابا لاری چلاتے تھے ہم ان کے ساتھ جا رہے تھے ارے توبہ توبہ۔ جنگل کا جنگل اکھڑ گیا تھا درخت یوں تیرتے ہوئے جا رہے تھے جیسے جہاز اڑتے ہیں ہم ایک گاؤں کے قریب تھے جب آندھی رکی تو لاری آگے بڑھ کر گاؤں تک پہنچی سارے گاؤں میں لاشیں بکھری پڑی تھیں جانوروں کی پرندوں کی اور انسانوں کی۔ کچے جھونپڑے تو سارے کے سارے اڑ گئے تھے۔ کچے گھر سب ڈھے گئے تھے۔ بندے ہر طرف روتے پیٹتے، چیختے چلاتے بھاگتے پھر رہے تھے ایک افراتفری مچی ہوئی تھی۔"

ابرار احمد کی آواز بھی بڑی مشکل سے میرے کانوں تک آ رہی تھی۔ ہم نے گاڑی کے سارے شیشے بند کرنے تھے اور آندھی بند ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ کچھ دیر کے بعد میں نے کہا۔

"یہ تو رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی ابرار بھائی۔"

"اللہ مالک ہے۔"

"تم نے گاڑی بڑی خطرناک جگہ سے نیچے اتاری ہے۔ ابرار بھائی۔"

"بس اللہ کا کرم ہے۔" اس نے یہ جگہ دکھائی ورنہ مالک میلوں تک جنگل ہی جنگل ہے۔ اور یہ تو چھوٹی سی گاڑی ہے۔"

"گاڑی اوپر چڑھا لو گے۔"

"ہاں مالک۔ مگر روشنی کا انتظار کرنا پڑے گا۔"

"روشنی تو اب صبح ہی کو ہو گی۔"

"مجبوری ہے مالک۔ رکنا پڑے گا۔ آپ کو حفاظت سے گھر پہنچا دینا ہماری ذمہ داری ہے۔"

ابرار احمد ٹھیک کہہ رہا تھا۔ آندھی رک بھی جائے تب بھی گاڑی سڑک پر لے جانے کے لئے دن کی روشنی کا انتظار کرنا پڑے گا۔ لیکن مجھے خوشی تھی کہ گھر میں امی سے میں نے یہ کہہ دیا تھا کہ اگر نیاز علی نے روکا تو میں رات کو رک جاؤں گا اس لئے امی پریشان نہیں ہوں گی۔

ابرار احمد نے پچھلی سیٹ سے کمر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں میں بھی شدید ذہنی تھکن محسوس کر رہا تھا میری سوچیں نہ جانے کہاں کہاں بھٹک رہی تھیں نیاز چچا سے ہونے والی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ ان کا مشورہ تھا کہ میں لاہور چلا جاؤں، کیا امی اس کی اجازت دیں گی یا پھر امی کو بھی ساتھ لے جاؤں۔ ہمارے لئے مشکل نہیں تھا کہ ہم لاہور میں ایک گھر خرید لیں۔ مگر بات پھر وہی ہو جاتی ہے تعلیم کے لئے لاہور چلے جانا کوئی خاص بات نہیں ہے لیکن گجر گھاٹ کی حویلی کوئی نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

آندھی اب بھی اسی زور و شور سے چل رہی تھی۔ قیامت کا شور بلند ہو رہا تھا۔ درختوں کے تنے ٹوٹ رہے تھے۔ بڑے بڑے چھاڑ فضا میں پرواز کر رہے تھے۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ دماغ کو ایک سکون کا احساس ہوا پھر آنکھیں بند ہی رہیں نیند بھی کمال کی چیز ہے۔ اس کے بارے میں بہت سی کہاوتیں کہی جاتی ہیں اور جب چاہو ان کہاوتوں کی تصدیق کر لو۔ میں سو گیا تھا۔ پھر جاگ گیا یا پھر جاگنے کا خواب دیکھ رہا تھا۔

سامنے ایک خوب صورت صبح بکھری ہوئی تھی۔ روشن، چمکدار اور سہانی صبح۔ ہر طرف جھاڑیوں کے انبار لگے ہوئے تھے دور دور تک جنگل تباہ ہو گئے تھے۔ میں انہیں دیکھ ہی رہا تھا کہ کانوں میں عجیب سی آواز گونجی۔ پتیل کے مجیرے بھی بج رہے تھے۔ اور ایک پاٹ دار آواز اور اس کے ساتھ ایک دلکش نسوانی آواز۔

کوئی مرد، اور عورت بھجن گا رہے تھے۔

سانچو تیرو نام رام سانچو تیرو نام
چھوٹے جگ کے کام رام سانچو تیرو نام
کالے کر آئے تھے جگ میں

کالے کر تم جاؤ گے
مٹھی باندھ کے آئے تھے
اور ہاتھ پسار چلے جاؤ گے
جھوٹے جگ کے کام رام
سانجھ تیرو نام

آوازیں اتنی حسین تھیں کہ دل مٹھی میں لئے جارہی تھیں۔ سحر کی سی کیفیت تھی۔ پتہ نہیں کہاں سے یہ آوازیں آرہی تھیں۔ اسی وقت مجھے ایک آواز سنائی دی اور میں ہوش میں آ گیا۔ مجھے احساس ہوگیا کہ میں اپنی کار کی پچھلی سیٹوں پر ہوں۔ جو آہٹ مجھے سنائی دی تھی وہ ڈرائیور ابرار کے قدموں کی تھی۔ وہ جھاڑیوں میں راستہ بناتا آرہا تھا۔

گزری رات یاد آ گئی کالی آندھی رک گئی تھی۔ سفید دن نکل آیا تھا لیکن بھجن کی یہ آوازیں.....؟

ابرار احمد میرے پاس پہنچ گیا۔

"آپ جاگ گئے چھوٹے مالک۔ بڑی تباہی پھیلی ہے ایسے ایسے پیڑ اکھڑ کر دور جا گرے ہیں کہ آپ دیکھو تو یقین نہ کرو۔"

"اندازہ ہو رہا ہے ابرار بھائی۔" میں نے کہا۔

"ہم تو جنگل میں ہیں۔ آس پاس کے گاؤں کے گاؤں اجڑ گئے ہوں گے۔ اللہ سب پر رحم کرے۔"

"یہ آوازیں کیسی ہیں ابرار بھائی۔"

"تھوڑے فاصلے پر پرانی دھرم شالہ ہے۔ وہاں کوئی پوجا پاٹ کر رہا ہے۔ یہاں اب بھی کافی ہندو آباد ہیں کئی مندر بھی ہیں۔ میرے خیال میں کسی نے دھرم شالہ میں گھر بسا رکھا ہے۔"

"تم نے اسے قریب سے دیکھا ہے۔"

"کسے مالک۔"

"دھرم شالہ کی بات کر رہا ہوں۔"

"قریب سے تو نہیں دیکھا گاڑی سڑک پر لے جانے کی جگہ تلاش کر رہا تھا۔ دور سے دھرم شالہ نظر آ گئی۔ کسی نے اسے صاف ستھرا کر رکھا ہے۔"

"گاڑی اوپر سے جانے کی جگہ مل گئی؟" میں نے پوچھا۔

"اتار تو لایا تھا بدحواسی میں چھوٹے مالک۔ چڑھانا آسان نہیں ہوگا لیکن فکر کی بات نہیں ہم گاڑی لے کر چلیں گے آگے چل کر کوئی جگہ مل ہی جائے گی۔"

"ہوں۔" میں نے گہری سانس لی پھر کہا۔ "دھرم شالہ چلیں۔"

"چلو مالک۔" ابرار نے کہا۔

"منہ ہاتھ وغیرہ دھونے کے لئے پانی مل جائے گا۔"

"ٹھیک ہے گاڑی لے چلتے ہیں۔" ابرار نے کہا۔

اور میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ابرار بھائی نے اسٹیئرنگ پر بیٹھ کر سلف لگایا اور گاڑی آرام سے اسٹارٹ ہوگئی۔ ابرار شاندار ڈرائیور تھا۔ حالانکہ بڑے بڑے جھاڑیوں نے راستہ بند کر رکھا تھا لیکن ابرار ان میں جگہ بناتا ہوا آخرکار دھرم شالہ تک پہنچ گیا۔

کمال کی جگہ تھی۔ چھوٹی سی پرانی عمارت کے گرد بہت وسیع احاطہ بنا لیا گیا تھا۔ یہ احاطہ درختوں کی گول شاخوں سے بنایا گیا تھا اور اس میں مزے کی بات یہ تھی کہ یہاں ہر طرف پھول کھلے ہوئے تھے۔ بھیانک آندھی نے ان پھولوں کو نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ ایک طرف دو چارپائیاں پڑی ہوئی تھیں۔ کچھ فاصلے پر ایک کنواں نظر آ رہا تھا۔ جس پر چرخی لگی ہوئی تھی اور چرخی میں ڈول پھنسا ہوا تھا اس کا ڈھیر بھی ساتھ ہی لگا ہوا تھا۔

"پانی۔" میں نے کہا۔

"آجایئے چھوٹے مالک۔ میں پانی نکالتا ہوں۔" ابرار نے کہا اور خود کنوئیں کی طرف بڑھ گیا۔ دھرم شالہ کی عمارت کے اندر سے بھجن کی دلکش آوازیں اب بھی آ رہی تھیں۔ کیا دلکش آوازیں تھیں پھر آواز بند ہوگئی اور رنگھے پھونکے جانے لگے۔ اس دوران ابرار نے ڈول کنوئیں میں ڈال کر پانی کھینچ لیا تھا۔ میں کنوئیں سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا اور ابرار بھائی ڈول لے کر میرے چلوؤں میں پانی ڈالنے لگے۔ میں نے اچھی طرح منہ دھویا۔ دھرم شالہ کے مکینوں کو ہماری آمد کے بارے میں معلوم نہیں تھا وہ اپنی پوجا پاٹ میں مصروف تھے۔

لیکن پھر اچانک اندر کی آوازیں رک گئیں۔

میں منہ دھو چکا تھا۔ چنانچہ میں نے ڈول سنبھال لیا۔ اور ابرار بھائی نیچے بیٹھ گئے۔ اسی وقت اندر سے ایک دراز قامت سادھو نمودار ہوا۔ کافی عمر رسیدہ تھا۔ اور بڑی رعب دار شکل کا مالک تھا۔ وہ رکا نہیں اور سیدھا ہماری طرف آیا۔ پھر اس کی نرم اور متفنن آواز ابھری۔

"سواگتم۔ سواگتم مہاراج۔" یہ کہہ کر اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر ماتھے سے لگائے۔ ہمیں اس کے دوستانہ انداز کا اندازہ ہوگیا۔

"معاف کیجیے پنڈت جی۔ ہم بن بلائے مہمان بن گئے ہیں آپ کے۔ چارگڑھی سے گجرگھاٹ کا سفر کر رہے تھے کہ آندھی نے گھیر لیا اور مجبوراً ہمیں یہاں پناہ لینی پڑی۔"

"آپ بن بلائے مہمان کیوں کہہ رہے ہیں مہاراج۔ آپ تو بھگوان سروپ ہیں سورج کی کومل کرن کی طرح، ہم آپ کا سواگت کرتے ہیں۔ آیئے جنگل پانی کی اچھا ہو تو ادھر چلے جایئے وہاں پانی بھی ہے۔"

"نہیں شکریہ۔ بس ہمیں سفر کرنا ہے۔ وہ ہماری گاڑی کھڑی ہے۔ رات کو ہم گاڑی نیچے تو اتار لائے تھے لیکن اب اوپر جانے کا راستہ نہیں مل رہا۔" میں نے کہا اور سادھو مسکرا دیا۔ پھر بولا۔

"راستہ کیسے ملتا مہاراج۔ بھگوان نے صبح کا بھوجن تو ہمارے بھاگ میں لکھ دیا تھا۔ بھگوان ہمارے دوار آئیں اور ہم سیوا نہ کریں یہ کیسے ممکن ہے۔ آیئے۔" سادھو نے کہا۔ اور ہم چارپائیوں کی طرف چل پڑے۔ اس نے کندھے پر پڑے انگوچھے سے چارپائیوں کی گرد جھاڑی پھر بولا۔ "بس دو منٹ کی آ گیا دے دیں۔ ابھی آئے....." یہ کہہ کر وہ اندر کی طرف چل پڑا۔ ہم چارپائیوں پر بیٹھ گئے تھے۔

ابھی ہم بیٹھے ہی تھے کہ ابرار بھائی کے موبائل پر بیل ہوئی اور انہوں نے اپنا سیل جیب سے نکال لیا۔ پھر میری طرف دیکھ کر بولے۔ "بڑے مالک رحمت خان صاحب ہیں۔"

"لاؤ مجھے دو۔" میں نے کہا اور ابرار نے فون مجھے دے دیا۔ "ہیلو۔" میں نے کہا۔

"کون۔ اشرف۔" آواز آئی۔

"جی تایا ابو۔"

"کہاں ہو تم۔ خیریت سے ہو۔"

"بالکل خیریت سے ہوں۔"

"چارگڑھی میں ہو۔ دلہن نے یہی بتایا تھا۔"

"جی۔ چارگڑھی کے اطراف کی سیر کرنے نکلا ہوں۔"

"رات کو کالی آندھی آئی تھی۔"

"ہاں۔ اسی کی تباہ کاری۔ دیکھتا پھر رہا ہوں۔"

"تمہارا سیل کیوں بند ہے۔ پہلے میں نے تمہیں ہی فون کرتا رہا ہوں۔ تمہاری امی بہت پریشان ہیں۔"

"میرے سیل کی چارجنگ ختم ہوگئی ہے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں اور تھوڑی دیر کے بعد گھر پہنچ جاؤں گا۔"

"ابرار کہاں ہے؟"

"میرے پاس ہیں۔"

"بات کراؤ۔" تایا ابو نے کہا۔ اور میں نے سیل ابرار بھائی کو دے دیا۔ تایا ابو نے ابرار سے خیریت پوچھی۔ ابرار بھائی نے میری باتیں سن لی تھیں اس کی روشنی میں، انہوں نے بات کی اور بالکل نہیں بتایا کہ ہم کہاں ہیں۔ اتنی دیر میں سادھو اندر سے آ گیا۔ اور دوسری چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"بڑی بھیانک آندھی آئی تھی رات کو۔ نہ جانے کتنا نقصان ہوا ہوگا۔"

"آپ یہاں رہتے ہیں؟" میں نے سوال کیا۔

"ہاں۔ یہی میرا سورگ ہے۔ میرا نام جمنا داس ہے۔ اور میں بھوانی پنتھی ہوں۔"

"ہم دونوں مسلمان ہیں۔" میرا نام اشرف خان ہے۔ اور یہ میرے ساتھی ابرار احمد ہیں۔"

"اچھا، اچھا۔ میرے بھاگ ہیں کہ مجھے آپ کی سیوا کا موقع ملا۔ آندھی سے آپ کو نقصان تو نہیں پہنچا۔"

"بالکل نہیں۔"

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

تھوڑی دیر تک ایسی ہی رسمی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر اندر سے ایک لڑکی باہر نکل آئی۔ سفید ساڑھی پہنے ہوئے تھی سیدھے بال باندھے ہوئے تھی لیکن چاند سا چہرہ نمایاں تھا اور میں اسے دیکھ کر سناٹے میں رہ گیا تھا۔ وہ منیکا تھی۔ اس نے ہاتھوں میں ٹرے اٹھائی ہوئی تھی جس میں گرم پراٹھے اور ترکاری رکھی ہوئی تھی۔ ساتھ ہی چائے کے برتن رکھے ہوئے تھے۔ میں پاگلوں کی طرح منیکا کو دیکھ رہا تھا۔

سادھو نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "مجھے معلوم ہے تم دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہو۔ اس کے الفاظ پر میں چونک پڑا۔ اس نے منیکا کی طرف دیکھا تو اس کی نغمہ بار آواز ابھری۔

"ہاں۔ میں نے پتاجی کو آپ کے بارے میں بتادیا تھا چھوٹے مہاراج۔"

"بتادیا تھا۔" میں نے سرسراتی آواز میں کہا۔ اس وقت میں سچ مچ حواس کھو بیٹھا تھا میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آرہا تھا۔

"بھوجن کریں مہاراج۔ منیکا نے مجھے یہ بھی بتادیا تھا کہ بالکل اتفاق سے آپ یہاں تک آگئے ہیں۔ وہ مجھے آپ کے کشٹ کے بارے میں بھی بتا چکی ہے۔ آپ بھوجن کریں، اس میں ہر چیز شدھ ہے۔ آپ کے دھرم کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔"

"اوہ نہیں۔ ایسی بات نہیں ہے۔" بس ابرار بھائی۔ میں نے سنبھل کر کہا۔ ماحول، وقت اور گرم پراٹھے۔

ہم نے ناشتہ شروع کردیا۔ لیکن میرا ذہن اب بھی ہوا میں اڑ رہا تھا۔ میں نے منیکا کو ناگن کی شکل میں دیکھا تھا۔ میں نے اسے گنگا سری سمجھا تھا۔ لیکن وہ۔

میں کھاتا رہا۔ سوچتا رہا۔ ابرار بھائی نے میرے لئے چائے انڈیلی، پھر بولے۔ "آپ باتیں کریں، میں ذرا گاڑی دیکھ لوں۔" میں خود بھی یہی چاہتا تھا کہ ابرار یہاں سے اٹھ جائے۔ اسے میرے برابر بیٹھنا بھی نہیں چاہیئے تھا لیکن سچوئیشن ایسی بن گئی تھی کہ ابرار کو بھی اس کا احساس نہیں رہا۔ ابرار اپنی چائے کا برتن لے کر وہاں سے چلا گیا۔ تب سادھو جمناداس نے کہا۔

"منیکا نے تمہارے بارے میں سب کچھ بتادیا ہے۔"

"یہ مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ میں بھی جیتی ہوں، یا آتما ہوں۔" منیکا نے ایک دلکش مسکراہٹ سے کہا۔

"وہ جیتی ہے چھوٹے مہاراج مگر بھوانی کی دیا ہے کہ اس نے اسے اپنی خاص داسی بنالیا ہے اور اسے بہت بڑا گیان دیا ہے، اس کا گیان مجھ سے بھی آگے چلا گیا ہے۔ اب بھیانک آتمائیں بھی اس سے دور بھاگتی ہیں اور اس کا سامنا کرنے سے گھبراتی ہیں۔"

"وہ میں دیکھ چکا ہوں۔" میں نے منیکا کو دیکھتے ہوئے کہا۔ اس وقت وہ ایک اٹھارہ سی نوجوان لڑکی لگ رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر شوخ مسکراہٹ تھی۔

میری عمر ابھی زیادہ نہیں تھی۔ اور میں نے کبھی جنس مخالف کے بارے میں ایسے انداز میں نہیں سوچا تھا لیکن منیکا اس وقت سے میرے حواس پر چھا گئی تھی جب میں نے اسے، پہلی بار کھڑکی سے لہنگے اور چولی میں دیکھا تھا اور اسے گنگا سری سمجھا تھا۔ اس وقت وہ شرارت سے مسکراتی ہوئی اتنی پیاری لگ رہی تھی کہ میں اسے دیکھتا رہ گیا۔

"منیکا نے یہ گیان کہاں سے سیکھا؟" میں نے پوچھا۔

"بھوانی نے اسے اپنی سکھی بنایا ہے۔ منیکا اگر چاہے تو محلوں کی رانی بن سکتی ہے، لیکن بھوانی دیوی کو اس کی یہی بات پسند ہے کہ وہ اپنے گیان سے کوئی بڑا فائدہ نہیں اٹھاتی۔ اسے گرن وستو کا گیان بھی مل گیا ہے۔"

"گرن وستو کیا ہے۔" میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

"بھوانی استھان ہے۔ جس طرح قہر و غضب کی دیوی کالی کلکتے والی اپنے کالے گیان سے گندی آتماؤں کی رکھشا کرتی ہے اس طرح بھوانی دیوی منش سیوک ہے اور اپنی مہان شکتی سے کالے علم کا شکار ہونے والوں کی رکھشا کرتی ہے۔ اس نے منیکا کو بھی یہ ادھیکار دیا ہے۔"

"منیکا نے کمالو کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔" میں نے کہا۔

"وہ تمہیں قتل کرنا چاہتا تھا۔ منیکا غضب ناک

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

ہوگئی تھی۔"

"آپ کو یہ بات معلوم ہے۔"

"یہ میری بیٹی ہے۔ لیکن من کی ہر بات مجھے بتادیتی ہے۔ اس نے کمالو اور فرید خان کے بارے میں مجھے بتادیا تھا۔"

"یہ آسانی سے ناگن کا روپ دھار لیتی ہے۔"

"اسے بہت سے روپ کا ورودان ہے۔" جمناداس نے فخریہ لہجے میں کہا۔

"بہت سے روپ؟" میں نے دلچسپی سے کہا۔

"ہاں۔ بہت سے روپ۔" نرم و نازک بھی، خوفناک و بھیانک بھی۔ اشرف مہاراج کو بتاؤ منیکا۔" جمناداس نے کہا۔ اور منیکا بچوں کی طرح ہنس دی۔ اس نے اپنے بدن کو زور سے جھٹکا اور دونوں ہاتھ دونوں طرف پھیلا دیئے کچھ لمحوں اپنے بدن کو جھٹکتی رہی اور پھر اچانک اس کا بدن سکڑنے لگا صرف تیس سیکنڈ میں وہ نظروں سے غائب ہوگئی اور اس کی جگہ ایک انتہائی خوب صورت، پرندہ نمودار ہوگیا۔ پرندے نے پاؤں دبائے اور دوسرے لمحے پر پھڑپھڑاتا ہوا فضا میں بلند ہو کر ایک اونچی جگہ جا بیٹھا۔ میں حیرت سے منہ کھولے اسے دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ وہاں سے بھی اڑی اور بلند ہوتی ہوئی دور نکل گئی اتنی دور کہ نظروں سے اوجھل ہوگئی میں نے جمناداس کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا کر بولا۔

"اس کی فکر مت کرو۔ جے بھوانی۔"

میری عقل دنگ تھی۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ ایسے مناظر ہوش میں کہاں نظر آتے ہیں۔ اچانک دھرم شالہ کے اندر سے ایک خوف ناک غراہٹ سنائی دی اور پھر اس کے دروازے پر انتہائی خوف ناک شکل کے ایک گہرے کالے چیتے نے ایک لمبی جست لگائی اور ہمارے سامنے پہنچ گیا۔

میرے حواس میرا ساتھ نہیں دے پا رہے تھے۔ یہ جنگل تھا۔ میں نے کبھی ان علاقوں میں کسی درندے کے بارے میں نہیں سنا تھا لیکن اپنی آنکھوں کے سامنے اس خونخوار چیتے کو دیکھ کر میرے حواس معطل ہوگئے تھے۔ وہ اتنے قریب تھا کہ ہم کہیں بھاگ بھی نہیں سکتے تھے۔ لیکن دوسرا حیرت ناک منظر سامنے آیا چیتا زمین پر بیٹھ گیا۔ اور پھر اس کی نیت بدلنے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ منیکا کی صورت میں تبدیل ہوگیا۔ میں گہری گہری سانسیں لینے لگا اپنی دماغی حالت پر شبہ ہو رہا تھا جو کچھ دیکھ رہا ہوں حقیقت ہے یا کوئی ذہنی فتور۔

منیکا سیدھی کھڑی ہوگئی تو جمناداس کی آواز ابھری۔

"تم نے اس کے دو روپ دیکھے چھوٹے مہاراج۔ ضرورت پڑنے پر یہ اور بھی بہت سے روپ دھار سکتی ہے۔"

میں ہوش میں آگیا۔ اور اس نے عجیب سے انداز میں کہا۔

"ان لمحوں کو میں موت کے وقت تک نہیں بھول سکتا پنڈت جی۔ میں نے کسی زندہ انسان کے اندر ایسی انوکھی خوبیاں نہیں دیکھیں۔ میرے دل میں ایک خواہش ہے۔"

"خواہش؟ کیا؟" سادھو نے پوچھا۔

"میں آپ کا چیلا بننا چاہتا ہوں۔ کہ جانے کب سے یہ آرزو میرے دل میں ہے۔ میں اپنے دادا جی کی بات نہیں کرتا۔ انہوں نے انسانوں پر ظلم کیا تھا جس کی تصدیق میری امی نے کی ہے۔ امی کے تفصیل بتانے سے پہلے مجھے دادی اور پھوپی پھوپا کی موت کا صدمہ تھا۔ لیکن جب امی نے دادا جی کے بارے میں تفصیل بتائی تو میرا ذہن بدل گیا۔ دادا جی نے جو کیا تھا اس کی قدرتی طور پر انہیں سزا مل گئی لیکن پھوپی اور پھوپا بے قصور تھے۔ اور پھر..... میرے ابو۔ میرے پیارے ابو کو بھی مجھ سے چھین لیا گیا۔ بہت پیار تھا مجھے اپنے ابو سے..... اور یہ سارے کام گنگا سری اور اس کے پتا نے کئے۔ انہوں نے قسم کھائی ہے کہ وہ ملکھانوں کی پوری نسل کو صفحہ ہستی سے مٹادیں گے۔ لیکن میں نے قسم کھائی ہے کہ میں پراسرار علم سیکھ کر ان ناپاک روحوں کو خاک کردوں گا انہیں جلا کر بھسم کردوں گا۔ میں دیکھوں گا کہ وہ کیسے میرے خاندان کا خاتمہ کرتے ہیں۔"

میری آنکھیں شعلے اگلنے لگیں۔ میں نے منیکا کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک دلکش مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ میں سنبھل گیا۔ پھر میں نے کہا۔ "میں آپ کا

شاگرد بننا چاہتا ہوں آپ مجھے یہ علم سکھادیں جو آپ نے مینکا کو سکھائے ہیں۔"

جمناداس نے ایک ہاتھ اٹھا کر گردن ہلائی اور بولا۔" بھول گئے تم۔ بھول گئے میرے بچے۔ میں نے تمہیں ابھی بتایا ہے کہ اسے یہ گیان میں نے نہیں، بھوانی ماں نے دیا ہے۔ اس نے بھوانی ماں کے جاپ کئے ہیں۔ اسے خوش کیا ہے۔ تب بھوانی ماں نے اسے یہ شکتی دی ہے۔"

"میں بھی یہ سب کروں گا۔" میں نے کہا۔

"نہیں بیٹا۔ تم یہ سب نہیں کرسکو گے۔" پنڈت بولا۔

"کیوں نہیں کرسکوں گا۔ میں کروں گا۔"

"نہیں کرسکو گے۔" اس بار پنڈت کا لہجہ سخت ہوگیا اور میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ میرے اندر لجاجت پیدا ہوگئی میں نے پست لہجے میں کہا۔

"آپ مجھے ایک موقع تو دیں۔ پنڈت جی مہاراج۔ میری مدد تو کریں۔ بھوانی سے میرے لئے بات کریں۔"

"بھوانی کا داس بننے کے لئے پہلے تمہیں اپنا دھرم چھوڑنا ہوگا۔ تمہیں ہندو دھرم اپنانا ہوگا۔ گووردھن پوجا کرنی ہوگی گئو ماتا کی پوجا کرنی ہوگی۔ بولو کرو گے۔"

"ایں؟" میں چونک پڑا۔

"بڑے پن کا کام تھا یہ۔" ایک مسلمان سے اس کا دھرم چھین کر اسے بھوانی پنتھ میں لانا بہت بڑا کام تھا۔ ہمیں اس کا بہت بڑا صلہ ملتا بھوانی ماں کی طرف سے۔ پرنتو، ہم ایسے منش نہیں ہیں ہم ایسا کر بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ تم ایک اچھے انسان ہو، تمہارے من میں سچائیاں ہیں دین دھرم ہے۔ بولو۔ اپنا دھرم چھوڑو گے۔"

"نہیں۔" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"میں بھی یہی کہہ رہا ہوں۔ بہت بڑا ہے تمہارا دھرم، بہت بڑا ہے۔ تمہاری بڑی کتاب میں سنسار کے سارے گیان ہیں۔ ان سے بڑھ کر کوئی گیان نہیں ہے سنسار میں۔ تمہیں کسی اور گیان کی کیا ضرورت ہے۔ ہم جانتے ہیں، ہمیں معلوم ہے تمہاری بڑی کتاب کے ایک ایک شبد میں، ایک ایک ماترا میں، گیان کے سمندر چھپے ہوئے ہیں، تمہیں دوسرے گیان کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے تمہارے گیانیوں کے بارے میں سنا ہے۔ ایک شبد کو اپنا لیا اور اپرم پار ہوگئے۔ اپنے دھرم سے گیان مانگو، سب مل جائے گا۔"

میرے بدن میں سرد لہریں دوڑ رہی تھیں۔ اس ہندو سادھو کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ سینے میں جذب ہو رہا تھا۔ اسی وقت مینکا نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی۔

"اپنے پریوار میں اپنے دشمنوں پر تم نظر رکھو۔ ہیرا لعل اور اس کی بیٹی کو میں ٹھیک کرلوں گی ان کی تم چنتا مت کرو۔" میں مینکا کی اس جرأت پر حیران رہ گیا تھا۔ اس نے اپنے باپ کے سامنے میرا ہاتھ پکڑا تھا۔ پھر میں نے سر جھکا لیا۔ اور کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد کہا۔

"بہت بے بس ہوں میں۔ میں نے بڑی بے کسی کے عالم میں اپنے باپ کو مرتے ہوئے دیکھا ہے قصور کسی اور کا تھا۔ انہوں نے مارا کسی اور کو۔ مجھے پتہ چل جائے کہ وہ مجھے کہاں مل سکتے ہیں میں جان کی بازی لگا کر انہیں ختم کردوں گا۔ انہوں نے مامون خان سے بدلہ لیا کافی تھا۔ میرے باپ کو کیوں مارا انہوں نے۔"

"بھگوان کی سوگند۔ بڑا انوکھا کام ہوگا۔ گندی آتماؤں سے جنگ کرنا۔ وہ تو یدھ کو نکل پڑی ہیں اور ساری کالی قوتوں کے ساتھ کام کررہی ہیں۔ لیکن اندر جو پریم شکتی پیدا ہوئی ہے، وہ ان آتماؤں کو ضرور بھسم کردے گی۔ میری ایک بات سنو بالک۔"

"جی جمناداس مہاراج۔" میں نے کہا۔

"تیرے اندر جو بدلے کی جوت جاگی ہے وہ اندھی ہے۔ بدلے کی آگ میں تو بہت آگے نکل سکتا ہے۔ کالے جادو والے تیرے لئے پاگل ہوجائیں گے۔ انہیں تیرے جیسے پکے دھرم والے مسلمانوں کی تلاش ہوتی ہے۔ ہر برائی اچھائی کی دشمن ہوتی ہے۔ وہ تیرے من کی منوکامنا جان کر تجھے بڑے رنگین باغ دکھائیں گے تجھے رجھائیں گے اور کہیں گے کہ مجھے مہان گیانی بنادیں نگران سے بچنا۔ وہ تجھے کچھ نہیں دیں گے بس اپنا الو سیدھا کریں گے اور تیری بلی

دے دیں گے۔"

میں اس نیک انسان کی باتوں کا ایک ایک لفظ دل پر نقش کررہا تھا۔ اس کے اندر سچائی بول رہی تھی۔ انسانیت بول رہی تھی۔

"آپ کا شکریہ پنڈت جی۔"

"اور میں تجھے بتا چکا ہوں کہ تیرے دھرم میں سب کچھ ہے۔ تجھے کہیں اور سے کچھ لینے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے پنڈت جی۔ اب میں چلوں۔ آپ نے بہت کچھ دیا ہے مجھے۔ میں آپ کو کبھی نہیں بھولوں گا۔ اور آج کے چرن چھونے آتا رہوں گا۔"

"میں پرندہ بن کر اڑی تھی تو میں نے ایک کام کیا تھا۔" مینکا نے کاہ۔

"کیسا کام۔" پنڈت نے پوچھا۔

"آپ کی گاڑی کے سڑک پر جانے کا راستہ تلاش کیا تھا۔"

"ارے واہ مینکا۔ کدھر ہے وہ راستہ......" میں نے کہا۔

"آؤ۔ میں بتاتی ہوں۔" اس نے کہا اور میں نے جمناداس سے اجازت مانگی۔

"جاؤ...... بھوانی ماں ہمیشہ تمہاری رکھشا کرے۔" پنڈت جی نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ اور میں مینکا کے ساتھ چل پڑا۔ دو قدم چل کر میں نے کہا۔

"میں اپنے ڈرائیور کو ساتھ لے لوں۔"

"دو منٹ تو رکو۔ مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔" اس نے کہا۔

"ضرور مینکا ویسے تمہارے کچھ بولنے سے پہلے میں ایک بات کہہ دوں۔"

"ہاں کہو۔" وہ بڑی چاہت سے بولی۔ جیسے میرے منہ سے کوئی خاص بات سننا چاہتی ہو۔

"حالانکہ اتفاق سے یہ سب کچھ ہوا۔ لیکن تمہارے پاس آ کر اور تمہارے بارے میں جان کر مجھے بہت خوشی ہوئی ہے۔ تم بہت اچھی ہو۔ میں تم سے بہت متاثر ہوگیا ہوں۔"

"شکریہ چھوٹے سرکار۔ مجھے آپ سے ایک اور بات کہنی ہے۔"

"کہو......" میں نے کہا۔ اور اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔ لیکن وہ کچھ نہ بولی۔ اور میرے ساتھ قدم اٹھاتی رہی۔ میں نے خود ہی کہا۔

"کہو مینکا۔"

"تمہارے پاس آؤں گی۔ پھر کہوں گی۔" میں خاموش ہوگیا۔ وہ مجھے اس جگہ لے آئی جہاں اوپر سڑک پر جانے کے لئے راستہ موجود تھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور واپس آ کر اس سے رخصت ہو کر ابرار کے ساتھ چل پڑا۔

گزری رات میں کئی طوفان ایک ساتھ آئے تھے۔ میں بڑے کام کی باتیں ساتھ لایا تھا جمناداس واقعی بہت اچھا انسان تھا۔ اتنا طاقتور علم اس کے پاس تھا اس سے کام لے کر وہ کروڑ پتی بن سکتا تھا محل بنا کر رہ سکتا تھا دیوتاؤں کی طرح پوجا جاسکتا تھا۔ لیکن وہ آبادیوں سے دور ایک معمولی سی دھرم شالہ میں رہتا تھا۔ یہ اس کے اندر کی بڑائی تھی۔ اس نے مجھے جو نصیحتیں کی تھیں وہ بھی میرے لئے مشعل راہ تھیں اس نے میرے ذہن میں دریچے کھول دیئے تھے۔

راستہ رات کی تباہ کاریوں سے بھرا پڑا تھا۔ جگہ جگہ درخت گرے ہوئے تھے۔ آخر کار ہم گجر گھاٹ پہنچ گئے۔ میری واپسی کا شدت سے انتظار کیا جارہا تھا۔ سب سے پہلے بڑی پھوپو سے ملاقات ہوئی تھی۔

"کہاں گئے تھے تم اشرف۔"

"بس پھوپی۔ ایسے ہی کچھ کام تھے۔"

"میاں صاحب کتنے پریشان تھے۔"

"کون کون۔؟" میں نے ہنس کر پوچھا۔ لیکن پھوپی کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ امی نے بھی مجھے گلے لگالیا۔ تایا ابو نے البتہ مجھ سے صرف میری خیریت پوچھی تھی۔ اسی وقت فرید چچا بھی آگئے۔ اور بولے۔

"ابھی تم اتنے بڑے بھی نہیں ہوئے اشرف کہ اس طرح منہ اٹھا کر چل پڑو۔ ہم سے مشورہ کئے بغیر تم حویلی سے باہر نہ نکلا کرو۔ اور میں نے ابرار کی تو خوب خبر لے لی ہے۔"

یہ سن کر میرا خون کھول اٹھا۔ میں نے تیوری بدل

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

کر کہا۔ "کیا مطلب۔ آپ نے ڈرائیور ابرار کو کچھ کہا ہے۔"

"نوکر ہے وہ ہمارا۔ اسے چاہئے تھا کہ مجھے بتا کر جاتا۔"

"نہیں چھوٹے چچا۔ اس کے بعد آپ اس فضول تصور سے گریز کریں کہ آپ کوئی اہم چیز ہیں۔ اگر آپ نے ابرار احمد کو کچھ کہا ہے تو میں آپ سے اس کا جواب طلب کر سکتا ہوں۔ لیکن اسے آپ کی پہلی غلطی سمجھ کر معاف کر رہا ہوں۔ آئندہ ایسا نہ ہو۔" میرے لہجے میں غراہٹ تھی۔ فرید خان کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ انہوں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بڑی پھوپھی اور امی کو دیکھا۔ پھر بمشکل تمام بولے۔

"یہ..... تم مجھ سے کہہ رہے ہو؟"

"جی..... آپ سے رشتہ اپنی جگہ۔ لیکن آپ بھی نوکر ہیں جو کسی بھی وقت آپ کو آپ کی ذمہ داریوں سے سبکدوش کیا جا سکتا ہے۔"

سب پر سکتہ طاری تھا۔ کوئی کچھ نہ بولا۔ "لیکن سب کے چہرے دھواں ہو رہے تھے۔ فرید چچا کچھ دیر کھڑے رہے۔ پھر غصے سے کھولتے ہوئے باہر نکل گئے۔ پھر ایک ایک کر کے سب باہر چلے گئے، امی کمرے میں رہ گئی تھیں۔ وہ بھی میرے ان سخت الفاظ پر حیران تھیں۔ ایک بار پھر میرا دل چاہا کہ فرید چچا کے کرتوت امی کے سامنے کھول دوں۔ لیکن نہ جانے کہاں سے مجھ میں عقل آ گئی اور میں خاموش رہا۔

میں جانتا تھا کہ اگر یہ بات امی کے کانوں تک پہنچ گئی تو ان کا دن کا چین اور راتوں کی نیندیں حرام ہو جائیں گی۔

پھر اچانک میں نے امی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھی۔ مجھے بہت اچھا لگا تھا۔ ابو کی موت کے بعد پہلی بار میں نے امی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھی تھی۔

"کیا بات ہے امی؟" میں نے پوچھا اور وہ چونک پڑیں۔

"اں۔" کچھ نہیں۔ انہوں نے کہا۔ اور سنجیدہ ہو گئیں۔

اس رات میرے پاس سوچنے کے لئے بہت کچھ تھا۔ مجھے چچا صاحب کا انداز یاد آ رہا تھا۔ ان کے لہجے میں جارحیت تھی ابرار ان کا ملازم کہاں سے ہو گیا وہ غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں خدا کا شکر ہے کہ مجھے کچھ سہارے حاصل ہو گئے، منیکا میری پیاری دوست۔ وہ ہر جگہ میرا ساتھ دے گی جمنا داس جی نے مجھے جو ہدایت دی تھیں وہ بھی میرے لئے قیمتی نوادر تھے میں ہر عمل ان ہدایات کی روشنی میں کرنا چاہتا تھا اور میں نے فیصلہ کیا تھا کہ آئندہ بھی ان کی خدمت میں حاضری دیتا رہوں گا۔ وہ نیک دل اور نیک نیت انسان تھے۔

پھر مجھے منیکا کا خیال آیا کیسی انوکھی قوتوں کی حامل تھی وہ۔ پرندہ بن کر فضا میں اڑ سکتی تھی درندہ بن کر کسی کو بھی چیر پھاڑ کر کھا سکتی تھی اور اسے شاید اس کی اجازت بھی تھی کیونکہ وہ مجھے ہلاک کرنے کے لئے آنے والے کمالو کو جہنم رسید کر چکی تھی۔

اس کے بعد نیاز علی نے مجھے فرید خان کے لئے مشورہ دیا تھا۔ انہوں نے مجھے لاہور جا کر طارق چغتائی سے ملنے کا مشورہ دیا تھا۔ یہ بے حد ضروری تھا۔ فرید خان کے عزائم کا پوری طرح انداز ہو گیا تھا۔ مجھے راستے سے ہٹا کر وہ ہماری جائیداد پر قبضے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے تعویز بھی غائب کر دیا تھا انہیں شبہ ہوا ہو گا کہ کچھ پراسرار قوتیں میری مدد کر رہی ہیں۔ جبکہ اصل بات انہیں معلوم ہی نہیں تھی۔

تو پھر اب کیا کروں؟

پھر رات کو دیر تک جاگ کر میں نے بہت سے فیصلے کئے۔ اللہ تعالیٰ نے میری حفاظت کے لئے میرے بہت سے طاقتور ہمدرد پیدا کر دیئے تھے اور اب میں ہر خطرہ مول لینے کے لئے تیار تھا۔ لیکن مجھے ہر معاملے میں بہت محتاط رہ کر کام کرنا تھا کیونکہ میرے بہت سے دشمن تھے۔ نیند آ گئی اور خواب میں، میں نے منیکا کو دیکھا۔ ایک عجیب سا احساس ہوا تھا۔ منیکا میری دوست۔ بہت اچھی تھی وہ۔ پھر مجھے اس کی آواز سنائی دی۔ "گنگا سری کی پازیب مجھے دے دو چھوٹے مہاراج۔ میں اسے قابو میں کر لوں گی۔"

اور میں نے خواب میں اس سے وعدہ کر لیا کہ اس سے ملاقات پر پہلا کام میں یہی کروں گا۔ ویسے بھی فرید خان سے یہ امید رکھی جا سکتی تھی ممکن ہے وہ پازیب بھی حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

دوسری صبح معمول کے مطابق رات کی سوچوں میں، میں نے سب سے اہم فیصلہ کر لیا تھا وہ یہ تھا کہ رات کو پرانی حویلی میں داخل ہو کر اس کے اسرار جاننے کی کوشش کروں گا۔

میں معمول کے مطابق صبح کی ضروریات سے فارغ ہو کر ناشتے کے کمرے میں پہنچ گیا۔ ناشتہ سب ساتھ کیا کرتے تھے اور اس طرح رات کا کھانا بھی ساتھ کھایا جاتا تھا۔ دن میں جس کی جو مصروفیت ہو اس پر کوئی پابندی نہیں تھی ناشتہ لگ چکا تھا لیکن میز کے گرد بیٹھے لوگوں کے چہروں پر عجیب سی خاموشی طاری تھی۔

میں اپنی کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

کچھ لوگ باقی تھے وہ بھی آ گئے۔ لیکن فرید چچا موجود نہیں تھے۔ کچھ وقت اور گزرا تو تایا ابو کا پارہ چڑھ گیا۔ انہوں نے بڑی پھوپی کو آواز دی۔

"کلثوم۔"

"جی بھائی جی۔" بڑی پھوپو کی آواز سہمی ہوئی تھی۔

"میں نے اسے بلایا تھا۔"

"جی بھائی جی۔"

"کیا ہو رہا ہے اس گھر میں۔ وہ اتنی سرکشی پر کیوں اتر آیا ہے۔"

"ایک بات کہوں بھائی جی۔ ہو سکتا ہے یہ بھی ہمارے گھر میں آنے والی نحوستوں میں سے ہو۔"

"ہاں۔ اب تو کسی کو قبض بھی ہو جائے تو یہ دشمن روحوں کا کام ہوتا ہے میں کہتا ہوں یہ مصیبت ہم پر کب تک نازل رہے گی۔ میں فرید کی کیفیت بہت دن سے....."

ابھی تایا ابو کا جملہ پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ فرید چچا اندر داخل ہو گئے۔ انہوں نے دروازے سے چند قدم اندر آ کر رکتے ہوئے کہا۔ "جی بڑے بھائی جی؟"

"کیا ہوا، ناشتے پر کیوں نہیں آئے؟" تایا ابو نے کرخت لہجے میں کہا۔

"میری حیثیت اچانک بدل گئی ہے بھائی جی۔ براہ کرم مجھے اپنے آپ پر غور کرنے دیجیے۔ میں ایک نوکر بن گیا ہوں اور نوکر مالکوں کے ساتھ ناشتے کی میز پر نہیں ہونے چاہئیں۔"

"خوب۔ اب کچھ نئے کھیل شروع ہو رہے ہیں اس گھر میں، پہلے ہی ہماری پریشانیاں کیا کم ہیں، کیا ہے یہ سب کچھ؟" تایا ابو غصے سے بولے۔

"باجی نے آپ کو نہیں بتایا بھائی جی۔" چھوٹے چچا نے کہا۔

"وہ مجھے بتا چکی ہیں۔ اشرف ابھی بچہ ہے۔ اس نے نادانی میں کوئی بات کہہ دی تو تم بھی نادان بن گئے۔"

"میں اس نوکری سے استعفیٰ دینا چاہتا ہوں بھائی جی۔" فرید خان نے کہا۔

"فضول باتیں مت کرو۔ اشرف تم سے معافی مانگے گا۔"

"لمبا حساب ہے تایا ابو۔ پورا کام ہو گا۔ پھر معافی تلافی کا سلسلہ چلے گا۔" میں نے زہریلے انداز میں فرید چچا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیوں چھوٹے چچا۔ ہم پورا کیس تایا ابو کی عدالت میں پیش کرتے ہیں بیان کمالو کی موت سے تعویز کی چوری تک شروع ہو گا کیوں چھوٹے چچا۔"

فرید خان کا چہرہ اتر گیا۔ انہوں نے بوکھلائے ہوئے انداز میں چاروں طرف دیکھا پھر آگے بڑھ کر اپنی کرسی پر بیٹھ گئے سب حیرت سے ہم دونوں کو دیکھ رہے تھے۔ فرید خان نے بیٹھے ہی ناشتہ شروع کر دیا تھا۔

"کیا مطلب کمال کی موت اور تعویز کی چوری۔ یہ کیا قصہ ہے؟"

"یہ ایک وظیفے کے لفظ ہیں تایا ابو، ان کے دوہرانے سے ناراض لوگ من جاتے ہیں چلئے ناشتہ کیجیے۔" میں نے اپنی پلیٹ سیدھی کرتے ہوئے کہا۔ ناشتہ ختم ہونے سے پہلے ہی فرید چچا اٹھ کر باہر نکل گئے۔ تایا ابو اور دوسرے لوگ مجھ سے اس بارے میں پوچھنے لگے۔ لیکن میں نے ہنس کر کہا۔ "میں نے بتا تو دیا۔ یہ ناراض لوگوں کو منانے کا ایک ٹوٹکا ہے۔"

میں نے کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ پھر دن بھر میں نے آج رات کی خوف ناک مہم کی تیاریاں کیں تھیں اور بے چینی سے رات کا انتظار کرتا رہا۔

(جاری ہے)

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk
Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

لیپ ٹاپ کا راز

اقصیٰ پیاسحر- گجرات

عجیب و غریب آواز سے جب نوجوان کی آنکھ کھلی ت اس کا دل دھل کر رہ گیا کیونکہ کمرے میں گھٹنوں گھٹنوں پانی تھا اور پھر جب وہ دوسرے کمرے میں پھنچا تو سر سے اوپر پانی تھا اور پھر اچانک سارا پانی کیسے غائب ہوگیا۔

دلوں کو گدگداتی ہوئی عجیب کہانی جو کہ پڑھنے والوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دے گی

میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ مارے خوشی کے میں پھولا نہ سمارہا تھا خواب اس طرح پورا ہوجائے گا مجھے گمان تک نہ تھا۔

میں نے لیپ ٹاپ چارجنگ پر لگایا چارچنگ اسٹارٹ ہوئی تو میں اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا اور مختلف کیز پش کرنے لگا، مگر یہاں مجھے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا کوئی بھی کی کام نہیں کررہی تھی، مجھے لگا شاید ہینگ ہوگیا ہے کافی دیر تک میں کیز پریس کرتا رہا .....مگر بے سود البتہ ٹچ پیڈ صحیح چل رہا تھا میں نے ٹچ پیڈ کی مدد سے کرزر کو میڈیا پلیئر پر لاکر چوز کیا تو ویڈیوز کے نام سے آہستہ آہستہ ایک فولڈر کھلنے لگا لیفٹ پر ڈبل کلک کرنے سے ویڈیوز فولڈر اوپن ہوگیا یہ تبدیلی خوشگوار تھی میں پرامید ہوگیا اورا یکسائیٹڈ بھی، میں نے یونہی ایک ویڈیو پلے کی، جلدہی میں نے اکتا کر دوسری ویڈیو پلے کی جس پر کہ ایک پرانے گانے کا نام لکھا تھا ویڈیو پلے ہوتے ہی میں نے فارورڈ کی، پھر تیسری ویڈیو پلے کی یہ بھی کوئی گانا تھا پانچویں، چھٹی، ساتویں ساری ویڈیوز میں نے پلے کیں ہر ایک میں تقریباً ایک ہی سین، کھلے آسمان تلے پھیلا ہوا وسیع وعریض سمندر پھر اچانک پرسکون سمندر میں جیسے طوفان آجاتا ہے اور سمندر کی بپھری ہوئی لہریں ہر چیز کو تہس نہس کردیتیں۔

بیس تیس ویڈیوز میں نے مستقل مزاجی سے چیک کرڈالیں سب میں یہ ہی سین تھے۔

میں سر پکڑ کر کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر بیٹھ گیا۔

خواب پورا تو ہوگیا مگر ارمانوں کا بیڑا غرق ہوگیا، میری بہت بڑی خواہش تھی کہ میرا لیپ ٹاپ ہو، تاکہ میں بھی بہت سے کام آسانی سے انجام دے سکوں، میری یہ خواہش پوری ہونے میں رکاوٹ تھے میرے بیوی بچے اوران کے اخراجات، جو بھی کماتا بچوں کی اسکول فیس اور گھر کے دیگر خرچے ہی پورے ہوپاتے، یوں میں بس خواب دیکھ کررہ جاتا کہ میں بھی کبھی ترقی کروں گا، میں بہت چھوٹا سا پراپرٹی ڈیلر تھا میرا کوئی باقاعدہ آفس نہیں گھر کی بیٹھک میں دفتر کھول رکھا تھا۔

محلوں کے چھوٹے چھوٹے پلاٹس اور گھروں کو رینٹ پر اٹھوانا بڑے کام کا انتظار کرتا تھا۔

اس لیپ ٹیپ کی کہانی تھوڑی مختلف سی ہے مجھے اتفاقیہ ہی مل گیا تھا، میں نے اس کے مالک کو تلاش کرنے کی بہت کوشش کی مگر کوئی بھی اس کی ملکیت کا

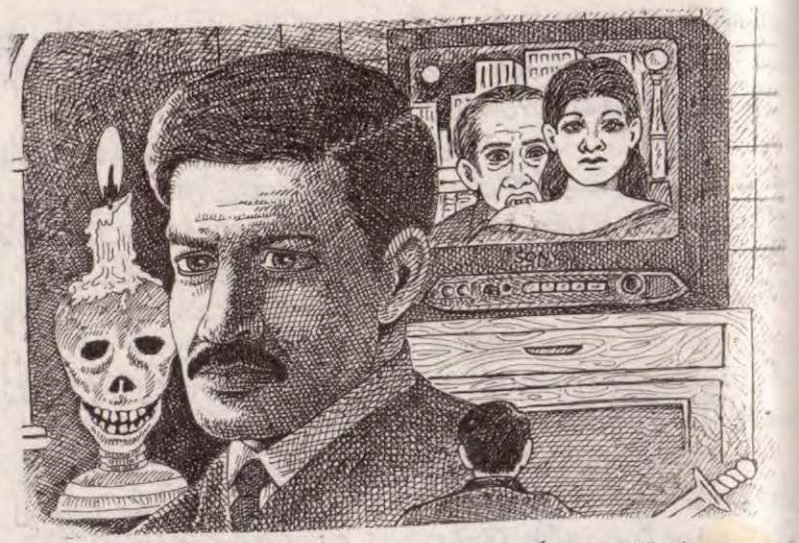

دعویدار سامنے نہ آیا تو میں نے سوچا کیوں نہ میں اس کو اپنے استعمال میں لاؤں اور اپنے دیرینہ خواب کو پایۂ تکمیل تک پہنچاؤں، میں نے قریبی دوستوں سے لیپ ٹاپ کا تھوڑا بہت استعمال سیکھا اور کچھ تو انڈرائڈ موبائل ہونے کی وجہ سے بھی مجھے آسانی ہوگئی مگر میرے ارمانوں پر پانی پھر گیا لیپ ٹاپ تو خراب نکلا۔

سوائے میڈیا پلیئر کے کچھ بھی ٹھیک نہ تھا۔

میں نے خود کو سوچوں کے گرداب سے نکالا اور آنکھیں مسل کر دکھتے ہوئے دل کے ساتھ شٹ ڈاؤن کرنے کا ارادہ کیا، ابھی میں نے لیپ ٹاپ کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ میرا ہاتھ جہاں تھا وہیں رک گیا۔ بات ہی کچھ ایسی تھی لیپ ٹاپ کی اسکرین پر پانی ہی پانی لہریں لے رہا تھا، میں یہ نظارہ دیکھ کر ساکت ہوگیا میری آنکھیں اسکرین پر ایسے جمی تھیں جیسے میں نے شیطان کو دیکھ لیا ہو۔ مارے حیرت کے میں مبہوت سا ہوگیا، تجسس کے مارے میں نے ڈرتے ڈرتے ہاتھ آگے بڑھایا اور اسکرین کو ٹچ کیا تو اسکرین سے پانی کا فوارہ پھوٹ نکلا، پانی شرر شرر بہنے لگا، میری چیخ نکل گئی اور میں اچھل کر پیچھے ہٹا، میرا لباس پانی میں شرابور ہوگیا۔

چیخ کی آواز سن کر نازیہ بھاگتی ہوئی کمرے میں آئی تو میں ایک طرف کھڑا ہانپ رہا تھا۔

''کیا ہوا آپ چیخے کیوں؟'' اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''ہیں۔'' میں جیسے خواب دیکھ رہا تھا چونک کر بولا۔

''کک کچھ نہیں۔'' مجھے حیرت کا مزید جھٹکا لگا کہ پانی کا اب کوئی بھی نشان نہ تھا۔

میں نے جلدی سے لیپ ٹاپ شٹ ڈاؤن کیا سوئچ بورڈ سے چارجر کا پلگ کھینچ کر نکالا اور لیپ ٹاپ کو بیڈ کے نیچے رکھ چھوڑا۔

نازیہ حیرت سے میری حرکتیں دیکھ رہی تھی۔

میں اس واقعہ کو اپنا وہم سمجھ رہا تھا پھر بھی کہیں نہ کہیں خوف اپنے شکنجے گاڑ چکا تھا، نازیہ مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتی ہوئی چلی گئی۔ رات کے دس بج رہے تھے میں سگریٹ سلگا کر آنگن میں چلا آیا اور کش پر کش لینے لگا اس واقعہ کو میں حقیقتاً ذہن سے جھٹک نہ پارہا تھا۔ شروع تاریخوں کا کمزور سا چاند آسمان پر روشنی بکھیر کر دبیز اندھیرے کی تنی چادر کی سیاہی کو کم کرنے کی کوشش میں تھا۔ میری پوری کوشش یہ تھی کہ میں کچھ دیر

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

پہلے ہونے والے عجیب وغریب واقعہ کو اپنا وہم باور کرسکوں یا کوئی منطقی جامہ پہنا سکوں۔

مگر یہ میرے بس سے باہر تھا آنگن میں ایک بڑا سا درخت لگا رکھا تھا جو کہ مجھے بہت عزیز تھا اکثر میں فرصت کے اوقات میں اس کے سائے میں بیٹھ کر قدرت کی ٹھنڈک اور تازگی اپنے اندر اتارتا تھا۔

اس کے پتوں سے چھن چھن کر آتی چاند کی چاندنی نے رات کے اس وقت بہت خوب صورت سماں باندھ دیا۔ میں مستقل پریشان خیال کا شکار تھا اس لئے قدرت کی یہ تازگی بھی مجھ پر اثر انداز نہ ہوپائی۔

میں نے اوپر تلے کئی سگریٹ پھونکے پھر واپس اپنے کمرے میں چلا آیا۔ تب تک نازیہ تھک ہار کر نیند کی وادیوں میں کھو چکی تھی۔

نازیہ کو سوتا پاکر میں بچوں کے کمرے میں آیا ان کے کمرے کی لائٹ آف تھی وہ بھی سو چکے تھے، بچوں کی طرف سے مطمئن ہوکر میں بھی سونے کے لئے اپنے کمرے میں آیا اور بیڈ پر لیٹ گیا جلد ہی نیند نے مجھ پر غلبہ پالیا۔

رات کا نجانے کون سا پہر تھا ہلکی سی آہٹ سے میری آنکھ کھل گئی آہٹ وقفے وقفے سے ہورہی تھی۔

میری نیند میں خلل آنے لگا تو میں نے کسمسا کر آنکھیں کھول دیں۔

سائیڈ ٹیبل پر پڑا لیمپ آن کیا اور پورے کمرے کا جائزہ لیا۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے کوئی چوہا یا بلی گھس آئی ہے اور اب آہٹیں پیدا کررہے ہیں۔

سب کچھ ٹھیک تھا حرکت کا کوئی محرک مجھے نظر نہ آیا تو میں پھر سوگیا۔ ابھی میں کچی نیند میں ہی تھا کہ وہ آہٹ نما آواز پھر سے ابھری۔

میں نے جھنجھلا کر چادر منہ سے اتاری اور آہٹ کی سمت کا اندازہ کرنے کے لئے دھیان سے سننے لگا آواز ایسی لگتی جیسے کوئی ہلکے وزن کی چیز بھاری جھٹکے سے ادھر سے ادھر لڑھک رہی ہو پھر میں نے آہٹ کی سمت کا اندازہ کرلیا وہ فرش سے ابھر رہی تھی میں نے گردن موڑ کر نیچے فرش پر دیکھا تو دھک سے رہ گیا، لوشن کی خالی شیشی فرش پر ادھر ادھر لڑھک رہی تھی اور اس کو لڑھکانے کا باعث وہ پانی تھا جو فرش پر پھیلا ہوا تھا۔

میں اچھل کر بیڈ سے نیچے اترا یہ دیکھنے کے لئے کہ پانی کہاں سے آرہا ہے۔ میں ٹیوب لائٹ آن کرکے نازیہ کی نیند خراب نہیں کرنا چاہتا تھا اس لئے لیمپ کی روشنی میں ہی کمرے کے کونے کونے کو غور سے دیکھنے لگا۔

اٹیچڈ باتھ روم کا تو میرے چھوٹے سے گمان میں کوئی تصور ہی نہ تھا جو کہانیوں کی طرح ٹوٹی کھلی رہ جاتی اور کمرے میں لبالب پانی بھر جاتا۔

کافی دیر تک مجھے پانی کے داخل ہونے کا کوئی سراغ نہ ملا کہ پانی کہاں سے داخل ہورہا ہے، میں پریشان ہوا دروازے تک آیا تو چھپ چھپ کی آواز واضح سنائی دی جو میرے پیروں کے نیچے پانی کے ہونے سے آئی تھی۔

دروازہ کھولا تو باہر سب ٹھیک تھا، میں پریشانی میں مبتلا ہوگیا اسی پریشانی میں، میں نے ٹراؤزر کی جیب سے ٹٹولیں سگریٹ نکالا ابھی سلگا کر ایک کش ہی لیا تھا کہ چونک کر مڑا، شرشر کی آواز کے ساتھ پانی کا اخراج ہوا اختیار کررہا تھا، بتدریج پانی کا لیول کمرے میں بڑھنے لگا، میں نے اپنے پیروں کی طرف دیکھا جو ٹخنوں تک پانی میں ڈوبے تھے، یخ ٹھنڈا پانی میرے پیروں کو جکڑے دے رہا تھا۔

اچانک مجھے بیڈ کے نیچے روشنی سی نظر آئی۔

میں چھپاک چھپاک کی آواز پیدا کرتا بیڈ تک آیا اور جھک کر نیچے جھانکا نیچے کا منظر دیکھ کر میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے رہ گیا پانی کی تہہ پر لیمپ ٹاپ تیر رہا تھا اور آن تھا، پانی کسی ٹیوب ویل کی مانند اس میں سے نکل رہا تھا۔

''او مائی گاڈ۔'' میں فوراً اسے پکڑنے کے لئے اس کی طرف بڑھا مگر لیمپ ٹاپ میری پہنچ سے دور تھا

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

میں جلدی سے اٹھا بیڈ کی دوسری جانب جا کر اسے پکڑنے کی کوشش کرنے لگا وہ پھر بھی میرے ہاتھ نہ آیا، مجھے خیال آیا کہ کسی چیز سے کھینچ کر اسے نکالوں، تو میں باہر کی طرف بھاگا، جیسے ہی میں کمرے سے باہر نکلا مجھے چکر سا آیا میں لہرا گیا تو میں نے دیوار کا سہارا لے کر خود کو گرنے سے بچایا۔ یہ کیا مصیبت ہے؟ لونگ روم میں بھی پانی ہی پانی بھرا تھا شاید اس لئے کہ میں نے اپنے کمرے کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا۔

وائپر، ڈنڈا، جھاڑو، میں نے ہر اس چیز سے لیمپ ٹاپ کو نکالنے کی کوشش کی جو اس وقت گھر میں دستیاب تھی، ہر ممکن کوشش کے باوجود لیمپ ٹاپ بیڈ کے نیچے سے نہ نکلا مجھے پھر پریشانی کے عالم میں سگریٹ کی طلب ہوئی، میں ایک چین سموکر تھا اس لئے میں نے اپنی جیب ٹٹول کر سگریٹ نکالنا چاہی مگر میں کمر تک پانی میں تھا تو سگریٹ بھی جیب میں بھیگ چکے تھے، سگریٹ بھیگنے کے خیال کے ساتھ ہی میرے ذہن میں دھماکے ہونے لگے لیمپ ٹاپ نکالنے اور پانی کا اخراج بند کرنے کے چکر میں، میں نازیہ کو بھول گیا تھا مجھے سب سے پہلے نازیہ کو جگا کر صورت حال سے آگاہ کرنا چاہئے تھا مگر میں اف..... نازیہ اور بیڈ دونوں پانی میں ڈوبے ہوئے تھے، میں دیوانہ وار نازیہ کو جھنجھوڑنے لگا، نازیہ کی طرف سے کوئی جواب نہ پاکر مجھے بچوں کی یاد آئی، میں پاگلوں کی طرح بچوں کے کمرے کی طرف دوڑا ہی تھا کہ کسی چیز سے ٹکرا کر گرا، پھر گر کر سنبھلا اور بچوں کی طرف اندھا دھند بھاگا۔

بچوں کے کمرے کا دروازہ کھولا تو پانی کا بہت بڑا ریلا میرے سر پر سے گزر گیا کمرے میں پانی فل بھرا ہوا تھا، اس کے بعد تو آسمان میرے سر پر ٹوٹ پڑا بچے بھی مردہ حالت میں پائے تھے میں نے۔

''خدایا۔'' میری آواز شیر کی دھاڑ سے بھی بلند تھی میں بے دم سا ہوکر پانی میں بیٹھتا چلا گیا، میرا سانس رکنے لگا میں نے خود کو پانی کے حوالے کردیا، پانی نے مجھے خوب ڈبکیاں لگوائیں۔

''زاہد، زاہد کیا ہوگیا آپ کو؟'' میں نے آنکھیں کھولیں تو نازیہ ستا ہوا چہرہ لئے میرے اوپر جھکی ہوئی تھی۔

''بب..... بچے کہاں ہیں؟'' میری مارے گھبراہٹ کے جان نکلی جارہی تھی۔

''وہ سو رہے ہیں اپنے کمرے میں۔'' نازیہ بولی۔

میں اس کو ایک طرف ہٹا کر تیزی سے بچوں کے کمرے کی طرف آیا تو میری جان میں جان آئی دونوں ننھے فرشتے سکون سے سو رہے تھے۔

''یقیناً میں نے بہت بھیانک خواب دیکھا ہے۔'' خواب کی سنگینی کا سوچ کر ہی مجھے جھرجھری آگئی، میں تھکے تھکے قدموں سے واپس آیا تو نازیہ پریشان بیٹھی تھی۔

''کچھ نہیں بس کبھی کبھی ذہن پر بوجھ ہونے کی وجہ سے ہوجاتا ہے ایسا انسان کے ساتھ۔'' میں نے اس کے گال پر چٹکی لی۔

اس نے اچھی بیوی کی طرح زیادہ کرید تو نہ کی مگر تشویش ناک نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔

''تم سو جاؤ، بچوں کو اسکول کے لئے بھی تیار کرانا ہے، یہ نا ہو کہ تم سوتی رہ جاؤ۔''

''آر یو شیور زاہد.....؟'' وہ ٹلنے والی کب تھی میں نظر چرا گیا۔

''تم تو مجھے کسی تھانے دارنی جیسی لگ رہی ہو، میں بالکل ٹھیک ہوں، ڈونٹ وری۔''

میں نے اسے کندھوں سے تھام کر لٹایا اور کمبل اوڑھا کر بچوں کی طرح تھپک تھپک کر سلانے لگا، وہ نیند میں ڈوبنے لگی تو اس نے مندی ہوئی آنکھیں کھول کر میرا ہاتھ پکڑا اور بولی۔ ''آپ بھی سو جائیں۔'' نیند میں ڈوبی نرمی سے بھرپور اس کی آواز سن کر مجھے اس پر بہت پیار آیا، اسے جتنی میری فکر رہتی اتنی پرواہ خود کی میں نہیں کرتا تھا۔

''او کے۔'' میں اس کا ہاتھ تھپتھپا کر بیڈ کی دوسری سائیڈ پر اپنی مخصوص جگہ پر لیٹا ہی تھا کہ ایک جھٹکے

سے اٹھ بیٹھا جیسے مجھے کرنٹ لگا ہو میرا بستر گیلا تھا۔

☆.....☆.....☆

تمام رات آنکھوں میں کٹی، سوچوں کی یلغار مجھے نڈھال کیے دے رہی تھی میں فیصلہ نہ کر پا رہا تھا کہ یہ سچ ہے یا سپنا۔

خدا خدا کر کے میرے کانوں میں فجر کی اذان کی آواز سنی میں نے رخ موڑ کر نازیہ کو دیکھا وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر سو رہی تھی میں آواز پیدا کیے بغیر اٹھا اور وہ شیطانی لیپ ٹاپ بیڈ کے نیچے سے نکالا۔

حیرت انگیز طور پر رات کی نسبت میں نے آسانی سے اسے نکال لیا تو قہر آلود نگاہوں سے اسے گھورا پھر اسے بغل میں دبا کر دبے پاؤں آنگن سے بائیک نکال کر گلی میں آ گیا اور اسٹارٹ کیے بنا ہی چل پڑا، میں اس وقت لوگوں کی نیند اکارت نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ میری بائیک کا سائلنسر نہیں تھا۔

اپنے گلی محلے سے کافی دور جا کر میں نے بائیک اسٹارٹ کی۔

اور اسی ویران ٹیلے کی جانب چلا جہاں سے مجھے یہ منحوس شیطانی لیپ ٹاپ ملا تھا۔

آدھے گھنٹے بعد میں اس ویران ٹیلے پر پہنچ گیا، پو پھٹ رہی تھی میں نے لیپ ٹاپ کو ایک چرمی بیگ میں بند کر رکھا تھا سو بیگ سمیت ہی اس کو اچھال کر دور جھاڑیوں میں پھینک دیا اور واپسی کی راہ لی۔

پو پھٹنے کا وقت بہت ہی بھلا اور سکون آور لگ رہا تھا، اس وقت کی راحت وہ ہی لوگ جانتے ہیں جو سحر خیز ہوتے ہیں۔

لیپ ٹاپ کی مصیبت سے جان چھڑا کر میں خود کو بہت فریش محسوس کرنے لگا، ٹھنڈی مست ہوا سے لطف اندوز ہوتا ہوا میں گھر جانے کے بجائے ایک دوست کی طرف چلا گیا دوست سے ملاقات کے دوران بھی میں چمکتا رہا وہاں سے اٹھا تو فون پر ایک کلائنٹ سے میٹنگ طے کر کے گھر جانے کا ارادہ باندھا، میں گھر میں داخل ہوا تو بہت خوشگوار موڈ میں تھا آتے ہی میں نے ہانک لگائی۔

"نازیہ، بھئی ناشتہ نہیں کرواؤ گی کیا؟"

وہ کچن سے برآمد ہوئی تو اس کے دونوں ہاتھ آٹے میں لتھڑے ہوئے تھے بالوں کی ایک آوارہ لٹ جو اس کے ماتھے پر جھول رہی تھی، اس کو ہٹانے کے چکر میں وہ بالوں پر بھی آٹا لگا چکی تھی۔

"ابھی تو آپ آئے ہیں ذرا دم تو لیں۔"

وہ مجھے ہر روز سے کہیں زیادہ خوب صورت لگی میرے جذبات مچل مچل گئے وہ اپنی بات کہہ کر پھر کچن میں غائب ہو گئی، میں بے خود سا ہو کر اس کے پیچھے لپکا، ابھی کچن کے دروازے تک ہی پہنچا تھا کہ زمین نے میرے پاؤں پکڑ لئے۔ غصے کی ایک تیز لہر میرے پورے وجود میں دوڑ گئی۔

"نازیہ۔" میں چلایا۔ وہ تقریباً بھاگی ہوئی آئی۔

"کیا بات ہے، آپ اتنے غصے میں کیوں ہیں؟"

"یہ۔" میں نے لیپ ٹاپ کی طرف اشارہ کیا جو ایک ریک پر رکھا تھا اور چارج ہو رہا تھا۔

"یہ یہاں کیسے آیا؟"

"کیسے آیا مطلب؟" اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

"آپ گھر میں نہیں تھے تو میں نے سوچا چارجنگ پہ لگا دوں تاکہ آپ کے آنے تک چارج ہو جائے ویسے بھی بجلی کا کیا بھروسہ۔"

اس کی بات سن کر میرا سر چکرا کر رہ گیا۔

میں نے اپنے لہجے کو حتی الامکان نارمل بناتے ہوئے پوچھا۔

"کب لگایا، مطلب کتنی دیر کا لگا ہوا ہے چارجنگ پر؟"

"صبح جب میں اٹھی تو آپ گھر میں نہیں تھے، میں نے سوچا آپ کسی ضروری کام سے گئے ہوں گے تبھی میں نے لگا دیا۔"

منحوس شیطانی ڈبے کو گھر میں پا کر میرا برا حال ہو گیا۔

بہت سوچنے کے بعد بھی سمجھ نہ پایا کہ میرے کن گناہوں کی سزا مجھے اس ذہنی اذیت کی صورت مل رہی ہے جو یہ شیطانی پراسرار ڈبہ میرے سکون کا دشمن بن گیا۔

میں نے لیپ ٹاپ اتارا اور ایک بار پھر اسے چرمی بیگ میں بند کر لیا، موزے جو میں گھر آ کر اتار چکا تھا پھر سے پہننے لگا، ابھی موزے پہن ہی رہا تھا کہ نازیہ بھی آ گئی۔

"ارے آپ اب کہاں جا رہے ہیں۔" اس نے مجھے تیاری پکڑتے دیکھ کر پوچھا۔

"بہت ضروری کام یاد آ گیا جانا ضروری ہے۔" میں نے عجلت میں شوز پہنے اور کھڑا ہوا۔

"مگر ناشتہ تو کرتے جائیں۔" وہ بولی۔

"نہیں یہ کام ناشتے سے بھی زیادہ ضروری ہے۔" میں بیگ لے کر صحن میں آ گیا اور بائیک اسٹارٹ کر کے ایک انجانے سفر پر نکل پڑا۔

مجھ پر کوئی مصیبت آتی یہ تو میں برداشت کر لیتا مگر میری بیوی بچوں پر کوئی آفت آئے یہ میری برداشت سے باہر تھا اس لئے میں اس آفت کے ڈبے کو گھر سے باہر نکال لایا۔ اور ایک ایسی جگہ تلاش کرنے لگا جہاں بیٹھ کر میں اس مصیبت سے چھٹکارا پانے کا بہتر حل سوچ سکوں، شہر کی سڑکوں پر گھومتے ہوئے میرا ذہن ٹھیک سے کام نہیں کر رہا تھا میری حالت اس شعر کے مصداق ہو رہی تھی۔

ارادے باندھتا ہوں سوچتا ہوں توڑ دیتا ہوں
کہیں ایسا نہ ہو جائے کہیں ویسا نہ ہو جائے

یہ ایک معروف شاہراہ تھی میرا پریشانی سے برا حال تھا اس لئے میں سگریٹ پینے کے ارادے سے یہاں رکا، بائیک سائیڈ پر کھڑی کی اور ایک طرف ہو کر سگریٹ سلگا کر گہرے گہرے کش لینے لگا، میں کافی دیر وہاں رکا رہا۔ پھر جب میں نے وہاں سے چلنے کا ارادہ کیا تو میری نظر سڑک کے کنارے نصب ایک بورڈ پر پڑی جس پر ذیل کی عبارت درج تھی۔

"عامل بنگالی، کالے علم کی کاٹ و پلٹ کے ماہر..... آپ کیسی ہی پریشانی میں مبتلا ہیں آپ کی ہر پریشانی کا حل آپ سے اتنا دور ہے جتنا آپ ہم سے .....تو دیر نہ کیجیے.....نوٹ۔

ہمارے علم کی کوئی کاٹ نہیں کر سکتا کر پائے تو ایک بڑی رقم انعام کے طور پر دی جائے گی عامل بنگالی کا چیلنج ہے۔"

سکھ کا سانس میرے لبوں سے آزاد ہو گیا میں نے دل میں اطمینان اترتا محسوس کیا اور میں بنا سوچے سمجھے عامل بنگالی کے آفس کی طرف بڑھا، یہ ایک تین منزلہ چوکور عمارت تھی نیچے والے فلور پر دکانیں اوپر آفس اور اس سے اوپر فلیٹس بنے ہوئے تھے۔

میں اپنے مطلوبہ آفس میں پہنچا یہ ایک ویل ڈیکوریٹڈ آفس تھا۔

فرش پر ایرانی قالین، قیمتی فرنیچر کھڑکیوں پر پڑے قیمتی پردے، اے ٹو زیڈ ہر چیز اپ ڈیٹ تھی مجھے لگا میں کسی غلط جگہ آ گیا ہوں کیوں کہ میرے تصور میں عامل کا آفس گندہ مندہ ہڈیوں کھوپڑیوں سے مزین، دیواریں کالک سے سجی پتہ نہیں کیا کیا الا بلا.....

مگر یہاں تو سب کچھ الٹ تھا میں مایوس ہو کر واپسی مڑنے لگا کہ میری نظر ان تصویروں پر پڑی جو دیکھنے میں پیروں فقیروں ٹائپ بزرگوں کی تھیں، ٹیبل کے پیچھے والی دیوار پر سرٹیفکیٹس ٹنگے ہوئے تھے اور ٹیبل پر چند اگربتیاں جل رہی تھیں خوشبو تو میرے نتھنوں میں گھس رہی تھی مگر دھوئیں کا نام و نشان نہ تھا۔

اتنے میں ٹیبل کے دوسری جانب سے ایک چہرہ نمودار ہوا میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور آگے بڑھ کر اس سے مصافحہ کیا اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود دوسری جانب ریوالونگ چیئر پر بیٹھ گیا۔

اس نے میرے آنے کا مقصد دریافت کیا پہلے تو میں جھجکا دیکھنے میں اچھا خاصا معقول آدمی تھا مگر

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

نجانے کیوں اس کی آنکھیں لال سرخ تھیں جیسے ابھی ان سے خون ٹپک پڑے گا ان کو دیکھ کر خوف آتا..... میرے دل میں خیال آیا۔ ''کہیں یہ شخص فراڈ نہ ہو، پھر بھی آزمانے میں کیا حرج ہے۔'' میں نے خود کو سمجھایا اور اسے الف سے یے تک اپنی درد آمیز داستان سنادی۔ سناتے سناتے جب میری آنکھوں میں وہ رات کا سین لہرایا تو میرا لہجہ بھرا گیا۔ بچوں کی صورتیں میری آنکھوں میں گردش کرنے لگیں وہ سکون سے کرسی کی سیٹ سے پشت ٹکائے ایک ہاتھ سے پیپر ویٹ کو ہلاتے ہوئے میری کہانی سنتا رہا۔ جب میں کہہ چکا تو اس نے ٹیک چھوڑ دی اور ٹیبل پر کہنیاں ٹکا کر سیدھا بیٹھ گیا اور بولا۔

''اوہ مسٹر زاہد مجھے لگتا ہے آپ جادو کے نہیں بلکہ کسی بدروح کے چکر میں پھنس گئے ہیں کیونکہ آپ کے ساتھ ہونے والے واقعات کی شروعات تب ہوئی جب آپ یہ لیپ ٹاپ گھر لائے۔''

''جی۔'' میں نے کہا۔

''دیکھیں زاہد اس کائنات میں انسانوں اور جانوروں کے علاوہ بھی بہت سی مخلوقات پائی جاتی ہیں جو اکثر اوقات ہماری نظروں سے اوجھل ہوتی ہیں مگر ہمارے لئے اتنی ہی خطرناک اور نقصان دہ ہوتی ہیں جتنی کہ نظر آنے والی مخلوق، بلکہ نظر نہ آنے والا دشمن زیادہ خطرناک ہوتا ہے بہرحال۔'' یہ کہہ کر اس نے رائٹنگ پیڈ پر آڑھی ترچھی لکیریں کھینچنی شروع کردیں چند لمحے ایسے ہی خاموشی کی نظر ہوگئے۔

''آپ کا کام ہوجائے گا مگر اس کے لئے کچھ خاص چیزوں کی ضرورت پڑے گی اگر آپ انتظام کرسکیں تو۔'' وہ بولا۔

''جی بتایئے کون سی چیزیں؟''

اس نے کاغذ پر ایک لسٹ بنا کر دی۔

آٹھ میٹر سفید لٹھا، پانچ پیکٹ اگربتی، دیسی گھی کا ڈبہ، لوبان، صندل، مٹھائی اور ایک زندہ الو، یہ لسٹ دیکھ کر تو میرے طوطے اڑ گئے۔

''بھائی صاحب یہ چیزیں مہیا کرنا تو میرے بس سے باہر ہے اگر آپ خود انتظام کرلیتے تو.....'' میں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''ٹھیک ہے آپ ان چیزوں کی قیمت ادا کریں میں کرلیتا ہوں۔'' اس نے ایک بار پھر ایک لسٹ بنا کر میرے سامنے کردی۔

پانچ ہزار ان چیزوں کا بل بن رہا تھا۔ جس میں اس نے مزید پانچ ہزار اپنی فیس شامل کردی میں حقیقتاً سوچ میں پڑ گیا تھا۔

''کیا مطلوبہ رقم ایڈوانس دینا ضروری ہے؟'' میں دل ہی دل میں فراڈیا دھوکے سے ڈر بھی رہا تھا جس طرح میڈیا نے ان لوگوں کے چہرے بے نقاب کئے تھے میں آئے دن ٹی وی پر دیکھتا رہتا تھا۔

وہ شاید میری پریشانی بھانپ گیا اس لئے بولا۔

''نہیں آپ صرف سامان کی قیمت ایڈوانس دے دیں، میں ابھی سے کام شروع کردیتا ہوں۔''

میرے چہرے کی اڑی رنگت دیکھ کر وہ پھر گویا ہوا۔

''گھبرایئے نہیں کام تسلی بخش ہوگا جس میں دھوکہ یا فراڈ کا کوئی دخل نہیں۔''

اس کی زبان سے یہ الفاظ سن کر کچھ ڈھارس ہوئی تو میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میں رقم کا انتظام کرکے آتا ہوں۔''

''میں آپ کے آنے تک پڑھائی اسٹارٹ کرتا ہوں۔'' وہ بھی کرسی سے اٹھ گیا۔

جیسے تیسے کرکے میں نے شام تک پانچ ہزار کا انتظام کیا اور عامل بنگالی کے آفس پہنچا۔ میں نے رقم اس کے سامنے ٹیبل پر رکھی جس کو اس نے اٹھا کر دراز میں ڈالا اور دراز کو لاک کرکے چابی جیب میں ڈال لی۔ پھر وہ مجھے لے کر آفس سے متصل ایک اور کمرے میں آ گیا، ہم نے جوتا کمرے کے باہر اتارا اور کمرے میں داخل ہوئے جس میں سرخ قالین بچھا تھا اور کسی قسم کا کوئی فرنیچر نہ تھا۔ کمرے کے وسط میں صرف ایک

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

بھٹی پڑی تھی، ایسی انگیٹھی میں نے اکثر فلموں ڈراموں میں ہندو پنڈتوں یا سادھوؤں کے پاس دیکھی تھی۔ ہم دونوں انگیٹھی کے گرد پالتی مار کر بیٹھ گئے، عامل نے ہمارے گرد انگلی کے اشارے سے ایک دائرہ کھینچا اور بولا۔ ''کچھ بھی ہوجائے تم اس دائرے سے باہر مت نکلنا.....'' اور وہ سامان قریب کرلیا جو اس نے پہلے سے ارینج کر رکھا تھا۔ پھر اس نے اپنے ماتھے پر سرخ رنگ کا ٹیکہ سا لگایا اور کسی ان دیکھی ہستی کو سجدہ کیا پھر انگیٹھی میں آگ جلادی۔

وہ منہ ہی منہ میں کچھ بدبدانے لگا ساتھ ہی ساتھ وہ گھی کے ڈبے سے تھوڑا تھوڑا گھی لیتا اور آگ میں ڈالتا جاتا، میں سہما سا اس کے پاس بیٹھا تھا، شام رات ہوگئی وہ ایسے ہی مختلف چیزیں آگ میں ڈالتا اور بدبداتا رہا۔ دھواں ہی دھواں کمرے میں بھرا گہری دھند کا منظر پیش کررہا تھا۔

دیسی گھی اور دوسری چیزوں کی بدبو سے میری طبیعت مالش کرنے لگی۔

مجھے اور کچھ نہ سوجھا تو میں نے جیب سے سپاری نکال کر منہ میں ڈالی اور آنکھیں بند کرکے اسے سوچنے لگا۔ آنکھیں بند کرتے ہی مجھے نیند کے جھونکے آگئے میں اونگھ گیا۔ جانے کتنی دیر اونگھتا رہا۔

الو جو پنجرے میں بند تھا پھڑ پھڑانے لگا تو اس کے پھڑ پھڑانے سے میری آنکھ کھلی۔

کمرے کا ماحول بہت پراسرار اور منحوس ناک ہوگیا تھا۔

آگ کے شعلے لپک لپک کر ادھر ادھر بڑھنے لگے، آگ کی تپش سے پسینہ میرے چہرے اور جسم پر پھوٹ پڑا۔ عامل بنگالی ایسے ہی آنکھیں موندے بڑبڑاتے ہوئے آگ کو گرما رہا تھا۔

ایسے میں الو نے ایک زوردار چیخ ماری، اس غیر متوقع چیخ نے جیسے ہی خاموشی کے پردے کو چیرا میں لرز گیا خوف سے میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔

عامل نے آنکھیں کھول دیں اور غور سے آگ کے شعلوں کو دیکھنے لگا جو مختلف ڈراؤنے ڈراؤنے ہیولوں کا روپ دھار رہے تھے۔

اب عامل نے پنجرے کا دروازہ کھولا اور اس میں سے الو کو نکال لیا پھر اس نے تیز چھری سے ایک کٹ الو کی شہ رگ پر ایسے لگایا کہ شہ رگ کٹنے نہ پائے الو کا خون تیزی سے بہنے لگا اور اس کی دردناک چیخیں گونجنے لگیں، عامل نے جلدی سے پیالی آگے کی اور اس پیالی میں خون جمع ہونے لگا۔

جب تک خون پرندے کے جسم میں تھا عامل نے اس کے پھڑ پھڑاتے وجود کو پیالی پر سے نہ ہٹایا۔ آخری قطرہ تک نچوڑ کر الو ابھی زندہ ہی تھا کہ اسے آگ میں پھینک دیا۔

میں اس کی اس حرکت پر بھنا گیا، عامل کی یہ سفاکی غیر انسانی تھی کمرے میں الو کی دو تین کربناک چیخیں گونجیں، میں نے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے، کافی دیر میں کانوں پر ہاتھ رکھے رہا مگر کچھ دیر میں مجھے ہاتھ کانوں سے ہٹا کر ناک پر رکھنا پڑا کیونکہ ہر طرف گوشت جلنے کی بو پھیلی ہوئی تھی۔

عامل کی گرج دار آواز سن کر میں نے آنکھیں کھولیں تو دنگ رہ گیا۔ کمرے میں ایک روح موجود تھی۔

سفید چادر میں لپٹا اس کا چہرہ بھی لٹھے کی مانند سفید پڑا ہوا تھا۔

''کون ہو تم اور اس لیپ ٹاپ میں کیسے آئے؟''

''میرا نام مہیش ہے اور یہ لیپ ٹاپ میرا ہے۔'' وہ بولا۔

''تم میرے کلائنٹ کو کیوں ستا رہے؟'' عامل نے پوچھا۔

''میں مکتی چاہتا ہوں۔'' وہ بولا۔

''وہ بدروح تھی جسے عامل نے اپنے عمل سے حاضر کیا تھا۔ میں زندگی میں پہلی بار کسی بدروح کو دیکھ رہا تھا۔

''مجھے قتل کیا گیا مگر میرا انتم سنسکار نہیں ہوا۔''

وہ کسی روبوٹ یا معمول کی طرح بول رہا تھا ہر قسم کے جذبات سے عاری۔

''کیسے اور کہاں قتل ہوئے؟'' عامل کے اس سوال پر وہ بدروح بولی۔

''مجھے پریانکا نے قتل کیا وہ میری کولیگ تھی، حسن وخوبصورتی کا شاہکار...... میں ہمیشہ اسے ستائشی نظروں سے دیکھتا دور دور سے اس کے حسن پر نثار ہوتا رہتا...... مگر میری یہ پسندیدگی میری موت کا سبب بن گئی۔

چند سال پہلے جب سوشل میڈیا نے فیس بک متعارف کروایا تو لوگوں کو جیسے اکاؤنٹ بنانے کا بخار چڑھنے لگا مجھے بھی یہ شوق ہوا تو میں نے بھی آفس کے کمپیوٹر پر اکاؤنٹ بنایا اور فارغ وقت میں اس دلچسپ مشغلے کا لطف اٹھانا شروع کردیا اسی شوق کی تسکین کے لئے میں نے یہ لیپ ٹاپ خریدا، میرا یہ شوق بہت مہنگا تھا میری جمع پونجی اس پر لگ گئی۔

ایک دن وہ میرے کیبن میں آئی تو بہت پریشان تھی میں اس کا حسین چہرہ اداس نہ دیکھ سکتا تھا اس لئے پوچھ بیٹھا۔

''مس پریانکا ایوری تھنگ از آل رائٹ؟''

وہ بولی۔ ''میرا سسٹم کام نہیں کررہا مہیش۔''

''تو اس میں اتنا پریشان ہونے والی کون سی بات ہے؟''

اس کی نظر اس دوران میرے لیپ ٹاپ پر پڑی تو اس نے پوچھا۔

''مہیش میں آپ کا لیپ ٹاپ یوز کرلوں؟''

''شیور وائے ناٹ......'' میں نے اپنا لیپ ٹاپ اس کی طرف بڑھایا اور خود اپنے سسٹم کی طرف متوجہ ہوگیا۔ میرا سارا دھیان کمپیوٹر کی طرف تھا پھر بھی میں کن انکھیوں سے پریانکا کو دیکھ رہا تھا۔

اس نے اپنا فیس بک اکاؤنٹ لوگ ان کیا اور نیوز فیڈ چیک کرنے لگی، کچھ ہی دیر میں اس کو کسی کا مسیج ملا تو اس کا چہرہ کھل اٹھا۔

میں اپنی سیٹ سے اٹھا اور پریانکا کی [illegible] طرف پڑے پانی کے کولر کی طرف بڑھا، دراصل چپکے چپکے اس کی چیٹ دیکھنا چاہتا تھا مگر اس سے [illegible] میں اس کے مسیج دیکھ پاتا اس نے جلدی سے [illegible] کیا اور اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی۔

اس کے کیبن کا فون مسلسل بج رہا تھا۔

''پلیز لوگ آؤٹ کردو۔'' یہ کہہ کر وہ [illegible] اور میں اس کو جاتا دیکھتا رہا، ایک بار تو جی چاہا کہ [illegible] آئی ڈی چیک کروں پھر میں نے غیر اخلاقی [illegible] جان کر اس کا اکاؤنٹ لوگ آؤٹ کردیا۔

اس کے بعد ہم ایک دوسرے کے قریب [illegible] لگے۔ ہماری دوستی ہوگئی، وہ اکثر اوقات میرے [illegible] ٹاپ پر فیس بک یوز کرتی۔

ہوتے ہوتے ہم بہت فرینک فرینڈ بن [illegible]

ایک دن اس نے مجھ سے ایک عجیب [illegible]

''مہیش کیا تم میری چند تصویریں بنادو [illegible]

''کب اور کہاں بنانی ہیں؟'' میں تو [illegible]

''میرے گھر پر......'' اس نے کہا۔

''او کے کب آؤں؟'' میں یہ سن کر [illegible] ہو کر بولا۔

''آفس ٹائم کے بعد۔''

''او کے ڈن، ساتھ ہی چلیں گے۔'' میں [illegible] تو وہ چلی گئی۔

میں نے وہ دن بہت بے چینی میں کاٹا۔ جیسے ہی آفس ٹائم آف ہوا میں [illegible] سر پر جا کھڑا ہوا۔

میری وجہ سے اسے بھی سب جلدی جلدی [illegible] اپ کرنا پڑا۔

ہم دونوں میری بائیک پر اس کے [illegible] پریانکا کے ساتھ بائیک پر بیٹھ کر میں تو جیسے [illegible] اڑنے لگا۔

گھر پہنچ کر وہ سیدھی کچن میں چلی گئی [illegible] سے کولڈ ڈرنک نکال لائی تو میں کولڈ ڈرنک [illegible]

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

[illegible] اور وہ کہیں غائب ہوگئی جب وہ واپسی آئی تو [illegible] بڑی سی چادر اوڑھ رکھی تھی۔

میں کچھ حیران ہوا گرمی کے موسم میں اس طرح [illegible] سے تو جان ہی نکل جائے۔

اس نے شولڈر بیگ سے ایک اسمارٹ فون [illegible] میری طرف بڑھایا۔

''اب میں اس پر فیس بک چلاتی ہوں۔''

''یہ کب لیا؟'' میں نے فون کو الٹ پلٹ [illegible]

''کچھ ہی دن ہوئے......'' وہ مسکرا رہی تھی [illegible] اس کی مسکراہٹ سے بڑھ گئی میں بھی نثار [illegible] مسکرا دیا۔

''تو تصویریں بنالیں؟'' میں نے پوچھا۔

''کیوں نہیں چلو میرے ساتھ۔'' پھر وہ مجھے [illegible] روم میں لے گئی اور دھماکہ ہی کردیا۔

روم میں آ کر اس نے چادر بھی نکال پھینکی تو [illegible] ہوش اڑ گئے وہ نیکڈ تھی اس کا لباس ضروری [illegible] ڈھانپنے میں ناکام ہو رہا تھا وہ تقریباً بالکل [illegible]

میں بھوت سا اس حسن مجسم کو دیکھے گیا تو اس [illegible]

[illegible] کہاں کھو گئے؟''

''ہاں...... کہیں بھی تو نہیں۔'' میں چونکا۔

''تو شروع کریں......'' وہ گہری مسکراہٹ سے [illegible] شاید میری غیر ہوتی حالت سے محظوظ ہو رہی [illegible] میں نے ہاں میں سر ہلا دیا۔

پھر وہ بیڈ پر مختلف فحش پوز دینے لگی اور میں [illegible] کے ساتھ تصویریں بناتا رہا۔ جب بہت سی [illegible] گئیں، تو وہ واش روم میں چلی گئی اور پورا [illegible] آ گئی۔

میں سکتے کی سی حالت میں گنگ سا ہوگیا اس [illegible] پوچھنے کی ہمت نہ کرسکا، رعب حسن ہی کچھ [illegible] تھا مجھ پر۔

پھر اکثر ہی یہ ہونے لگا وہ اکثر مجھ سے اپنی ننگی تصویریں بنواتی اور میں چپ چاپ بناتا جاتا، میرے لئے یہ نہایت دلچسپ امر تھا لیکن شکر خورے کے سامنے شکر ہو تو وہ خود کو کھانے سے کیسے روک سکتا ہے اس لئے ایک دن تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں نے پوچھ ہی لیا۔

''یہ سب کیا ہے؟''

''کچھ مت پوچھو مہیش۔''

''اب میں چپ نہیں رہ سکتا۔'' میں غصے میں آ گیا اور میرا لہجہ بھی کچھ تلخ ہوگیا، اس نے میرا موڈ دیکھ کر مجھے ٹھنڈا کرنے کی بہت کوشش کی مگر میں اپنی ضد پر اڑا رہا۔ مجبوراً اسے اس راز سے پردہ اٹھانا ہی پڑا۔

''یہ میرا بزنس ہے میں فیس بک پر فحش پیجز اور گروپس کے لئے کام کرتی ہوں، مجھے اتنے پیسے ایک دن میں ہی مل جاتے ہیں جتنی میری پورے مہینے کی سیلری ہے میں نے یہ سب غربت سے تنگ آ کر کیا۔''

میں نے چونکہ غصے کی جوش میں اسے دھمکی دے ڈالی تھی جو کہ کارگر ثابت ہوئی اور اس نے مجھے یہ راز بتادیا، یہ سن کر میری تو ہوائیاں اڑ گئیں، میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ پریانکا اس حد تک جاسکتی ہے۔

دھیرے دھیرے اس نے مجھے بھی اس کاروبار میں شریک کرلیا، میں پیسے کے لئے تو نہیں مگر پریانکا کی قربت کے لئے یہ سب کرنے لگا، وہ میرے ساتھ غیر اخلاقی ہیجان انگیز تصویریں بنواتی جس کے اس کو پیسے ملتے تھے دینے والا کون تھا یہ میں نہیں جانتا۔

رفتہ رفتہ میری برداشت جواب دینے لگی میں اپنے تشنہ کام جذبات کی تسکین چاہنے لگا، بلی کے سامنے چھچھڑے رکھ کر رکھوالی کرنے کی امید بے کار ہے، میں آخر کب تک شریف اور فرماں بردار بنا رہتا۔ میرے ساتھ بنوائی تصویروں کی وجہ سے اسے ڈبل فائدہ ملنے لگا لیکن مجھے بھی تو فائدہ ملنا چاہئے، میں نے جب

بے باکی سے اپنے خیالات کا اظہار کیا تو پریانکا پس وپیش کرنے لگی۔

جب وہ کسی طرح نہ مانی تو مجھے اپنی پرانی دھمکی بروئے کار لانی پڑی کہ ”میرے لیپ ٹاپ میں اس کی ایسی تصویریں سیو ہیں جن میں اس کا چہرہ صاف دکھتا ہے۔“ میری یہ دھمکی کام کرگئی اور وہ مان گئی۔ لیکن اس نے اپنی ایک انوکھی خواہش کا اظہار کیا کہ ”ہم رات کے سمے کشتی رانی کرتے ہوئے دنیا کی نظروں سے دور جا کر یہ سب کریں گے۔“ میں مان گیا۔

اور وہ دن مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہم نے سمندر میں جانے کا پروگرام بنالیا تھا، میرے دوست نے مجھے ایک بوٹ کرائے پر دی، میں نے کسی کو نہیں بتایا تھا کہ میں کیوں اور کس کے ساتھ بوٹ پر سمندر کی سیر کے لئے جارہا ہوں؟

یہ بھی پریانکا کی ہی ہدایت تھی، تمام احتیاطوں کے ساتھ ہم بوٹ پر تھے۔ چاند کی چودھویں رات تھی چاند ابھی تک تو شانت ہی تھا، سمندر کی وسعتوں میں پریانکا خوش تھی وہ چاہتی تھی کہ ہم ساحل سے دور چلے جائیں تو میں بوٹ لے کر ساحل سے بہت آگے آ گیا، لیپ ٹاپ بھی میرے ساتھ تھا کیونکہ میں لیپ ٹاپ سے ایک پل بھی دور نہ رہتا تھا۔

میں پریانکا کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کررہا تھا کہ سمندر کی لہروں میں طغیانی سی آ گئی۔

چاند بلند ہوتے ہوتے ہمارے سروں پر پہنچ گیا میری طبیعت کی رنگینی نے زور مارا تو میں پریانکا کو چھوڑ کر سمندر کا نظارہ کرنے لگا، مجھے ایک شعر یاد آ گیا جو میں نے پریانکا کو سنایا۔

اس نے بھی چوٹ کوئی حسن سے کھائی ہوگی
چاند کو دیکھ کر سمندر جو بپھر جاتا ہے

اور پھر سمندر بیچ میں بپھرنے لگا پریانکا میرا لیپ ٹاپ لے کر بیٹھ گئی میں بوٹ کے کنارے کھڑا سمندر کا نظارہ کررہا تھا میں چونکہ ڈرنک تھا اس لئے اپنے ہوش وحواس میں بھی نہ تھا ابھی تک میں اپنے من کی کامنا پوری نہ کرپایا تھا اب مجھے کوئی جلدی نہ تھی کیونکہ پریانکا میری تھی اب، میں انہی سوچوں میں سرشار سا کھڑا تھا کہ مجھے کسی نے پیچھے سے زوردار دھکا دیا۔ میں دھڑام سے سمندر میں جا گرا۔

ڈوبتے ابھرتے ہاتھ پاؤں چلاتے میں نے دیکھا کہ اسی دشمن جاں نے مجھے دھکا دیا تھا جسے میں اپنی جان بنانا چاہتا تھا۔

میں التجائیں کرنے لگا کہ مجھے کسی طرح اوپر لے لو کیونکہ مجھے تیرنا نہیں آتا تھا مگر وہ مجھے ڈوبتا ناصرف دیکھتی رہی بلکہ ہنستی بھی رہی۔

جیسے ہی میرے جسم سے جان نے میرا ساتھ چھوڑا پریانکا نے لیپ ٹاپ بھی سمندر میں اچھال دیا میری آتما کو لیپ ٹاپ میں ایک کھڑکی سی نظر آئی تو اس میں داخل ہوگئی پھر لیپ ٹاپ بہتا ہوا کئی سالوں بعد اس ویران ٹیلے پر پہنچ گیا جہاں سے ان مہاشے نے پراپت کرلیا۔

مہیش کی آتما نے اپنی کہانی تمام کی تو عامل بولا پڑا۔

”میں تمہیں مکتی دلاؤں گا مگر تمہیں تب تک لیپ ٹاپ چھوڑ کر میرے ساتھ رہنا ہوگا۔ میرا فرماں بردار بن کر۔“ مہیش کی روح مان گئی اور میرے دیکھتے دیکھتے لیپ ٹاپ کو آگ لگ گئی اور وہ ایک دھماکے سے پھٹ گیا مہیش کی فسوں ناک کہانی سن کر میں اس میں کھو سا گیا تھا۔

عامل نے سب کچھ وائنڈ اپ کیا اور ہم اس کمرے سے باہر آ گئے۔

مجھے لگا جیسے میں جی اٹھا ہوں ایک تعفن زدہ کمرے سے خوشبوؤں کے ماحول میں آ گیا۔

عامل نے مجھ سے میرا ایڈریس اور فون نمبر اور چند ہدایات کیں فیس کی ادائیگی کا وعدہ کرکے میں خوشی خوشی آدھی رات کو گھر آ گیا۔

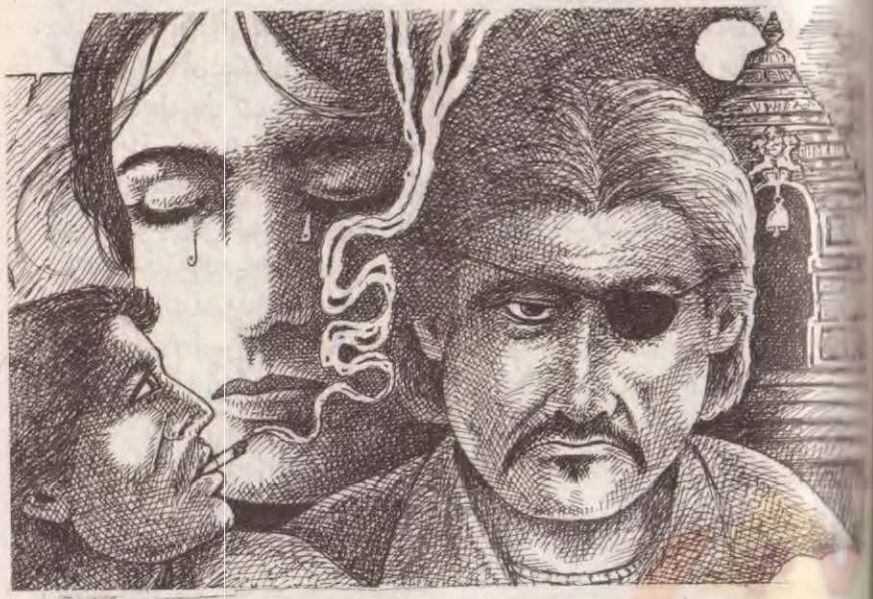

عجیب کہانی

رضوان قیوم۔ راولپنڈی

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

اچھی بھلی نوجوان لڑکی کھڑی تھی اور جب اس پر عامل نے جادوئی الفاظ پڑھ کر پھونکا تو لڑکی کی شکل دیکھتے ہی دیکھتے ناقابل شناخت ہوگئی، کسی نے اسے پہچان کر نہ دیا اور پھر اس طرح لڑکی سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر.....

کہتے ہیں کہ جادو اور عمل نا قابل یقین شکتی شالی ہوتا ہے، ثبوت کہانی میں موجود ہے

یہ سچی کہانی مجھے ایک ایسے ضعیف قریب المرگ درزی نے سنائی ہے جس کی عمر تقریباً ستر سال کے لگ بھگ تھی۔ اس دلچسپ اور مافوق الفطرت کہانی کا راوی مجھے راولپنڈی تا مری کے سفر کے دوران ملا تھا۔ اس بزرگ درزی کو شدید ٹی بی کا عارضہ لاحق تھا۔ بقول اس کے بیٹے کے، باپ کا مرض آخری اسٹیج پر تھا اور وہ اپنے باپ کو علاج کی غرض سے ساحلی سینی ٹوریم (ٹی بی ہاسپٹل) لے کر جارہا تھا۔ باتوں باتوں میں جب میں بحیثیت ان کا ہم سفر مسافر، ان سے کچھ بے تکلف ہوا تو کھانستے ہوئے بزرگ نے منہ پر ہاتھ رکھ کر اپنی کھانسی کے دورے کو روکتے ہوئے مجھ سے پوچھا تھا۔

”بیٹا تم کیا کرتے ہو؟“ میں نے انہیں بتایا کہ میں ایک سرکاری محکمے میں جاب کرتا ہوں اور میرا مشغلہ کہانیاں پڑھنا اور لکھنا ہے“۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

میری یہ بات سن کر ذرا دیر خاموشی کے بعد اس بزرگ نے کہا۔ "بیٹا! تم بے شک میری کہانی لکھو یا نہ لکھو لیکن میری خواہش ہے کہ میں مرنے سے پہلے اپنی زندگی میں بیتی ہوئی یہ کہانی تمہیں سناؤں"۔

"کیا آپ کے پاس واقعی کوئی ایسی خاص اور دلچسپ کہانی ہے جو آپ اس شدید بیماری کے عالم میں بھی مجھے سنانا چاہ رہے ہیں؟" میں نے بہت توجہ اور انہماک سے ان بزرگ کی بات سن کر یہ سوال کیا تھا۔

"ہاں بیٹا! میری زندگی کی یہ کہانی بہت خاص ہی نہیں بلکہ دلچسپ اور عجیب بھی ہے"۔ اور پھر انہوں نے اپنی کہانی کچھ یوں شروع کی تھی۔

میرا نام بابو طاہر علی ہے۔ میری پیدائش موجودہ ہندوستان کے مشہور شہر انبالہ چھاؤنی میں 1930 میں ہوئی۔ میرے ابا جن کا نام قادر علی تھا، وہ اسی شہر میں ایک سرکاری باغ میں مالی کا کام کرتے تھے۔ ان کی تنخواہ اس زمانہ میں پچاس روپے تھی اور اس تنخواہ میں وہ ہم پانچ بھائیوں اور دو بہنوں کو پال رہے تھے۔ میری ماں کی میری پیدائش کے دوران وفات ہوگئی تھی۔ میں اپنے بہن بھائیوں میں جنم لینے والا آخری بچہ تھا۔

یہ جو مجھے آج ٹی بی کا مرض لاحق ہے، مجھے اللہ بخشے، ابا مرحوم کی جانب سے ورثہ میں ملا ہے۔ وہ بھی سارا دن خون تھوکتے رہتے تھے، بیماری کی وجہ سے نہ صرف ان کے گھٹنے جڑ گئے تھے، بلکہ ان کا سارا جسم بالکل سوکھ کر پنجر بن چکا تھا اور جب بیماری کی وجہ سے وہ ریٹائر ہوئے تھے تو ہمارا سب سے بڑا بھائی نُور بے چارہ وہاں جہاں وہ مالی کا کام کرتے تھے، بھرتی ہوگیا تھا، یوں اس کی تنخواہ 65 اور ابا کی پنشن 40 روپے کے سہارے ہمارے گھر کے آٹھ افراد بمشکل پل رہے تھے کیونکہ گھر کی آمدنی کا ایک بڑا حصہ ابا کی موذی بیماری چوس رہی تھی..... اور پھر جب گھر میں بھوک، افلاس نے ہمیں زیادہ ہی ستایا تھا تو نور بھائی نے مجھے اور مجھ سے بڑے بھائی منیر کو کہا تھا کہ "تم دونوں گھر کی معاشی پریشانی کی آگ کو دھیما کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو ہاتھ پاؤں مارو" اور ہم نے ہاتھ پاؤں مارنے کی جگہ یعنی نوکری کی تلاش شروع کردی۔

ہمارے محلے میں ایک سکھ رہتا تھا جس کی بنٹوں اور دھاگے کی دکان تھی۔ اس نے بھائی سے کہا تھا۔ "طاہر کو امرتسر اس کے جاننے والے ایک مشہور درزی کے پاس کام سکھوانے کے لیے بھیج دیا جائے، وہاں اسے اس کا استاد کام سکھانے کے علاوہ اسے معقول خرچہ، رہائش اور خوراک بھی دے گا"۔

پہلے تو بھائی نے یہ بات نہیں مانی تھی کہ امرتسر دور جگہ ہے لیکن سردار جی نے بھائی کو سمجھایا تھا کہ "درزی کا کام ہمیشہ چلنے والا ہے۔ انسان کھائے پیسے بغیر بھوکا تو رہ سکتا ہے لیکن جسم کو تو اس نے ہر حال میں ڈھانپنا ہی ہے، اور مرنے کے بعد کفن بھی درزی کا محتاج ہوتا ہے"۔ اور پھر بھائی بالآخر سردار جی کی بات مان گئے تھے۔

☆.....☆.....☆

سردار جی نے جب مجھے امرتسر لے جا کر اپنے واقف کار ٹیلر ماسٹر پریم بابو سے ملوایا تھا تو اس نے میرے سراپے کا سرسری جائزہ لینے کے بعد کہا تھا۔

"تجھے میں اس سردار جی کی خاطر اپنے پاس شاگرد رکھ رہا ہوں۔ دیکھ تو بہت محنت سے سب کچھ سیکھنا اور دکان کے علاوہ گھر کا بھی اوپر کا کام کاج بھی کرنا۔ تجھے فی الحال 75 پیسے روز ملیں گے اور وہ بھی میں تیرے بھائی کو بھیجا کروں گا۔ تیری رہائش اور کھانا میرے پاس ہی ہوگا"۔

ان سب باتوں کے بعد جب سردار جی کی روانگی ہوگئی تھی تو پریم بابو نے بڑے کرخت لہجے میں آواز لگائی تھی "ابے او راجو.....! حرام زادے..... تم بخت..... کدھر مر گیا؟"

"آیا استاد جی....." آواز کے ساتھ ہی میرے سامنے ایک چھوٹے قد کا مگر گوری رنگت اور ہلکی نیلی آنکھوں والا لڑکا، پرانے بوسیدہ کپڑے پہنے موجود تھا جس کی عمر دیکھنے میں سترہ، اٹھارہ برس کے لگ بھگ تھی۔

"تو کدھر مر گیا تھا؟ حرام زادے....."

"جی، وہ آرڈر کی پینٹوں میں بٹن کس رہا تھا"۔

"اچھا، یہ لڑکا آج سے تیرے حوالے، یہ یہاں درزی کا کام سیکھے گا، ابھی تو گھر کھانا لینے جا رہا ہے تو اسے بھی اپنے ساتھ لے جا، وہاں مایا دیوی کو اس کے بارے میں بتا دے، کہ دکان پر یہ نیا شاگرد آیا ہے اور ہاں، جانے سے پہلے اس کو دکان کے دوسرے افراد سے بھی ملا دے"۔

پریم بابو کی ٹیلر شاپ میں اس وقت دو بندے موٹا سا چشمہ لگائے اپنی اپنی مشینوں پر سلائی کر رہے تھے جبکہ ایک نوجوان لڑکا تُرپائی کر رہا تھا۔ اس کی عمر چودہ پندرہ سال کے لگ بھگ تھی..... "یہ بابا جی، استاد منور لعل ہے، اس دکان کے سب سے پرانا درزی، اُن کے ساتھ یہ استاد تلمید چچا ہیں اور یہ لڑکا ملائم سنگھ، یہ یہاں پانچ سال پہلے میرٹھ چھاؤنی سے آیا تھا"۔ راجو نے میرا ابتدائی طور پر دکان کے لوگوں سے تعارف کروایا۔

"اب میں تمہیں تمہاری رہائش کے بارے میں بھی بتا دوں"۔ راجو نے دکان کے اوپر بنی ایک بڑے مچان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ ہمارا گھر ہے"۔

"ہمارا گھر؟" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

ہاں! تمہارا، میرا اور ملائم سنگھ کے رہنے اور سونے کی جگہ، یہ دونوں استاد اور بڑے استاد پریم بابو تو چھٹی کر کے چلے جاتے ہیں۔ میں اور ملائم سنگھ یہاں ہی رہتے ہیں اور اب تم بھی ہمارے ساتھ ہی رہو گے"۔

دکان کے ملازموں سے تعارف اور وہ مچان والا گھر دکھانے کے بعد راجو مجھے بڑے استاد پریم بابو کے گھر لے گیا، جو کہ دکان سے کچھ ہی فاصلے پر واقع تھا۔ راستے میں، میں نے راجو سے کہا "استاد دیکھنے میں بہت سخت رویئے والا لگتا ہے لیکن وہ اس کے ساتھ ہی دل کا نرم اور سخی محسوس ہوتا ہے چونکہ وہ اپنے کاروباری گروں کو کھانا کھلاتا ہے"۔

"ابے یار، وہ دل دل کا کوئی اچھا و چھا نہیں ہے، وہ تو بڑا ہی چالاک شخص ہے، اپنے مطلب کے لیے سب کو کھانا کھلاتا ہے، کہ کھانے کے بہانے ہوٹل میں گھنٹے، دو گھنٹے برباد نہ کریں اور کھانا بھی کیا دیتا ہے، پتلی پتلی روٹیوں کے ساتھ لمبے پانی والی دال یا پتلی سی کڑھی اور دونوں بڑے استادوں کو تو وہ صرف ایک وقت کی روٹی دیتا ہے کیونکہ یہ یہاں کے مقامی ہیں، مجھے اور ملائم سنگھ کو یہ دو وقت کی روٹی اور صبح کا ناشتہ دیتا ہے اور اب تم بھی ہمارے ساتھ دو وقت کا کھانا اور ناشتہ کرو گے"۔ راجو نے بڑے استاد کی برائیوں کی پٹاری کھولنا شروع کردی تھی..... راستے میں اس نے مجھے اپنی جیب سے پتے والی برفی کے علاوہ چنا چاٹ کا پتالے کر کھلایا تھا۔ (ہندوستان میں اب بھی بڑ کے پتے پر چھولے، ربڑی اور دوسرا چھوٹا موٹا سودا دیا جاتا ہے جسے پتا کہتے ہیں۔)

وہ مجھے ساتھ لیے سیدھا بغیر کھٹکا کیے بڑے استاد کے گھر میں گھس گیا۔ یہ ایک پرانا سا گھر تھا۔ وہاں ایک دبلی پتلی ادھیڑ عمر عورت باورچی خانے میں کھانا پکا رہی تھی۔ راجو نے انہیں نمستے کیا۔ انہوں نے اسے نمستے کا جواب نہیں دیا بلکہ الٹا اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"کم بخت، صبح تو کتنے گندے برتن دھو کر گیا ہے، دل کرتا ہے، یہ تیرے سر پر مار دوں، میں نے یہ دوبارہ دھوئے ہیں۔ لگتا ہے تیرے ہاتھوں میں جان نہیں رہی....."

میں نے بھی انہیں سلام کیا تو انہوں نے جواباً راجو سے سوال کیا۔ "یہ کون ہے؟"

"جی! یہ طاہر علی ہے، دکان پر استاد کا نیا شاگرد، انبالہ سے آیا ہے"۔ راجو نے میرا تعارف کرایا۔

"اچھا، ٹھیک ہے۔ اب تو اسے اپنے ساتھ گھر کی صفائی وغیرہ کے لئے لے آیا کر، ویسے دیکھنے میں تو یہ بڑا نٹ کھٹ لگ رہا ہے"۔ انہوں نے میرے بارے میں تبصرہ داغا۔

"جی.....! وہ کھانا کب تک تیار ہو جائے گا؟" راجو نے ان سے پوچھا۔

"دس منٹ تو اس کے ساتھ دالان میں بیٹھ، ابھی میں کڑھی میں بگھار دے رہی ہوں"۔

میں اور راجو دالان میں ایک طرف پڑے اسٹول پر بیٹھ گئے، میں نے نظریں گھما کر گھر کا جائزہ لینا شروع کیا تو اچانک میری نظریں سامنے گیلری میں کھڑی ایک کم عمر مگر لمبے قد والی خوبصورت لڑکی پر پڑی جو کہ راجو کی طرف دیکھ

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

کرمسکراتے ہوئے ہاتھوں اور آنکھوں سے اشارتاً باتیں کر رہی تھی، پھر راجو نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے kiss کیا تھا اور بڑے رومانوی انداز میں اس کی طرف اشارتاً اچھالا۔ میں ان دونوں کے مابین ہونے والی یہ عجیب اشارے بازی بڑے انہماک سے دیکھ رہا تھا کہ میرے کانوں میں آواز آئی۔

"ارے ڈولی بیٹی! ذرا اوپر سے ہنڈیا پر باندھنے والا کپڑا تو لے آ"۔

"آئی اماں!" پھر وہ لڑکی اپنے ہاتھوں میں ایک بڑا سا کپڑا لے کر نیچے آئی۔

نیچے آنے کے بعد بھی لڑکی نے میرے سامنے اپنی ماں کی نظروں سے بچتے ہوئے راجو کی کمر میں بڑے پیار بھرے انداز میں چٹکی کاٹی تھی۔

ہم جب گھر سے باہر آئے تھے تو، میں نے راجو سے اس لڑکی کے بارے میں پوچھا تھا کہ "یہ کیا معاملہ ہے؟"

اس نے مسکراتے ہوئے کہا "یہ ڈولی بڑے استاد پریم بابو کی بیٹی ہے اور ہمارا پریم والا ہی معاملہ ہے، دیکھ اب تو میرا شاگرد ہی نہیں، میرا دوست اور ہمراز بھی ہے، استاد کو کچھ نہ بتلانا، اور ہاں! تجھے جو چیز کھانی ہو، سینما دیکھنا ہو یا کوئی عیاشی کرنی ہو مجھے بغیر تکلف کے بتا دینا اور میں ہر اتوار کو تیری خوب عیاشی کراؤں گا۔ اس دن دکان پر بس میں اکیلا ہوتا ہوں، اور اب تو ہوگا"۔ اس نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

"ملائم سنگھ کہاں ہوتا ہے؟"

"ابے! یہ اکثر اپنے علاقے میرٹھ، ہفتے کی شام کو چلا جاتا ہے"۔ میرے سوال کے جواب میں راجو نے بتایا۔

ہم جب کھانا لے کر دکان پر پہنچے تو ملائم سنگھ نے راجو کے ہاتھ سے سالن لے کر چمچے کی مدد سے سب کی کٹوریوں میں کڑھی ڈالی۔ بعد میں راجو نے سب کے آگے روٹی رکھی اور کھانے کے بعد بڑے استاد نے ہاضمے کے لیے، ہم سب کو گڑ کی چھوٹی چھوٹی ڈلیاں دیں، پھر راجو نے سب کے برتن دھوئے اور پھر وہ مجھے دکان کے اوپری حصے میں لے گیا، جہاں اس نے نئی سلی ہوئی پینٹوں، قمیضوں کو بٹن لگانے شروع کر دیئے تھے..... اس نے مجھے سب سے پہلے سوئی میں دھاگہ ڈالنا سکھلایا تھا۔ بٹنوں کے نمبر، رنگ اور اسی طرح دھاگوں کی مختلف ساختوں اور رنگوں کی جانچ کروائی تھی۔

"اوئے راجو حرام زادے، تیز تیز ہاتھ چلا؟" اچانک ہی بڑے استاد نے نیچے سے چلاتے ہوئے کہا۔ یہ آواز سن کر میں نے بھی بڑے بڑے ٹانکوں سے پینٹوں اور قمیضوں میں بٹن ٹانکنے شروع کر دیئے تھے۔

رات کو دکان بن ہونے سے پہلے راجو نے، جب بٹن لگی پینٹیں اور شرٹیں استاد کو دی تھیں تو اس نے ایک زوردار تھپڑ راجو کے منہ پر مارتے ہوئے کہا تھا۔

"حرام زادے، اتنے بھونڈے طریقے سے تو نے انہیں ٹانکا ہے"۔

"استاد جی! یہ بٹن تو!" ملائم سنگھ نے ڈرتے ڈرتے بتانا چاہا تھا کہ..... وہ بٹن راجو نے نہیں میں نے لگائے تھے۔

"تو چپ کر، اس کی وکالت مت کر"۔ بڑے استاد کی ڈانٹ سن کر ملائم سنگھ بے چارہ سہم کر رہ گیا تھا۔

"رات ہوئی تو میں نے راجو سے پوچھا۔" استاد آپ سے بہت برے طریقے سے پیش آتا ہے اور آپ کو ہر بات پر ڈانٹتا اور حرام زادہ کہتا رہتا ہے اور آپ بڑے آرام سے سنتے رہتے ہیں۔ ایسا کیوں؟"

میرے سوال پر راجو ذرا دیر تو چپ رہا، پھر بڑے عجیب سے انداز میں بولا"۔ یار! میں ہوں تو حرام زادہ ہی نا؟"

"حرام زادہ؟ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں"۔ میں نے تجسس بھری نگاہ سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں یار! میں واقعی کسی کے گناہوں کا انجام ہوں، میری ماں مجھے، اس دکان کے قریب پڑے ہوئے کچرے کے ڈھیر میں پھینک گئی تھی۔ بڑے استاد نے مجھے شاید مجھے یہ سوچ کر اس کچرے کے ڈھیر میں سے اٹھایا تھا کہ ثواب کے ساتھ، میں ساری زندگی اس کی غلامی بھی کروں

گا اور اب وہ مجھے ہر روز، ہر قدم پر، حرام زادہ کے طعنے دے کر سب کے سامنے میرا ٹیم باندھتا رہتا ہے اور میں یہ سب کچھ ہر یلا گھونٹ سمجھ کر پی لیتا ہوں"۔

☆.....☆

دکان بند ہونے سے پہلے راجو دکان کی صفائی کرتا اور صبح تڑکے وہ پہلے اس میں جھاڑو دیتا اور پھر بڑے استاد پریم بابو کے گھر جا کر ان کے برتن کپڑے دھو کر سارے گھر کی صفائی کرتا اور جب کام زیادہ ہوتا تو میں اس کے ساتھ اس کی مدد کے لئے چلا جاتا تھا۔ اس دوران جو بات مجھے کھٹکتی تھی، وہ یہ تھی کہ راجو اور ڈولی آپس میں اشاروں کی صورت میں نہ جانے کیا کیا باتیں کرتے تھے! ڈولی شکل وصورت سے بہت معصوم لگتی تھی لیکن اندر سے وہ بہت گھنی اور پوری تھی۔ میں نے کئی بار راجو کو کریدنے کی کوشش کی تھی کہ..... "ڈولی اور اس کے بیچ کی پریم کہانی کا انجام کیا ہوگا؟"

"تم اپنے کام سے کام رکھا کرو"۔ یہ کہہ کر اس نے مسکراتے ہوئے مجھے آنکھ ماری تھی۔

راجو مجھے اتوار کے روز خوب کھٹا میٹھا کھلانے کے ساتھ ساتھ کوئی نہ کوئی فلم بھی ضرور دکھاتا تھا۔ میرے، یہ مزے دیکھ کر اب ملائم سنگھ نے بھی چھٹی پر گھر جانا چھوڑ دیا تھا..... اور پھر اسی دوران میں ایک بڑی عجیب سی بات ہونے لگی تھی..... وہ یہ کہ جب ہم رات کو مچان پر سو جاتے تو راجو رات کے دوسرے پہر اٹھ کر اکڑوں بیٹھ کر کوئی بھجن جیسی چیز پڑھنا شروع کر دیتا تھا اور اس دوران میں اس کے ماتھے پر پسینہ اس طرح رواں ہوتا تھا جیسے وہ تیز بارش میں کہیں سے بھاگ کر آیا ہو..... میں نے اور ملائم سنگھ نے جب اس کے بارے میں راجو سے استفسار کیا تو اس نے کہا۔

"یار! یہ میرا ذاتی معاملہ ہے، تم بس اپنے کام سے کام رکھو اور مجھ سے کھاتے پیتے اور سینما دیکھتے رہو"۔

راجو اب ہم دونوں کو اتوار کے دن خاص طور پر امرتسر کی دودھ سے بنی اشیاء کی مارکیٹ میں لے جاتا تھا اور ہمیں کہتا..... تم دونوں کا جو دل کرے کھاؤ پیئو، اس کا بل میں دوں گا"۔ اور پھر وہ ہمیں وہاں بٹھا کر ایک ڈیڑھ گھنٹے کے لیے مارکیٹ کے اوپر بنی دکانوں میں بقول اس کے کسی دوست کے پاس چلا جاتا تھا۔

ایک اتوار کے دن وہ ہم دونوں کو اس مارکیٹ میں بیٹھا کر ایسا گیا کہ..... دو گھنٹے تک اس کی واپسی نہ ہوئی اور جب کافی دیر ہو گئی تو ملائم سنگھ نے خاصے تشویش زدہ لہجے میں مجھ سے کہا۔ "یار تو ذرا راجو کو دیکھ کر آ"۔

راجو نے ہمیں تاکید کی تھی کہ "میں خود نیچے آؤں گا، تم اوپر نہ آنا، لیکن میں مجبوراً اسے دیکھنے کے لیے جب مارکیٹ کی سیڑھیاں پھلانگ کر اوپر گیا تو وہاں میں نے ایک دکان کے باہر بیٹھے لڑکے سے پوچھا..... "تم نے اس حلیے کا کوئی لڑکا یہاں نہیں دیکھا!"

اس نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے بتایا کہ..... "وہ لڑکا دو کمرے چھوڑ کر ایک بنگالی عامل کے آستانے نما کمرے میں گیا ہے۔"

میں جب اس بنگالی عامل کے کمرے کے پاس پہنچا تو اتفاق سے اس کا دروازہ مکمل بند نہ تھا، بس صرف بھڑا ہوا تھا، میں نے جب اسے اپنے ہاتھوں کی مدد سے دھکیلا تھا تو اندر سے آنے والی شدید بدبو میرے نتھنوں سے ٹکرائی، ایسی بدبو غلاظت سے بھرے گٹر کے کھلنے سے آتی ہے۔

میں اندر گیا تو اس کمرے سے ملحقہ کمرے میں راجو، سخت سردی میں بھی کپڑے اتارے آنکھیں بند کیے زور زور سے کچھ پڑھ رہا تھا اور ایک سوکھا سا بنگالی بڈھا، نیم برہنہ اپنے ہاتھ میں پکڑی جھاڑو راجو کے جسم پر کچھ پڑھتے ہوئے مسلسل پھیر رہا تھا۔ اس منظر کو دیکھ کر میری سانسیں اوپر کی اوپر، نیچے کی نیچے رہ گئیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ وہ پر اسرار منظر دیکھ کر میری ہمت ہی نہ ہوئی کہ..... میں راجو کو پکارتا یا بلاتا۔ میں نے راجو کا پردہ رکھنے کی خاطر ملائم سنگھ کو کچھ نہ بتایا، بس یہ کہا کہ..... "وہ ابھی آ جائے گا"۔

"یار، میں تو ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں تو بیٹھا راجو کا انتظار کرتا رہ!" یہ کہہ کر ملائم سنگھ وہاں سے چلا گیا۔

راجو تھوڑی دیر بعد بالکل نارمل انداز میں ہی آیا اور اس نے سب سے پہلے ملائم سنگھ کے بارے میں پوچھا

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

......میں نے اسے بتایا کہ ملائم سنگھ کو ایک ضروری کام تھا لہٰذا وہ چلا گیا۔

راجو نے مجھ سے کہا...... تو نے کچھ اور کھانا ہے تو کھا لے لیکن میں نے فوراً ہی انکار کر دیا...... "نہیں میرا موڈ نہیں ہے!"

"اچھا تو پھر آ میرے ساتھ، میں نے پرندوں کی دکان سے ایک چڑیا لینی ہے"۔

پھر ایک پرندے کی دکان سے راجو نے ایک کالی چڑیا خریدی اور اس کے پنجے میں دھاگہ باندھ کر اسے اپنی جیب میں ڈالتے ہوئے مجھ سے کہا...... "تو پریم کے بارے میں اس چڑیا کو کچھ نہ بتلانا"۔

گھر واپسی سے پہلے اس نے مجھے زبردستی بازار سے زعفرانی زردہ کھلایا تھا اور مجھے سمجھانے والے انداز میں بولا۔ "تو مایا دیوی کو یہ نہیں بتلانا کہ ہم نے بازار سے کھانا کھا لیا ہے۔ وہاں وہ جو کچھ کھانے کو دیں گی، بے شک دو تین نوالے ہی سہی مگر کھا لینا"۔

مایا دیوی نے جب مجھے اور راجو کو گھر میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تو انہوں نے چلا کر راجو کو مخاطب کیا "تو کہاں مر گیا تھا' حرام خور' چل اس لڑکے کے ساتھ مل کر چھت کی صفائی کر"۔

میں نے اور راجو نے مل کر چھت کی صفائی کی لیکن مایا دیوی نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ ڈھیرے سارے اور بھی کام کروائے۔ میری تو پانی کی بالٹیاں اٹھاتے اٹھاتے کمر دکھ گئی تھی۔ اس دوران میں گھر کی ڈیوڑھی پر ڈولی اور راجو کے درمیان اشارتی باتوں کا تبادلہ بھی ہوتا تھا اور ڈولی نے راجو کے کان میں کوئی ایسی بات کہی کہ میرے سامنے ہی راجو نے ڈولی کے گال کو چوم لیا تھا اور وہ مسکرا کر گھر کے اندر چلی گئی تھی۔

ہم جب دکان پر پہنچے تھے تو ملائم سنگھ سو رہا تھا۔ راجو نے اپنی جیب سے ادھ مری چڑیا نکالی اور اسے ایک ڈبے میں ڈال کر اس کا ڈھکن بند کر دیا لیکن اس سے پہلے وہ اس ڈبے میں دو تین چھوٹے چھوٹے سوراخ کرنا نہیں بھولا تھا۔

وہ آدھی رات کا وقت ہوگا۔ جب اچانک ہی میری آنکھ کھل گئی تھی اور میں نے یہ دیکھا کہ...... راجو بلی جیسی چال چلتا ہوا چڑیا کے ڈبے کی جانب بڑھا تھا۔ اسے وہاں سے اٹھا کر دکان کی چھت کی طرف جاتی سیڑھیوں پر چڑھ گیا، مجھے اس کی یہ حرکت بہت عجیب اور پراسرار لگی تو میں نے فوراً ہی ملائم سنگھ کو جھنجوڑ کر اٹھایا اور اسے ساری بات بتائی۔

تھوڑے سے توقف اور سوچ و بچار کے بعد ہم دونوں نے یہ فیصلہ کیا کہ چھت پر جا کر دیکھتے ہیں کہ راجو وہاں کر کیا رہا ہے؟...... اور پھر جب ہم چھت پر دبے پاؤں پہنچے تو ہم نے دیکھا...... سخت سردی میں اس نے اپنی قمیض اتاری ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ آسمان کی طرف منہ کیے کوئی منتر پڑھ رہا تھا جبکہ اس بے چاری چڑیا کے پاؤں دھاگے سے بندھے ہوئے تھے اور اس کے جسم میں چند سوئیاں چبھی ہوئی تھیں، جن سے خون رس رہا تھا اور وہ شدید تکلیف کا شکار ہو کر تڑپ رہی تھی۔ ملائم سنگھ میرے کندھے کے پیچھے چھپا، سردی اور خوف سے کانپ رہا تھا...... یہ منظر دیکھ کر ہم نیچے اتر آئے۔

نیچے آنے کے بعد ملائم سنگھ کا خیال تھا کہ...... ہمیں بڑے استاد پریم بابو کو راجو کی ان پراسرار حرکتوں کے بارے میں بتا دینا چاہیے لیکن میں نے ملائم سنگھ سے کہا...... یہ راجو کا ذاتی فعل ہے، ہمارے ساتھ تو وہ اچھا ہے، ہمیں تو وہ کوئی نقصان نہیں دے رہا!" یوں یہ بات ہم نے اپنے آپ تک محدود کر لی تھی۔

☆......☆

اس روز معمول کے مطابق ہم سب صبح چھ بجے اٹھے تھے، راجو نے سب سے پہلے بڑے استاد پریم بابو کے گھر جا کر مایا دیوی کے حکم کے مطابق صفائی وغیرہ کی اور پھر وہاں سے آ کر دکان کھولی۔ پریم بابو کی دکان پر آمد اپنے وقت کے مطابق ہوتی تھی اور انہوں نے آنے کے ساتھ ہی راجو کو گالیاں دینا شروع کر دی تھیں۔ پہلے تو ہمیں کچھ نہیں آئی تھی کہ کیا ماجرا ہوا ہے!...... بعد میں پتا چلا تھا کہ...... جب صبح ان کے گھر صفائی کے لیے گیا تھا تو مایا

دیوی نے اسے گھر کی صفائی کے بعد کہا تھا کہ...... وہ باہر گندی نالی کی صفائی بھی کرے...... لیکن راجو نے یہ کہہ کر اس کام سے انکار کر دیا تھا کہ...... "میں بھنگی چوہڑا نہیں ہوں، جو گندی نالیوں میں اتروں اور صفائی کروں"۔

"جا تو ابھی گھر جا اور نالی کی صفائی کر کے آ"۔ پریم بابو نے حکم دیا۔

"نہیں میں یہ کام نہیں کر سکتا"۔ راجو نے فوراً ہی انکار کر دیا۔

"حرام زادے تیرا باپ بھی یہ کام کرے گا!"

"کون سا باپ؟" راجو نے طنزیہ ہنسی ہنستے ہوئے کہا ......اور پھر جب دونوں کے درمیان بات بہت زیادہ بڑھ گئی تو پریم بابو نے دکان پر پڑی، جھاڑو اٹھا کر راجو کو بے دردی سے مارنا پیٹنا شروع کر دیا۔

"نہیں کروں گا، نہیں کروں گا"۔ راجو نے باغیانہ انداز اپناتے ہوئے چلانا شروع کر دیا اور پھر ایک وقت ایسا بھی آیا جب پریم بابو نے بار بار اسے حرام زادہ کہنا شروع کر دیا تو راجو نے بڑے استاد کا ہاتھ پکڑ کر، جھٹکتے ہوئے کہا

"اب بہت ہو گئی، جا میں تجھے، حرام زادہ ہی بن کر دکھلاؤں گا"۔

"تو حرام زادہ بن کر کیا دکھلائے گا تو تو ہے ہی حرام زادہ!"

پریم بابو کی یہ بات سن کر راجو نے غصے کے عالم میں دکان کی دہلیز پر تھوکتے ہوئے کہا...... "اب میں زندگی بھر اس دکان میں قدم نہیں رکھوں گا"۔

"چل دفع ہو یہاں سے"۔ پریم بابو نے غصے سے اسے لات مارتے ہوئے کہا۔

"میں تجھے اب حرام زادہ ہی بن کر دکھلاؤں گا"۔ راجو یہ جملہ کہہ کر چلا گیا۔

صبح سے دوپہر ہو گئی تھی۔ راجو دکان سے جو ناراض ہو کر گیا تو واپس نہ آیا، پریم بابو بڑی لاپرواہی سے اپنے کام میں مصروف رہے...... اور پھر گھر سے دوپہر کا کھانا لانے کی ڈیوٹی انہوں نے میری لگا دی تھی اور جب میں مایا دیوی کے پاس کھانا لینے پہنچا تو انہوں نے مجھ سے کہا۔

"پہلے تو باہر کی نالی صاف کرے گا"۔

میں نے کہا۔ "آپ مجھ سے جو مرضی کام کروالیں، لیکن میں باہر کی گندی نالی ہرگز صاف نہ کروں گا"۔

"جا تو بھی راجو کے ساتھ مر جا"۔ یہ کہہ کر انہوں نے میرے گال پر تھپڑ رسید کر دیا، سچی بات ہے کہ میرے دل سے ان کے لیے بہت بددعا نکلی تھی' اس دوران میں، میں نے ڈولی کی طرف دیکھا، وہ خاموشی سے مجھے اس طرح گھور رہی تھی جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہ رہی ہو لیکن اپنی ماں کی موجودگی کی وجہ سے کچھ بول نہیں پائی۔

دو دن ہو گئے تھے پر راجو کا کچھ پتا نہ چلا تھا کہ وہ کہاں گیا، استاد نٹو رلعل اور استاد تلمند نے پریم بابو سے کہا کہ وہ راجو کو تلاش کرنا چاہتے ہیں مگر انہوں نے بڑی بدتمیزی سے ان دونوں کو ڈانٹتے ہوئے کہا...... آ جائے گا، آ جائے گا حرام زادہ، حرام خور، اسے میرے سوا اپنے پاس رکھے گا بھی کون؟"

تیسرے روز اتوار تھا۔ میں نے اور ملائم سنگھ نے دکان بند ہونے کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور راجو کو ادھر اُدھر خوب تلاش کیا لیکن اس کا کہیں بھی پتا نہ چلا تھا ہی حقیقی بات ہے کہ ہم راجو کے بغیر اداس ہو گئے تھے اور ہی بات بھی اپنی جگہ سچی تھی کہ ہماری زبان بھی پھیکی پڑ گئی تھی کیونکہ وہ ہمیں کھٹا میٹھا جو کھلاتا رہتا تھا۔ خیر، ہم راجو کو یاد کرتے اس کی باتیں کرتے ہوئے سو گئے تھے۔

رات کے تیسرے پہر اچانک ہی دکان کا دروازہ دھڑ دھڑانے کی خوفناک آوازوں سے لرزنے لگا...... "ملائم سنگھ، طاہر علی، دروازہ کھول!" یہ تو پریم بابو کی آواز تھی...... ہم گھبرا کر مچان سے نیچے آ گئے۔

"اس وقت مالک کیسے آ گیا؟ ایسے تو وہ کبھی نہیں آیا۔" ہمارے دل میں کئی اندیشے کوندنے لگے تھے، اب پریم بابو کی آواز کے ساتھ ہی کچھ اور کرخت آوازیں بھی آنے لگی تھیں۔

ملائم سنگھ نے دکان کا دروازہ کھولا تھا تو سامنے پریم بابو بہت گھبرائے ہوئے اور ان کے ساتھ چند آدمی

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk
Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

کرخت شکل روایتی پولیس والے بھی کھڑے تھے۔

"استاد جی کیا ہوا؟" میں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

"وہ..... وہ..... راجو ڈولی کو بھگا کر، نہیں نہیں، اغوا کر کے لے گیا ہے۔" پریم بابو کے منہ سے یہ سن کر تو ہمارے پاؤں سے جیسے زمین نکل گئی۔

"مگر وہ یہاں تو نہیں ہے"۔ میں نے ڈرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"راجو کہاں چھپا ہوا ہے؟ تم دونوں کو بخوبی معلوم ہے کیونکہ تم دونوں کا اس کے ساتھ چوبیس گھنٹے کا اٹھنا بیٹھنا تھا"۔ ایک سپاہی نے نہایت ہی سخت لہجے میں کہا۔

"ہمیں نہیں معلوم کہ راجو کہاں ہے اور.....!"

چلو تھانے جب دونوں کی پچھاڑیوں پر ڈنڈے پڑیں گے تو سب بتا دو گے"۔ دوسرے سپاہی نے ہماری بات کاٹ کر کہا پھر وہ دونوں سپاہی ہم دونوں کو مارتے اور گھسیٹتے ہوئے قریبی تھانے لے گئے۔ وہاں ایک سپاہی بہت موٹا سا ڈنڈا پکڑے کھڑا تھا۔ جب سپاہیوں نے ہم دونوں کو انسپکٹر کالی داس کے سامنے پیش کیا تھا تو اس نے ایک لمحے کے لیے ہمارا سرسری جائزہ لیا اور پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔

"سنا ہے تیری اور راجو کی بڑی دانت کاٹی دوستی تھی، وہ تیرا استاد ہی نہیں بلکہ ہم راز بھی تھا، سچ سچ بتلا دے کہ وہ لونڈیا کو لے کر کہاں چھپا ہوا ہے؟" اور پھر اس نے تڑاخ سے ایک ایسا زوردار تھپڑ میرے گال پر رسید کیا کہ میری آنکھوں سے پانی رواں ہو گیا۔

"مجھے کچھ نہیں معلوم صاحب جی!" میں نے روتے ہوئے اس کے آگے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

میری شامت لانے کے بعد، کالی داس نے اپنی توجہ ملائم سنگھ کی طرف مبذول کرتے ہوئے کہا۔ "تجھے دیکھ کر تو لگتا ہے کہ ابھی تازہ تازہ جوان ہوا ہے، ویسے بھی تو اپنے نام کی طرح ملائم اور نازک ہے، میں نہیں چاہتا کہ تیرے ساتھ کوئی سختی ہو، سچ سچ بتا دے راجو کہاں ہے؟"

ملائم سنگھ بے چارے نے بھی وہی جواب دیا تھا، جو میں نے دیا تھا۔ "مجھے کچھ معلوم نہیں صاحب"۔

اچھا تم دونوں یہ تو بتلاؤ کہ وہ بے غیرت کتا راجو جو اپنے مالک کو ہی کاٹ کر بھاگ گیا ہے، کہاں کہاں جاتا تھا؟ اور کیا کیا کرتا تھا؟"

راجو جو بھی تھا، جیسا بھی تھا، وہ تھا تو ہمارا محسن، ہمیں کھلاتا پلاتا تھا، ہمارا خیال رکھتا تھا، ہمیں بھی اس سے ایک ہمدردی تھی، اس لیے ہم اس کے بارے میں جتنا بھی جانتے تھے، وہ پولیس سے آخری حد تک چھپانا چاہتے تھے۔ سو شروع شروع میں تو ملائم سنگھ..... پولیس والوں کے تھپڑ، لاتیں اور ڈنڈے کھاتا رہا، لیکن جب اس بے چارے کو دونوں پولیس والے تھانے دار کے اشارے پر جسمانی اذیت دینے والے کمرے میں لے گئے تو وہاں اس بے چارے کی اذیت ناک چیخیں گونجنے لگیں۔ "بتلاتا ہوں، مجھے اس کے بارے میں جتنا علم ہے، بتلاتا ہوں"۔

"ہاں، ہاں، جو معلوم ہے، زبان سے پھوٹ!" تھانیدار نے اپنے ہاتھوں میں پکڑے ڈنڈے کو اس کی ٹھوڑی پر رکھتے ہوئے کہا تھا۔

"جی! وہ رات کو اٹھ کر چھت پر جا کے کوئی پراسرار جادوئی عمل کیا کرتا تھا اور چڑیا کو سوئیاں چبھو کر اسے اذیت دے کر نہ جانے اس کے ذریعے کیا منتر پڑھا کرتا تھا"۔ یہ سب بتاتے ہوئے ملائم سنگھ کے ہونٹوں اور ناک سے خون نکل رہا تھا۔

"اور بھی کچھ بتلا اس کے بارے میں؟" تھانیدار کی چنگھاڑ کمرے میں گونجی تھی۔

تھانیدار صاحب! مجھے جو معلوم تھا، میں نے آپ کو بتلا دیا ہے۔ اس سے آگے اور کچھ مجھے معلوم نہیں"۔ ملائم سنگھ نے روتے اور ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

"اور تو راجو کے بارے میں اور کیا کچھ جانتا ہے؟ وہ کہاں کہاں جاتا تھا اور ڈولی کے بارے میں تیرے سے کیا کیا باتیں کرتا تھا؟" تھانیدار نے میرے کانوں کو اپنے ہاتھوں سے مروڑتے ہوئے پوچھا۔ درد سے میری چیخیں نکل گئی تھیں۔ اوپر سے دونوں سپاہیوں نے میرے کولہوں اور کمر کو اپنے ڈنڈوں سے پیٹنا شروع کر دیا تھا..... اور

جب درد تکلیف میری برداشت سے باہر ہو گئی تھی تو..... میں نے مجبوراً انہیں سب کچھ بتلا دیا جو کہ میں نے راجو اور ڈولی کے درمیان دیکھا تھا اور ساتھ ساتھ بنگالی عامل کے ٹھکانے پر میں نے جو پراسرار حرکت دیکھی تھی، اس کا ذکر بھی تھانے دار کے سامنے کر دیا۔

"ابے یہ چڑیا کو زخمی کر کے منتر پڑھنا اور بقول اس چھٹکے کے راجو کسی بنگالی عامل کے پاس جا کر پیٹ کے بل لیٹ کے برہنہ بدن کوئی عمل پڑھتا تھا۔ یہ سارا ڈرامہ، سچی بات ہے مجھے تو سمجھ نہیں آ رہا، لگتا ہے یہ دونوں اس واردات کی گتھیاں سلجھانے میں میری مدد نہیں کر رہے، الٹا الجھا رہے ہیں، مجھے تو ان دونوں کی ڈولی کے اغواء میں راجو کے ساتھ معاونت کی بو صاف محسوس ہو رہی ہے"۔ تھانیدار نے اپنے ماتھے پر شکنیں بڑھاتے ہوئے کہا تھا۔

"نہیں صاحب جی! ہم دونوں بالکل بے قصور ہیں اور ہمیں کچھ نہیں معلوم کہ راجو اور ڈولی کہاں گئے ہیں!" ہم دونوں نے آنے والے وقت کے خیال سے لرزتے ہوئے کہا..... اور مدد طلب نظروں سے پریم بابو کو دیکھا مگر انہوں نے اپنی آنکھیں ماتھے پر رکھتے ہوئے تھانیدار سے کہا۔

"میری بیٹی کو وہ کمینہ اغواء کر کے لے گیا ہے اور یہ دونوں اس کے پکے رازدار ہیں، ان دونوں کو خوب مار لگاؤ تا کہ یہ بتلا دیں کہ وہ ڈولی کو لے کر کہاں چھپا ہوا ہے؟"

ہم دونوں نے ہزار ہاتھ جوڑ کر تھانیدار کے پاؤں پڑ کر اسے یقین دلانے کی کوشش کی تھی..... ہم راجو کے اس جرم میں شامل نہیں ہیں لیکن وہ ہماری کسی بات پر یقین کرنے کو تیار نہ تھا..... اس نے ہمارے ہاتھوں میں ہتھکڑی پہنا دی..... اور مجھے بنگالی عامل کے ٹھکانے پر چلنے کو کہا لیکن وہاں جا کر پتا چلا کہ وہ چند روز قبل اپنا ٹھکانا چھوڑ کر جا چکا ہے..... اب تو ہماری اور بھی شامت آ جانی تھی لیکن شاید قسمت اچھی تھی کہ دوسرے دن پولیس کے مخبروں نے اطلاع دی تھی کہ راجو جالندھر شہر میں کسی بنگالی شخص کے ساتھ رہ رہا ہے۔

تھانیدار کو اس بات کا یقین تھا کہ..... یہ وہی بنگالی عامل ہے، جس کے پاس وہ جایا کرتا تھا، اس خبر کے ملنے سے پولیس کو ڈولی کے ملنے کی نہ صرف امید بڑھی تھی بلکہ پریم بابو کو بھی بڑی ڈھارس ملی تھی۔ بہر حال پولیس کی خاصی بھاری نفری نے راجو کو گرفتار اور ڈولی کو بازیاب کرنے کے لیے اس بنگالی عامل کے گھر میں راجو اور اس کے علاوہ ایک نہایت کالی اور بدصورت لڑکی موجود تھی، جس کے چہرے پر چیچک کے بڑے بڑے، کراہیت انگیز دانے چمک رہے تھے، اس کے ساتھ اسی کی عمر کا اس کی طرح بالکل کالا سیاہ، سوکھا لکڑی کی مانند لڑکا بھی موجود تھا جو اس کے ساتھ ہی سہما ہوا کھڑا تھا۔

"تو کون ہے؟" تھانیدار نے اس لڑکی سے پوچھا۔

"جی! میں بنگالی عامل گوگیا کی بیٹی ہوں اور یہ میرا بھائی پورن ہے۔" اس وقت لڑکی کے جسم سے اتنی بدبو آ رہی تھی کہ وہاں تھانیدار کا کھڑا ہونا دوبھر ہو رہا تھا.....

راجو نے گرفتاری کے بعد تھانے میں یہ بیان دیا تھا کہ..... "میں نے پریم بابو کے ظلم و ستم اور حرام زادے کے مسلسل طعنوں سے تنگ آ کر، ان سے ہمیشہ کے لیے لاتعلقی اختیار کر لی ہے اور اپنے اس واقف کار بنگالی عامل کے پاس رہ رہا ہوں۔ اس میں بھلا کیا برائی اور غیر قانونی بات ہے۔ میں ڈولی کے اغواء یا اس کے گھر سے فرار ہونے کے بارے میں کچھ نہیں جانتا"۔..... جبکہ بنگالی عامل نے یہ بیان دیا تھا کہ..... "راجو میرا دوست ہے اور اپنے مالک اور اس کی بیوی کے ظلم و ستم سے جان چھڑا کر، میرے پاس آ گیا ہے، میں نے اسے، نہ صرف سہارا دیا ہے، بلکہ میں اس کی اپنی بیٹی سے سگائی بھی کر دوں گا"۔

تھانیدار نے راجو اور بنگالی عامل، دونوں کی خوب دھنائی کی تھی۔ انہیں ہر قسم کی اذیتیں دی تھیں اور انہیں بالآخر عدالت میں پیش کر کے، ریمانڈ بھی لے لیا تھا..... لیکن راجو اور عامل بنگالی اپنے مؤقف سے ٹس سے مس نہ ہوئے تھے۔

تھانیدار نے ان کے خلاف بہت مضبوط کیس بنایا تھا۔ میری اور ملائم سنگھ کی گواہیاں، پریم بابو اور مایا دیوی کے بیانات کے علاوہ کیس میں اور بھی بہت کچھ ڈالا تھا لیکن جب راجو اور عامل بنگالی کو عدالت میں پیش کیا گیا، تو وہاں

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

ان کے وکیل صفائی نے ثابت کردیا کہ..... راجو کا مالک اور مالکن اس کی ذات پر بے جا ظلم ڈھاتے تھے اور ڈولی کے اغواء یا بھاگنے میں، ان کا کوئی کردار نہیں ہے..... دوسری طرف استغاثہ عدالت میں زور دیتا رہا تھا..... کہ راجو اور اس عامل بنگالی نے جادو کے ذریعے ڈولی کو اغوا کیا ہے مگر گورے جج نے بہت طویل شنوائی اور پولیس کی بار بار انکوئریوں کی روشنی میں راجو اور عامل بنگالی کو بے گناہ قرار دیتے ہوئے الٹا تھانیدار کو ڈانٹا تھا کہ ہمارا قانون کسی جادو ٹونے کی حقیقت کو تسلیم نہیں کرتا۔

راجو اور عامل بنگالی کے باعزت عدالت سے بری ہونے کے بعد میری اور ملائم سنگھ کی بھی جان خلاصی ہوئی تھی ورنہ تو تھانیدار ہمیں آئے روز کسی نہ کسی انکوائری کے بہانے بلا لیتا تھا۔

مایا دیوی ڈولی کی گمشدگی کے صدمے کو نہ جھیل سکی اور مرگئی..... جبکہ پریم بابو امرتسر کی گلیوں میں ڈولی ڈولی پکارتا پاگلوں کی طرح پھرا کرتا تھا، اس کا کاروبار تباہ ہوگیا تھا اور درزی کی وہ مشہور دکان ایک چائے کے کھوکے میں تبدیل ہوگئی تھی۔

☆.....☆

یہ کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی ہے..... اس کا دوسرا اور حقیقی پس منظر، اس کتھا کو پڑھنے والوں کے لیے لازمی طور پر دلچسپی اور حیرت کا باعث بنے گا۔

ہوا یوں تھا کہ..... جب راجو اور بنگالی عامل عدالت سے باعزت بری ہوگئے تھے تو ملائم سنگھ واپس میرٹھ چلا گیا تھا جبکہ میرے بھائی نے مجھے ایک درزی کی دکان پر کام سیکھنے کے لیے بٹھا دیا تھا اور جب میں اپنے کام میں مشاق ہوگیا تو انہوں نے اس شہر میں اپنی ذاتی چھوٹی سی، درزی کی دکان کھلوا دی تھی۔

ایک دن میں اپنی دکان پر بیٹھا اپنے شاگرد کو کچھ کام سمجھا رہا تھا کہ اچانک ہی راجو اور ڈولی بہت خوش بہشاش بشاش نہایت شاندار کپڑے پہنے میرے سامنے آن کھڑے ہوئے تھے..... ان کی اس خلاف توقع اچانک آمد اور ڈولی کو راجو کے ساتھ دیکھ کر مارے گھبراہٹ کے میرے تو اوسان ہی خطا ہوگئے تھے۔

میرے یار! گھبرانے اور پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں راجو ہوں اور یہ میری بیوی ڈولی ہے" راجو نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"لیکن تمہاری شادی تو بنگالی عامل کی اس بدشکل لڑکی سے ہوئی تھی!!" میں نے کہا۔

"ارے، وہ بدشکل لڑکی اور یہ خوش شکل ڈولی کوئی علیحدہ علیحدہ لڑکیاں نہیں ہیں۔" راجو نے ایک معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ میری بات قطع کرتے ہوئے کہا۔ میں نے اپنے گرو بنگالی عامل سے ایسا عمل سیکھ لیا ہے کہ جس کی وجہ سے، جس شخص پر یہ عمل کیا جائے، اسے جب کوئی دوسرا شخص دیکھتا ہے تو اسے وہ دوسرا چہرا نظر آتا ہے جیسے تجھے اور پولیس کو، جو کالی بدشکل لڑکی نظر آرہی تھی، وہ اصل میں ڈولی ہی تھی، جسے صرف میں ہی اصل شکل میں دیکھ سکتا ہوں یا اب تو ہے، جو میری مرضی سے اس کا اصل روپ دیکھ رہا ہے"۔

راجو نے جاتے ہوئے مجھ سے اس بات پر معافی مانگی تھی کہ..... اس کی وجہ سے مجھے بہت پریشانی اٹھانی پڑی تھی..... اور ساتھ ہی یہ بھی کہا تھا کہ..... "پریم بابو مجھے ہمیشہ حرام زادہ کہا کرتا تھا؟..... اب دیکھو یہ ڈولی، یعنی اس کی بیٹی میرے ساتھ رہ رہی ہے..... اور میرے دو بچوں کی ماں بھی ہے!"

راجو کی یہ بات سن کر مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا..... لیکن اس سے زیادہ حیرت کے ساتھ خوف زدہ کر دینے والا جھٹکا تو مجھے اس وقت لگا تھا جب میں نے راجو کی اس بات پر ڈولی کو نہیں، بنگالی عامل کی اسی کالی بدصورت اور چیچک زدہ چہرے والی لڑکی کو مسکراتے دیکھا.....!!

قارئین..... ابوڑھے درزی نے تو اپنی منزل آنے سے پہلے یہ کہانی مکمل کردی تھی..... لیکن میں نے یہ عجیب کہانی لکھنے میں کئی برس لگا دیئے ہیں!!

اندھیرے کی آواز

ایس امتیاز احمد۔ کراچی

ایک نامعلوم جزیرے کی کہانی جس پر ایک ناقابل فہم مخلوق کی حکمرانی تھی، وہ مخلوق نہ کچھ کہتی اور کچھ سنتی تھی، بس آہستہ آہستہ غیر محسوس طور پر جاندار کو چاٹتی رہتی تھی اور اسے اپنے جیسا بنالیتی تھی۔

تاریکی کے ایک باسی کی کہانی جو کہ روشنی کا سامنا کرتے ہوئے گھبراتا تھا، پراسرار کہانی

وہ ایک تاریک رات تھی۔ ہم شمالی بحرالکاہل میں تھے۔ ہمارا جہاز کس مقام پر تھا یہ میں یقین سے نہیں بتا سکتا چونکہ ایک ہفتے کے اس تھکا دینے والے سفر کے دوران سورج اس دھند میں چھپا رہا تھا جو تاحد نگاہ چھائی ہوئی تھی۔ ہوا رکی ہوئی تھی اور میں وہ واحد شخص تھا جو عرشے پر کھڑا تھا۔ جہاز کا مختصر عملہ جو دو آدمیوں اور ایک لڑکے پر مشتمل تھا، نچلی منزل میں آرام کر رہا تھا۔

ان کے علاوہ آرتھر جو میرا دوست اور اس نجی جہاز کا مالک تھا وہ اپنے کیبن میں سو رہا تھا۔ اچانک جہاز کے اطراف میں پھیلی ہوئی تاریکی سے ایک آواز ابھری "ارے ہوت!"

یہ پکار اس قدر غیر متوقع تھی کہ شدت حیرت کے باعث میں فوری طور پر اس کا جواب نہ دے سکا۔ کسی نے دوبارہ صدا بلند کی۔ وہ عجیب طرح کی بیٹھی

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk
Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

ہوئی اور غیر انسانی آواز تھی جو گھٹا ٹوپ اندھیرے اور سناٹے میں بڑی پراسرار محسوس ہو رہی تھی۔

"ہیلو۔" میں نے کپکپاتی آواز میں کہا اور پھر اپنے حواس پر کچھ قابو پاتے ہوئے پوچھا۔ "تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟"

"تمہیں خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔" اس عجیب آواز نے جواب دیا۔ شاید اس نے میرے لہجے میں چھپے ہوئے خوف کو محسوس کر لیا تھا۔ وہی آواز پھر آئی۔ "میں ایک کمزور اور..... بوڑھا..... آدمی ہوں۔"

"تو تم جہاز کے قریب کیوں نہیں آتے؟" میں نے ذرا ترش لہجے میں کہا کیونکہ مجھے یہ بات پسند نہیں آئی کہ اس نے میری کمزوری کو بھانپ لیا تھا۔

"میں..... میں نہیں آ سکتا۔ میرا قریب آنا مناسب نہیں ہوگا۔" میں اس نادیدہ ہستی کی آواز جذبات سے مغلوب ہوگئی اور پھر خاموشی چھا گئی۔

"تمہارا کیا مطلب ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ "تمہارا قریب آنا کیوں مناسب نہیں ہوگا؟ تم کہاں ہو؟"

چند ثانیوں تک میں جواب کا انتظار کرتا رہا مگر وہ پراسرار آواز سنائی نہ دی۔ کسی انجانے خوف کے تحت میں نے جلدی سے اپنی دوربین اٹھائی اور دوسرے ہاتھ میں ٹارچ لے کر آرتھر کی کیبن پر دستک دی۔ یہ انتظار کیے بغیر کہ وہ باہر آئے میں واپس عرشے پر آیا اور سمندر کی عظیم وسعت میں اس سمت جہاں سے وہ آواز سنائی دی تھی ٹارچ سے روشنی پھینکی۔

جیسے ہی میں نے ایسا کیا، مجھے گھٹی گھٹی سی چیخ سنائی دی اور اس کے بعد میں نے چھپ چھپ کی آواز سنی جیسے کوئی جلدی جلدی چپو چلا رہا ہو۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ میں نے کیا دیکھا سوائے اس کے کہ سمندر میں جس جگہ میں نے روشنی پھینکی تھی، پانی پر کوئی چیز تھی جو اب وہاں سے غائب ہو چکی تھی۔

"تم کون ہو؟" میں نے چیخ کر کہا۔ "یہ کیا حماقت ہے؟"

مگر سوائے کشتی کھینچنے کی غیر واضح آواز کے کوئی اور آواز نہیں آئی۔

اس کے بعد مجھے آرتھر کی آواز سنائی دی جو کیبن سے نکل رہا تھا۔

"کیا بات ہے جارج؟"

"ذرا یہاں آؤ آرتھر۔"

"ہاں بتاؤ کیا بات ہے؟" وہ عرشے پر میرے قریب آ کر بولا۔

میں نے اسے چند لمحے قبل ہونے والے عجیب واقعہ کے بارے میں بتایا۔ اس نے مجھ سے کئی سوال کیے۔ اس کے بعد اس نے کچھ سوچا اور پھر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے چیخ کر کہا۔ "ارے ہوت کشتی والے۔"

جہاز کے اطراف میں پھیلی ہوئی تاریکی میں کہیں دور سے غیر واضح سا جواب آیا۔ میرے ساتھی نے دوبارہ اس نادیدہ کشتی راں کو آواز دی۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد ہمیں چپوؤں کی چھپ چھپ کی آواز قریب آتی سنائی دی۔ آرتھر نے اسے پھر پکارا۔

اس بار جواب واضح طور پر سنائی دیا۔

"آپ لوگ روشنی ہٹا لیں۔"

"میں ایسا نہیں کروں گا۔" میں بڑبڑایا لیکن آرتھر نے مجھ سے کہا کہ وہی کرو جو وہ آواز کہہ رہی ہے۔ میں نے بادل ناخواستہ فلیش لائٹ آف کر دی۔

"اب قریب آ جاؤ۔" آرتھر نے چلا کر کہا۔

اس کے بعد چپوؤں کی آواز باقاعدگی سے آتی رہی۔ پھر ہمارے جہاز سے تقریباً دس گز کے فاصلے پر اس نادیدہ کشتی راں نے اپنی کشتی روک لی۔ اس کا اندازہ یوں ہوا کہ چپوؤں کی آواز تھم گئی تھی۔

"کچھ اور قریب آ جاؤ۔" آرتھر نے کہا۔ "تمہیں اس جہاز پر کسی سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"وعدہ کرتے ہو نا کہ تم روشنی نہیں دکھاؤ گے؟"

"کیا بات ہے۔" میں پھٹ پڑا۔ "تم روشنی

سے اس قدر خوف زدہ کیوں ہو؟"

"چونکہ....." اس آواز نے کچھ کہنا چاہا مگر پھر خاموشی چھا گئی۔

"چونکہ کیا؟" میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔ آرتھر نے میرے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے مجھے غصے پر قابو پانے کا اشارہ کیا۔ اور پھر بولا۔ "تم ایک منٹ رکو اور مجھے اس سے بات کرنے دو۔"

آرتھر آواز کی سمت عرشے پر جھکتے ہوئے بولا۔ "دیکھو مسٹر یہ بڑی عجیب بات محسوس ہو رہی ہے کہ تم ہمارے پاس اس طرح آنا چاہتے ہو۔ اس وسیع سمندر میں جس پر دھند کی گہری چادر چھائی ہوئی ہے رات کے اس پہر تمہیں کس چیز کی تلاش ہے؟ ہم کیسے اعتبار کر لیں کہ تم ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤ گے؟ تمہیں روشنی پر اعتراض کیوں ہے؟"

جونہی میرے دوست نے اپنی بات مکمل کی، میں نے ایک بار پھر چپوؤں کی آواز سنی۔ اس کے بعد آواز آئی۔ مگر اب یہ آواز زیادہ فاصلے سے آ رہی تھی اور لہجہ میں بے حد مایوس اور دردناک تھا۔

"مجھے افسوس ہے ..... بے حد افسوس، میں تمہیں تکلیف نہ دیتا مگر میں بھوکا ہوں اور..... وہ بھی بھوکی ہے۔"

آواز تھم گئی اور پھر چپوؤں کی آواز دوبارہ آنے لگی۔ شاید وہ نادیدہ ہستی مایوس ہو کر واپس جا رہی تھی۔

"ٹھہرو۔" آرتھر چیخا۔ "میں نہیں چاہتا کہ تم واپس چلے جاؤ..... جہاز کے قریب آ جاؤ۔ گر تم روشنی پسند نہیں کرتے تو ہم روشنی نہیں کریں گے۔"

یہ کہہ کر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "ہے تو یہ بڑی عجیب سی بات لیکن میرا خیال ہے کہ یہ کوئی خوف زدہ ہونے والی بات بھی نہیں ہے؟"

اس کا لہجہ سوالیہ تھا اور میں نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ "ہاں تمہارا خیال درست معلوم ہوتا ہے۔ شاید اس غریب آدمی پر اس وسیع سمندر میں کوئی افتاد آ پڑی ہے اور وہ پاگل ہو گیا ہے۔"

چپوؤں کی آواز اب کافی قریب آ گئی تھی چند گز کے فاصلے پر چپوؤں کی آواز تھم گئی۔

"کیا اب بھی تم جہاز کے قریب آ کر ہم سے بات نہیں کرو گے؟" آرتھر نے کہا۔ "ہم نے فلیش لائٹ بھی رکھ دی ہے۔"

"میں..... میں نہیں آ سکتا۔" اس آواز نے جواب دیا۔ "میں قریب آنے کی ہمت نہیں کر سکتا اور نہ ہی میں اشیائے خوردنی کی قیمت ادا کر سکتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" آرتھر بولا۔ "تم جس قدر چاہو اشیائے خوردنی لے جا سکتے ہو۔"

"تم بہت اچھے ہو۔" اس آواز نے کہا۔ "خدا تمہیں اس کا صلہ دے۔" وہ پراسرار آواز بھرا گئی۔

"وہ خاتون۔" آرتھر نے اچانک کہا۔ "کیا وہ بھی۔"

"نہیں۔" نادیدہ ہستی نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "میں اسے جزیرے پر چھوڑ آیا ہوں۔"

"کون سا جزیرہ؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے اس کا نام معلوم نہیں ہے۔" اس آواز نے جواب دیا۔ "کاش میں اس جزیرے پر نہ۔" وہ آواز ایک بار پھر بھرا گئی۔

"کیا ہم کشتی بھیج کر اس خاتون کو یہاں بلوا لیں؟" آرتھر نے کہا۔

"نہیں!" نادیدہ ہستی نے پرزور لہجے میں کہا۔ "میرے خدا! بالکل نہیں۔"

پھر چند ثانیوں کی خاموشی کے بعد اس نے مزید کہا۔ "اپنی ضرورت کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں نے یہ جرأت کی ہے۔ مجھ سے اس کی اذیت دیکھی نہیں گئی؟"

"مجھے تمہاری مدد کر کے خوشی ہوگی۔" آرتھر نے کہا۔ "تم جو کوئی بھی ہو چند لمحے انتظار کرو، میں تمہارے لئے کچھ لے کر آتا ہوں۔"

وہ جتنی تیزی سے اپنے کیبن کی طرف گیا تھا۔ اتنی ہی تیزی سے واپس آ گیا۔ اس کے بازوؤں میں اشیائے خوردنی کے کئی ڈبے موجود تھے۔

"کیا تم یہاں آ کر یہ ڈبے نہیں لے سکتے؟"

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

آرتھر نے پوچھا۔

’’نہیں...... میں اس کی ہمت نہیں کرسکتا۔‘‘ اس نے جواب میں کہا اور میں نے اس آواز میں بے چارگی سی محسوس کی جیسے کوئی شخص اپنی شدید خواہش کو دبا رہا ہو۔ اس وقت میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ تاریکی میں چھپی ہوئی اس نادیدہ ہستی کو کھانے کے ان ڈبوں کی واقعی شدید ضرورت ہے جو آرتھر نے اپنے بازوؤں میں تھام رکھے ہیں مگر کسی ناقابل فہم خوف کی وجہ سے وہ ہمارے جہاز کے قریب آ کر انہیں حاصل نہیں کرسکتا۔

’’جارج تم لکڑی کا کوئی خالی ڈبہ لے آؤ۔‘‘ آرتھر نے کہا۔ ’’ہم یہ چیزیں اس میں رکھ کر اس کی کشتی کی طرف بہا دیتے ہیں۔‘‘

میں فوراً ہی ایک خالی ڈبہ لے آیا اور ہم نے اسے ایک تختے سے باندھ کر اس آواز کی سمت بہا دیا۔ چند ثانیوں بعد اس نادیدہ ہستی کی مسرت آمیز چیخ سنائی دی۔ ہمیں یہ اندازہ کرنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ اس نے اشیائے خوردنی سے لبریز وہ ڈبہ حاصل کرلیا ہے۔ اس کے بعد اس آواز نے ہمیں دعا دے کر خدا حافظ کہا پھر چپوؤں کی آواز سنائی دی جو بتدریج دور ہوتی چلی گئی۔

’’یہ شخص تو بہت جلد چلا گیا۔‘‘ آرتھر نے کہا۔ ’’ٹھہرو۔‘‘ میں نے جواب دیا۔ ’’میرا خیال ہے، یہ شخص لوٹ کر آئے گا۔ اسے یقینی طور پر خوراک کی دوبارہ ضرورت ہوگی۔‘‘

’’ہاں۔‘‘ میں نے جواب دیا۔ اور گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

وقت گزرتا رہا۔ ایک گھنٹہ، دو گھنٹے اور آرتھر بھی میرے ساتھ عرشے ہی پر کھڑا رہا۔ اس عجیب ایڈوانچر کے باعث اس کی نیند اڑ گئی تھی۔

تیسرے گھنٹے کے اختتام پر سمندر پر چھائے ہوئے اس پرہول سناٹے میں ہمیں ایک بار پھر چپوؤں کی آواز سنائی دی۔

’’سنو۔‘‘ آرتھر پرجوش لہجے میں بولا۔ ’’چپوؤں کی آواز قریب سے قریب تر ہوتی جارہی ہے۔ اسے واقعی خوراک کی سخت ضرورت تھی۔‘‘

چپوؤں کی آواز ایک بار پھر ہمارے جہاز سے چند گز کے فاصلے پر آ کر تھم گئی۔

’’ارے ہوت! جہاز والو۔‘‘ اس آواز نے کہا۔

’’کیا یہ تم ہی ہو؟‘‘ آرتھر نے پوچھا۔

’’ہاں۔ معاف کرنا میں اشیائے خوردنی حاصل کر کے فوراً ہی چلا گیا تھا لیکن...... لیکن یہ بہت ضروری تھا۔‘‘

’’اس خاتون کی وجہ سے؟‘‘ آرتھر نے پوچھا۔

’’ہاں۔ وہ خاتون اب آپ کی بے حد ممنون ہے۔ وہ جلد ہی جنت میں بھی آپ کی مزید شکر گزار ہوگی۔‘‘

’’یہ تو ہمارا فرض تھا۔‘‘ آرتھر نے کہا۔ ’’لیکن تم یہ......‘‘

’’میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ...... اپنے اس احسان کو یوں سرسری انداز میں تذکرہ نہ کریں۔‘‘

چند ثانیوں کے لئے خاموشی چھا گئی۔ میں حیرت اور ہمدردی کے جذبات سے مغلوب ہوکر کچھ نہ کہہ سکا۔

اس آواز نے سلسلہ کلام آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ’’میں نے اور میری بیوی نے گفتگو کی تھی...... اس آفت کے بارے میں جو ہم پر نازل ہوئی۔ ہم نے طے کیا تھا کہ...... ان ہولناک واقعات کا تذکرہ اپنی زندگی کے دوران کسی سے نہیں کریں گے، مگر آج رات کے واقعات کے بعد ہم نے یہ ارادہ بدل دیا۔ ہم نے یہ طے کیا کہ میں تمہیں ان مصائب کے بارے میں بتاؤں جن کا سامنا ہم اس وقت سے کر رہے ہیں جب سے...... جب سے۔‘‘

وہ آواز بھرا گئی۔

’’ہاں۔ ہاں تم بتاؤ تو سہی۔‘‘ آرتھر نے نرم لہجے میں کہا۔

’’جب سے گرین اسٹار ڈوبا۔‘‘

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

اسماء الحسنیٰ۔۔۔۔ کامیابی کا راستہ

آرزوئیں اس طرح بھی پوری ہوجایا کرتی ہیں

پریشانیوں سے چھٹکارہ

ہمارا ہر عمل دنیا کے ہر کونے میں اثر کرتا ہے

شادی کرنی ہو یا رکوانی ہو | جادو چلانا ہو یا ختم کرنا ہو

شوہر یا بیوی کی اصلاح | اولاد کا نہ ہونا یا ہوکر مرجانا

گھریلو ناچاقی | کاروباری بندش

جنات کا سایہ | دیگر مسائل

سید فرمان شاہ کا پیغام جو لوگ سوچتے رہتے ہیں۔ وہ ہمیشہ دکھی رہتے ہیں پلک جھپکنے سے پہلے کام علم جو بگڑے کام بنائے

ہر مشکل کا حل بذریعہ موکلات جس پریشانی کی وجہ سے آپ کی زندگی موت سے بھی بدتر ہوگئی ہو اور ہر عامل ناکام ہوگیا ہو ہم سے مشورہ ایک بار ضرور لیں عامل وہ جس علم سات سمندر پار چلے کالے و سفلی جادو ختم پتھر سے پتھر دل محبوب تابع ہوگا اولاد فرمان بردار خاوند سے بے رخی، بچوں کے اچھے رشتے اور کاروبار میں کامیابی وہ لوگ مایوس نہ ہوں بلکہ اپنی آخری امید سمجھ کر سید فرمان شاہ سے رابطہ کریں انشاء آپ محسوس کریں گے ایک فون کال نے ہماری زندگی بدل دی

سسرال میں بہو سب کی آنکھ کا تارا بن سکتی ہے ہر کام 100% رازداری کے ساتھ

کلام الٰہی سے ہر پریشانی کا حل پہلے تعویز سے آپکی اجڑی ہوئی زندگی میں بہار ایک فون کال پر آپ کے مسائل کا حل ایک فون کال پر

خواہش

زندگی کی کوئی بھی خواہش ہے کسی کو پانے کی تمنا اپنوں کی بے رخی سے دکھی ہیں یا میاں بیوی کی رنجش کو ختم کرنا ہے

غرض کوئی بھی جائز خواہش ہے تو پوری ہوگی انشاءاللہ

میں آپ سے ایک فون کال کی دوری پر موجود ہوں فون ملائیے اور آزمالیجئے

ایک بار ہمیں خدمت کا موقع دیں کامرانیاں آپ کے قدم چومیں گی اور آپ یقیناً بہترین اور خوشگوار زندگی کا لطف اٹھائیں گے۔

نوٹ: جو خواتین و حضرات خود نہیں آسکتے وہ گھر بیٹھے فون کریں اور ہم سے کام لیں انشاءاللہ کامیابی ہوگی۔

وہ علم ہی کیا جس میں اثر نہ۔ وہ آنکھیں کی کیا جن میں شرم نہ ہو۔ وہ علم ہی کیا جس عمل نہ ہو۔ وہ زبان ہی کیا جس میں اثر نہ ہو۔

سید فرمان شاہ

اچھرہ سٹاپ مین بازار اچھرہ لاہور پاکستان

0300-6484398

"ارے!" میں نادانستہ طور پر کیسے چیخ پڑا۔ "یہ جہاز تو چھ ماہ قبل نیو کیسل سے فرسکو کے لئے روانہ ہوا تھا اور اس کے بعد اس کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملی۔"

"ہاں۔" اس آواز نے جواب دیا۔ "اپنے سفر کے آغاز کے دوسرے ہی دن وہ جہاز شدید طوفان میں گھر گیا اور راستہ بھٹک گیا۔ طوفان کے ختم ہونے پر میں اپنی بیوی کے ساتھ نچلی منزل پر اپنے کیبن میں سامان کے جائزے کے لئے گیا۔ کچھ دیر بعد جب ہم لوٹ کر عرشے پر آئے تو مجھ پر یہ ہولناک انکشاف ہوا کہ جہاز کا عملہ ہمیں تنہا چھوڑ کر کشتیوں کے ذریعے فرار ہو گیا ہے۔ جہاز برباد ہو چکا تھا اور وہ کسی بھی لمحے ڈوب سکتا تھا۔ ان حالات کے باوجود ہم مایوس نہیں ہوئے ہم نے چند تختوں کو رسیوں سے باندھ کر ایک چھوٹی سی کشتی بنالی اور اس پر مختصر سا سامان رکھ کر اپنے آپ کو سمندر کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ دو گھنٹے کے سفر کے بعد وہ تباہ شدہ جہاز ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

دوسرے دن سمندر پر کہر کی گہری چادر چھا گئی۔ ہوا ساکت تھی اور ہماری یہ تختوں کی کشتی چار دن تک بہتی چلی گئی۔ ایک وقت تو ایسا آیا کہ طوفانی لہریں ہمیں ڈبونے پر تل گئیں۔ ہم اپنی سلامتی کی دعائیں مانگتے رہے۔ خدا خدا کر کے ہم ہموار سمندر..... میں داخل ہو گئے۔ لہروں کا شور اب بہت پیچھے رہ گیا تھا۔

ہم اس رات سکون سے سوئے۔ صبح جب ہماری آنکھ کھلی تو ہم نے سطح سمندر پر نمک ہی نمک دیکھا۔ سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔ کہر کی دبیز چادر کے باوجود جو سمندر پر اب تک چھائی ہوئی تھی۔ ہمیں ایک جہاز کا ہیولا دکھائی دیا۔ وہ ہم سے چند فٹ کے فاصلے پر تھا۔ ہم نے خدا کا شکر ادا کیا۔ ہم یہ سوچ رہے تھے کہ اب ہمارے مصائب ختم ہو گئے ہیں۔ ہم نے اپنے تختے کو جہاز کے بے حد قریب کرتے ہوئے چلا کر کہا کہ ہمیں بھی جہاز پر سوار کر لیا جائے مگر جہاز سے کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اب ہم جہاز کے بالکل قریب پہنچ چکے تھے۔ نیچے کی طرف پانی میں ایک رسی کو لٹکے ہوئے دیکھ کر میں نے اسے پکڑ لیا۔ اس رسی پر اور جہاز کے بیرونی حصے پر اسفنج نما سفید کائی جم گئی تھی جس کی وجہ سے مجھے کافی جدوجہد کرنا پڑی۔

آخر کار میں جنگلے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا اس کے بعد میں عرشے پر آ گیا۔ وہاں میں نے اس اسفنج نما سفید رنگ کی کائی کی ڈلیاں دیکھیں جن میں سے کچھ چند فٹ اونچی بھی تھیں۔ عرشے پر سناٹا طاری تھا۔ اس امکان کے پیش نظر کہ اندرونی کیبنوں میں کوئی ہو، میں نے چیخ چیخ کر ان کو متوجہ کرنا چاہا۔ مگر مجھے کوئی جواب نہ ملا۔ اس کے بعد میں نے جہاز کے اوپر اور نیچے کی منزلوں میں واقع تمام کیبن دیکھے مگر وہاں کوئی جاندار ہستی موجود نہیں تھی۔ اچانک مجھے شدید تنہائی کا احساس ہوا۔

میری بیوی اب تک اس تختے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ جہاز پر مجھے رسیوں کی بنی ہوئی سیڑھی مل گئی جسے میں نے نیچے لٹکا دیا۔ چند لمحے بعد میری بیوی بھی جہاز پر میرے ساتھ تھی۔

ہم دونوں نے مل کر جہاز کا ایک بار پھر جائزہ لیا مگر وہاں زندگی کے کوئی آثار نہیں تھے۔ تب میں نے اپنی بیوی کی توجہ کائی کے ان اسفنج نما ٹکڑوں کی طرف مبذول کرائی جو فرش پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے انہیں دیکھنے کے بعد کہا کہ وہ صاف کئے جا سکتے ہیں جہاز پر اشیائے خوردنی اور پانی کا کافی ذخیرہ موجود تھا۔ اس طرف سے بے فکر ہو کر ہم نے فرش کی صفائی کی تو تھک کر چور ہو گئے۔

بہر حال عرشے سے ہم ان ٹکڑوں کو صاف کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

رات کھانے کے بعد ہم سوئے تو صبح دیر سے جاگے۔ میری بیوی کی نگاہ فرش پر پڑی تو وہ حیرت سے چلا اٹھی وہ اسفنج نما ٹکڑے دوبارہ فرش پر اسی جگہ نمودار ہو گئے تھے۔ ہم نے ناشتے سے فارغ ہو کر جہاز کے اسٹور سے تیزاب کی بوتلیں تلاش کیں اور فرش کو دوبارہ اچھی طرح دھو دیا۔ ہم اس کے بعد کئی دن تک جہاز پر رہے۔ ہم خوش تھے کہ وہ عجیب سی چیز عرشے کے فرش سے غائب ہو گئی

تھی۔ مگر ہماری یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی۔

دسویں دن وہ اسفنج نما کائی کے ٹکڑے دوبارہ نمودار ہو گئے۔ اس بار ان کی تعداد پہلے سے بھی زیادہ تھی۔ شاید صاف کرنے سے ان کے جراثیم پھیل گئے تھے۔

دوسرے دن صبح جب ہم ناشتے سے فارغ ہوئے تو میری بیوی نے کہا۔ "جون ذرا کیبن میں چلو میں تمہیں ایک عجیب چیز دکھاؤں۔" جب میں اس کے ساتھ کیبن میں گیا تو اس نے اپنا تکیہ میرے سامنے کر دیا۔ اس پر بھی وہ عجیب سی اسفنج نما چیز نمودار ہو گئی تھی اور اس کا حجم چنے کی دال کے دانے کے برابر تھا۔ میں اسے دیکھ کر کانپ گیا۔ ہم دونوں نے جہاز کو فوراً چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا۔ ہم نے جلدی جلدی اپنا سامان اکٹھا کیا۔ ان میں سے بھی بعض چیزوں پر وہ منحوس شے نمودار ہو گئی تھی۔ میں نے وہ تمام چیزیں وہیں چھوڑ دیں۔

بہر حال اپنی محفوظ چیزوں کے علاوہ میں نے اشیائے خوردنی کے ڈبے لئے اور جہاز سے ایک چھوٹی سی کشتی کو پانی میں اتارنے کے بعد ہم دونوں ساحل کی طرف چل دیئے۔ جونہی ہم ساحل پر پہنچے ہم پر یہ بھیانک انکشاف ہوا کہ منحوس اسفنج نما چیز وہاں بھی پھیلی ہوئی ہے۔ لیکن کچھ دیر کی تلاش کے بعد ہمیں اس جزیرے پر زمین کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ایسا مل گیا جس پر وہ اسفنج نما چیز موجود نہیں تھی۔

میں تمہیں بتا نہیں سکتا کہ ہمیں یہ دیکھ کر کس قدر خوشی ہوئی تھی کہ اس جزیرے کا ایک حصہ تو ایسا ہے جو اس لعنتی چیز سے بالکل محفوظ ہے۔ میں نے ماریا کو وہیں چھوڑا اور جہاز پر دوبارہ جا کر کچھ اور کارآمد اشیاء لے آیا۔ ان میں ایک بادبان اور لکڑی کے تختے بھی تھے۔ جن کی مدد سے ہم نے وہاں رہنے کے لئے ایک ٹینٹ بنا لیا۔ اب ہمارے پاس ضرورت کی تمام چیزیں موجود تھیں۔ ہم نے اگلے چار ہفتے بڑے سکون سے گزارے۔ اپنی حسین بیوی کی رفاقت کے باعث وہ دن میری زندگی کے خوش گوار ترین دن بن گئے۔

ہاں، مجھے یاد آیا شاید میں نے تم سے یہ کہا تھا کہ میں ایک بوڑھا آدمی ہوں۔

بہر حال اب ہم ایک محفوظ مقام پر آ گئے تھے ایک دن ماریا کے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے پر اس اسفنج نما چیز کی نشوونما کے آثار ظاہر ہوئے۔ وہ ٹکڑا ایک چھوٹے سے تل کی مانند تھا۔ جب اس نے مجھے وہ جگہ دکھائی تو میں خوف سے کانپ گیا۔ ہم نے اسے صابن اور پانی سے صاف کیا۔ مگر اگلے دن وہ سفید سا لجلجا ٹکڑا دوبارہ اس کے انگوٹھے پر نمودار ہو گیا۔ کچھ دیر تک ہم خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر میں دوبارہ اس کی صفائی میں لگ گیا۔ جب میں اس کام میں مصروف تھا تو اچانک ماریا بولی۔ "یہ تمہارے چہرے پر بائیں کان کے قریب بالوں کے نیچے کیا چیز ہے ڈیئر؟"

میں نے چہرے پر انگلی گھماتے ہوئے اس جگہ کو تلاش کر لیا۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ میں خود بھی اس منحوس چیز کی زد میں آ گیا ہوں۔

"ہاں یہ چیز یہاں بھی آ گئی۔" میں نے تشکر آمیز لہجے میں کہا۔ "بہر حال پہلے میں تمہارے انگوٹھے سے تو اسے صاف کر لوں۔"

وہ مان گئی اور اس نے اس وقت تک میرے چہرے کو نہیں چھوا جب تک کہ وہ ٹکڑا اس کے انگوٹھے سے مکمل طور پر صاف نہ ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے بھی میرے چہرے سے اس ٹکڑے کو صاف کر دیا۔ ہمیں یہ صورت حال موت سے بھی زیادہ خطرناک محسوس ہونے لگی۔ ہم نے اس بات پر بھی غور کیا کہ ہم کشتی پر خوراک اور پانی کا ذخیرہ رکھ کر کہیں چلے جائیں مگر ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم اس وقت تک وہیں رکے رہیں جب تک کہ ہمیں اس مصیبت سے نجات نہ مل جائے۔ اس طرح تین ماہ گزر گئے۔ ہمارے چہرے پر اور جسم پر اس اسفنج نما چیز کی نشوونما کچھ اور زیادہ ہو گئی۔ اب ہمیں یہ احساس ہو گیا تھا کہ ہم تندرست لوگوں کے درمیان نہ رہ سکیں گے اور ہمیں شاید کئی سال اس جزیرے پر گزارنے پڑیں۔

ایک صبح جب میں جہاز کے اسٹور سے کھانے

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

کی مزید چیزیں لے کر لوٹا تو میں نے اپنی بیوی کو کچھ کھاتے ہوئے دیکھا۔

''ڈیئر یہ کیا ہے؟'' میں نے ساحل پر اترتے ہوئے اس سے پوچھا میری آواز سنتے ہی وہ خوف زدہ ہوگئی اور اس نے کوئی چیز زمین پر پھینک دی۔ میرے دل میں ایک اندیشے نے سر ابھارا اور میں نے دھڑکتے دل سے وہ چیز زمین سے اٹھالی۔ وہ اسی منحوس اسفنج نما چیز کا ٹکڑا تھا۔

''ڈیئر! مائی ڈیئر۔'' میں نے کہا اور پھر مزید کچھ نہ کہہ سکا۔ وہ میری آواز سن کر رونے لگی۔ کچھ دیر کے بعد جب جذبات کا طوفان تھما تو اس نے مجھے بتایا کہ خوراک کی کمی کے پیش نظر اس نے گزشتہ روز اس نئی چیز کو چکھا تھا جو اسے پسند آئی۔

میں نے اس سے وعدہ لیا کہ چاہے کتنی ہی بھوک لگے وہ اس منحوس چیز کو ہاتھ نہیں لگائے گی۔

وعدہ کرنے کے کچھ دیر بعد اس نے مجھے بتایا کہ اچانک اس کے دل میں اس چیز کو کھانے کی خواہش ابھر رہی ہے۔

اس نے بہرحال وعدہ نبھایا اور اس خواہش کو کچل دیا۔

اسی دن شام کو میں پریشانی کے عالم میں جزیرے کے اس حصے کی طرف نکل گیا جہاں وہ اسفنج نما چیز موجود تھی۔ اچانک کسی نے مجھے عقب سے پکارا۔ میں نے گھوم کر دیکھا تو حیران رہ گیا۔ انسانی قد کے برابر وہ اسفنج نما چیز حرکت کرتی ہوئی میرے بالکل قریب آ گئی تھی۔ اس کی ایک شاخ انسانی بازو کی طرح اٹھی اور میں نے اس کا لمس اپنے چہرے پر محسوس کیا۔ خوف سے میری چیخ نکل گئی اور میں وہاں سے بھاگ کر ہانپتا ہوا جزیرے کے اس محفوظ حصے کی طرف واپس آ گیا۔ جہاں میری بیوی میرا انتظار کر رہی تھی۔

وہاں پہنچ کر میں نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری تو کچھ مٹھاس سی محسوس ہوئی۔ کسی غیر انسانی خواہش کے تحت میں اپنے ہونٹوں کو چاٹنے لگا۔ میری بیوی ٹینٹ کے پاس کھڑی ہوئی مجھے عجیب سی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی شاید اسے وجدانی طور پر میری اس کیفیت کا علم ہوگیا تھا۔ اس کی ترحم آمیز نگاہیں دیکھ کر میں نے اسے اپنی کمزوری کے بارے میں بتایا۔

بہرحال میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ اس کی وجہ کیا ہے۔ شاید اس جزیرے میں کچھ دیر قبل میں نے اس ویران جہاز کے مسافروں میں سے ایک کا انجام دیکھ لیا تھا اور شاید وہی ہم دونوں کا ہونے والا انجام تھا۔

اس کے بعد دن گزرتے گئے اور جہاز پر موجود اشیائے خوردنی ختم ہوگئیں۔ میں نے سمندر سے مچھلیوں کا شکار بھی کیا مگر وہاں مچھلیاں بہت کم تھیں۔ اس طرح چھ ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ گزشتہ ہفتے ہم نے آخری بسکٹ کھایا تھا۔ اس کے بعد سے میں صرف تین مچھلیاں پکڑ سکا۔

میں آج رات مچھلیوں ہی کی تلاش میں آیا تھا چونکہ ماریا بھوک سے بے حال ہو رہی تھی دھند میں چھپے ہوئے آپ کے جہاز کو دیکھا تو میں نے آپ کو آواز دی۔ اس کے بعد کے واقعات کا تو آپ کو علم ہے۔

آپ نے بے ٹھکانہ روحوں کے جوڑے پر جو مہربانی کی ہے خدا آپ کو اس کا صلہ دے۔

اس کے بعد سمندر میں چپوؤں کی آواز ابھری۔

''خدا آپ کی حفاظت کرے۔'' اس نے کہا۔

''خدا حافظ۔'' سپیدہ سحر پھیلنے لگا تھا اور وہ تیزی سے چپو چلاتا ہوا دور ہوتا چلا گیا۔ میں نے دوربین سے اس سمت میں دیکھا۔ دھند اب کچھ کم ہوگئی تھی اور سمندر میں دور میں نے اسفنج نما انسانی ہیولے کو دیکھا۔ اس کے چپوؤں اور بازوؤں میں مجھے کوئی فرق نظر نہیں آ رہا تھا چونکہ وہ بھی کسی اسفنج نما چیز ہی جیسے نظر آ رہے تھے۔ کچھ دور جانے کے بعد وہ عجیب سی کشتی اپنے مسافر کے ساتھ اس دھند میں غائب ہوگئی جواب تک مکمل طور پر صاف نہیں ہوئی تھی۔

ناگ راجہ

محمد خالد شاہان۔ صادق آباد

کمرے میں لالٹین کی زرد کمزور روشنی پھیلی تھی کہ اچانک زبردست پھنکار سنائی دی، جسے سن کر وہاں موجود لوگوں کے دل دہل گئے، ان پر سکتہ طاری ہوگیا، آنکھیں پتھرا گئیں کیونکہ سانپ نے ایک نوجوان کا روپ دھارا اور پھر.....

ایک موذی کی خوفناک دہشت ناک، اچھوتی انوکھی اور ناقابل فراموش دل دہلاتی حیرتناک کہانی

اماں نے عورت ہونے کے جرم میں جانے کون کون سی اذیتیں سہی تھیں کہ انہیں لفظ بیٹی سے بھی خوف آتا تھا۔

ان کے ماں باپ بے حد غریب تھے۔ ان پر چھ بیٹیوں کا بوجھ، اماں کا بچپن بہت غریبی اور محرومیوں میں گزرا تھا۔ غربت کی وجہ سے والدین کو اپنی ساری بیٹیوں کا رشتہ آنکھ بند کر کے قبول کرنا پڑا، جس نے لین دین کی بات نہیں چلائی۔ اسی کے ساتھ ہاں کر دی۔ نتیجے کے طور پر کوئی بہن بوڑھے کے پلے بندھی، کوئی بے اولاد گھر میں بچے کے لئے گئی، تو کوئی جواری یا چور اچکے کا چوری کا مال سمجھی گئی، یہی وجہ تھی کہ اماں بیٹی کے بجائے زہر کا پیالہ پینے کو تیار تھیں۔ حالانکہ اپنی بہنوں میں وہی تھیں جن کے حالات کچھ بہتر تھے۔ میرے ابا کی ایک ٹانگ نہیں تھی۔ اگرچہ غریبی اس گھر میں بھی موجود تھی۔ لیکن اپنی لاچاری

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk
Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

کے باوجود یا کسی نہ کسی طرح زندگی کی گاڑی کھینچ لیتے تھے۔ ان میں ایک ہی عیب تھا جب باہر کسی سے جھاڑ کھا کر یا تھک کر گھر آتے تو اپنا سارا غصہ اماں پر اتارتے۔ اماں کی دھنائی کر کے ابا کی بھی تھکن اتر جاتی اور انہیں روتے، بلبلاتے ہاتھ جوڑتے دیکھ کر ان کا مردانہ غرور بھی انگڑائی لے کر پھر سے جوان ہو جاتا۔ بس ابا کی یہی واحد تفریح تھی۔ اماں کو اب بہتر حالات کی اور امید نہ تھی۔ سوائے اس کے کہ جب وہ بیٹے کی ماں بنیں گی تو گھر کی کایا پلٹ کر رکھ دیں گی۔ خدا جانے کتنے ارمان اور کتنے خواب تھے جو لفظ بیٹا سے اماں نے وابستہ کر رکھے تھے۔ اماں نے اپنی ساری تمنائیں بیٹے کے لئے رکھ چھوڑی تھیں۔

اماں سوتی جاگتی آنکھوں سے بس بیٹے کا خواب دیکھتی رہتیں۔ انہیں مکمل یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن ان کے خوابوں کی تعبیر انہیں ضرور ملے گی۔ پھر جونہی آثار نمودار ہوئے ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ وہ پورے یقین کے ساتھ بیٹے کے استقبال کی تیاریاں کرنے لگیں۔ سب سے پہلے نام تلاش کیا گیا۔ "زور آور۔"

ابا سے فرمائش ہوئی کہ "گاؤں میں تقسیم کرنے کے لئے پانچ کلولڈوؤں کا انتظام ابھی سے شروع کر دیں۔"

"عقیقہ کب ہوگا۔ بیٹا اسکول کب جائے گا۔"

اماں نے سب سوچ ڈالا۔ وہ تو اس فکر میں شاید بہو کی تلاش میں بھی نکل کھڑی ہوتیں کہ ابا نے ٹوک دیا۔ اور "جو لڑکی ہوگئی تو پھر۔"

"اوہ..... میں نے اتنی دعائیں کی ہیں کہ چاہے دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے پر آئے گا تو بیٹا اور سولہ آنے بیٹا۔" اماں نے بڑے یقین کے ساتھ جواب دیا۔

"اری باؤلی بیٹا اور بیٹی دونوں ہی خدا کی رحمت ہیں تو ان میں فرق کیوں کرتی ہے۔" ابا نے سمجھایا۔

"بس تم اپنی کالی زبان بند رکھو۔ بندے کے منہ سے اچھی بات نہ نکل سکتی ہو تو اس کا چپ رہنا ہی بھلا ہے۔"

اس خود اعتمادی کے مظاہرے نے ابا کو متاثر کر دیا، وہ سچ مچ چپ ہو جاتے۔ ساری مدت ایک ایک دن گنتے امیدوں کے موتی پروتے تمناؤں کے جال بنتے اور خواہشوں کے چراغ جلاتے ختم ہو گئی۔ اماں نے ہر تکلیف اور ہر دکھ کو امرت سمجھ کر ہی سہہ لیا۔

لیکن جب دائی نے منہ ٹیڑھا کر کے لڑکی ہونے کی خبر دی تو انہیں اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ "کیا کہا ماسی تو نے؟" انہوں نے دھڑکتے دل سے سوال کیا۔

"لڑکی ہے دی لڑکی۔" دائی کو بھی کم غصہ نہ تھا۔ کیونکہ اب اس کو کم پیسے ہی ملنے تھے۔ یہ تو بہت بڑا نقصان تھا۔

اماں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کا منہ تکے جا رہی تھی۔ اتنے برسوں کے خواب ایک ہی جملے نے شیشے کی مانند چکنا چور کر دیئے تھے۔ ان کے دل و دماغ میں طوفان اٹھنے لگا۔ دن کا اجالا پلک جھپکنے میں گھپ اندھیرا بن گیا تھا۔

پھر جیسے ہی دائی نے اس ننھی سی بچی کو پلٹا تو اس کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ "ہائے، ہائے اس بچی کے انگ سے تو ایک سانپ لپٹا ہوا ہے۔ اللہ میری توبہ نہ جانے کس گناہوں کی سزا ہے۔ لے سنبھال اسے، اب تو جان اور تیرا میاں، آگے میں بے بس ہوں۔" وہ باہر نکل گئی۔

"ارے ٹھہرو ماسی پیسے تو لیتی جاؤ۔" ابا نے اسے پکارا۔

"پھر لے لوں گی۔ تم جاؤ، اس سنپولئے کو تو ٹھکانے لگاؤ، توبہ توبہ اتنی عمر بیت گئی، لیکن ایسا اندھیر کبھی نہیں دیکھا۔" وہ پھولتی ہوئی سانسوں سے بولی۔

"ابا اندر آئے تو دیکھا کہ سچ مچ نوزائیدہ کی پیٹھ پر نصف بالشت کا ایک سنپولیا چپکا ہوا ہے۔

لوگ اس پر یقین کریں یا نہ کریں۔ لیکن یہ اپنی جگہ ایک سچ تھا۔ بچی اور اس کے ساتھ پیدا ہونے والا سانپ دونوں زندہ تھے۔ ابا نے ہاتھ آگے بڑھایا تاکہ اسے نوچ کر پھینک دیں کہ اماں جیسے سکتے سے چونکیں اور ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔

"ناں ناں خبردار۔"

"کیوں؟" ابا حیرانی سے بولے۔

"ناں مارو اسے مت ظلم کرو یہ، ورنہ میں بھی اپنی جان دے دوں گی۔" وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگیں۔ اپنا سر اور سینہ دونوں ہاتھوں سے پیٹنے لگیں۔

"کیا ہوا تجھے؟" ابا بوکھلا کر ان کی طرف

متوجہ ہوئے۔

"یہ..... یہ میرا بیٹا ہے، میرا ناگ راجہ ہے۔ یہ میری دعاؤں کا اثر ہے۔ منتوں کا ثمر ہے۔ مت مارو اسے۔" وہ پھٹی پھٹی آواز میں بولیں۔

"کیوں پاگل ہوئی ہے۔ دیکھ تو اللہ میاں نے مجھے کتنی پیاری بیٹی دی ہے۔ لیکن یہ سانپ آفت ہے۔" ابا نے کہا۔

"نہیں چاہئے نہیں چاہئے مجھے بیٹی، تم مجھے میرا بیٹا، دے دو، میرا راجہ بیٹا خدا کے لئے اسے مجھ سے نہ چھینو، میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔" وہ اپنے بال نوچنے لگیں۔

عجیب حال تھا اماں کا، کمزوری سے زرد چہرہ، پسینے سے بھیگا جسم، پھیلی پھیلی آنکھیں، مسلسل بہتے آنسو، تھر تھر کانپتے ٹھنڈے ہاتھ، ابا ڈر گئے، آدھی عمر کے اکیلے پن کے بعد انہیں بیوی ملی تھی وہ بھی ایسی کہ گائے بھینس کی طرح، اس کی وجہ سے گھر کی روٹی ملتی تھی، اولاد نصیب ہوئی، اپنا وجود اہم لگنے لگا تھا۔ اگر اب اسے کچھ ہو گیا تو اماں کی حالت سے صاف ظاہر تھا کہ اگر تھوڑی دیر اور وہ اسی طوفان میں گھری رہیں تو ان کا کلیجہ پھٹ جائے گا۔

ابا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ انہیں کیا کہیں۔ بچی کو اس مصیبت سے کیسے نجات دلائیں۔ انہوں نے آخری کوشش کی۔

"دیکھو اگر بچی کو کچھ ہو گیا تو؟"

"کچھ نہیں ہوتا، جب نو مہینے اس کا کچھ نہیں بگڑا تو اب کیا نقصان پہنچے گا اسے....."

"آخر تمہاری مرضی....."

"اسے یونہی رہنے دو، ابھی سارا گاؤں ہمارا تماشہ دیکھنے آتا ہوگا۔" ابا نے تنگ آ کر کہا۔

"اسے مجھے دے دو۔ میرے راجہ کو، یہ لو پیالہ، لیکن نہیں تم اسے مت چھوؤ، بڑے سخت ہاتھ ہیں تمہارے۔" اماں پاگلوں کی طرح بڑبڑائیں اور اس ننھے سے سانپ کو انہوں نے بچی کے جسم سے الگ کر کے پیالے میں رکھا اور اپنے سینے سے لگا لیا۔ ابا نے افسردہ نظروں سے گھبرائی ہوئی اماں کی جانب دیکھا۔ جو خود اپنی ذات کی پہچان اپنی اولاد کو چھوڑ کر سانپ کو پیار کر رہی تھیں۔

فی الحال ان کے حال پر چھوڑ کر ابا نے بچی کو سنبھالا۔ ابا کا خیال تھا کہ یہ وقتی جنون ہے۔ ذرا حالت سنبھلنے پر وہ خود ہی سانپ کو چھوڑ دے گی، یا پھر موقع پاتے ہی وہ خود اسے ٹھکانے لگا دیں گے۔

لیکن یہ ان کا خیال ہی رہا۔ نیم دیوانی ماں نے سانپ کی حفاظت اپنی جان سے بڑھ کر کی، وہ خود ہی بوند بوند دودھ اسے پلاتیں اور اس طرح چھپا کر رکھتیں کہ کسی کی نظر نہ پڑے۔

دائی کی اطلاع پر سارا گاؤں ہی اُلٹ کر گھر آ گیا تھا۔ اس قسم کے واقعات گاؤں والوں کی زندگی میں کافی اہمیت رکھتے تھے۔ لیکن اماں نے لوگوں سے کہہ دیا۔ "اس سانپ کو کچل کر ہم نے مار ڈالا ہے۔" لوگوں کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔

ابا مجھے سنبھالتے رہے، میرا ہر کام انہوں نے اپنے ذمے لے لیا۔ دن بھر محنت کرتے، شام اور رات میرے کاموں میں مصروف رہتے، اماں اپنے راجہ کی دیکھ بھال میں لگی رہتیں، ان کی طبیعت ابھی تک نہیں سنبھلی تھی، دماغی حالت بھی نیم دیوانوں جیسی تھی۔ ہر وقت ابا کی نقل و حرکت کی نگرانی کرتی رہتیں۔ سوتے وقت بھی چونکتیں تھیں کہ کہیں انہیں بے خبر پا کر ان کے راجہ کو مار ہی نہ دیں۔

ابا نے کئی بار نرمی سے سمجھانے کی کوشش کی، وہ چاہتے تھے کہ بیوی خوابوں کی دنیا سے نکل آئے اور اپنی پھول سی بچی کو سنبھال لے، اماں پر بھی کچھ کچھ ان باتوں کا اثر ہونے لگا تھا۔ اب وہ ان کی غیر موجودگی میں مجھے گود میں اٹھا لیتیں۔ دودھ دیتیں، لیکن راجہ پر اب بھی مجھے ترجیح نہ مل سکی جو کٹورے سے اب ایک پٹاری میں رہنے لگا تھا۔

اس کی نشوونما حیرت انگیز طور پر بہت تیز تھی۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ وہ خود بھی سب کی نظروں سے چھپا رہنا پسند کرتا تھا۔ رات میں ایک آدھ بار اپنی پناہ گاہ سے باہر نکلتا پھر خود ہی اس میں آ بیٹھتا۔ ابا اب بھی اس سے ناراض رہتے اور چاہتے تھے کہ کسی طرح بیوی کو راضی کر کے سانپ سے پیچھا چھڑا لیں۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

جوں جوں اماں میری جانب کھنچتی چلی آرہی تھیں۔ ابا کا مطالبہ ضرور پکڑ رہا تھا کہ ہمیں اس مصیبت سے جلد چھٹکارا حاصل کرلینا چاہئے۔ اماں کے پاس اس کے جواب میں آنسوؤں کی دھاریں ہی تھیں۔ وہ اس بے بسی اور معصومیت سے ابا کی طرف دیکھتی تھیں کہ ان کا سر جھک جاتا۔

پھر ایک رات فیصلہ ہو ہی گیا۔ ہوا یوں کہ سوتے سوتے عادت کے مطابق جب ابا نے مجھے ٹٹول کر مجھے چادر اوڑھانا چاہی تو ان کا ہاتھ کسی نرم چیز سے چھو گیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھے اور لالٹین کی لو اونچی کر کے دیکھا تو اماں کا لاڈلہ کنڈلی مارے میرے سرہانے بیٹھا دکھائی دیا۔ ابھی ابا کا ہاتھ اس کی طرف بڑھا ہی تھا کہ اماں نے بجلی سی تیزی سے جھپٹا مار کر اسے اپنی گود میں چھپالیا۔ ابا غصے سے بے قابو ہو گئے۔ انا پ شناپ بکتے ہوئے انہوں نے فیصلہ سنا دیا کہ "اب یہ سانپ ہرگز یہاں نہیں رہ سکتا۔ ورنہ وہ اپنی بیٹی کو لے کر اسی وقت کہیں اور چلے جائیں گے۔"

اماں کی ہمت بھی ٹوٹ سی گئی تھی۔ ڈوبی ہوئی آواز میں انہوں نے شوہر کو سمجھانا چاہا۔ "اتنے ناراض کیوں ہو رہے ہو، راجہ کے ابا، یونہی جا بیٹھا ہوگا پیار سے اس کے سرہانے۔"

"پیار کیسا پیار ایک زہریلے سانپ اور میری بیٹی کا کیا رشتہ۔" ابا جھنجھلا کر بولے۔

"کیوں وہ اس کی بہن نہیں ہے کیا۔" اماں نے یاد دلایا۔

"پاگلوں جیسی باتیں نہ کر، کیسی بہن کہاں کا بھائی۔ تو نے پانی میں سانپ پی لیا ہوگا جو بچی کو جا چمٹا، وہ تو خدا نے خیر کی اس معصوم بچی کی جان بچ گئی ورنہ۔"

"ناں ناں الزام مت لگاؤ، بے زبان پر وہ کسی کو نقصان نہیں پہنچائے گا۔"

"اب میں کچھ سننا نہیں چاہتا، تو اس کی ایسی حمایتی ہے، تو اپنا بوریا بستر اٹھا اور اس کے ساتھ کہیں چلی جا۔" ابا کا اکھڑپن لوٹ آیا، اماں گھر چھوڑتیں تو کس کے بھروسے پر، اس کے بھروسے پر جو خود ان کا محتاج ہے۔ پھر جب شوہر کوئی رشتہ ماننے کو تیار نہ تھا تو بھلا دنیا والے ان انوکھے ماں بیٹے کو کیسے جینے دیتے۔ یہی سوچ کر اپنا گھر اور اپنی جان بچانے کی خاطر سینے پر سل رکھ کر اماں اس بات پر راضی ہو گئیں کہ ان کے راجہ کو دور کہیں جنگل میں چھوڑ دیا جائے۔ شوہر پر اتنا اعتبار نہیں تھا کہ اپنے راجہ کو اس کے حوالے کر دیتیں، ابا نے مجھے اٹھایا اور اماں نے پٹاری سنبھالی اور راتوں رات اسے دور کہیں چھوڑ کر پلٹ آئے۔

کئی دن تک تو اماں کھوئی کھوئی رہیں کہ جیسے سچ مچ ان کا بیٹا ان سے جدا کر دیا گیا ہو، پھر ابا نے دلجوئی کی، کچھ میری مصروفیت میں الجھ کر انہیں تھوڑا بہت صبر آ ہی گیا۔ اس واقعہ کے دو ماہ بعد کی بات ہے کہ میں صحن میں بیٹھی پتھروں سے کھیل رہی تھی۔ اماں میری طرف پیٹھ کئے کپڑے دھو رہی تھیں۔ ابھی میں نے بولنا شروع نہیں کیا تھا لیکن ہنسی اور وہ بھی قہقہے سے ملتی جلتی آواز اماں کے کانوں میں پڑی تو انہوں نے پلٹ کر دیکھا کہ ان کا راجہ میرے ننھے منے وجود کے پاس کنڈلی مارے بیٹھا ہے۔ اس کا نرم نرم وجود جیسے مجھے گدگدا رہا تھا۔ جس سے میں بے تحاشہ ہنس رہی تھی۔ اماں کپڑے چھوڑ چھاڑ کر میری طرف لپکیں تو اس نے دھیرے سے مجھے چھوڑ کر اماں کے پیروں میں بل ڈال دیئے اور پھن اٹھا کر ان کے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔

اماں کی آنکھیں خوشی سے چھلک گئیں۔ وہ یہ کہتی ہوئی بے اختیار اس پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔ "ارے تو ٹھیک تو ہے بیٹا۔ اپنی بدنصیب ماں کو نہیں بھولا۔" ماں بیٹے کا یہ ملاپ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ اپنا سر اماں کے پیروں سے رگڑ رگڑ کر شوں شوں کی آوازیں نکال رہا تھا۔

اور ماں کا بس نہیں چلتا تھا کہ اٹھا کر اسے اپنے سینے سے لگا لیتی۔ ان کے منہ سے بے ربط جملے نکل رہے تھے۔

"میرا بیٹا کہاں تھا تو اتنے دنوں تک، پلٹ کر خبر بھی نہ لی تو نے کہ تیری دکھیاری ماں تیرے بغیر کتنی اداس ہے۔" اس کی شوں شوں رک گئی۔ سر جھک گیا، جیسے اپنی غلطی پر سچ مچ شرمندہ ہو، پھر تو یہ آئے دن کا معمول بن گیا، ابا کی غیر حاضری میں وہ اچانک ہی کہیں سے نمودار ہوتا۔ اماں سے لپٹتا اور مجھ سے کھیلتا اور پھر

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

خاموشی سے چلا جاتا۔

مجھے کھلونے نصیب نہیں تھے۔ یونہی مٹی پتھروں سے دل بہلاتی تھی۔ اب خدا نے جیتا جاگتا کھلونا دے دیا تھا۔ میں بڑی خوش تھی، پھر ایک دن ابا نے دیکھ لیا۔ وہ گھبرا کر اسے مارنے دوڑ پڑے۔ مگر اماں پیروں سے لپٹ گئیں۔ میں چیخ چیخ کر رونے لگ پڑی، شور شرابہ اور افراتفری میں وہ کھسک گیا۔ لیکن ابا کا سارا غصہ بیوی پر اترا، برسوں بعد اماں کو اتنی بے دردی سے مار پڑی تھی کہ اگلی پچھلی کسر نکل گئی تھی۔

ابا اب کوئی رعایت دینے کو تیار نہ تھے۔ کھڑے کھڑے انہوں نے فیصلہ سنا دیا۔ "آئندہ اگر یہ موذی سانپ پھر گھر میں دکھائی دیا تو تین لفظوں کے ساتھ وہ سدا کے لئے چھٹی کر دیں گے۔" ہر عورت کی طرح اماں کے لئے بھی یہ دھمکی موت کا پیغام تھی۔ جس کے بعد ان کی قینچی کی طرح چلتی ہوئی زبان تالو سے چپک کر رہ گئی۔ کئی دن خاموشی سے گزر گئے۔

اماں بہت اداس تھیں، وہ پہروں خاموش بیٹھی نہ جانے کیا کیا سوچ سوچ کر ٹھنڈی آہیں بھرتی رہتیں، ابا کے چڑچڑے پن نے گھر کے ماحول کو اور بھی خراب کر دیا تھا، اپنا پیارا بھائی بچھڑ جانے پر میرا دل بھی ہر چیز سے اچاٹ ہو گیا تھا۔

پھر اچانک ہی وہ آ گیا۔ اماں خوشی سے بے تاب ہو کر اس کی طرف لپکیں۔ لیکن فوراً ہی سہم کر رک گیا۔ مجھے بھلا کیا خوف تھا۔ ہنستے اور قہقہے لگاتے ہوئے، اس کا استقبال کیا تو اماں کی بھی ہمت بندھی، مگر کچھ دیر بعد ہی انہیں ابا کی دھمکی یاد آ گئی۔ دکھے دل اور بھیگی آنکھوں کے ساتھ انہوں نے اپنے راجہ کو چلے جانے کا اشارہ کیا۔ پھر خود پکڑ کر صحن کی نالی کی طرف لے گئیں اور بولیں۔ "یوں دندناتے ہوئے نہ آیا کر بیٹا۔ سبھی تیرے دشمن ہیں۔ کسی کی نظر پڑ گئی تو خدا جانے کیا ہو جائے، تو یہاں سے چپ چاپ چلا جا اور اب کبھی مت آنا، میں تجھے یاد کرتے کرتے مر جاؤں گی، جا بیٹا تیرا خدا حافظ۔"

وہ اپنا سر جھکائے ہوئے نالی سے باہر نکل گیا، میں پھر اکیلی رہ گئی۔

وقت گزرتا گیا۔ اماں کو اب مستقل چپ لگ گئی تھی۔ ابا لاکھ باتیں کرتے ادھر ادھر کی سناتے مگر اماں کے پاس سوائے ہوں ہاں کے اور کوئی جواب نہ تھا۔ اس بے حسی میں وہ جھلا جاتے۔ اماں کی معمولی غلطیوں اور لاپرواہیوں کو نمک مرچ لگا کر مجھ سے بیان کرتے ہوئے سنبھالنے سے پہلے کے سارے واقعات اور راجہ کی ساری داستان میں نے انہی سے سنی تھی۔ "اری بیٹا میں تیرا خیال نہ رکھتا تو یہ پاگل عورت نے تو تجھے مار ہی دیا تھا۔"

ایسے ہی اداس گھٹے ہوئے ماحول میں رہ کر کئی سال بیت گئے۔ اب میں عمر کے اس دور میں تھی۔ جب ماں باپ کی محبت سے ہٹ کر دل کچھ ڈھونڈنے لگتا ہے۔ کھوجتے تلاش کرتے اور سپنوں کے جال بنتے، اس تسلسل میں مصروف ہو کر بھیا میرے دماغ سے اتر گیا۔

پھر گھر میں میری شادی کی باتیں ہونے لگیں، وہ بھی گاؤں کے اس لڑکے سے جو کئی لڑکیوں کی آنکھوں میں بسا ہوا تھا۔ میری خوشی کی کوئی حد نہ رہی۔ جہیز کے لئے جوڑے، برتنوں کی آوازیں، کانچ کی چوڑیوں کی کھنک اور پائل کی جھنکار مجھے مست کر دیتیں۔

ابا بھی بہت خوش تھے۔ اب وہ یوں تیز تیز چلنے لگے، جیسے پھر سے جوان ہو گئے ہوں، ایک اماں تھیں۔ جو ہنستے ہنستے ایک دم خاموش ہو جاتیں اور چور نظروں سے صحن میں نہ جانے کیا ڈھونڈنے لگ جاتیں، شاید ان کی ممتا کی پکار تھی کہ ایک دن ابا میرے زیور بنوانے شہر گئے ہوئے تھے کہ اچانک وہ چلا آیا۔ اماں کا وہ لاڈلہ بیٹا۔

ایک دم چوڑا پھن لش پش کرتی کھال اور نگینوں کی طرح چمکتی آنکھیں اس نے آتے ہی اماں کے قدموں میں اپنا سر ڈال دیا۔ اماں جہاں کی تہاں رہ گئیں۔ خوشی نے ان کی حالت خراب کر دی، اور اب وہ نہ ہنس رہی تھیں نہ کچھ بول رہی تھیں۔ مگر چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ جیسے اندر ہی اندر کوئی طوفان آ گیا ہو۔

میں نے بھاگ کر صحن کا دروازہ بند کر دیا کیونکہ شادی کے گھر میں لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا، کوئی اسے دیکھ

لیتا تو پتہ نہیں کیا ہنگامہ برپا ہو جاتا۔

پلٹی تو دیکھا کہ اماں اپنے تھرتھراتے ہاتھ اس کے جسم پر پھیر رہی تھیں، آنکھوں میں خوشیوں کے چراغ جلائے وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولیں۔

"میں جانتی تھی، میں جانتی تھی کہ تو ضرور آئے گا۔ بھلا بہن کی شادی بھائی کے بغیر ہو سکتی ہے۔ کب سے تیری راہ تک رہی تھی۔ بیٹا کہاں رہ گیا تھا، بے مروت۔" اس کے نتھنوں سے شوں شوں کی آوازیں نکلنے لگیں۔ جیسے اتنے دنوں کی غیر حاضری پر شرمندہ ہو کر اس کی وجہ بتا رہا ہو۔

دیر تک ماں بیٹے ایک دوسرے میں گم صم رہے۔ پھر اس نے میری طرف دیکھا اور آگے بڑھ کر میرے دونوں پیروں میں بل ڈال دیئے۔ "ارے ارے چھوڑ مجھے میں گر جاؤں گی، بچپن کی وہ شوق ہنسی پھر سے فضا میں بکھر گئی۔ اماں آنسو بہاتی بہن بھائی کا یہ ملن دیکھ رہی تھیں۔ آج انہیں ابا کا بھی خوف نہیں تھا۔ شاید وہ اس خوف کو نہیں بھولا تھا۔

مختصر ملاقات کے بعد وہ نالی کی طرف بڑھا تو جیسے اماں کو ہوش آ گیا۔ "جا رہا ہے..... بس اتنی جلدی۔" وہ بے تابی سے آگے بڑھیں۔ "پھر کب آئے گا، جمعہ کو تیری بہن کی شادی ہے۔" پھر ان کی آواز بھرا گئی۔ "یہ کیسا ناطہ ہے، تجھے میں نے اپنی کوکھ سے جنم دیا ہے پھر دنیا اس رشتے کو کیوں نہیں مانتی، کیسے کیسے ارمان تھے دل میں کہ بیٹا ہوگا تو میرا دل بڑھ جائے گا، سکھ دے گا، بڑھاپے کا آسرا بنے گا۔ لیکن کچھ بھی تو نہیں ملا۔ ارے راجہ بیٹا تو مجھے چھاؤں نہ دے سکا۔ بہن کو ڈولی میں نہ بیٹھا سکا، تو کیا اسے کوئی تحفہ بھی نہ دے گا، وہ سوچے گی نہیں کہ میرا بھائی کیسا ہے جس نے کوئی رسم بھی نہ نبھائی۔" وہ اور نہ جانے کیا کیا کہتیں کہ دروازے پر کھٹکا ہوا جس نے انہیں حقیقت کی دنیا میں کھینچ لیا اور راجہ بھیا بھی جھٹ سے نالی پار کر گیا۔

ناگ بھیا کو گئے دو ہفتے ہو گئے تھے اماں بہت پریشان تھیں اماں کو ہر وقت بھیا کی فکر رہتی تھی۔ "نہ جانے میرا بچہ کس حال میں ہوگا۔"

رات آٹھ بجے کا ٹائم تھا، کمرے میں دو چارپائیاں بچھی تھیں، ایک پر ابا اور دوسری پر اماں اور میں تھی، ابا میری شادی کی باتیں کر رہے تھے اور ساتھ ہی مجھے مستقبل کے لئے نصیحت بھی کر رہے تھے۔ اماں خاموش تھیں کہ اتنے میں ابا اماں سے مخاطب ہوئے۔ "اری نیک بخت میں دیکھ رہا ہوں کہ آج کل تو کچھ زیادہ خاموش اور فکر مند رہنے لگی ہے..... شادی کا گھر ہے..... ہنس بول..... دھوم دھڑکا گھر میں کرا، اور اگر تجھے اس موذی کی یاد آ رہی ہے تو اسے بھول جا..... وہ موذی تھا..... اچھا ہوا کہ اس سے ہماری جان چھوٹ گئی، کسی دن بھی اس سے ہمیں نقصان پہنچ سکتا تھا..... میرا تو خیال ہے کہ جنگل میں وہ اچھا وقت بتا رہا ہوگا اور تو اس کے غم کو سینے سے لگا بیٹھی ہے، چند دن میں مہمان آئیں گے اور تجھے اس حال میں دیکھ کر کیا خیال کریں گے، تو اسے بھول جا۔"

کمرے میں لالٹین کی روشنی پھیلی تھی، موسم نہ زیادہ گرم اور نہ زیادہ سرد تھا کہ اتنے میں زبردست پھنکار سنائی دی۔ اس آواز کو سنتے ہی ہم دونوں ماں بیٹی نے سمجھ لیا کہ ناگ بھیا کمرے میں موجود ہیں اور ابا کی حالت دیدنی تھی، اچانک جیسے ان پر بدحواسی طاری ہو گئی تھی، ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔

کہ اتنے میں کمرے کے ایک کونے میں دھواں اٹھا اور جب دھواں چھٹا تو اس جگہ ایک بہت ہی خوب صورت اپنی مثال آپ نوجوان موجود تھا..... اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ وہ فوراً بولا۔ "آپ لوگ گھبرائیں نہیں..... میری بات غور سے سنیں۔"

نوجوان کو دیکھ کر اماں اور میں بھی گھبرا گئی تھیں کیونکہ اس سے پہلے کبھی ایسا نہ ہوا تھا کہ اس حالت میں وہ نوجوان ہمارے سامنے آیا ہو۔

پھر اس کی آواز سنائی دی۔ "آپ لوگ بالکل نہ گھبرائیں اور ابا آپ خاص طور سے اپنے دل کو قابو میں رکھیں، اماں میں آپ کا بیٹا ناگ راجہ ہوں۔

میری باتیں آپ سب غور سے سنیں۔ اماں یہ اس رات کی بات ہے جس رات آپ ابا سے بیٹے کی پیدائش کے لئے جن الفاظ میں اپنی خواہش بیان کر رہی تھیں، آپ کو بالکل یقین تھا کہ اس مرتبہ بیٹا ہی پیدا ہوگا اور دل میں یہ

بات بسی سی کہ وہ بیٹا ہمارے بڑھاپے کا سہارا ہوگا۔

اس وقت میں غائب حالت میں اس جگہ موجود تھا۔ آپ کی باتیں سن کر میرا دل بھر آیا۔

پھر میرے دل میں آیا کہ میں ضرور آپ دونوں کے بڑھاپے کا سہارا بنوں گا۔

وقت گزرتا رہا..... اور میں لمحہ لمحہ آپ کی خبر گیری کرتا رہا۔

اور پھر وہ وقت آیا جب بچے کی پیدائش ہونی تھی۔ رات کا وقت تھا، لالٹین کی روشنی میں سارا معاملہ ہو رہا تھا۔ اور پھر بچی کی پیدائش ہوئی، وہی لمحہ میرے لئے اہم تھا، چونکہ میں غائب حالت میں تھا، مجھ پر کسی کی نظر نہیں پڑی تھی۔

میں نے فوراً خود کو ایک بالشت کے برابر سنپولیا میں ڈھال لیا اور بچی کی پشت سے چپک گیا۔ اماں اور دائی سمجھی کہ میں نو ماہ پیٹ میں رہا ہوں۔

میرے لئے اماں کی محبت بے مثال تھی..... اماں نے مجھے سینے سے لگا لیا تو میرے دل میں اماں کی محبت اور زیادہ جڑ پکڑ گئی۔

لیکن میرے لئے ابا کے دل میں نفرت ہی رہی..... یہ میری ذات سے ہر پل خوفزدہ ہوتے رہتے تھے۔ خیر یہ بات، اپنی جگہ حقیقت بھی ہے کہ انسان ایک سانپ سے ہمیشہ خوفزدہ رہتا ہے۔ اور ابا کی اس بات سے میں نے کبھی برا نہیں منایا۔ جو حقیقت ہے وہ حقیقت ہے۔

وقت گزرتا رہا..... لیکن میں اماں آپ اور بہن سے خفیہ طور پر ملتا رہا۔

وقت کے ساتھ ساتھ بہن جوان ہوتی گئی..... اماں آپ نے جو خواہش کی اب اس کے پورے ہونے کا وقت آ گیا ہے، میں حقیقت میں آپ لوگوں کے بڑھاپے کا سہارا بنوں گا، یعنی آپ کے قدموں میں اتنا دھن و دولت رکھ دوں گا کہ آپ کا بڑھاپا آرام و سکون سے کٹ جائے اور ساتھ ہی بہن کے لئے بھی بہت کچھ سوچ رکھا ہے۔

میں کون ہوں..... کیا ہوں..... اسے بھول جائیں..... یہ راز ہی رہے تو اچھا ہے۔"

بھیا کی نظریں اب ابا پر مرکوز ہو گئی تھیں۔ ابا سر جھکائے ساری باتیں سن رہے تھے۔ ابا اپنی جگہ ساکت ہو گئے تھے، اماں کی خوشی دیدنی تھی۔

پھر بھیا کی آواز سنائی دی۔ "ابا اب تو آپ کو مجھ سے ڈر نہیں لگ رہا، کیونکہ آپ کو موذی سے بہت ڈر لگتا ہے۔ اب آپ کی کیا رائے ہے؟"

یہ سن کر ابا کے ہونٹوں پر جنبش ہوئی۔ "ناگ راجہ یہ تو حقیقت ہے ناں کہ انسان سانپ سے ڈرتا ہے، اور میں بھی تو انسان ہی ہوں ناں اور میرا ڈرنا فطری بات ہے۔"

ابا کی بات سن کر وہ بولا۔ "آپ صحیح فرما رہے ہیں، اور ایسا ہونا فطری عمل ہے۔ خیر گزرے وقت کو کریدنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ گئے وقت کو بھولنا اچھا ہے۔

اماں آپ بہت اچھی ہیں، آپ اپنی ذات سے زیادہ مجھے چاہتی ہیں۔ آپ تاحیات مجھے یاد کرتی رہیں گی۔ میری دعا ہے کہ میری بہن سدا خوش رہے۔

ابا کل میں دوپہر کے وقت آؤں گا..... اس کا ذکر کسی سے بھی نہیں کرنا..... بلکہ بھول کر بھی میری ذات اور واقعات کا تذکرہ نہیں کرنا.....

میں آپ لوگوں کے علاوہ کسی اور کو نظر نہیں آ سکتا۔ کل جب میں آؤں گا تو اس وقت بھی کسی کو نظر نہیں آؤں گا..... ابا میرے ساتھ چلنا جہاں پہاڑیاں ہیں..... کچھ چیزیں ہیں وہ میں تحفہ میں دوں گا، بلکہ بتا ہی دوں۔ وہ قیمتی سونے اور ہیرے کے زیورات اور کچھ ہیرے ہوں گے، انہیں آہستہ آہستہ حسب ضرورت فروخت کر کے زندگی عیش و آرام سے گزارنا..... اور ہاں میری بہن کو جہیز میری طرف سے اتنا دینا کہ لوگوں کی آنکھیں خیرہ ہو جائیں۔ بلکہ آپ کے پاس موجود دولت بھی اس کی ہوگی۔

اماں کل کے بعد میں کبھی بھی ملنے نہیں آؤں گا۔ وجہ یہ ہے کہ کل رات میں یہاں سے دور بہت دور چلا جاؤں گا اور میری واپسی کبھی بھی اس علاقے میں نہیں ہوگی۔ جب میری یاد آئے تو میرے حق میں دعا کرنا..... آپ لوگ بھی مجھے بہت یاد آئیں گے۔

اماں..... بہن اور ابا..... میں اب چلتا ہوں.....

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

کل دوپہر کے وقت آؤں گا..... اس بات اور میری ذات کا کسی سے بھی ذکر نہیں کرنا..... بڑی مہربانی ہوگی۔ بلکہ یہ راز آپ لوگ اپنی زندگی کے ساتھ ہی لے جانا..... یہی بہتر ہوگا۔ ٹھیک ہے اب میں چلتا ہوں۔"

اور پھر بھیا کے گرد گاڑھا گاڑھا دھواں پھیلا اور جب دھواں چھٹا تو بھیا موجود نہ تھا۔

ابا ابھی بھی اچنبھے میں تھے۔ ابا ہم ماں بیٹی کو یک ٹک تکے جا رہے تھے کہ اتنے میں اماں بولیں۔ "میرا بیٹا چلا گیا..... اللہ تعالیٰ میری مامتا کی دعا ہے کہ وہ سدا خوش و خرم رہے۔" اور اماں کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اماں کو دیکھ کر میں بولی۔ "اماں اب ہم اس کے حق میں دعا ہی کر سکتے ہیں، ہمارا اپنا جو ہے۔"

خیر شام ہوئی اور شام کے بعد رات کا اندھیرا ہر سو چھا گیا۔ اماں نے سسکتے بلکتے کھانا پکایا..... کھانا کھانے کے بعد ہم ایک ہی کمرے میں بیٹھ گئے، ابا اماں اور میں..... تینوں اسی کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ باتیں جو تھیں کسی طور ختم ہو کے نہ دے رہی تھیں۔

باتوں باتوں میں صبح ہوگئی، ہم رات بھر کے جاگے پڑے تھے مگر خوشیوں نے ہم تینوں کو اپنی آغوش میں لے لیا تھا، ہمیں نیند کا بالکل بھی احساس نہ تھا۔

ہم ناگ راجہ کی خوشیوں اور صحت و تندرستی کے لئے دعا گو تھے۔ خیر حسب وعدہ وقت مقررہ پر ناگ بھیا آ گیا۔ اس وقت وہ سامنے دروازے سے آیا تھا بقول اس کے کہ وہ کسی کی نظر میں نہیں آئے گا۔

وہ اماں کے گلے لگ گیا..... اماں نے اسے بہت پیار کیا اور اس کے ماتھے کا بوسہ لیا پھر وہ ابا کے گلے لگا..... اس کے بعد مجھے گلے لگا کر لمبے لمبے سانس لیتا رہا، پھر میرے سر پر ہاتھ پھیرتا ہوا..... دعائیں دیتا رہا۔ پھر اپنے گلے سے مجھے الگ کر کے اماں سے بولا۔ "اماں میں جا رہا ہوں..... آپ لوگوں سے جدا ہو کر میں بہت بے چین رہوں گا۔ مگر..... ایسا ہونا ہے، میں کبھی نہ آنے کے لئے جا رہا ہوں۔ بس اماں یہیں تک ہم سب کا ساتھ رہا۔ میرے لئے آپ سب دعا ضرور کرنا۔"

پھر ابا سے مخاطب ہوا۔ "ابا جلدی چلئے..... میرے پاس وقت کم ہے، جو تحفہ میں دوں گا اس سے آپ لوگ پوری زندگی عیش و آرام کرنا۔" اور یہ بول کر پھر ایک مرتبہ اماں کے گلے لگا اور مجھے بھی گلے لگا کر پیار کیا۔ اس کی آنکھوں میں اب نمی تیر رہی تھی اور پھر ابا کے ساتھ وہ دروازے سے نکلتا چلا گیا۔

اماں کی آنکھیں ساون بھادوں کی طرح برسنے لگیں اور میں بھی رو رہی تھی۔ ابا کوئی دو گھنٹے بعد واپس آئے، وہ ایک گٹھری اٹھائے ہوئے تھے، اندر آ کر ابا سیدھے کمرے میں گئے اور اماں کو آواز دی تو اماں جھٹ کمرے میں آئیں، اور اماں کے پیچھے میں بھی لپکی۔

مجھے دیکھ کر ابا بولے۔ "جلدی سے باہر کا دروازہ بند کر کے چٹخنی لگا دے۔"

میں بھاگی ہوئی گئی اور جلدی سے دروازہ بند کر کے چٹخنی چڑھائی اور واپس آ گئی۔

ابا نے چارپائی پر گٹھری رکھی ہوئی تھی۔

ابا نے جب گٹھری کھولی تو ہماری آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ گٹھری میں سونے اور ہیرے جواہرات جڑے ہوئے بے شمار زیورات تھے اور الگ سے بھی ہیرے جواہرات تھے۔ ہم تینوں اچنبھے سے زیورات دیکھتے رہے۔

پھر ابا اماں سے بولے۔ "جلدی سے اسے صندوق میں چھپا دے اور خبردار بھول کر بھی کبھی کسی سے ذکر نہ کرنا۔" اس کے بعد پھر ابا بولے۔

"وہاں پر بھی وہ میرے گلے لگ کر باتیں کرتا رہا۔ اور ایک بار پھر وہ بولا۔ "ابا مجھ موذی کو معاف کر دینا..... کیونکہ میری ذات سے آپ کو تکلیفیں پہنچتی تھیں۔ اور وہ چلا گیا۔"

اماں جب تک زندہ رہیں اسے صبح شام بلکہ ہر پل یاد کرتی تھیں اور اکثر ناگ بھیا کی یاد میں اماں کی آنکھیں نم ہو جاتی تھیں۔ اللہ سے میری دعا ہے کہ ہمارا ناگ بھیا جہاں بھی رہے خوش رہے۔"

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

ہم آہنگی

ناصر محمود فرہاد۔ فیصل آباد

نوجوان کو یقین نہیں آرہا تھا کہ اس کی بیوی اب اسٹریچر پر مردہ پڑی تھی حالانکہ ایک گھنٹہ پہلے وہ کار میں زور و شور سے بحث کر رہی تھی، مگر جو ہونا تھا ہو چکا تھا، ویسے بھی نوجوان ذہنی طور پر خوش تھا کہ.....

کیا بے جا مداخلت انسان کو خود سر یا منہ پھٹ بنا دیتا ہے، اس کا فیصلہ تو کہانی پڑھ کر ہی ہوگا

ان کی شادی کو تیس سال گزر چکے تھے ہر چیز درست چل رہی تھی مگر اب ان کے درمیان بحث شروع ہوگئی تھی۔ ہر بات پر تکرار ہونے لگی۔ دلیل، جوابی دلیل اور بحث در بحث۔ بسا اوقات دوران بحث برکت کو یوں محسوس ہوتا جیسے وہ دونوں شکاری کتوں کی مانند کسی مشینی خرگوش کا پیچھا کرتے ہوئے ایک ہی دائرے میں چکر لگا رہے ہیں۔ صرف خرگوش پر نظریں جمی ہیں آس پاس کی کچھ خبر نہیں۔

اگر ان کی کوئی اولاد ہوتی تو شاید صورت حال مختلف ہوتی مگر کئی ڈاکٹروں، حکیموں، ویدوں کے چکر لگانے اور بے شمار ٹیسٹ کروانے کے بعد ڈاکٹروں کی رائے یہی تھی کہ دوسری شادی سے مسئلہ حل ہو سکتا ہے اس بیوی سے اولاد ممکن نہیں۔ مگر یہ برکت کے لئے ممکن نہیں تھا کہ بیوی کو چھوڑ دے یا اس کے ہوتے کسی

دوسری کو بیاہ لائے، بے شک یہ اس کی ''لو میرج'' نہیں تھی سراسر اماں ابا کی پسند تھی مگر شادی کے بعد اب وہ برکت کی زندگی بن چکی تھی لہٰذا اس نے زندگی سے سمجھوتہ کرلیا۔ بھائی بہن تو کوئی تھا نہیں لہٰذا اماں ابا کے گزر جانے کے بعد صرف دونوں میاں بیوی گھر میں رہ گئے تو تنہائی زیادہ ستانے لگی۔ ایک دن برکت ایک کتے کا پلا خرید لایا اس کی بیوی کو جانوروں سے پیار تو تھا ہی اس پلے کو بھی پیار سے پال لیا۔ جب برکت دفتر ہوتا تو وہ اس کے ساتھ اس کی دیکھ بھال میں اپنا وقت گزار لیتی۔ وہ پلا بھی بڑا ہو کر برکت کی بیوی مریم کے آگے پیچھے دم ہلاتا پھرتا۔ انہوں نے اس کا نام ''ٹامی'' رکھا تھا۔

زندگی بڑی مطمئن گزر رہی تھی۔ برکت ایک سرکاری دفتر میں ہیڈ کلرک کے عہدے سے ریٹائر ہوا تو کچھ رقم مل گئی۔ اماں ابا کا گھر بیچ کر کچھ مزید رقم جمع کی، ایک پرانی کار اور ایک بڑا سا گھر خرید لیا جس میں ایک باغیچہ بھی تھا۔ سوچا تھا اب باقی کی زندگی اس میں آرام کرتے اور کتابیں پڑھتے گزاریں گے مگر پھر پتہ ہی نہ چلا کب بحث شروع ہوگئی ہر ایک بات پر تکرار ہونے لگی۔ چھوٹے چھوٹے موضوع جھگڑے بننے لگے۔

آج وہ گھاس کے بیج خریدنے بازار جارہے تھے کیونکہ انہوں نے اپنا یہ گھر بیچنے کا فیصلہ کیا تھا اب وہ اس کو افورڈ نہیں کرسکتے تھے۔ مریم کا خیال تھا کہ جب تک لان کی حالت اچھی نہ ہوگی اس مکان کی زیادہ قیمت نہیں لگے گی۔ پانی کی کمی سے لان کی گھاس اڑ چکی تھی پچھلی گرمیوں میں زیادہ بارش بھی نہیں ہوئی تھی اب انہوں نے سوچا تھا کہ نئے سرے سے لان کو سرسبز کیا جائے اور مکان کی اچھی رقم بٹور لی جائے۔ برکت کا خیال تھا کہ گھاس کے بیج بارش کے بغیر اگ نہیں سکتے چاہے وہ کتنے ہی اعلیٰ نسل کے کیوں نہ ہوں اس لئے موسم برسات کا انتظار کرنا چاہئے۔ مریم اس کی بات سنتے ہی بپھ گئی اور جل کر بولی۔

''یہ سب سوچتے ہوئے دو سال بیت گئے اب مزید ایک اور سال کا انتظار نہیں ہوسکتا ہم پہلے ہی دیوالیہ ہورہے ہیں آمدنی ہے نہیں اور اخراجات منہ کھولے بیٹھے ہیں۔''

''تم دیوالیہ ہونے سے مت ڈرو..... جلد ہی بارش ہوجائے گی۔'' وہ اس کو سمجھانے کے انداز میں بولا پھر کچھ توقف کے بعد اس کے کچھ مزید کہنے سے پہلے ہی کہنے لگا۔

''بیجوں کی مارکیٹ شہر کے دوسرے سرے پر ہے۔ ان کی قیمت اتنی زیادہ نہیں جتنا ہم پیٹرول خرچ کر کے وہاں پہنچیں گے۔ ٹکے کی بڑھیا آنہ سر منڈائی۔ کیا تم نے کبھی یہ محاورہ سنا ہے؟''

''ہاں جب بھی سنا ہے تم سے ہی سنا ہے۔ ہزاروں دفعہ۔'' مریم منہ پھلا کر بولی۔

برکت نے ہنکارا بھرا اور خاموشی سے ٹامی کو عقبی شیشے میں دیکھنے لگا۔

''سنو.....! ذرا'' کے پی'' اسٹور پر رکنا میں تانیہ کے لئے باسکٹ بال خریدنا چاہتی ہوں چند دن بعد اس کی سالگرہ ہے۔'' مریم یوں بولی جیسے اسے اچانک کچھ یاد آ گیا ہو۔ تانیہ اس کے بڑے بھائی کی چھوٹی بیٹی کا نام تھا۔

''باسکٹ بال تو وال مارٹ پر بھی مل جائے گا..... اور..... وہاں پر تو سستا بھی ہوگا۔'' برکت نے خیال ظاہر کیا۔

''مجھے نارنجی رنگ کا باسکٹ بال چاہئے جو تانیہ کا پسندیدہ رنگ ہے۔ میرا نہیں خیال کہ وال مارٹ پر یہ رنگ موجود ہوگا۔'' مریم تیز لہجے میں بولی۔

''اگر وہاں نہ ہوا تو ہم واپسی پر ''کے پی'' اسٹور سے خرید لیں گے مگر پہلے وال مارٹ سے معلوم کرلو۔'' برکت نے اسے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ وہ عموماً ایسا ہی کرتی تھی چلتے چلتے لمحے بھر میں اپنے پروگرام میں ردوبدل کرلیتی تھی۔ آج بھی اس نے ایسا ہی کیا تو برکت کو اپنے ذہن پر بوجھ محسوس ہونے لگا۔

وہ اکثر سوچتا کہ شادی فٹ بال کے کھیل کی طرح ہے اور وہ اس کھیل میں فل بیک کی پوزیشن پر کھیل رہا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ فل بیک اپنی ٹیم کا بے کار آدمی ہوتا ہے۔

''واپسی پر'' کے پی اسٹور'' سڑک کی الٹی سمت ہوگا اور پھر ٹریفک کا دباؤ بھی بہت ہوتا ہے اس وقت رکنا مشکل ہوگا۔ تم بس ایک منٹ رکنا۔ میں یوں گئی اور بال لے کر یوں واپس آ گئی۔''

''دو سو پونڈ وزن کے ساتھ..... تمہاری پھرتی کے دن گئے۔'' برکت اس کے پھیلے ہوئے وزنی جسم کو دیکھتے ہوئے سوچ کر مسکرانے لگا۔

''وہ بال شاید صرف دو سو روپے کا ہوگا تم اتنے کھی چوس مت بنو۔'' وہ اسے مسکراتے دیکھ کر تیکھے لہجے میں بولی۔

''اور تم اتنی فضول خرچ مت بنو۔'' اس نے یہ صرف سوچا کیونکہ وہ یہ کہہ نہیں سکتا تھا مگر پھر بولا۔

''مجھے سگریٹ خریدو میں باہر ہی رک کر چند کش لگاتے ہوئے تمہارا انتظار کروں گا۔''

''اگر تم اپنے اس کش لگانے والے شوق سے جان چھڑا لو تو ہم ہر مہینے تقریباً ہزار روپے بچا سکتے ہیں۔ شاید کچھ زیادہ بھی۔'' اس کی بات سنتے ہی وہ بھڑک اٹھی۔

مریم اس سے پہلے بھی کئی دفعہ یہی بات دہرا چکی تھی مگر برکت ہمیشہ ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دیتا۔

''میں دن میں ایک پیکٹ ہی تو استعمال کرتا ہوں اور کبھی تو آدھے سے بھی کم۔'' وہ متمنایا حالانکہ وہ اس سے کہیں زیادہ سگریٹ پیتا تھا۔ یہ بات وہ جانتی تھی اور وہ خود بھی۔

بوجھل دل و دماغ کے ساتھ برکت نے کار کا رخ چپ چاپ ''کے پی اسٹور'' کی طرف موڑ دیا۔ جہاں کار کو پارکنگ کی طرف لے جانے کی بجائے اس نے اسٹور کے مین دروازے کی ایک طرف روکا۔ سورج سر کے عین اوپر تھا اور کار کا اے سی بھی معمولی کام کر رہا تھا۔ دونوں کا پسینہ پھوٹ پڑا۔ عقبی نشست پر ٹامی بھی ہانپ رہا تھا۔

''تم سگریٹ نوشی چھوڑ کیوں نہیں دیتے.....'' مریم پھر بولی۔

''اور تمہیں چکن کھانا چھوڑ دینا چاہئے۔'' وہ دھیرے سے بولا۔ وہ یہ کہنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ اپنے وزن کے بارے میں کتنی حساس ہے۔

''میں زیادہ نہیں کھاتی..... میرا مطلب ہے بہت زیادہ۔'' اس کا لہجہ سخت ہوگیا۔

''اب اندر جاؤ اور باسکٹ بال تلاش کرو..... مجھے سگریٹ پینے دو۔'' برکت نے جان چھڑانے میں ہی عافیت جانی۔

''کیا تم گھر پہنچنے تک کا انتظار نہیں کرسکتے..... اتنا ہی صبر نہیں ہے تم میں۔''

''تم جاؤ اور سستی چیز تلاش کرو۔''

''کیا تم کار کے اندر سگریٹ پیو گے..... سانس لینا مشکل ہوجائے گا۔'' وہ ناگواری سے بولی۔

''میں کھڑکی کھول دوں گا..... ہمیشہ ایسا ہی کرتا ہوں۔''

''میں بال لے کر ابھی واپس آتی ہوں۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ پچاس ساٹھ روپے کا زہر اپنے پھیپھڑوں میں اتارنا تمہارے لئے بہتر ہے تو پھر میں یہیں کار ہی میں بے بی کے ساتھ بیٹھوں گی اور تم اندر جا کر اپنے لئے سگریٹ لے آؤ۔''

جب وہ ٹامی کو بے بی کہہ کر پکارتی تھی تو برکت کو زہر لگتا تھا۔

''تم ہی اندر جاؤ..... میں یہیں باہر ہی ٹھیک ہوں۔'' وہ رکھائی سے بولا۔

''تم اول درجے کے گھٹیا ہو۔'' وہ کار سے اترتے ہوئے بولی اور جھٹکے سے کار کا دروازہ بند کردیا۔ کار سے نکلتے ہی وہ اسٹور کے اندر چلی گئی برکت اس

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ چلتے ہوئے اس کا فربہ جسم جس طرح بل کھا رہا تھا اس سے صاف ظاہر تھا کہ اب وہ بہت موٹی ہوتی جا رہی تھی۔

مریم کے جاتے ہی ٹامی عقبی سیٹ پر آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ برکت وہیں بیٹھا اس کا انتظار کرتا رہا۔ کچھ دیر بعد اس نے سگریٹ کی تلاش میں گلوکمپارٹمنٹ کھولا مگر وہاں سوائے ایک ٹافی کے کچھ نہ تھا۔ مایوس ہو کر اسے ہی کھول لیا مگر وہ بھی سخت ہو کر اکڑ چکی تھی شاید ہفتوں پرانی تھی۔ وہ ٹافی کار پر اتار کر عقبی سیٹ پر اچھالتے ہوئے بولا۔

''ٹامی..... کھاؤ گے؟''

ٹامی اسے چپ چاپ نگل گیا۔ برکت نے اپنا ہاتھ گاڑی کی سیٹ سے صاف کر لیا۔ یہاں مریم ہوتی تو اسے ضرور ٹوکتی۔ برکت نے پیٹرول میٹر کی طرف دیکھا اس کی سوئی نصف سے نیچے تھی۔ اگر وہ گاڑی کا انجن بند کر کے شیشے نیچے کر لیتا تھا تو اس طرح یقیناً کچھ پیٹرول تو بچ جاتا مگر وہ خود واقعی ''بھن'' جاتا۔ اب وہ اس گرمی میں یہاں بیٹھا مریم کا انتظار کر رہا تھا جو سو روپے کا باسکٹ بال خریدنے اسٹور کے اندر گئی تھی جب کہ یہی بال وہ ''وال مارٹ'' سے بھی اسی قیمت میں خرید سکتے تھے چاہے وہ سرخ یا پیلا ہوتا کیا فرق پڑتا ہے مگر اس شہزادی تانیہ کو تو صرف نارنجی چاہئے تھا۔

وہ کافی دیر بیٹھا انتظار کرتا رہا مگر مریم واپس نہ آئی۔ اس نے انجن بند کرنے کا ایک بار پھر سوچا تاکہ پیٹرول بچ جائے پھر اگلے ہی لمحے اس نے اس پروگرام کو یہ سوچتے ہوئے کینسل کر دیا کہ دفع کرو اس بچت کو، اس سے مریم نہ دبلی ہوگی نہ اس کو سگریٹ پینے دے گی کیا فائدہ بچت کا۔

اسی وقت اس کو عقبی آئینے میں ایک جوان عورت نظر آئی وہ دوڑتی ہوئی اس کی طرف آ رہی تھی۔ وہ مریم سے بھی زیادہ وزنی اور موٹی تھی اس کے نیلے لبادے کے نیچے اس کے بڑے بڑے کولہے نمایاں ہلتے نظر آ رہے تھے۔ اسے آتا دیکھ کر ٹامی بھونکنے لگا۔ وہ عورت کار کے قریب آ کر رک گئی اسے رکتے دیکھ کر برکت نے کھڑکی کا شیشہ تھوڑا نیچے کیا۔

''کیا تم اس موٹی عورت کے ساتھ ہو جو ابھی اندر گئی ہے۔ کیا وہ تمہاری بیوی ہے؟'' وہ ہانپتے ہوئے پوچھنے لگی۔ اس کے چہرے پر پسینے کے قطرے نمایاں تھے۔

''ہاں..... وہ میری بیوی ہے اور ہماری بھانجی کے لئے بال خریدنے گئی تھی۔''

''اس کے ساتھ ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔ وہ بے ہوش ہو کر گر گئی ہے۔ مسٹر گھوش کا خیال ہے کہ اسے دل کا دورہ پڑا ہے۔ انہوں نے 1122 کو فون کر دیا ہے بہتر ہے تم بھی اندر آ جاؤ۔'' موٹی عورت نے ایک ہی سانس میں ساری کہانی سنا دی۔

برکت نے گھبرا کر عجلت میں گاڑی کو لاک کیا اور اس کے پیچھے بھاگتا ہوا اسٹور میں چلا گیا۔ اندر ٹھنڈک تھی۔ مریم گیندوں والی ٹوکری کے قریب پاؤں پھیلائے فرش پر چت لیٹی تھی اس کے بازو پہلوؤں میں بالکل سیدھے تھے۔ آنکھیں بند تھیں یوں لگتا تھا جیسے سو رہی ہو۔ تین افراد اس کے قریب کھڑے تھے خاکی پینٹ اور سفید قمیض میں ملبوس ایک قدرے سیاہ رنگت والا آدمی جس کے سینے پر لٹکے ٹیگ پر لکھا تھا۔ ''مسٹر گھوش منیجر۔'' باقی دو لوگ گاہک تھے ایک دبلا پتلا بوڑھا آدمی جس کے سر پر زیادہ بال نہ تھے اس کی عمر ستر سال سے زائد معلوم ہوتی تھی۔ دوسری ایک موٹی عورت تھی وہ مریم اور اس نیلے لبادے والی عورت سے بھی زیادہ موٹی تھی۔ برکت نے سوچا فرش پر مریم کی بجائے اس موٹی عورت کو ہونا چاہئے تھا۔

''جناب.....! کیا آپ ان خاتون کے خاوند ہیں؟'' برکت کو دیکھتے ہی مسٹر گھوش نے پوچھا۔

''جی ہاں..... میں ہی ہوں۔'' برکت نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

''مجھے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے مگر میرا خیال ہے یہ مر چکی ہیں۔'' مسٹر گھوش نے بتایا پھر برکت کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی دوبارہ بولنے لگا۔ ''میں نے مصنوعی طریقے سے ان کا تنفس بحال کرنے کی کوشش کی، ان کا سینہ دبایا اور مسلا بھی اس کے علاوہ منہ کے ذریعے بھی سانس دینے کی کوشش کی مگر.....''

برکت ایک دم چونک گیا اور سوچنے لگا کہ اس گاڑھی رنگت والے نے اپنا منہ مریم کے ہونٹوں پر رکھا ہوگا۔ یہ سوچتے ہی وہ بوکھلا گیا اور گھٹنوں کے بل نیچے جھکا۔

''مریم.....!'' اس نے یوں پکارا جیسے وہ اسے گہری نیند سے جگانا چاہ رہا ہو۔

بظاہر مریم کی سانس چلتی محسوس نہ ہو رہی تھی مگر کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا۔ برکت نے اپنا کان اس کے منہ سے لگا کر سننے کی کوشش کی مگر کچھ سنائی نہ دیا۔

''اس شریف آدمی نے 1122 کو فون کیا ہے۔'' موٹی عورت جو ایک تھیلا اٹھائے ہوئے تھی قریب کھڑے بوڑھے آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

''مریم.....!'' برکت نے اونچی آواز میں چلانا چاہا مگر اس کی آواز حلق سے نہ نکل سکی۔ آس پاس جو لوگ کھڑے تھے ان کی طرف معذرت خواہانہ انداز میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ''یہ تو کبھی بیمار بھی نہیں ہوئی مکمل فٹ تھی۔''

''شاید تمہیں..... علم نہ ہو۔'' بوڑھا اپنا سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''کھڑے کھڑے ایک دم ہی نیچے گر گئی ایک بھی لفظ بولے بغیر۔'' نیلے لبادے والی نوجوان عورت بولی۔

''کیا اس نے گرنے سے پہلے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا تھا۔'' موٹی عورت پوچھنے لگی۔

''میں نہیں جانتی۔'' جوان عورت بولی۔ ''میں نے دیکھا نہیں..... یہ ایک دم ہی نیچے گر گئی۔''

گیندوں والی ٹوکری کے قریب ہی ٹی شرٹ کا ایک ریک پڑا تھا اس میں سے مسٹر گھوش نے ایک ٹی شرٹ اٹھائی اور بولے۔ ''کیا میں اس سے ان کا چہرہ ڈھک دوں؟''

''نہیں.....'' برکت چلا اٹھا۔ ''ہو سکتا ہے یہ صرف بے ہوش ہوئی ہو۔''

اس دوران میں اس نے دیکھا مسٹر گھوش کے پیچھے کچھ دور چند نوجوان کھڑے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ایک کے پاس موبائل فون تھا اور وہ اس سے ان کی تصویر لے رہا تھا۔ مسٹر گھوش نے برکت کی نظروں کے تعاقب میں گھوم کر اپنے پیچھے دیکھا تو نوجوانوں پر نظر پڑتے ہی وہ بدک اٹھے اور ہاتھ لہرا کر بیرونی دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چلائے۔

''بھاگو..... یہاں سے دفع ہو جاؤ۔''

نوجوان ہنستے ہوئے وہاں سے پلٹ کر بھاگے اور باہر نکل گئے۔ باہر سڑک پر ایک کار فراٹے بھرتے ہوئے گزری اس کی آواز برکت کو مریم کے دل کی دھڑکن کی طرح محسوس ہوئی۔

''ایمبولینس کہاں رہ گئی..... ابھی تک آئی کیوں نہیں۔'' بوڑھا آدمی فکرمندی سے بولا۔

برکت ننگے فرش پر اپنی بیوی کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھا ہوا تھا جس کی وجہ سے اس کی کمر اور گھٹنے دکھنے لگے تھے مگر وہ کھڑا نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ اس طرح وہ بھی تماشائی محسوس ہوتا۔

اس اثناء میں باہر ایک گہرے رنگ کی ایمبولینس ہوٹر بجاتی آ کر رکی جس پر کسی فلاحی تنظیم کا نام درج تھا۔ اس کے سامنے لفظ ''ایمبولینس'' الٹا لکھا ہوا تھا تاکہ آگے چلنے والی گاڑیاں اپنے عقبی آئینے میں اسے سیدھا پڑھ سکیں۔ سفید لباس میں ملبوس دو آدمی ایمبولینس سے اترے وضع قطع سے وہ کسی ہوٹل کے ویٹر نظر آ رہے تھے۔ ان میں سے ایک آکسیجن سلنڈر کو کھینچے لا رہا تھا۔

''سوری..... ہمیں کچھ دیر ہو گئی ابھی ابھی ایک کار ایکسیڈنٹ کے متاثرہ شخص کو اسپتال چھوڑ کر آ رہے

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

ہیں۔'' آگے چلنے والا شخص بولا جب کہ دوسرا جھک کر فرش پر پڑی مریم کا معائنہ کرنے لگا۔

''یہ تو زندہ ہے نا..... کیا یہ صرف بے ہوش ہے..... تم جلدی سے آکسیجن لگادو۔'' برکت نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کرڈالے۔

مسٹر گھوش نے ناامیدی کے انداز میں اپنا سر ہلادیا جب کہ نیلے لبادے والی عورت ہولے ہولے رونے لگی۔ برکت کا جی چاہا کہ آگے بڑھ کر اس سے رونے کی وجہ پوچھے مگر پوچھ نہ سکا کیونکہ وہ وجہ جانتا تھا۔

ڈاکٹر نے مریم کی آنکھوں کے پپوٹے الٹا کر آنکھوں کی پتلیاں دیکھیں، پھر آلہ لگا کر اس کا بلڈ پریشر چیک کیا۔ اس دوران میں کیمرے والا نوجوان اپنے چند دوستوں کے ہمراہ واپس آگیا اور وہ سب وہاں کھڑے ہوکر یہ منظر دیکھنے لگے، کچھ اور لوگ بھی اکٹھے ہوگئے شاید وہ ایمبولینس کی وہاں موجودگی سے متجسس ہوگئے تھے۔ مسٹر گھوش ایک دفعہ پھر ان نوجوانوں کی طرف اپنے بازو لہراتے ہوئے لپکے تو وہ نوجوان دوبارہ بھاگ گئے۔ مسٹر گھوش دوبارہ ہجوم میں آکھڑے ہوئے۔

''کیا یہ تمہاری بیوی ہے؟'' ڈاکٹر برکت سے پوچھنے لگا۔

''ہاں۔''

''مجھے افسوس ہے یہ مرچکی ہے۔'' ڈاکٹر نے اعلان کیا۔

''اوہ میرے خدا.....'' موٹی عورت سسک اٹھی۔

''اوہ.....'' برکت اٹھ کھڑا ہوا اس کے گھٹنے اکڑ چکے تھے۔

مسٹر گھوش نے ریک پر پڑی ایک ٹی شرٹ اٹھا کر ڈاکٹر کی طرف بڑھائی تاکہ وہ اسے مریم کے چہرے پر ڈال دے مگر وہ اسے نظرانداز کرکے باہر کی طرف چل پڑا۔ وہ ہجوم کو وہاں سے ہٹنے کے لئے کہتا ہوا ایمبولینس تک گیا اور اس کے عقبی حصے سے ایک اسٹریچر کھینچ کر باہر نکالا۔ بوڑھے آدمی نے لپک کر دروازہ کھولا اور اسٹریچر اندر آگیا۔

''برائے مہربانی، سب لوگ ایک طرف ہٹ جایئے۔'' ڈاکٹر کا اسسٹنٹ بولا اور پھر دونوں مریم کو اٹھا کر اسٹریچر پر ڈالنے لگے۔ برکت ان کو دیکھتا رہا۔ اسٹریچر پر بچھی چادر کا ایک پلو نیچے لٹک رہا تھا جسے اٹھا کر انہوں نے مریم کے جسم پر ڈال دیا۔ اب وہ فلموں میں دھکائی جانے والی لاشوں کی طرح نظر آرہی تھی۔ دونوں ڈاکٹر اسٹریچر کو دھکیلتے ہوئے باہر کی طرف چلے۔ اب دروازہ موٹی عورت نے کھولا۔ ہجوم راستہ دینے کے لئے ایک طرف سمٹ گیا۔ دونوں نے احتیاط سے اسٹریچر کو ایمبولینس میں رکھ دیا۔

ڈاکٹر کے اسسٹنٹ نے ایمبولینس کے ڈیش بورڈ سے ایک کلپ بورڈ اٹھایا اور برکت کے قریب آکر مریم کے متعلق مختلف سوالات پوچھ کر ایک فارم پر کرنے لگا۔

''ہم اس لاش کو سول اسپتال لے جارہے ہیں تم اپنی گاڑی میں ہمارے پیچھے آجاؤ۔'' اسسٹنٹ فارم کو دوبارہ ایمبولینس میں رکھتے ہوئے بولا۔

''میں راستہ جانتا ہوں۔'' برکت تیزی سے بولا پھر دوبارہ پوچھنے لگا۔ ''کیا تم اس کا پوسٹ مارٹم کروگے۔ اس کو چیر پھاڑ دوگے؟''

برکت کا سوال سن کر نیلے لبادے والی جوان عورت پھر سسک اٹھی۔ مسٹر گھوش نے اس کو اپنے ساتھ لپٹا کر دلاسہ دیا تو اس عورت نے اپنا چہرہ اس کی سفید قمیض پر رکھ دیا۔ برکت اسے غور سے دیکھنے لگا اسے مسٹر گھوش پر رشک آرہا تھا۔

''ہم اس کا فیصلہ نہیں کرسکتے، یہ تو اسپتال میں ڈاکٹر ہی بتائیں گے۔'' ڈاکٹر کے اسسٹنٹ نے برکت کی بات کا جواب دیا۔

''صاف نظر آرہا ہے کہ اس کو ہارٹ اٹیک آیا ہے، پوسٹ مارٹم کی کیا ضرورت ہے؟'' بوڑھی

عورت بول اٹھی۔

برکت کو یقین نہیں آرہا تھا کہ مریم اب اس اسٹریچر پر مردہ پڑی تھی حالانکہ ایک گھنٹہ پہلے وہ کار میں زور و شور سے بحث کررہے تھے۔

ایمبولینس وہاں سے روانہ ہوئی تو اس کی روشنیاں ابھی تک جل بجھ رہی تھیں مگر سائرن بند تھا۔ ہجوم منتشر ہونا شروع ہوگیا۔ بوڑھا آدمی، موٹی عورت اور مسٹر گھوش نے برکت کی طرف یوں دیکھا جیسے وہ کوئی اہم شخصیت ہو۔

''وہ..... یہاں ہماری بھانجی کی سالگرہ کے لئے ایک نارنجی رنگ کا باسکٹ بال خریدنے آئی تھی۔'' برکت بتاسفانہ لہجے میں بولا۔

مسٹر گھوش نے کچھ بولے بغیر گھوم کر ریک سے نارنجی رنگ کی ایک بال اٹھائی اور اسے برکت کے دونوں ہاتھوں میں تھمادیا اور بولا۔ ''یہ ہماری طرف سے لے جاؤ۔''

''شکریہ جناب.....'' برکت نے کوشش کی کہ اس کی آواز متوازن رہے۔ بوڑھی عورت اس کی بات سن کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

وہ سب چند لمحے وہاں چپ چاپ کھڑے رہے پھر مسٹر گھوش فریج سے ٹھنڈے مشروب کی بوتل نکال لائے اور گلاسوں میں ڈال کر ان کو دی۔ برکت اسے پیتے ہوئے مریم کو یاد کرتا رہا۔ وہ ان کو بتا رہا تھا کہ کیسے اپنی کشیدہ کاری کا ہنر دکھا کر مریم نے ایک مقابلے میں تیسرا انعام جیتا تھا۔ ''یہ 2002ء یا 2003ء کی بات ہے۔''

برکت آنکھیں موندے ماضی کو کریدرہا تھا۔

بوڑھی عورت نے اپنے تھیلے سے بسکٹ کا ڈبا نکالا اور سب کو تقسیم کرنے لگی جب کہ بوڑھا ان کو اپنی بیوی کے متعلق بتانے لگا۔

''میری بیوی بھی اللہ کو پیاری ہوچکی ہے۔ وہ ایک رات سونے کے لئے بیڈ پر لیٹی پھر صبح اٹھی ہی نہیں۔ ہم سینتیس سال شادی شدہ رہے۔ میں سمجھتا تھا کہ میں پہلے اس دنیا سے جاؤں گا مگر شاید یہ خدا کو منظور نہیں تھا وہ مجھے آج بھی اسی بستر پر لیٹی نظر آتی ہے۔''

اس اثناء میں گاہک دوبارہ اسٹور کے اندر آنا شروع ہوگئے۔ موٹی عورت نے برکت کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دلاسہ دیا اور باہر کی طرف چل دی۔ برکت نے دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھا مریم کو اسٹور کے اندر آئے دو گھنٹے بیت چکے تھے۔ اس وقت اچانک اس کو نامی یاد آیا۔ وہ فوراً باہر کی طرف لپکا۔ دروازہ کھولتے ہی لوکا جھونکا اس کے چہرے سے ٹکرایا گاڑی کے اندر بیٹھتے ہوئے جب اس نے اسٹیئرنگ وہیل کو چھوا تو تقریباً چیخ اٹھا اسٹیئرنگ وہیل شدید گرم تھا مڑ کر دیکھا تو عقبی سیٹ پر ٹامی عجیب سے انداز میں پڑا ہوا تھا اس کی آنکھیں ادھ کھلی تھیں اور زبان باہر لٹک رہی تھی صاف ظاہر تھا کہ وہ مرچکا ہے۔ برکت پریشان ہوگیا وہ تو اس کو بالکل بھول ہی گیا تھا اس پر افسردگی چھاگئی۔

''یہ بھی مریم کے ساتھ ہی چلا گیا۔'' وہ سوچنے لگا اس کا جی چاہا کہ زور زور سے چیخے۔ پھر ایک دم اس کو یاد آیا کہ اب وہ اپنی مرضی سے جب چاہے جہاں چاہے سگریٹ پی سکتا ہے یہاں گاڑی کے اندر اور گھر میں ڈائننگ ٹیبل پر بھی۔

باسکٹ بال اس کے ہاتھوں میں تھی وہ اس نے سیٹ پر رکھ دیا اور خود دوبارہ اسٹور کے اندر جاکر مسٹر گھوش سے کہنے لگا کہ وہ سگریٹ لینا بھول گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ مزید ہمدردی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مسٹر گھوش سگریٹ کا پیکٹ اس کو مفت میں تھمادیں گے مگر مسٹر گھوش کی ہمدردی کا وقت ختم ہوچکا تھا۔ انہوں نے سگریٹ کے پیکٹ کے ساتھ اس کا بل بھی اسے تھمادیا۔ اسپتال جاتے ہوئے برکت سگریٹ پیتا رہا کار کی کھڑکی اور ایئر کنڈیشنڈ چلا ہوا تھا اور اسکوٹو کنے والی پہلے ہی اسپتال پہنچ چکی تھی۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

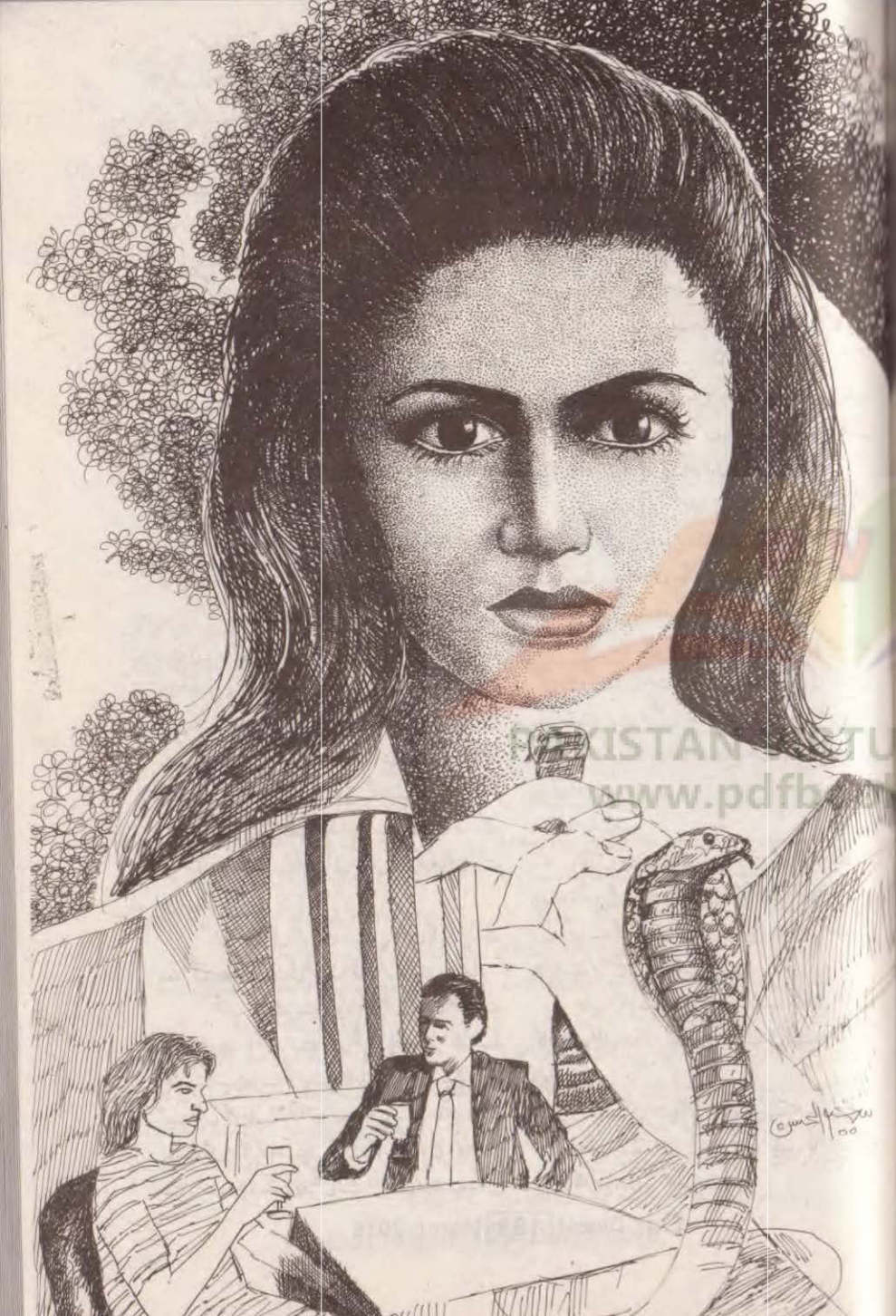

ضدی ناگن

ملک این اے کاوش-سلانوالی سرگودھا

قسط نمبر:3

نفسانی خواہشات کی بدولت خون کی ندیاں بہتی رہیں، ہر طرف ویرانی اور اداسی کا دور دورہ تھا، انا پرستی نے سب کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا، دل والے دل کے ہاتھوں بے چین تھے کہ اتنے میں حقیقت کھل کر سامنے آگئی، دل گرفتہ اور دل شکستہ داستان زندگی

خودغرضی، اور مطلب پرستی کی ناقابل یقین دل ودماغ کو تھرا دینے والی خونی کہانی

پنڈت پروہت نے مندر کے اندر بنے تہہ خانے کا معائنہ کروایا تو راجہ پرتاب سنگھ حیران وششدر رہ گیا تھا۔ اسے پنڈت پروہت کی ذہانت پر بہت رشک آیا۔ اس تہہ خانے کو تین دروازے رکھے گئے تھے۔ ہر دروازہ اپنے ساتھ ایک لمبی سرنگ لیے ہوئے تھا۔

تینوں سرنگیں مختلف سمتوں میں جا کر اختتام پذیر ہوتی تھیں۔ جن میں سے ایک سرنگ راجہ پرتاب سنگھ کے محل کے کمرۂ خاص میں جا نکلتی تھی۔ جس کا پتہ آج تک راجہ پرتاب سنگھ کو بھی نہ ہو سکا تھا۔ کمرۂ خاص میں راجہ پرتاب سنگھ اور اس کی رانی رجنی رہتے تھے۔

راجہ پرتاب کے کمرۂ خاص کے ساتھ والا کمرہ اس کے بیٹے اصفہان ناتھ اور مکشی ناتھ کا تھا۔ دونوں شہزادے ابھی بہت ہی چھوٹے تھے۔

پہلے تو اپنے کمرۂ خاص میں جانے والی سرنگ کو دیکھ کر راجہ پرتاب سنگھ کو خوب تاؤ چڑھا لیکن جب پنڈت پروہت نے اس سرنگ کو بنانے کی وجہ بتائی تو راجہ پرتاب سنگھ نے پنڈت پروہت کو کھینچ کر سینے سے چپکا لیا تھا۔

پنڈت پروہت نے بتایا کہ یہ سرنگ اس لیے بنائی گئی ہے کہ نامناسب حالات میں راجہ پرتاب سنگھ اپنی فیملی کو لے کر اس راستے سے بآسانی نکل سکے۔ یہ سرنگ سیدھی جا کر راجہ پرتاب سنگھ کے بیڈ کے نیچے ختم ہوتی تھی۔ بیڈ کے نیچے اعلیٰ قیمتی ریشمی قالین کے نیچے ایک چھوٹا سا لوہے کا ڈھکنا لگا دیا تھا۔ جسے اٹھاتے ہی نیچے لوہے کا زینہ عبور کر کے بآسانی بھاگا جا سکتا تھا۔

راجہ پرتاب سنگھ کو پنڈت پروہت کی وفاداری پر شک نہ تھا۔ وہ پنڈت پروہت کی وفا داری کا قائل تھا۔ لیکن پنڈت پروہت کے ساتھ کام کرنے والے اس کے لیے خطرہ بن سکتے تھے۔ دشمن کو بتا سکتے تھے کہ پنڈت پروہت کے مکان کے پیچھے بنے مندر میں کیسی قیمتی سرنگیں نکل رہی ہیں۔

دشمنوں کے ملکوں میں نکلنے والی سرنگیں عین ان کے محلوں کے اس جگہ بنائی گئی تھیں جہاں پر ان کے خزانوں کا انبار تھا۔ نجانے پنڈت پروہت کو ان کے محلات میں چھپائے خزانوں کا کیسے پتہ تھا۔ لیکن جلد ہی راجہ پرتاب سنگھ کو یاد آ گیا کہ اس کے سامنے براجمان پنڈت پروہت کوئی عام انسان نہیں بلکہ ایک گیانی دھیانی انسان ہے۔

جو نجانے کتنے ہی علوم پر دسترس رکھتا ہے۔ پلک جھپکتے میں آنکھوں کا کاجل چرا لیتا ہے۔ راجہ کے سینے میں ابلتے سوالوں کو شاید پنڈت پروہت نے پڑھ لیا تھا۔ اس لیے اس نے خود ہی اس کے سوالوں کا جواب دیا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"مہاراج آپ چنتا نہ کریں۔ میرے ساتھ یہاں کام کرنے والے انسان نہیں بلکہ میرے بیر تھے۔ جو ہمہ وقت میرے اشارے کے پابند رہتے ہیں۔ میں کسی طور بھی اس کام میں کسی منش پر وشواس نہیں کرسکتا تھا۔ مجھے آپ سے مسلک ہر کس و ناکس کی عزت اور جان و مال بہت عزیز ہیں۔"

پنڈت پروہت کی بات سن کر راجہ پرتاب سنگھ کے لبوں پر مسکراہٹ جلوہ گر ہوئی۔ اس نے مسکراہٹ سے پنڈت کے جواب کا شکریہ ادا کیا۔

"مہاراج وقت کا ضیاع ابھی ثابت ہوسکتا ہے۔ میرے خیال میں ہمیں اپنے کام کو اختتام تک پہنچانا چاہیے۔"

پنڈت نے اسے یاد دلاتے ہوئے کہا تو راجہ پرتاب سنگھ نے حیرت سے پنڈت کو دیکھا۔

"پنڈت جی آپ جیسے وفادار اور اچھے انسان کو کھونے کا من نہیں کررہا۔" راجہ پرتاب سنگھ نے بے چارگی سے کہا۔

"آپ مجھے کھو نہیں رہے بلکہ ایک ایسا جنم دے رہے ہیں کہ اس جنم میں میرا بڑھاپا بھی راستے کی دیوار نہیں بن سکتا۔ بس جب تک میری آتما میرے شریر کا حصہ ہے تب تک میرے لیے سانس تک لینا بہت کٹھن ہے۔" پنڈت پروہت نے راجہ پرتاب سنگھ کا داہنا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر دباتے ہوئے کہا۔

"ایک بار پھر مجھے وضاحت سے بتایئے کہ مجھے کیا کرنا ہے۔" راجہ نے ایک لمبی سانس کھینچ کر کہا تو پنڈت زیر لب مسکرادیا۔

"مہاراج میں اس چبوترے پر لیٹوں گا۔" پنڈت نے انگلی سے چبوترے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"آپ نے میرے شریر کو اچھی طرح سے جکڑنا ہے تاکہ اذیتِ اجل سے میرا شریر زیادہ پھڑ پھڑائے نہیں۔ جب میرے شریر سے سارا خون نکل کر نیچے رکھے ٹب میں بھر جائے۔ تو اس ٹب میں سے ساتھ رکھے پیالے میں لہو بھر کر وہ آپ نے پی جانا ہے۔ باقی ماندہ خون سے دشٹ دیوتا کے دیو ہیکل مجسمے کو اشنان دینا ہے۔ لیکن یاد رکھنا یہ کام جلدی سے کرنا ہے کیونکہ لیٹ ہونے کی صورت میں خون جم جائے گا اور اشنان نہیں ہو پائے گا۔"

پنڈت پروہت کی بات سن کر راجہ نے سر ہلا دیا۔ اس نے مصمم ارادہ کرلیا تھا کہ اپنے خاندان کے روشن مستقبل کے لیے وہ ہر قدم اٹھائے گا۔ چاہے اس کے راستے میں کیسی ہی دشواریاں کیوں نہ سر اٹھائیں۔ وہ ڈٹ کر ان کا مقابلہ کرے گا۔ پنڈت پروہت چبوترے پر لیٹ چکا تھا۔ راجہ نے آخری بار ترحم آمیز نگاہوں سے پنڈت پروہت کو دیکھا اور پھر اس کے اندر ایک جلاد نے سر اٹھانا شروع کردیا۔

☆.....☆.....☆

عالیہ اپنے کمرے میں شدید بھونچال کی زد میں آکر ٹہل رہی تھی۔ اس کا دل جس بات کو ماننے سے انکاری تھا۔ اس کا ذہن بار بار اسی پگڈنڈی کی طرف جاتا تھا۔

اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ حنا اسکیلٹر جمال کے پیچھے بائیک پر براجمان تھی۔ یہی نہیں بائیک سے اترنے کے بعد ان کے درمیان بات چیت ہوتی رہی تھی۔ چاہے اس کے بارے میں یا چاہے جو بھی۔

اسکیٹر کے چلے جانے کے بعد حنا اس کو پیچھے سے تکتی رہی تھی۔ اس وقت تک جب تک وہ اس کی نگاہوں کے سامنے سے اوجھل نہ ہوا تھا۔ دال میں ضرور کچھ کالا تھا یا پھر اس کا ذہن غلط راستے پر چل رہا تھا۔ اسے اپنی پیاری دوست پر اس کی امید تو نہ تھی۔ لیکن عورت کا ذہن ہوتا ہی ایسا ہے۔

حقائق جانے بنا اس کے ذہن میں غلط خیالات پیدا ہونا شروع ہوجاتے ہیں۔ شاذ و نادر تو ایسا ہوتا بھی دیکھا گیا ہے کہ عورتیں ایسے ہی خیالات اور شکوک کی بنا پر اپنے گرہستیوں کو تباہ کر بیٹھتی ہیں۔

عالیہ پیہم ٹہلے جارہی تھی۔ جب آناً فاناً کمرے کا دروازہ کھلا۔ دروازہ کھلنے کی آواز سنتے ہی جیسے وہ ساکت و جامد ہوگئی۔

"ہیلو۔ کیسی ہو میڈم؟" حنا نے چہکتے ہوئے پوچھا۔

عالیہ نے اس کی طرف ایک طائرانہ نگاہ ڈالی۔ پھر گویا ہوئی۔ "ٹھیک ہوں۔"

اس نے حقارت سے جواب دیا۔ حنا کو اس کا یہ لہجہ بہت ہی عجیب لگا۔ اس سے قبل اس نے کبھی اس کے ساتھ ایسے رویے میں بات نہ کی تھی۔ عالیہ کا یہ رویہ دیکھ کر حنا انگشت بدنداں رہ گئی۔

"آج خیر تو ہے، صبح صبح چہرے پہ بارہ کیوں بجے ہوئے ہیں تمہارے؟" حنا نے حیران ہوکر پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" عالیہ نے مختصر جواب دیا۔

حنا کو اس کا جواب بہت پھیکا محسوس ہوا۔ تبھی اس کے ذہن میں خیال آیا کہ کہیں عالیہ نے اسے جمال کے ساتھ تو نہیں دیکھ لیا۔ ممکن ہے اس کے ذہن میں کوئی غلط بات آرہی ہو۔ یہ خیال ذہن میں آنے کی دیر تھی کہ اس کا ماتھا ٹھنکا۔

"جانتی ہو تمہارے گھر تک کس کے ساتھ آئی ہوں؟" حنا نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"مجھے کیا معلوم تم کس کے ساتھ آئی ہو؟" عالیہ نے سفید جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔

"جمال بھائی کے ساتھ۔" حنا نے چہک کر جواب دیا۔

بھائی کا لفظ سن کر عالیہ نے ایک بار پھر حنا کو بغور دیکھا۔

"جانتی ہو میں نے بھائی سے بات کی ہے کہ عالیہ کے لیے رشتے آنے شروع ہوگئے ہیں۔ لیکن وہ بار بار جواب دیئے جارہی ہے۔ مگر وہ لڑکی ہے کب تک جواب دے سکتی ہے۔ اب اس کے پاس والدین کا سر جھکانے کی جسارت نہیں ہے۔ ممکن ہے آئندہ آنے والے رشتے پر وہ ہاں کردے۔" حنا نے فقرہ ادھورا چھوڑ کر کہا۔

اس کا خیال تھا کہ شاید عالیہ اس سے مزید کچھ پوچھے گی لیکن عالیہ کو چپ دیکھ کر اس نے خود ہی بولنا شروع کردیا۔

"تمہاری بات ٹھیک تھی عالیہ۔ بھائی نے کوئی ٹھوس جواب نہیں دیا لیکن میں اتنا جان گئی ہوں کہ بھائی کسی پریشانی میں مبتلا ہیں۔ میں تمہیں ایک مشورہ دوں گی کہ ایک بار بھائی سے مل کے ڈائریکٹ بات کرو۔"

حنا نے عالیہ کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ لیکن عالیہ کی سماعت سے جیسے اس کے الفاظ ٹکرا ہی نہیں رہے تھے۔ اس کا ذہن کسی اور طرف ہی گھوم پھر رہا تھا۔

"اے کہاں گم ہو تم۔ میں اینویں پاگلوں کی طرح بولے جارہی ہوں۔"

حنا نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہراتے ہوئے کہا تو عالیہ ہڑبڑائی۔

"کیا سوچ رہی ہو تم۔ میں نے کتنی باتیں کی ہیں لیکن تم نے میری ایک بات کا جواب بھی نہیں دیا؟"

حنا کی سوالیہ نگاہیں اس پر گڑی ہوئی تھیں۔

"کیا جواب دوں؟"

عالیہ نے اسے نفرت سے گھورتے ہوئے بولا۔ اس کا لب و لہجہ پہلے سے زیادہ تلخ ہوگیا تھا۔ حنا حیران و ششدر رہ گئی تھی کہ نجانے کیوں عالیہ اس کے ساتھ ایسا رویہ رکھ رہی ہے۔

"تم مجھے پس پشت دھوکہ دے رہی ہو۔" عالیہ نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

عالیہ کی آنکھوں میں نفرت اور شک دونوں جھانک رہے تھے۔ اس کی بات سن کر حنا کو اپنی سماعت پر وشواس نہیں ہو پارہا تھا۔ اس نے تخیل میں بھی نہیں سوچا تھا کہ اس کی بیسٹ فرینڈ اس کے بارے میں ایسے خیالات رکھتی ہوگی۔

"واٹ یو مین؟" حنا نے ورطۂ حیرت میں مبتلا ہوکر پوچھا۔

"تم دودھ پیتی بچی نہیں ہو۔ میں نے جو کچھ کہا ہے تم بہت اچھے سے سمجھ رہی ہو۔" عالیہ نے اس کے پاس سے کھڑے ہوکر کہا اور چلتی ہوئی کمرے کی کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئی۔

باہر سے آنے والی ہوا کے ٹھنڈے جھونکوں نے ایک بار اس کے دل و دماغ کو معطر کیا۔

"میں نے تمہیں آکاش کے پیچھے بیٹھے ہوئے دیکھا۔ پھر تم دونوں کھڑے آپس میں باتیں کررہے تھے۔ آکاش چلا گیا تو اس کے آنکھوں سے اوجھل ہونے تک تم اسے تکتی رہی۔ کیا یہ سب دھوکہ نہیں ہے تو اور کیا ہے؟"

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

عالیہ بات کرتے کرتے بھڑک اٹھی تھی۔ اس کی بات سن کر حنا بھی اپنی جگہ پر کھڑی ہوگئی تھی۔ عالیہ نے بات کرتے کرتے رخ اس کی طرف موڑ لیا تھا۔ جبکہ اس کی پشت کھڑکی کی طرف تھی۔

"عالیہ۔" حنا نے بے یقینی سے اسے پکارا۔

اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ اسے سمجھائے تو کیسے۔ اس نے تخیل میں بھی نہ سوچا تھا کہ عالیہ اس کے بارے میں ایسے خیالات ذہن میں رکھتی ہوگی۔ وہ تو جمال کو اپنا بھائی گردانتی تھی۔ اگر وہ اس کے ساتھ آئی تھی تو بھی اسی کی خاطر۔ اور اگر اس کے پاس کھڑے ہو کر اس نے کوئی بات کی بھی تھی تو اسی کے لیے ہی کی تھی۔

"دوبارہ کبھی بھی میری نگاہوں کے سامنے مت آنا۔ مجھے تم سے اور تمہارے اس بھائی سے دلی طور پر نفرت ہوگئی ہے۔" عالیہ نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"عالیہ تم۔" حنا نے عالیہ کی طرف بڑھتے ہوئے اس کا شک دور کرنا چاہا لیکن عالیہ نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔

"پلیز چلی جاؤ یہاں سے۔" عالیہ نے اس کی بات سنے بغیر دروازے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

عالیہ شدید جذباتی بھونچال کی زد میں آچکی تھی۔ وہ جو کچھ کر رہی تھی اپنی طرف سے ٹھیک کر رہی تھی۔ لیکن کہتے ہیں کہ جذبات کی رو میں بہنے والے جب سنبھلتے ہیں تو بالکل تہی دست ہو چکے ہوتے ہیں۔

حنا نے اس کی بات سن کر بمشکل خود پر قابو پایا بے شک آنسو اس کی آنکھوں سے تھمنے کا نام تک نہ لے رہے تھے۔ لیکن وہ اس کے باوجود خود پر کنٹرول کیے ہوئے تھی۔

اس نے دونوں لبوں کو جیسے ایک دوسرے کے ساتھ چسپاں کر دیا تھا۔ اس کے باوجود ایک دو بار اس کے منہ سے سسکیوں کی آواز نکلی تھی۔ اس نے ایک بار بغور منہ پھیرے عالیہ کی طرف دیکھا اور پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتی تقریباً دوڑتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

عالیہ اس کے بھاگنے سے پیدا ہونے والی آواز سن کر جان چکی تھی کہ وہ جا چکی تھی۔ عین اسی لمحے اس کے موبائل نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

بیڈ پر پڑے موبائل فون پر انسپکٹر جمال کا نمبر دیکھ کر اس نے کال بزی کر دی۔

دوسری طرف حنا روتی ہوئی جیسے ہی زینہ عبور کر کے نیچے اتری تو ریحانہ زوار (عالیہ کی والدہ) اسے دیکھ کر ٹھٹھکیں۔

انہوں نے اسے آواز دی لیکن حنا سنی ان سنی کر کے روتی ہوئی وہاں سے اسی رفتار سے چلتی بنی۔ جبکہ ریحانہ زوار حیرت سے اسے جاتا ہوا دیکھتی رہ گئیں۔ پھر اس نے ایک نظر اوپر کی طرف دیکھا کہ شاید اس کے پیچھے عالیہ بھی نیچے آئے لیکن چند ساعتوں تک اسے نہ آتا دیکھ کر انہوں نے زینے پر قدم رکھا۔

☆.....☆.....☆

صائمہ یونیورسٹی میں ایم اے اردو جبکہ زریں ایم ایس سی فزکس کر رہی تھیں۔ مہوش نے تو بمشکل ایف ایس سی کی تھی اور اس کے بعد تعلیم کو خیرآباد کہہ ڈالا۔ مہوش نے ایک پرائیویٹ ادارے سے کمپیوٹر کورس کیا جلد ہی اسے ایک ادارے میں بطور سیکرٹری کی جاب کی آفر ہوئی لیکن گلشن نے انکار کر دیا۔

وہ جانتی تھیں کہ آج کا ماحول اس قابل نہیں کہ جوان بچیوں کو مردوں کے درمیان جاب کرنے کی اجازت دی جاسکے۔

وہ خود ایک بار دھوکہ کھا چکی تھیں اور نہیں چاہتی تھیں کہ جو کچھ ان کے ساتھ ہوا ان کی کسی بچی کے ساتھ بھی ایسا ہو۔

جب گلشن نے اس جاب کی آفر کو مسترد کیا تو ایک بار پھر مہوش نے ایک بیوٹی پارلر کو جوائن کیا اور وہاں سے ٹریننگ لی۔ پھر گھر میں ہی پریکٹس شروع کر دی۔

ساتھ ساتھ اس نے ٹیوشن سنٹر بھی کھول لیا جہاں وہ میٹرک تک طلباء و طالبات کو ٹیوشن پڑھانے لگ گئی۔

جلد ہی اس کے پاس طلباء و طالبات کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا تو صائمہ اور زریں نے بھی اس کے ساتھ مل

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

کر انٹر اور بیچلر کی طالبات کو پڑھانا شروع کر دیا۔

گلشن کے دن بھی پھر آئے۔ پہلے جہاں وہ دن رات سلائی، کڑھائی کر کے بچوں کے اخراجات برداشت کرتی چلی آرہی تھیں۔ اب بیٹیوں کے جوان ہونے سے ان کا ہاتھ بھی بٹ گیا۔

قبل از وقت وہ قریب المرگ دکھائی دینے لگی تھیں۔

جب بیٹیوں نے کچھ ہاتھ بٹایا تو گلشن کی بھی سانس میں سانس آئی۔ ٹیوشن سے اتنی آمدن آرہی تھی کہ نہ صرف دونوں بیٹیوں کی پڑھائی کے اخراجات بآسانی نکل رہے تھے بلکہ گھر کے اخراجات بھی پورے ہونے لگ گئے تھے۔

مہوش نے ماں سے سلائی کا کام بھی سیکھ لیا تھا۔ وہ اکثر و بیشتر ماں کے ساتھ سلائی بھی کروا تی تھی۔ لیکن اس کے پاس زیادہ وقت نہ نکلتا تھا۔ کیونکہ دن بھر میک اپ کروانے والی لڑکیوں اور عورتوں کی آمد و رفت جاری رہتی تھی۔

گلشن نے اب پیسہ بچانا شروع کر دیا تھا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ جوان بیٹیاں ماں باپ پر بوجھ کی مانند ہوتی ہیں۔ باپ تو ان کا ویسے ہی ایک ظالم اور صفاک انسان نکلا تھا اب وہی ان کے لیے ماں اور باپ دونوں تھیں۔

زریں کو بھی اس نے اپنی سگی بیٹیوں کی طرح سمجھا ہوا تھا۔

وہ ہمہ وقت اسی ڈر اور خوف میں مبتلا رہتی تھیں کہ کبھی ان کی کسی بچی کے ساتھ ایسا حادثہ نہ پیش آجائے جو ان کی زندگی میں پیش آیا تھا۔

☆.....☆.....☆

بالآخر بڑی مشکل سے دونوں نے غنی بھائی کو راضی کر ہی لیا۔ غنی بھائی نے انہیں بتایا کہ سکندر ملک کس قدر خطرناک انسان ہے۔ اب چونکہ انہوں نے شیر کی کچھار میں ہاتھ ڈال ہی دیا ہے تو ہر ممکن مستعد ہو کر رہیں۔

سکندر ملک آتش کا پرکالا ہے۔ معافی والے لفظ سے اسے انتہائی نفرت ہے۔ خاص کر اپنے دشمن کو معاف کرنا تو اس کی خصلت نہیں ہے۔ وہ جلد باز نہیں ہے جب بھی وار کرتا ہے موقع دیکھ کر کرتا ہے اور کبھی بھی اس کا وار ضائع نہیں گیا۔

ہیبت خان سکندر ملک کا نہایت ہی قریبی دوست تھا۔ اس نے بھی سکندر ملک کے ساتھ غداری کی تھی لیکن زیادہ عرصہ حیات بھی نہ رہ سکا۔ سکندر ملک نے اس کا کیا حال کیا تھا۔ غنی بھائی اس کا عینی شاہد تھا۔ ان دونوں کے لیے سکندر ملک کوئی اہمیت نہ رکھتا تھا۔

ان کے لیے تو بس یہ بات اہمیت کی حامل تھی کہ غنی بھائی ان سے راضی ہو گیا تھا۔ غنی بھائی نے انہیں معاف کر دیا تھا۔

اس سے بڑھ کر ان کے لیے اور کیا بات ہو سکتی تھی۔ اس وقت بھی وہ دونوں غنی بھائی کے ساتھ باہر لان میں براجمان تھے۔ جبکہ غنی بھائی کے باقی کارندے ادھر ادھر پھر رہے تھے۔ کچھ چھت پر مستعد تھے۔ غنی بھائی کی یہ محل نما کوٹھی کم و بیش دس کنال پر مشتمل تھی۔

چاروں اطراف سے چار دیواری کافی اونچی بنائی گئی تھی۔ علاوہ ازیں جگہ جگہ خفیہ کیمرے نصب کیے گئے تھے۔

یہ کوٹھی جو کہ دو منزلہ تھی اور بیس منٹ بھی بنائی گئی تھی۔ علاوہ ازیں چاروں طرف سبزہ ہی سبزہ دکھائی پڑتا تھا۔

کوٹھی کا اندر سے نقشہ اس قسم کا بنایا گیا تھا کہ ایک عام آدمی اندر جا کر راستہ ہی بھول جائے کہ وہ کہاں سے آیا تھا اور واپسی کہاں سے جانا ہے۔

خاص کر گراؤنڈ فلور میں تو بے شک کوئی دو چار بار ہی کیوں نہ آیا ہو، آنے والا اکثر و بیشتر راستہ بھول جاتا تھا۔ کوٹھی کے اندر بھی جا بجا کیمرے نصب تھے۔

فرسٹ فلور اور سیکنڈ فلور بھی کچھ اس قسم کے ہی تھے۔ جبکہ بیس منٹ بالکل سمپل تھی لیکن اس کا راستہ سوائے غنی بھائی، زریاب اور وریام کے کسی کارندے تک کو معلوم نہ تھا۔

بیشتر کو تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ بیس منٹ ہے بھی کہ نہیں۔

کوئی بھی اس بات سے آشنا نہ تھا کہ بیس منٹ کس مقصد کے تحت بنائی گئی تھی۔ بیس منٹ کے اندر جدید اسلحہ کی فراوانی تھی جو اندرون و بیرون سپلائی کیا جاتا تھا۔

غنی بھائی اسلحہ کے ایک من مانا ڈیلر تھا لیکن آج تک کسی کی گرفت میں نہ آیا تھا۔ یہ اس کی خوش قسمتی سمجھ لی جائے یا پھر انتظامیہ کی غفلت۔ کالی بھیڑیں تو ویسے ہی ایسے افراد پر ہاتھ ڈالنے سے گھبراتی ہیں۔

دو نوٹ جیب میں کیا جاتے ہیں اپنے فرض منصبی سے ہی غافل ہو جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں غنی بھائی منشیات کے دھندوں میں بھی سرفہرست گردانا جاتا تھا۔ ٹرکوں کے حساب سے ہیروئن وہ اندرون و بیرون سپلائی کرتا تھا۔

اس وقت بھی ان تینوں کے درمیان کچھ ایسی ہی گفت و شنید کا سلسلہ جاری و ساری تھا۔ غنی بھائی انہیں آنے والے مہمان کے بارے میں انفارمیشن دے رہا تھا۔

"کل رات کی فلائٹ سے روپ بدل کر جکسی موہن لال آرہا ہے۔ ہمیں ہر ممکن طریقے سے اسے بخیر و عافیت یہاں لانا ہے۔ یہاں وہ ہمارے ساتھ ایک نہایت ہی اہم میٹنگ کریں گے۔ اگر وہ ہماری کارکردگی سے مطمئن ہو کر گئے تو دیکھنا جلد ہی ہم انڈیا میں بھی اپنے نام کا جھنڈا گاڑ دیں گے۔

جکسی موہن لال ہمیں استعمال کرنے کے لیے آرہا ہے اور اسی بات کا ہم نے فائدہ اٹھانا ہے۔

جکسی موہن لال ممبئی کا ایک من مانا غنڈہ ہے جس کی وحشت سے ہی لوگ ابدی نیند سو جایا کرتے ہیں۔" غنی بھائی نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے کہا۔

جو تھوڑی دیر قبل ہی ملازم ان کے سامنے لوازمات کے ساتھ رکھ کر گیا تھا۔

دوسری طرف زریاب فروٹ کیک کا ایک پیس اٹھائے چوہوں کے جیسے کتر کتر کر کھا رہا تھا۔ وہ ہمہ تن گوش غنی بھائی کی باتیں سن رہا تھا۔ اندر ہی اندر اس کا من جھلس رہا تھا۔

"جکسی موہن لال تیرا یہاں آنا تیرے لیے خوشی کا باعث ثابت نہیں ہوگا تیری موت تو میرے ہی ہاتھوں لکھی ہے۔ تو جتنا بڑا بھی غنڈہ ہے تجھے ایسی موت ماروں گا کہ تیری آتما بھی بلکتی رہے گی۔" زریاب نے متواتر فروٹ کیک کے پیس کو کتر کتر کر کھاتے ہوئے دل ہی دل میں کہا

"میں تم سے کچھ کہہ رہا ہوں زریاب۔" آناً فاناً اس کی قوت سماعت سے غنی بھائی کی بازگشت ٹکرائی تو اس نے چونک کر غنی بھائی کی طرف دیکھا۔

"کیا کہا تھا آپ نے؟" زریاب نے تھوک نگلتے ہوئے پوچھا۔

"کہاں کھو گئے تھے تم؟" غنی بھائی نے جواب دینے کی بجائے سوال داغا۔

"وہ ایسے ہی....." زریاب نے ٹال مٹول کرتے ہوئے کہا۔

اس کے لہجے میں شرمساری کا عنصر مترشح تھا۔

"جکسی موہن لال کو یہاں تک بخیر و عافیت پہنچانے کی ذمہ داری تمہاری ہوگی۔ اگر ان کا بال تک بھی بیکا ہوا تو اس کے ذمہ دار تم ہوگے۔ جان کی بازی لگا کر بھی ان کو یہاں تک پہنچانا لازمی ہے۔ وہ ہمارے لیے بہت اہمیت کے حامل ہیں۔" غنی بھائی نے بغور اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"وہ آئیں گے کہاں، یہاں سے یا کسی اور شہر سے ان کو لانا پڑے گا؟" زریاب نے پوچھا۔

"یہاں سے ہی ان کو پک کرنا ہے۔ ایئرپورٹ سے ان کو پک کرنا ہے۔" غنی بھائی نے وضاحت کی۔

"تو کیا ایئرپورٹ پر انہیں کوئی پہچاننے والا نہیں ہے؟" زریاب نے ایک اور سوال داغا۔

"ہم لوگوں کو کوئی کہیں بھی روکنے کی سکت نہیں رکھتا بس اپنی حفاظت کی خاطر کچھ نہ کچھ ضرور کرنا پڑتا ہے۔ ایئرپورٹ ہو یا بارڈر ہم ایسے عبور کرتے ہیں جیسے اپنے ہی گھر سے نکل کر اپنے ہی گھر میں داخل ہونا۔ اور تم لوگوں سے کچھ چھپا ڈھکا تو ہے نہیں۔" غنی بھائی نے زیر لب مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"مطلب ایئرپورٹ انتظامیہ کو اس کی آمد کی خبر ہے؟" اب کی بار وریام نے انگشت بدنداں آنکھوں سے غنی بھائی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

ایئرپورٹ انتظامیہ کو ہی نہیں ہمارے ملک کے کچھ افسران اعلیٰ کو بھی اس بات کی خبر ہے۔ جلد ہی جب جکسی

موہن لال ہمارے ہاں بخیر و عافیت پہنچ جائیں گے تو پھر افسران بالا کے ساتھ وہ ایک میٹنگ اٹینڈ کریں گے۔ جس میں وہ کچھ اہم امور پر نظر ثانی کریں گے۔" غنی بھائی نے خالی کپ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"اب سوالوں کا یہ سلسلہ ختم کرو اور چائے پیو ٹھنڈی چائے کا تو کوئی سواد نہیں رہتا۔"

دونوں نے چائے کے کپ اٹھا لیے تھے۔ ہر گھونٹ کے ساتھ لوازمات سے پیٹ پوجا بھی جاری تھی۔ پہلی بار زریاب اور وریام کی نگاہیں آپس میں بغل گیر ہوئیں۔ زریاب نے محسوس کیا کہ وریام بھی جکسی موہن لال کی آمد سے خوش دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

"میں سونے کے لیے جا رہا ہوں۔ کوئی آئے تو انفارم کر دینا۔ اور ہاں یاد سے جا کر اس ماسٹر سے ایک کروڑ لے کر آؤ۔ کوئی بات کرے تو اڑا ڈالنا سالے کو۔" غنی بھائی نے اپنی چیئر سے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

جواباً دونوں منہ سے تو کچھ نہ بولے لیکن اپنے سر ہاں میں ہلا دیے۔

غنی بھائی کے جانے کی دیر تھی کہ دونوں ایک دوسرے کے اور قریب ہو گئے۔ زریاب نے وریام کو اشارہ کر کے اس چیئر پر بیٹھنے کو کہا جس پر غنی بھائی براجمان تھے۔ وریام نے ایک نگاہ کوٹھی کی سمت ڈالی۔

غنی بھائی جا چکا تھا۔ وہ آرام سے اٹھ کر اس چیئر پر آ کر بیٹھ گیا۔

"تم کیا سمجھتے ہو وریام جکسی موہن لال کا آنا خیر کی علامت ہے؟" زریاب نے وریام کے بیٹھتے ہی سوال داغا۔

"دفعہ کر یار مجھے تو نفرت سے ایسے لوگوں سے۔ ان کے نام سے بھی نفرت ہے۔ میں اس بات کو اچھا نہیں سمجھتا کہ ہمارے ملک کی ساکھ کو نقصان پہنچے۔ یہ ملک ہمارے لیے ماں کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کی مٹی سے سے دھوکہ..... چھی چھی چھی..... میں کسی طور ایسا نہیں کر پاؤں گا۔

ایک ناپاک وجود کو ہم کس طرح اپنی دھرتی پر قدم رکھنے کی اجازت دے سکتے ہیں۔ اس ناسور کو وہیں اڑا ڈالیں گے۔" وریام نے غم و غصے کی زیادتی کے باعث پیچ و تاب کھاتے ہوئے کہا۔

"مجھے خوشی ہوئی تمہاری بات سن کر وریام۔ لیکن ہم جلد بازی نہیں کریں گے بلکہ اب کی بار ایک ایسی گیم کھیلیں گے کہ تم ہکا بکا رہ جاؤ گے۔" زریاب نے وریام کی طرف بغور دیکھ کر کہا۔

اس کی بات سن کر وریام کی آنکھیں چنداں پھیل گئیں۔

"کیسی گیم؟" وریام نے حیران و ششدر ہو کر پوچھا۔

"دھیمی آواز میں بولو۔" زریاب نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔

"ہمیں جکسی موہن لال کا ہمشکل ان چند گھنٹوں میں ڈھونڈنا ہے۔ یا کوئی ایسا انسان تلاش کرنا ہے جو ہمیں جلد سے جلد ایک ایسا ماسک تیار کر کے دے جسے پہننے والے کو کوئی بھی نہ پہچان پائے کہ وہ اصل جکسی موہن لال ہے یا اس کا بہروپیہ۔"

"کیا بات ہے تمہاری۔" وریام نے زریاب کی بات سن کر خوشی سے تقریباً چہکتے ہوئے کہا۔

"ہمیں ابھی سے اپنا کام شروع کرنا ہوگا۔" زریاب نے کہا۔

"لیکن ماسک یا بہروپیہ مل گیا تو پھر؟" وریام نے سوال داغا۔

"پھر جو پلاننگ ہے وہ تمہیں بعد میں بتاؤں گا پہلے ٹائم کا ضیاع کرنے کی بجائے ہمیں اپنے کام کا آغاز کرنا چاہیے۔" زریاب نے جواب دیا۔

☆.....☆.....☆

عالیہ کی والدہ ریحانہ زوار عالیہ کے کمرے میں پہنچی تو وہ کھڑکی میں کھڑی تھی۔ انہوں نے آنکھیں بند کی ہوئی تھیں۔ اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ شاید وہ دل پر دھرے پر بوجھ کو ختم کرنے کی سعی کر رہی تھی۔

"کیا بات ہے بیٹا؟" ریحانہ نے اسے پکارا تو اس

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

نے جھٹ سے آنکھیں کھول کر مڑ کر ماں کی طرف دیکھا۔

"حنا کو کیا ہوا ہے وہ ایسے روتی ہوئی کیوں گئی ہے یہاں سے۔ کیا کوئی بات ہوئی ہے تمہارے مابین؟"

ریحانہ نے اسے سوالیہ آنکھوں سے گھورتے ہوتے پوچھا۔ ریحانہ کی نگاہیں عالیہ کے چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں۔

"کچھ نہیں امی۔" عالیہ نے ماں کو ٹالتے ہوئے کہا۔

"لیکن کچھ تو ہے جس کی وجہ سے وہ اس طرح روتی ہوئی یہاں سے گئی ہے۔ میں نے اسے پکارا بھی لیکن وہ رکی نہیں؟" ریحانہ کو ابھی تک اس کی کسی بات پر یقین نہیں آرہا تھا۔

"کہا نا امی کہ کچھ نہیں بس آپ دفع کریں اس بات کو۔" عالیہ نے متواتر ماں کو ٹالتے ہوئے کہا۔

قبل اس کے کہ دونوں میں سے کوئی بات شروع کرتا ایک بار پھر عالیہ کے موبائل فون نے دونوں کو چونکایا۔ عالیہ نے موبائل فون کی اسکرین پر نگاہ ڈالی تو حنا کے والد کی کال تھی۔

"کس کی کال ہے؟" ریحانہ نے پوچھا

"حنا کے والد کی۔" عالیہ نے مختصر سا جواب دیا۔

"لاؤ مجھے دو میں سنتی ہوں۔" ریحانہ نے کہا اور موبائل خود ہی آگے بڑھ کر بیڈ سے اٹھالیا۔

کال ریس کر کے انہوں نے موبائل کان سے لگایا۔

"السلام علیکم۔!" ریحانہ نے موبائل کان سے لگاتے ہوئے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام!" حنا کے والد نے جواب دیا۔

"ریحانہ بہن بات کر رہی ہو؟"

حنا کے والد نے آواز پہچان کے پوچھا۔ "جی ہاں بھائی ریحانہ بات کر رہی ہوں۔"

ریحانہ نے جواب دیا۔ عالیہ نے بغور ماں کی طرف دیکھا۔ وہ ماں کے چہرے کے بدلتے نقوش دیکھ کر اندازہ لگانا چاہتی تھی کہ حنا نے گھر جا کر کوئی مسئلہ تو پیدا نہیں کر دیا۔

"بہن آپ کو بتانا تھا کہ حنا کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ جنرل ہسپتال میں لے گئے ہیں۔ کسی اللہ کے بندے نے ہماری بیٹی کو وہاں پہنچا دیا ہے۔ ابھی ڈاکٹر کی کال آئی کہ اس کی حالت نازک ہے۔ حنا کی والدہ کا رو رو کر برا حال ہے۔ اگر آپ لوگ آجاتے تو تھوڑا دلاسہ مل جاتا۔" بات کرتے کرتے حنا کے والد نے تقریباً رونا شروع کر دیا تھا۔

"کیا حنا کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے؟" ریحانہ نے حیرت سے بوکھلاتے ہوئے پوچھا۔

حنا کے ایکسیڈنٹ کا سن کر عالیہ کے بھی رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اسے یوں لگا جیسے اس کا دل پسیج کر مٹھی میں آگیا ہو۔

"بھائی آپ لوگ فکر مت کریں ہم ابھی آجاتے ہیں۔ عالیہ بھی ساتھ آئے گی۔"

ریحانہ نے حنا کے والد کو دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

"آخر کیا کہا ہے تم نے اسے جو اتنا بڑا مسئلہ بن گیا ہے۔ اگر حنا کے ساتھ کچھ ہو گیا تو ساری زندگی تمہیں معاف نہیں کروں گی۔" ریحانہ نے غصے سے پیچ و تاب کھاتے ہوئے کہا اور موبائل عالیہ کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔

"فوراً نیچے آؤ اظہار ابھی ڈیوٹی سے واپس آیا ہے۔ اسے کہتے ہیں گاڑی نکالے۔"

اتنا کہہ کر ریحانہ تو وہاں سے چلتی بنیں لیکن عالیہ اپنے کیے پر شدید پشیمان ہو کر رہ گئی تھی۔ اس نے غصے میں بہت کچھ کہہ دیا تھا۔ اس نے اپنی پیاری دوست پہ شک کیا تھا یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ اس کے ساتھ کتنی مخلص ہے۔

جمال کو وہ بہن کہتی تھی اور اس نے عالیہ کو یقین دلانے کی لاکھ کوشش کی تھی لیکن اس کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی تھی۔ وہ اپنی ہی نظروں سے گر گئی تھی۔ اسے اپنے کیے پر اتنا پچھتاوا ہو رہا تھا کہ آنسو چھلک پڑے تھے۔ اس کا من چاہ رہا تھا کہ دیواروں سے ٹکریں مار مار کے روئے لیکن جو کچھ اس نے کیا تھا اس طرح سے اس کا ازالہ ہونے والا نہیں تھا۔

اس سب کا ازالہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ وہ نہ صرف حنا کی سلامتی کے لیے دعا گو ہو بلکہ اس سے معافی بھی مانگے۔ اس نے ایک وقت میں دو گناہ کیے تھے۔ ایک تو اپنی جان سے پیاری دوست پر شک کیا تھا جبکہ دوسری

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

طرف اس نے اپنی محبت پر بھی شک کیا تھا۔

اس کے پاس سوائے پچھتانے کے کچھ نہ رہ گیا تھا۔ عالیہ بیڈ پر تقریباً ڈھے سی گئی اور پھر اس نے دھواں دھار رونا شروع کر دیا۔ لیکن اس کے رونے سے بیتے حالات و واقعات پلٹ تو نہیں سکتے تھے۔

☆.....☆.....☆

زریاب کے دل میں زریں کے پیار نے برگد کے درخت کی طرح اپنی شاخیں پھیلا دی تھیں۔ وہ تو پاگل ہی ہو گیا تھا۔ جس دن اسے زریں دکھائی نہ دیتی۔ اس دن گویا اس کی حالت مرغ بسمل کی سی ہو جاتی۔ اس کا من کرتا کہ ہر چیز کو آگ لگا کر رکھ دے۔

آج بھی صبح ہی صبح وہ تیار ہو گیا۔ وریام اس کی کیفیت سے آشنا تھا۔ اس نے کتنی ہی بار اسے سمجھایا تھا کہ اپنی حرکتوں سے باز رہے لیکن مجال ہے اس کے کانوں پر جوں تک رینگ جائے۔ وہ تو بس بادلا ہوئے جا رہا تھا۔ وریام بیڈ پر دراز اسے تیار ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

زریاب کنگھی بھی کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ گنگنا بھی رہا تھا جبکہ وریام بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے اسے پیہم تکے جا رہا تھا۔ زریاب نے ایک آنکھ دبا کر اسے دیکھا۔ اور اشارے سے پوچھا کہ وہ کیسا لگ رہا ہے۔

"بالکل پاگل۔" وریام نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

"ایک ایسا پاگل جسے اپنا کوئی خیال ہی نہیں۔ اسے یہ بھی نہیں معلوم کہ جس کے لیے وہ روز بن سنور کے جاتا ہے۔ آیا وہ بھی اس کے لیے کوئی دل میں جذبات رکھتی ہے۔ یا ایسے ہی پاگلوں کی طرح وہ روز بن سنور کے جاتا ہے۔"

"تو فکر مت کر بس دیکھتا جا۔ اگر میرا پیار سچا ہوا تو دیکھنا آج وہ مجھے اظہار کیے بنا نہیں جائے گی۔" زریاب نے اس کی بات سن کر جواب دیا۔

"آج۔" وریام نے حیرت سے پوچھا۔

"کیوں آج ایسی کیا بات ہے جو وہ تمہارے پیار کا اظہار کرے گی؟"

وریام کی بات سن کر وہ اس کے قریب آکر بیڈ پر بیٹھ گیا اور سرگوشیانہ لہجے میں بولا: "آج میں اس سے اظہار محبت کروں گا۔ تم میرے ساتھ ہو گے۔ دیکھنا کہ کیسے وہ میری چاہت کا جواب چاہت سے دیتی ہے۔"

زریاب کی بات سن کر وریام کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ زریاب کی ضد سے بخوبی آشنا تھا۔ لیکن وہ زریاب کو کوئی ایسا قدم اٹھانے نہیں دینا چاہتا تھا جس سے کوئی گڑبڑ ہو کیونکہ حالات آج کل کچھ الٹی ڈگر پر چل رہے تھے۔

"تیرا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا جو ایسی حرکت کرے گا۔ تو جانتا ہے کہ تو کیا کہہ رہا ہے۔ وہ ایک پڑھی لکھی باشعور اور باعزت گھرانے کی لڑکی ہے اور تو..... تو کیا ہے۔ سڑک چھاپ۔ سالے وہ تیری چاہت کا جواب تو تھپڑ سے دے گی۔" وریام غصے سے بولا۔

"اگر اس نے ایسا کیا تو وہیں بیچ چوراہے پر اس کی جان لے لوں گا۔" زریاب نے ہونٹ بھینچتے ہوئے کہا۔

"کسی سے زبردستی محبت کے بول اگلوانے کو محبت کا نام نہیں دیا جا سکتا زریاب۔" وریام نے اس کا غصہ ٹھنڈا کرتے ہوئے کہا۔

جواباً زریاب اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ وریام نے حیرت سے اسے گھورا۔ "میں نیچے گاڑی میں تیرا انتظار کر رہا ہوں۔ فوراً ہاتھ منہ دھو کے نیچے آؤ۔"

زریاب چٹکی بجا کر اسے حکم دیتے ہوئے بولا اور اگلے ہی لمحے وہ کمرے سے نکل گیا جبکہ وریام حیرت سے اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہ گیا۔

جلد ہی دونوں اس چوراہے پر پہنچ گئے جہاں سے گزر کر روزانہ صائمہ اور زریں یونیورسٹی آتی جاتی تھیں۔ ان کے آنے کا وقت ہوئے جا رہا تھا۔ جیسے جیسے سے بیت رہا تھا وریام کا دل ہول رہا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ زریاب کچھ ایسا ویسا نہ کر دے۔ وہ کسی قسم کا لفڑا اڈالنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ زریاب نے اسے گاڑی میں ہی بٹھایا تھا اور خود اکیلا گاڑی سے نکل کر چوراہے پر کھڑا ہو گیا تھا۔

مارکیٹیں کھلی ہوئی تھیں۔ آتے جاتے لوگ اسے

بغور دیکھ کر گزر جاتے تھے۔ ہر کس و ناکس کو اس کے بارے میں علم تھا۔ زریاب زیادہ بحث پسند نہیں کرتا تھا بلکہ گولی مار کے سیدھا کام تمام کر دیتا تھا۔ مارکیٹ میں رہنے والے دکاندار اور آتے جاتے لوگ اسے بس کن انکھیوں سے گھور رہے تھے۔ لیکن کسی میں اتنی جرأت نہ تھی کہ کوئی اس سے کچھ کہہ سکتا۔

زریاب نے ڈریس پینٹ شرٹ پہن رکھی تھی۔ ہلکی خوشبو والا کوئی سینٹ بھی لگا رکھا تھا۔ سامنے کی جیب میں پہلی بار اس نے ایک نہایت ہی خوبصورت پنسل پھنسائی ہوئی تھی۔ جبکہ اوور کوٹ کے نیچے ہولسٹر میں دو پسٹل گولیوں سے بھرا ہوا تھا۔

ابھی اسے وہاں انتظار کرتے ہوئے تھوڑا ہی وقت گزرا ہوگا کہ صائمہ اور زریں آ گئیں۔ جلدی سے وہ اس جگہ کھڑا ہو گیا جہاں سے ان دونوں نے گزرنا تھا۔ جیسے ہی وہ اس کے پاس سے گزرنے لگیں۔ اس نے جھٹ سے زریں کی کلائی تھام لی۔ اس کی اس حرکت کو دیکھتے ہی وریام سرعت سے گاڑی سے باہر نکلا لیکن تب تک بھری مارکیٹ کے سامنے زریں نے ہاتھ چھڑوا کر ایک زوردار طمانچہ اس کے گال پر رسید کیا۔

زریاب کو دن دیہاڑے تارے دکھائی دینے لگے تھے۔ وہ یہی سمجھتا تھا کہ اس کے نام سے ڈرنے والے لوگوں میں کہاں اتنی جسارت کہ اس کے سامنے دم بھی ہلا سکیں لیکن زریں کے طمانچے نے اس کے نظریے کو غلط کر دکھایا تھا۔ کتنے ہی لوگوں نے یہ منظر دیکھا تھا۔ وہ سب پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ سب دیکھ کر حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہو گئے تھے۔

"حرام زادے کیا تیرے گھر میں ماں بہن نہیں۔ آیا بڑا ہیرو بننے۔ کل کو اگر کوئی تیری ماں بہن کی کلائی اس طرح تھام لے تو تیرے لیے تو ڈوب کر مرنے کا مقام ہوگا۔ لیکن تجھے غیرت کہاں سے آئے گی تو تو خود ہی بے غیرت دکھائی دیتا ہے۔ جو ایسی گھٹیا حرکت کرنے کی جسارت کر سکتا ہے اس کے اندر غیرت کا مادہ بھلا کہاں سے آ سکتا ہے۔" زریں نے چٹکی بجا کر مٹھی بند کر کے شہادت کی انگلی زریاب کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔

ایسی بے عزتی آج تک زریاب کی کسی نے نہ کی تھی۔ ہر کس و ناکس کو زریں کی جرأت پر حیرانگی ہو رہی تھی۔ سب کی حیرت میں ڈوبی نگاہیں زریں کے چہرے کا کبھی طواف کرتیں تو کبھی زریاب کے چہرے کا جو غصے سے پیچ و تاب کھا کر رہ گیا تھا۔

وریام پہنچ چکا تھا۔ اس نے جاتے ساتھ ہی زریاب کو کنٹرول کر لیا تھا۔ لیکن زریاب نے جھٹکا مار کر خود کو چھڑا لیا۔ وریام نے دوبارہ اسے پکڑنا چاہا لیکن اس نے ہاتھ کا اشارہ کر کے اسے روک دیا۔

زریاب سیدھا زریں کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ صائمہ کا دل ماہیٔ بے آب کی مانند دھڑکے جا رہا تھا۔ لیکن زریں کو جیسے کوئی فکر ہی نہ تھی۔

"میں چاہوں تو ابھی تمہیں مسل کر رکھ دوں۔ تم شاید جانتی نہیں کہ میں کون ہوں؟" زریاب نے کھا جانے والی آنکھوں سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"تم ایک بدچلن، آوارہ اور نہایت ہی گھٹیا انسان ہو۔ جس کو کسی کی عزت کا کوئی خیال نہیں ہے۔ کبھی تنہائی میں اپنی ماں یا بہن کے بارے میں سوچنا کہ اگر سرِ راہ کوئی ان کا بازو تھام لے تو اس وقت ان پر کیا بیتے گی اور ان کا ردِعمل کیا ہوگا؟" زریں نے زریاب کی بات کا جواب متواتر غصے سے دیا۔

صائمہ اسے دھکیل رہی تھی کہ کسی طرح وہ یہاں سے چلے کیونکہ ہر کسی کی نگاہیں انہی پر مرکوز ہو کر رہ گئی تھیں۔

پھر زریں کوئی مزید بات کیے صائمہ کے ساتھ چل دی جبکہ زریاب انہیں جاتا ہوا دیکھتا رہ گیا۔ جب تک دونوں نظروں سے اوجھل نہ ہو گئیں وہ انہیں دیکھتا رہا۔ جیسے ہی وہ نظروں سے اوجھل ہوئیں اس نے چہار سو نگاہ دوڑائی۔ ایک مجمع سا لگ گیا تھا۔

"کیا دیکھ رہے ہو تم لوگ۔ یہاں کوئی تماشہ لگا ہوا ہے۔ جاؤ دفع ہو جاؤ اور اپنے اپنے کام کرو۔" زریاب نے سب کو مخاطب کر کے کہا تو لوگ سرعت سے ادھر ادھر بکھر گئے۔

☆.....☆.....☆

زہرش جیسے ہی اپنے کمرے سے باہر نکلی اس کی نگاہ ٹی وی لاؤنج میں براجمان سدرہ بی بی اور سمعیہ (ماں) اور دونوں صوفے پر براجمان آپس میں گفت و شنید کر رہی تھیں۔

دونوں کی پشت اس کی طرف تھی جس کی وجہ سے وہ دونوں اسے دیکھ نہ پائی تھیں۔ اس کا من چاہا کہ ابھی جا کر اپنی پھوپھو کا ہاتھ پکڑ کر گھر سے باہر نکال پھینکے۔

پھر اس نے کان لگا کر ماں اور پھوپھو کے درمیان ہونے والی گفتگو کو سننا چاہا تو جیسے ہی پھوپھو کے الفاظ اس کی قوتِ سماعت سے ٹکرائے۔ اس کا سارا غصہ رفو چکر ہو گیا۔

"سمعیہ میں تم لوگوں کے احسانوں کے بوجھ تلے سر تا پاؤں دبی ہوئی ہوں۔" میرا بیٹا اس بات کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ کسی شہری لڑکی کے چکر میں پڑ گیا ہے۔ لیکن میں بھی اسے فیصلہ سنا چکی ہوں کہ مجھ سے وابستہ ہر رشتہ ختم کر کے ہی وہ اس لڑکی کو اپنائے گا۔

میں یہاں اس لیے آئی تھی کہ بھائی سے ملاقات ہو اور ان کو ساری بات بتاؤں تاکہ وہ اس لڑکی کے گھر والوں سے جا ملیں اور انہیں کہیں کہ اپنی اس بے لگام بیٹی کو لگام ڈال کے رکھیں۔" سدرہ بی بی کے لہجے میں غم و غصے کی آمیزش تھی۔

"آج کی اولاد بہت تیز ہے سدرہ۔ میں اس بات کو بہت اچھی طرح سے جانتی ہوں کہ تم ہمارے لیے کیسے جذبات رکھتی ہو لیکن رہی بات جمال کی تو وہ آج کی نئی پود ہے۔ نئی پود ویسے بھی بے لگام ہے۔

تھوڑی سی بات پہ ناک بھوں چڑھانے والی۔ ماں باپ کی معمولی سی بات سے گھر چھوڑ جانا، خودکشی کر لینا یہ معمول بن گیا ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ تم نے اپنے بیٹے کی نگہداشت کرنے میں کسی بھی قسم کا دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا لیکن بہتر ہے تم اسے ویسا ہی کرنے دو جیسا وہ چاہتا ہے۔ رشتے آسمانوں پر بنتے ہیں۔

اگر تو ان دونوں کا جوڑا آسمانوں پر بنایا جا چکا ہے۔ تو ہم کسی بھی طرح کی ناراضگی کا اظہار نہیں کریں گے۔

میں جانتی ہوں کہ تمہارے دل میں یہ بات کلبلا رہی ہے کہ ہم لوگ کہیں گے کہ جب بیٹے کو اقتدار ملا تو دونوں ماں بیٹے کے تیور ہی بدل گئے۔ تو یاد رکھنا کہ میں نے سدا تمہیں اپنی بہن اور جمال کو اپنا بیٹا مانا ہے اور اس رشتے میں کبھی دراڑیں نہیں پڑیں گی۔"

سمعیہ کی بات سن کر سدرہ بی بی سمیت زہرش بھی چونک اٹھی۔

قبل اس کے کہ وہ کچھ بولتی مقصود احمد آن وارد ہوئے۔

"ارے آج یہ کیا کھچڑی پک رہی ہے نند بھابھی کے درمیان۔" مقصود احمد نے پاس ہی صوفے پر براجمان ہوتے ہوئے کہا۔

بہن کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر مضطرب ہو گئے۔

"ارے یہ کیا.....؟ کیا ہوا خیریت تو ہے ناں، سدرہ کوئی پریشانی تو نہیں ہے؟"

پھر سدرہ بی بی نے انہیں ساری بات سے آشنا کیا۔ ان کے آنسو متواتر جاری و ساری تھے۔ مقصود احمد ساری بات سن کر چونکے ضرور لیکن ان کی پیشانی پر شکن تک نہ آئی۔

"بس اتنی سی بات۔" مقصود احمد بمشکل تمام اپنے جذبات پر قابو رکھ کر بولے۔

"تو کیا ہوا اگر ہمارا بچہ زہرش کی بجائے کسی اور سے رشتہ کرنا چاہتا ہے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میری بہن وہ ہمیں ہماری بیٹی کی طرح پیارا ہے۔ کیونکہ میں نے اپنے ہاتھوں میں اسے کھلایا پلایا ہے۔"

زہرش مقصود کے لیے تو یہ سب باتیں چونکا دینے کے لیے کافی تھیں۔ اس کے اشک تھے کہ رکنے کا نام نہ لے رہے تھے۔ وہ بے قدموں واپس کمرے میں لوٹ گئی اور ایک بار پھر دروازہ بند کر کے زار و قطار رونا شروع کر دیا۔

اس کے من کی نگری ویران ہو چکی تھی۔ جس کی خاطر آج تک اس نے پلکوں پر خواب سجائے تھے۔ خیالوں کی پگڈنڈیوں پر جس کے علاوہ اس نے کسی کو قدم دھرنے کی اجازت نہ دی تھی۔

آج اس نے اسے ٹھکرا دیا تھا۔ اس کا دل کر چی

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk
Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

کر چکی ہو چکا تھا۔

ابھی تو اس کی محبت کی کونپل پھوٹی ہی تھی اور ابھی اسے پھلنا پھولنا تھا مگر خزاں نے آن دبوچا۔

محبت نہ روایتوں کو مانتی ہے نہ طبقوں میں منقسم معاشرے کا تجربہ کرے محبوب کا انتخاب کرتی ہے۔ یہ تو بس ہو جاتی ہے۔ دل طبقوں کی پرواہ کرتا ہے۔ اور نہ ہی کوئی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزرنا پڑتا ہے۔

زندگی بساط اور وقت کے دھارے، سب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں اور کبھی بازی پلٹ جاتی ہے۔ بیتا وقت لوٹ نہیں سکتا۔

محبت، ریاضی کا سوال نہیں کہ بار بار کی کوشش سے حل ہو جائے گا اور کوئی نہ کوئی فارمولا جواب تک لے جائے گا۔ محبت تو شاعری کی طرح دل پر وارد ہونے کا نام ہے۔ جہاں کوئی کوشش کام نہیں آتی۔

☆.....☆.....☆

"آج تو جناب کو تن تنہا محبوب کی بانہوں میں سر رکھ کر عشق و محبت کی باتیں کرنے کا موقع میسر آ گیا۔" اقصیٰ نے گلشن کو چھیڑتے ہوئے کہا۔

جس وقت گلشن کی تینوں بھابھیاں واپس آئیں۔ اتفاق سے اس وقت نجانے گلشن کی آنکھ میں کوئی ذرہ چلا گیا۔ صدام صوفے پر براجمان تھا۔

تو اس کی گود میں سر رکھ کر اس نے آنکھ میں سے وہ ذرہ نکلوایا اور جیسے ہی صدام نے ذرہ نکالا تینوں بھابھیاں جن میں صدام کی بہن زریں بھی شامل تھی آن وارد ہوئیں۔

دونوں تھوڑی دیر کے لیے تذبذب کا شکار ہوئیں اور پھر جلد ہی صدام نے کھانا کھائے بغیر اجازت لی۔ سب نے بہت روکا لیکن وہ نہ رکا۔ اس کے جاتے ہی سب گلشن کے آس پاس جمع ہو گئیں۔

"واٹ یو مین؟" گلشن نے حواس باختہ ہو کر اپنی بھابھی اقصیٰ کو دیکھ کر پوچھا۔

"ارے کیا مین۔ سیدھی طرح بتاؤ کیا گپ شپ لگ رہی تھی۔ اقرار، وعدے اور قسمیں تو ہو گئی ہوں گی ناں۔" اب کی بار انعم نے لقمہ دیا۔

"نہیں نہیں صاحب بہادر گئے ہوں گے اپنی محبت کا یقین دلانے کے لیے آسمان سے تارے توڑنے ہیں ناں گلشن؟" اقصیٰ نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر کہا تو اس کی بات سن کر سب کا پرزور قہقہہ گونجا۔

"ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ میرا بھائی کسی سے کم نہیں ہے۔ آسمان سے تارے تو کیا چاند کو بھی توڑ لائے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ان سب کو یہاں دیوار سے تو لٹکایا نہیں جا سکتا۔ اسی لیے وہ بازار سے لے آئیں گے تاکہ انہیں دیوار پر لٹکایا جا سکے پھر تو ثابت ہو ہی جائے گا نا کہ میرا بھائی کتنا بڑا عاشق ہے۔" اب کی بار زریں خان نے گلشن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ایکسکیوزمی! آپ لوگ غلط سمجھ رہے۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ ایکچوئلی وہ میری آنکھ میں ذرہ چلا گیا تھا اور۔" قبل اس کے کہ گلشن اپنا فقرہ مکمل کرتی انعم نے اسے ٹوکا۔

"اور اس ذرے نے جناب کو محبوب کی نرم و گداز گود میں سر رکھنے پر مجبور کر دیا۔"

"نہیں یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس ذرے نے شرط رکھی ہو کہ اگر تم محبوب کی گود میں سر رکھو گی تو میں خود بخود نکل جاؤں گا۔" زریں نے اس کے پاس ہی بیٹھتے ہوئے کہا۔

"اوہ مائی گاڈ! تم لوگ تو بال کی کھال نکالنے پر لگ گئی ہو۔" گلشن نے سر پکڑ کر کہا۔

"آسمان میں تھگلی لگانے سے جان نہیں چھوٹنے والی۔ بھانڈا پھوٹ چکا ہے بے شک تم آرے بلے کرتی رہو لیکن اب ہم بھی یقین کرنے والے نہیں ہیں۔ آج تو رنگے ہاتھوں پکڑا ہے۔" انعم نے کہا۔

"لگتا ہے آنکھوں سے آنکھ لڑ گئی ہے اور آنکھیں چار ہو گئی ہیں۔ بس اب یہ ہماری آنکھوں کا کاجل چرانے کی تگ و دو کر رہی ہے لیکن۔" اقصیٰ نے زیر لب مسکراتے ہوئے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑا تو گلشن نے اس کی طرف دیکھا۔

"بھابھی آپ بھی ناں۔ ارے یقین جانیے

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

ہمارے درمیان ایسا ویسا کچھ بھی نہیں ہے۔ میں کوئی آلا بالا نہیں کر رہی جو حقیقت ہے وہ تم لوگوں کو بتا رہی ہوں۔ میرے من میں صدام کے لیے قطعاً ایسے کوئی جذبات نہیں ہیں۔ جس رخ آپ لوگوں کی سوچوں کا دھارا بہہ نکلا ہے۔

اس طرف میں نے کبھی تخیل میں بھی نہیں سوچا۔ حقیقت میں میری آنکھ میں ایک ذرہ گھس گیا تھا۔ ویسے نکلا نہیں تھا تو صدام نے کہا کہ میری گود میں سر رکھو اور پھر اس صورت وہ نکلا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اب ہمارے درمیان رام لیلا شروع ہو چکی ہے۔" گلشن نے سب کی طرف بغور دیکھ کر کہا تو سب کو مجبوراً چپ لگ گئی۔

لیکن اس کی بات پر اعتبار کسی کو نہ تھا اور یہ بات اس نے بھی محسوس کر لی تھی تبھی وہاں سے فوراً ہی کھسک گئی۔

☆.....☆.....☆

پنڈت پروہت نے جیسا کہا تھا ویسا ہی ہوا تھا۔ جیسے ہی اس کے شریر نے موت کی اذیت سے چھٹکارا حاصل کیا تھا۔ راجہ پرتاب سنگھ کے سامنے مندر کے تہہ خانے میں دودھیا دھواں پیدا ہونا شروع ہو گیا۔ پھر اس دھوئیں نے پنڈت پروہت کا روپ دھار لیا۔ مرنے والے اور اس پنڈت پروہت میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

مرنے والے پنڈت پروہت کے چہرے پر بڑھاپے کی تھکن عیاں تھی۔ جبکہ یہ پنڈت پروہت تو جیسے ہشاش بشاش دکھائی دے رہا تھا۔ یقین نہیں ہو رہا تھا کہ یہ وہی پنڈت پروہت ہے جو کچھ سے قبل راجہ پرتاب سنگھ کے ساتھ بیساکھی کے سہارے چلتا ہوا مندر تک آیا تھا۔

"مہاراج وقت کا نقصان مت کیجئے جلدی سے پیالہ اٹھائیے اور لبالب بھر کر حلق میں انڈیل دیجئے۔ میرے خون کے اندر میری شکتیاں ہیں۔ خون کا ہر ایک قطرہ میری شکتیوں کو آپ کے شریر میں دوبارہ زندہ کر دے گا۔"

پنڈت پروہت نے تحکمانہ لہجے میں کہا تو راجہ پرتاب سنگھ نے جلدی سے قریب رکھا پیالہ اٹھایا اور اسے خون سے لبالب بھر لیا۔ لیکن جیسے ہی اس نے خون کا پیالہ منہ سے لگایا۔ پنڈت پروہت کے خون سے اٹھتی بساند نے اس کے نتھنوں کا خیر مقدم کیا۔

راجہ پرتاب سنگھ کو یوں لگا جیسے اسے ابھی کے ابھی قے آئے گی اور اس کے اندر کا سب کچھ بھی باہر نکل آئے گا۔ پنڈت پروہت نے شاید راجہ کی کیفیت سے آشنائی حاصل کر لی تھی۔ اس نے نہ جانے منہ ہی منہ میں کیا پڑھ کر پھونک ماری تو راجہ ایک ہی سانس میں پیالے میں بھرا لہو پی گیا۔ پھر اس نے باقی ماندہ لہو کو شیطان دیوتا کے دیو ہیکل مجسمے پر گرانا شروع کر دیا۔ راجہ پرتاب سنگھ کے اندر پنڈت پروہت کا لہو کیا گیا گویا ایک بھونچال سا پیدا ہو گیا تھا۔

راجہ کا من کر رہا تھا کہ پنڈت پروہت اس کی نظروں سے اوجھل ہو اور وہ کتوں کی طرح تہہ خانے کے فرش اور شیطان دیوتا کے مجسمے پر لگا لہو چاٹ جائے۔ اس کی برداشت سے باہر ہوا جا رہا تھا۔ لیکن اس کے اندر ایک راجہ حکمران براجمان تھا۔ جو اسے یہ سب نہ کرنے پر اکسا رہا تھا۔ اگر پنڈت پروہت اس کے سامنے کھڑا نہ ہوتا تو کب کا وہ اس لہو کو چاٹ چکا ہوتا۔

"مہاراج۔" ایک بار پھر اسے پنڈت پروہت نے مخاطب کیا۔

راجہ نے سوالیہ نگاہوں سے پنڈت پروہت کی طرف دیکھا۔

"مہاراج دیوتا کے چرنوں میں سجدہ ریز ہو جایئے۔ تاکہ دیوتا آپ کی بلی سے متی ہو کر آپ کو شکتیوں سے نوازیں۔"

پنڈت کی تحکمانہ بات سن کر راجہ نے پنڈت کے سامنے سر تسلیم خم کیا۔ پھر راجہ شیطان کے مجسمے کے چرنوں میں سجدہ ریز ہو گیا۔ تبھی شیطان کی بے نور آنکھوں میں جیسے تیز دیے سے جلنے لگے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے شیطان کی زبان میں جنبش پیدا ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی پورے مجسمے میں جنبش پیدا ہو گئی۔

"ہم تمہاری بلی سے متی ہو کر تمہیں نہ صرف پنڈت پروہت کی شکتیاں نوازتے ہیں بلکہ مزید ایسی شکتیاں بھی نوازتے ہیں۔ جن کے بل بوتے پر تم دنیا کو انگلی کے

پور پر اٹھا کر الٹ سکتے ہو۔ یاد رکھنا جب تک تم ہمارے سامنے اسی طرح سر تسلیم خم رکھو گے تب تک ہماری مدد تمہارے ساتھ رہے گی۔ لیکن جس دن تم ہم سے روگردانی کرو گے اس کے بعد ہم بھی تم سے روگردانی کر لیں گے۔ اور ہماری روگردانی کا نقصان تمہیں ہی ہوگا۔"

راجہ پرتاب سنگھ جو شیطان کے چرنوں میں سجدہ ریز تھا۔ اس کی قوت سماعت سے شیطان دیوتا کے الفاظ گونجے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے بولنے والا کوسوں دور سے بول رہا ہو۔ یا کسی گہرے کنوئیں سے اس کی آواز آ رہی ہو۔ اس کی آواز میں قربت کی کوئی علامت نہ تھی۔ بلکہ یوں لگ رہا تھا جیسے بولنے والا بہت ہی دور سے بول رہا تھا۔

راجہ نے سجدے سے سر اٹھا کر شیطان دیوتا کے دیو ہیکل مجسمے کو دیکھا۔ تو آنکھوں کی جگہ دیپ جلتے دکھائی دیے۔ پتھر کے مجسمے میں گویا جان بھر دی گئی تھی۔

راجہ یہ سب کچھ دیکھ کر ایک بار پھر شیطان دیوتا کے چرنوں میں سجدہ ریز ہو گیا۔

"میں کبھی بھی آپ کی حکم عدولی نہیں کروں گا نہ ہی کبھی روگردانی کرنے کا سوچ سکتا ہوں۔ مجھے اپنے خاص لوگوں میں شمار کر لیجیے۔ شما چاہتا ہوں لیکن میں جلد از جلد ان لوگوں میں شمار ہونا چاہتا ہوں جن کے منہ سے نکلتے الفاظ فوراً سے بھی پیشتر حقیقت کا روپ دھارنے کی شکتی رکھتے ہیں۔"

راجہ پرتاب سنگھ نے اب کی بار التجائیہ لہجے میں استدعا کرتے ہوئے کہا۔

قریب ہی کھڑا پنڈت پروہت کے دھوئیں نما شریر کے لبوں پر گویا فاتحانہ مسکراہٹ جلوہ گر ہو گئی تھی۔

"ہمارے خاص اور مقرب لوگوں میں شمولیت اختیار کرنے کے لیے انسانوں کی بلی چڑھانے میں کسی قسم کا دقیقہ فروگزاشت نہ کرنا۔ جلد ہی ہمارے مقرب لوگوں میں تمہارا شمار ہوگا۔ ممکن ہے سرفہرست لوگوں میں تمہارا نام پہلے نمبر پر آ جائے۔" شیطان دیوتا کے ہونٹوں نے ایک بار پھر جنبش کی۔

"یہ آپ کی عنایت ہوگی دیوتا۔" راجہ پرتاب سنگھ نے خوشی سے بے حال ہوتے ہوئے کہا۔

"میں اپنی سلطنت کا راجہ ہوں میں بھلا ایسی کنجوسی کیوں کروں گا۔ اب سے انسانوں کی بلی چڑھانا میرا فرض منصبی بن گیا ہے۔ سب سے پہلے اپنے سسرال والوں کو جنہوں نے میرے خلاف اعلانِ جنگ کیا ہے۔ انہی کو آپ کے چرنوں میں بلی چڑھاؤں گا۔ تب جا کر مزید شکتیاں حاصل کروں گا۔"

راجہ خوشی سے بے گانہ ہوئے جا رہا تھا جبکہ وہ اس بات سے بالکل نا آشنا تھا کہ ظلم کی دیوار جتنی بھی اونچی بنا لی جائے ایک نہ ایک دن اسے زمین بوس ضرور ہونا ہوتا ہے۔

☆.....☆.....☆

ڈاکٹر کے مطابق حنا کی طبیعت ابھی خطرے سے خالی نہ تھی۔ ڈاکٹر نے چوبیس گھنٹے کا ٹائم دیا تھا۔ اور ان گزرتے چوبیس گھنٹوں کے اندر کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ ڈاکٹر نے آپریشن تھیٹر سے باہر نکلتے ہی سب کو حنا کی زندگی کے لیے دعا کرنے کی التجا کی۔ اور ساتھ میں یہ بھی کہا کہ ابھی کسی کو بھی حنا سے ملنے کی اجازت نہیں دی جائے۔

حنا کو کسی وارڈ میں منتقل نہ کیا گیا تھا بلکہ آپریشن تھیٹر میں ہی رکھا گیا تھا کیونکہ بوقت ضرورت اسے یہیں ٹریٹمنٹ دی جا سکتی تھی۔ دو نرسیں اور ایک ڈاکٹر کو مستقل طور پر حنا کے پاس بیٹھا دیا گیا تھا۔

حنا کے والد کے ہسپتال کے کئی ڈاکٹرز کے ساتھ اچھی خاصی بنتی تھی۔ یہی نہیں حنا کا ایک خالو بھی ہسپتال میں ایمرجنسی وارڈ میں ڈیوٹی دے رہا تھا۔ یوں حنا کی ٹریٹمنٹ اور دیکھ بھال میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا جا رہا تھا۔ بلکہ جس حد تک ممکن تھا ان لوگوں کے ساتھ تعاون کیا جا رہا تھا۔

حنا بے ہوشی کی حالت میں تھی۔ ڈاکٹرز کے مطابق چوبیس گھنٹوں کے دوران اگر اسے ہوش آ گیا تو سمجھو خطرہ ٹل گیا اگر ہوش نہ آیا تو سمجھو حنا کا بچنا ناممکنات میں سے ہوگا۔

ہر کس و ناکس حنا کی سلامتی کے لیے دعا گو تھا۔ عالیہ اس کی والدہ اور بھائی بھی آ گئے تھے۔ سوائے عالیہ کی ماں کے کوئی بھی حقیقت سے آشنا نہ تھا۔ انہوں نے

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

بھی ڈاکٹر کی بات سن لی تھی۔ حنا کی والدہ کے گلے لگ کر عالیہ رونے لگی تھیں۔

حنا کی والدہ ایک صابر اور شاکر عورت ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے ہمت و حوصلے والی خاتون تھیں۔ انہوں نے عالیہ کو رونے کی بجائے صبر سے کام لینے کی تلقین کی تھی۔

شہباز اور جمال دونوں اکٹھے ہی ہسپتال کی راہداری میں داخل ہوئے تھے۔ اتفاق سے انہیں سب سے پہلے دیکھنے والی بھی عالیہ ہی تھیں۔ جو اس وقت سر جھکائے بینچ پر براجمان سر کو دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں میں تھامے ہوئے تھیں۔

شہباز کو یونیورسٹی سے کٹ آف ہونے کے بعد آج عالیہ نے بڑے عرصے بعد دیکھا تھا۔ اس کی شکل و صورت میں کوئی خاص فرق نہ آیا تھا۔ ہاں بس اتنا فرق ضرور آیا تھا کہ اس نے بڑی بڑی مونچھیں رکھ لی تھیں۔ یہی نہیں پینٹ شرٹ اور جینز کی جگہ آج اس نے سفید کاٹن کا کلف لگا سوٹ زیب تن کیا ہوا تھا۔

شہباز پہلے سے زیادہ خوبصورت ہو گیا تھا۔ اس کا چہرہ کافی پر رعب ہو گیا تھا۔ دوسری طرف جمال پولیس کی وردی میں تھا۔ دونوں کی نظروں کا تاولہ ہوا تو جمال نے نگاہیں پھیر لی تھیں۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی کو رتی برابر بھی کچھ شک ہو۔ جبکہ عالیہ کو اس کے اس بی ہیویر بہت غصہ آیا تھا۔

شہباز اور جمال دونوں آپس میں گفتگو کرتے چلے آ رہے تھے۔ شہباز مجید کے چہرے پر تفکر اور اضطرابیت کی سلوٹیں عیاں تھیں۔ اس بات سے صرف عالیہ ہی آشنا تھیں کہ شہباز اور حنا کے مابین عشق و مشک کا چکر چل رہا ہے۔ ممکن ہے کوئی اور بھی اس بات سے آشنا ہو لیکن اس بات پر عالیہ کو یقین نہ تھا۔

جمال نے ایک پولیس افسر کے جیسے ضروری کارروائی کی اور اجازت لے کر چلتا بنا۔ عالیہ اس کے وہاں سے آنے سے قبل بہانہ کر کے نیچے ریسپشن پر آ کر کھڑی ہو گئی تھیں۔ جمال نے اسے نیچے جاتے دیکھ لیا تھا لیکن اس نے کسی کو کچھ ظاہر نہ ہونے دیا تھا۔

انسپکٹر جمال اپنا ڈنڈا لہراتا ہوا زینے عبور کر کے جیسے ہی نیچے اترا، عالیہ نے اس کا راستہ روک لیا۔ انسپکٹر جانتا تھا کہ عالیہ یہاں موجود ہوگی اس لیے اس نے اپنے ساتھ کسی کانسٹیبل کو لے جانا بہتر نہ سمجھا تھا۔ اس کے ساتھ دو کانسٹیبل ہمہ وقت موجود رہتے تھے لیکن اس نے ان دونوں کو گاڑی میں ہی بیٹھا دیا تھا۔

"ایکسکیوزمی مسٹر!" عالیہ نے اپنا پرس کندھے پر لٹکاتے ہوئے جمال کو مخاطب کیا۔

"یہ سب کیا ہے؟ تم جتنی دیر سے آئے اور مجھے دیکھنا تک گوارہ نہیں کیا۔ پھر کہتے ہو کہ میں اول فول بکتی ہوں۔ کیا تم جو کچھ کر رہے ہو وہ بہتر ہے؟"

انسپکٹر آکاش ظہیر نے اس کی بات سن کر ڈنڈا بغل میں دبایا۔ "تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ وہاں سب کے سامنے میں نہ صرف تمہیں مخاطب کرتا بلکہ تم سے پیار بھری باتیں بھی کرتا اور تمہاری سنتا بھی؟" جمال نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تم غلط سمجھ رہے ہو میرے کہنے کا یہ مطلب قطعاً نہیں۔ بندہ ایک نظر پیار سے دیکھ ہی لیتا ہے۔ تمہارے چہرے پر تو سدا بارہ ہی بجے رہتے ہیں۔" عالیہ نے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے میں فی الحال آن ڈیوٹی ہوں۔ آتے جاتے لوگ گھور گھور کر دیکھ رہے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ کل کی کسی اخبار میں ہماری لو سٹوری پیش کی جا رہی ہو۔" انسپکٹر نے ٹوپی سر پر درست کرتے ہوئے کہا۔

"چلو کسی بہانے تو تشہیر ہوگی ناں۔ تمہارے منہ میں تو زبان ہے نہیں۔" عالیہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"میں فی الحال ایک پولیس افسر کے طور پر تمہارے سامنے موجود ہوں۔ عاشق کے طور پر نہیں۔" انسپکٹر جمال نے زیر لب مسکرا کر کہا۔

"او کے بائے۔ ٹیک کیئر۔" عالیہ اسے الوداع کرتی ہوئی اوپر آ گئی۔

☆.....☆.....☆

ناگنی نے بالآخر اپنی ضد پوری کی اور شنکر کو لے کر ساحل

پڑ آگئی۔ چاند پوری آب وتاب سے چمک رہا تھا جبکہ دوسری طرف ماحول میں ایک عجیب سی گھٹن اور اضطرابیت پیدا ہوچکی تھی۔ بے شک اس نے اپنی ضد منوالی تھی۔ لیکن اس کے من کے مندر میں گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ جو اسے آنے والے خطرے سے آگاہ کررہی تھیں۔

شنکر تو اپنی محبت کی خاطر ساحل پر آگیا تھا لیکن اندرونی طور پر وہ بہت ڈرا ہوا تھا۔ اسے ناگ دیوتا سمیت دوسرے کئی اور نے انسانوں کے بارے میں بہت ڈرایا تھا اور ایسی ایسی باتیں کی تھیں کہ اس کا من چاہ رہا تھا کہ پلک جھپکتے میں وہ واپس لوٹ جائے۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ اس کی واپسی اسے اس کی محبت سے اتنا دور کردے گی کہ چاہ کر بھی وہ مسافت کبھی ختم نہیں کرپائے گا۔ ساتھ رہتے ہوئے بھی جنموں کی مسافت درمیان میں پیدا ہوجائے گی۔

شنکر اور ناگنی دونوں ہی لباس سے عاری تھے۔ انہیں کیا معلوم کہ جسموں کو چھپانے کے لیے انسان کیا طریقہ اپناتے ہیں۔ سانپوں کی دنیا میں ایسے طور طریقے بھلا کہاں ہوتے ہیں۔ ناگنی نے شنکر کی طرف آنکھ بھر کر دیکھا تو اسے شنکر کی معصومیت پر بہت پیار آگیا۔ ناگنی تقریباً بھاگ کر شنکر کے گلے لگ گئی۔

"تم بہت اچھے ہو شنکر۔" ناگنی نے شنکر کے گلے لگتے ہوئے کہا۔

"محبت کتنا خودغرض جذبہ ہے ناگنی؟" شنکر نے ناگنی کی بات کا جواب دینے کی بجائے پوچھا۔

"میں تمہاری بات کا مطلب اچھی طرح جانتی ہوں شنکر۔ لیکن دوبارہ میں کبھی بھی ضد نہیں کروں گی۔" ناگنی نے شنکر سے علیحدہ ہوکر اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا۔

"دیکھو تو چاند کی چاندنی پورے علاقے کو کیسے منور کیے ہوئے ہے۔ دل موہ لینے والی چاندنی نے پورے علاقے میں ایک عجیب طرح کا تاثر پیدا کیا ہوا ہے۔ یوں لگ رہا ہے جیسے کسی دلہن کے ہاتھوں پر مہندی کے رنگ اتر آئے ہوں۔"

ناگنی نے ماحول سے لطف اندوز ہوکر پہاڑوں کی طرف دیکھتے ہوئے دونوں ہاتھ ادھر ادھر پھیلا دیئے۔ گویا وہ ماحول سے پوری طرح لطف اندوز ہونا چاہتی ہو۔ شنکر نے اس کی طرف دیکھا اور زیر لب مسکرا دیا۔ اب جب اتنا بڑا رسک لے ہی لیا تھا تو ڈرنے کی ضرورت ہی کیا۔ ماحول سے لطف اندوز اٹھانا واقعی لازمی بنتا تھا۔ ایک رات کی ہی تو بات ہے۔ جیسے ہی چاندنی ماند پڑنا شروع ہوگی دونوں واپس لوٹ جائیں گے۔

اگر ناگنی اسی طرح اس کی محبت کو آزمانا چاہتی ہے تو بھلا وہ کیوں پیچھے ہٹے۔ چاند کی چاندنی میں بتدریج اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ سمندر کی لہریں ایک عجیب سا خوش کن تاثر دے رہی تھیں۔ سماعت شکن لہروں کی بازگشت انہیں سرور دے رہی تھی۔ دونوں کی نگاہیں آسمان پر پوری آب وتاب سے چمکتے چاند پر مرکوز تھیں۔

"ناگنی! چاند کی چاندنی ہر چیز کو اپنی آغوش میں لے چکی ہے۔ ہمیں اس ماحول سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لیے سرور ومستی میں آکر جھومنا چاہیے۔ جانتی ہو ایسے ہی تو چاند کی چاندنی اور ماحول کی دل نشینی سے لطف اندوز ہوا جاسکتا ہے۔" شنکر نے ناگنی کو دیکھے بغیر کہا۔

شنکر کی بات سن کر ناگنی کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا تھا۔ شنکر ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا کہ "اگر ماحول کی خوبصورتی کو آنکھوں میں جذب کرنا ہے یا لطف اندوز ہونا ہے تو یہ رات کو فل مستی میں گزارنا چاہیے۔" ناگنی نے اپنے ہاتھ شنکر کی طرف بڑھائے تو شنکر نے اس کے نرم وگداز ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھام لیا اور دوسرے ہی لمحے دونوں کے بدن جیسے ہوا کے دوش پر لہرا رہے تھے۔

دوسری طرف شمعان نے دونوں ناگوں کو ساحل کی طرف آتے دیکھ لیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے ناگوں نے پلک جھپکتے میں انسانی روپ دھار لیا تھا۔ شمعان کی للچائی ہوئی نگاہیں ناگنی کے بدن پر جیسے ٹک سی گئی تھیں۔ بے شک دونوں ناگ انتہائی خوبصورت تھے۔ شمعان نے ایک نگاہ شنکر کو بھی دیکھا تھا۔ جو نہایت ہی خوبصورت، پروجاہت

اور پر رعب دکھائی دے رہا تھا۔ لیکن ناگنی جو کہ بہت ہی خوبصورت دوشیزہ کی شکل میں تھی۔

یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی مصور کا جیتا جاگتا خواب ہو۔ جسے اس نے بناتے وقت کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا تھا۔ خاص کر سینے کے نشیب وفراز نے تو جیسے شمعان کو پاگل ہی کردیا تھا۔ اوپر سے سونے پر سہاگا ناگنی برہنہ حالت میں کھڑی تھی۔

شمعان نے ناگنی کو جب شنکر کے سینے سے لگتے ہوئے دیکھا تو اس کے من میں شنکر کے لیے نہایت ہی نفرت کے آلاؤ جلنے لگے۔ اس کا ہاتھ نہ چاہتے ہوئے بھی پاس رکھی بین پر جاٹکا۔ اس نے بین کو اٹھالیا۔

"سالے پہلے تو تجھے ایسی موت ماروں گا کہ تو کبھی کسی خوبصورت دوشیزہ کے قریب بھٹکنے کا خیال بھی ذہن میں نہیں لائے گا۔ تجھے نرک میں پہنچا کے پھر تیری اس محبوبہ پر اپنی محبت کا ایسا جال پھینکوں گا کہ وہ خود بخود میری محبت کے جال میں ایک بدمست مچھلی کے جیسے پھنستی چلی آئے گی۔" شمعان منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

دونوں ناگ چاند کی چاندنی میں سرشار ہوکر رقص کررہے تھے۔ انہیں کیا معلوم کہ موت کی پرچھائیاں ان کے سروں پر سایہ فگن تھیں۔ شنکر اور ناگنی دونوں دنیا و مافیا سے بے خبر رقص کررہے تھے۔ جب اس پررونق اور پرتاثیر ماحول میں بین کی آواز شامل ہوگئی۔ تو دونوں ناگوں کی سماعت سے جیسے ہی بین کی آواز ٹکرائی۔ دونوں مزید مست ہوگئے۔

دونوں اتنی سرعت سے جھوم رہے تھے کہ یوں لگتا تھا جیسے پلک جھپکتے میں ان کے شریر کرچیاں کرچیاں ہوکر رہ جائیں گے۔

جب شنکر کو دشواس ہوگیا کہ دونوں ناگوں پوری طرح سے اس کی بین کے جادو میں جکڑ چکے ہیں۔ تو اس نے آناً فاناً بین بجانا بند کردی۔ بین بجنی کیا بند ہوئی گویا ناگ بپھر گئے۔ دونوں ناگ دوبارہ بین کی آواز سننے کے لیے مچل رہے تھے۔ دونوں کی کیفیت ماہی بے آب کی سی ہوچلی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے بین کی آواز دوبارہ ان کی سماعت سے نہ ٹکرائی تو دونوں ناگ ہر چیز کو تہس نہس کرکے رکھ دیں گے۔

پلک جھپکتے میں شمعان نے منہ ہی منہ میں منتر بڑبڑایا اور دوسرے ہی لمحے اس نے شنکر کی طرف پھونک ماری۔ دونوں ناگ دنیا و مافیا سے بے خبر رقص کرنے میں اتنے محو تھے کہ انہیں پتہ ہی نہ چل سکا۔ شنکر جو اس وقت ناگنی کی محبت میں دیوانہ وار رقص کیے جارہا تھا۔ اچانک اسے یوں لگا جیسے کسی نے کوئی تیز دھار آلہ اس کی شہ رگ پر چلادیا ہو۔

اسے آناً فاناً رکتا دیکھ کر ناگنی بھی رک گئی۔ وہ محو حیرت سے شنکر کو تکنے لگی تھی۔ شنکر اپنی گردن پر ہاتھ رکھے بری طرح سے کلبلا رہا تھا۔ ناگنی سرعت سے اس کے قریب آئی۔

"کیا ہوا شنکر؟" ناگنی نے آگے بڑھ کر شنکر کو مرغ بسمل کی طرح تڑپتے دیکھ کر پوچھا۔

"بولو کیا ہوا۔ یہ اچانک کیا ہوگیا تمہیں؟"

بات کرتے کرتے ناگنی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ شنکر اس کی کسی بات کا جواب دینے سے پہلے ہی ابدی نیند سوچکا تھا۔ یہ سب کچھ اتنی عجلت میں ہوا تھا کہ شنکر کو سنبھلنے تک کی مہلت نہ مل سکی تھی۔ ناگنی نے شنکر کو ابدی نیند سوتے دیکھا تو اس کی آنکھوں سے آنسو جاری وساری ہوگئے۔ اسے یقین نہیں ہورہا تھا کہ اس کی محبت، اس کا پیار شنکر اسے یوں پلک جھپکتے میں تنہا چھوڑ جائے گا۔

اسے پہلی بار ناگ دیوتا کی باتوں میں سچائی دکھائی دی تھی۔ وہ ناگ دیوتا کو مہان مان چکی تھی لیکن اب ان باتوں کو ماننے نہ ماننے سے کیا ہونے والا تھا۔ جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہوچکا تھا۔

اچانک ناگنی کو سرسراہٹ سنائی دی۔ اس نے سرعت سے گردن موڑ کر دیکھا تو شمعان جو جلدی سے بھاگتا ہوا اس طرف آرہا تھا۔ اسے دیکھ کر ناگنی تقریباً ڈر گئی۔ اس نے جلدی سے ناگن کا روپ دھارا اور دوسرے ہی لمحے وہ اس طرف جاکر روپوش ہوگئی جس طرف پہاڑ کا عکس پڑ رہا تھا۔

وہاں گہرا اندھیرا بھی تھا۔

شمعان شنکر کے قریب پہنچ چکا تھا۔ وہ ناگنی کو

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

پکڑنا چاہتا تھا لیکن اس کے پہنچنے سے پہلے ہی ناگنی بھاگنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔اس نے سامنے مردہ پڑے شنکر کو دیکھا۔

"سالے اگر تجھے مار گرایا ہے تو تیری محبوبہ کہاں تک بھاگ لے گی۔بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ایک نہ ایک دن تو قصائی کی چھری تلے آئے گی۔"شمعان نے پیر کی ٹھوکر شنکر کو مارتے ہوئے کہا۔

"چل پہلے تجھے تو کھا پی لوں پھر تیری محبوبہ کے بارے میں سوچتے ہیں۔"

شمعان نے شنکر کے مردہ شریر کو درمیان سے پکڑ کر اٹھایا اور لے کر سرعت سے پہاڑی کی بلندی پر چڑھنے لگا۔شمعان خوشی سے سرشار تھا لیکن اس بات سے قطعی آشنا نہ تھا کہ نا گنیہم اس کا پیچھا کر رہی تھی۔ایک طرف جہاں شمعان سرعت سے پہاڑی کی بلندی پر چڑھتا جا رہا تھا وہیں دوسری طرف کچھ فاصلے پر ناگنیہی ناگن بنی پہاڑ کی بلندی پر چڑھتی جا رہی تھی۔

ناگنی نے شمعان کو بغور دیکھ لیا تھا۔اس کے دل میں شمعان کے لیے شدید نفرت کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔وہ بس موقع کی تلاش میں تھی۔موقع ملتے ساتھ ہی وہ شمعان کو ابدی نیند سلانے پر تل چکی تھی۔اس نے دل ہی دل میں مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ جیسے تیسے بھی ہو وہ شمعان کو ابدی نیند سلائے بنا چین سے بیٹھنے والی نہیں ہے۔

تبھی ناگنیہ نے ایک عجیب ہی منظر دیکھا۔وہ حیرت سے اس منظر کو دیکھنے لگی تھی۔اس کی آنکھیں جہاں اپنے محبوب کی موت پر خون کے آنسو رو رہی تھیں۔وہیں اس کی آنکھوں میں حیرت عود کر آئی تھی۔

☆.....☆.....☆

گلشن کے لیے آنے والا ڈرائیور جس کا نام جمیل احمد تھا۔نجانے اس میں ایسی کیا خاص بات تھی کہ پہلی ہی نظر میں گلشن اس پر فریفتہ ہو گئی تھی۔گلشن جانتی تھی کہ اس کا ماموں زاد صدام اس سے بے پناہ محبت کرتا ہے لیکن ایک طرفہ محبت کے لیے اپنی خوشیوں کا گلہ تو نہیں گھونٹا جا سکتا۔ ہر کس و ناکس کو اپنی زندگی جینے کا مکمل اختیار حاصل ہوتا ہے۔

جمیل احمد کا رنگ گندمی تھا۔وہ شیو کرواتا تھا۔ساتھ میں چھوٹی چھوٹی مونچھیں اس کے گندمی چہرے پر بہت سوٹ کرتی تھیں۔وہ زیادہ تر چپ ہی رہتا تھا۔گلشن اور اس کی فیملی کے پاس اس کا جو بائیو ڈیٹا تھا۔اس کے مطابق اس کا تعلق ایک مڈل طبقے سے تھا۔

جمیل احمد کے والدین بچپن میں ہی سورگباش ہو گئے تھے۔اس کی پرورش اس کے خالو نے کی تھی۔اس کی خالہ اس کی ماں کی وفات کے دو سال بعد ابدی نیند سو گئی تھی۔اس کے والدین یکے بعد دیگرے قدرتی موت کا شکار ہوئے تھے۔پہلی اس کی ماں مری تھی اور بعد میں اس کے باپ کو بھی موت نے اپنی آغوش میں بھر لیا تھا۔

جب وہ بالکل بے بس اور بے سہارہ تھا تو تب اس کی خالہ اور خالو نے اسے سہارہ دیا تھا۔ان کی اپنی کوئی اولاد نہ تھی۔انہوں نے اسے بیٹا بنا کر اپنے گھر میں رکھ لیا تھا۔اس کی خالہ کی وفات کے تقریباً ڈیڑھ سال بعد جب وہ سن بلوغت کو چھونے والا تھا۔اس کے خالو نے خاندان سے باہر کسی لڑکی سے شادی رچالی تھی۔

اس لڑکی نے آتے ساتھ ہی اس پر مظالم ڈھانا شروع کر دیے تھے اور پھر ایک دن اس کے خالو نے اپنی بیگم کی باتوں میں آکر اسے پہلے خوب زدوکوب کیا پھر گھر سے نکال دیا۔اس کے پاس سے ایک بار پھر ہر سہارہ چھن چکا تھا۔

بے یارومددگار وہ سڑک پر چلا جا رہا تھا۔جب اس کے محلے کے ایک نوجوان نے اسے دیکھا۔وہ نوجوان کسی کی گاڑی پر ڈرائیوری کرتا تھا۔اس نے جب اسے روتے ہوئے سڑک پر جاتے دیکھا تو اسے روک کر گاڑی میں بٹھایا۔

جمیل احمد نے ساری بات اسے بتائی تو اس نے جمیل احمد کو کہا کہ وہ اس کے پاس شاگردی میں آجائے جتنی جلدی ہو سکا وہ اسے ڈرائیوری سکھا دے گا۔یوں جمیل احمد اس کے پاس بطور شاگرد رہنے لگا اور وعدے کے مطابق اس نے جمیل احمد کو جلد ہی ایک اچھا ڈرائیور بنا دیا تھا۔

اب جمیل احمد کو ڈرائیوری کرتے ہوئے تقریباً نو دس

برس بیت چکے تھے۔یہی اس کی بیک ہسٹری تھی۔اور یہ ہسٹری انہیں جمیل احمد نے نہیں بلکہ جمیل احمد کے کسی ڈرائیور دوست نے بتائی تھی۔جمیل احمد کو پرائیویٹ کمپنی کی طرف سے گھر میں ڈرائیور رکھا گیا تھا۔

اس سے زیادہ ان لوگوں کے پاس جمیل احمد کی کوئی رپورٹ نہ تھی۔دوسری طرف جمیل احمد غربت کی چکی میں پس پس کر تنگ آچکا تھا۔وہ پیسے کی خاطر اپنے تن من دھن کی بازی لگانے کے لیے مستعد رہتا تھا۔پیسے پہ وہ جان چھڑکتا تھا۔وہ راتوں رات کروڑ پتی بننا چاہتا تھا۔

کتنی ہی نوجوان لڑکیاں اس کے ہاتھوں اپنی زندگیاں تباہ کر چکی تھیں۔کئی تو ان میں ایسی بھی تھیں جن کے گھروں میں پیسے کی ریل پیل تھی۔اور کئی ایسی بے چاریاں بھی تھیں۔جو اس کی جھوٹی محبت اور جھوٹے دعوؤں میں آکر اپنی عصمت دری کروا بیٹھی تھیں۔اس کمینے انسان کا شیوا تھا کہ جس لڑکی کی بھی عزت خراب کرتا اس کی ساتھ میں مووی بنا لیتا تھا۔

پھر ان لڑکیوں کو بلیک میل کر کے ان سے پیسے بٹورتا تھا۔اب جب گلشن اس کے ساتھ آنے جانے لگی تھی۔تو اس نے دل میں مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے وہ گلشن کو بھی بہر صورت اپنے پیار کے جال میں پھنسائے گا۔اس سے قبل اس کی زندگی میں کوئی لڑکی گلشن کے امیر کبیر نہ آئی تھی۔

گلشن کا باپ کمشنر تھا۔اس کے سارے بھائی اپنا اپنا بزنس سنبھالے ہوئے تھے۔ایک اکیلی بہن ہونے کے ناطے اس کے چاؤ چونچلوں کے سامنے سر تسلیم خم کیا جاتا تھا۔جمیل احمد ہمہ وقت اسی سوچ و بچار میں گم رہتا تھا کہ کس طرح وہ گلشن کو اپنے پیار کے جال میں پھنسائے کیونکہ وہ اس بات سے بھی اچھی طرح آشنا تھا کہ اگر اس بات کی بھنک بھی گلشن کے گھر والوں کو پڑ گئی تو وہ لوگ اسے فوراً سے بھی پیشتر ابدی نیند سلا دیں گے۔

ایک طرف محبت کی چنگاریاں بھڑک رہی تھیں تو دوسری طرف دھوکے بازی اور فراڈ کے منصوبے بنائے جا رہے تھے۔گلشن کسی طرح جمیل احمد کے منہ سے محبت کے دو بول سننے کے لیے بے تاب تھی۔عورت ذات ہوتی ہی ایسی ہے کبھی بھی اپنے منہ سے مرد کو اپنی محبت کا اظہار نہیں کرتی۔چاہے کتنی ہی محبت کرتی ہو اس کے باوجود وہ مرد کے منہ سے محبت کے دو بول سننا چاہتی ہے۔اور جب تک مرد خود اظہارِ محبت نہ کرے تب تک وہ بھی اپنی محبت کو اپنے من میں دبائے رکھتی ہے۔

گلشن نے جمیل احمد سے محبت کے دو بول سننے کے لیے پلان بنانا شروع کر دیے تھے۔جمیل احمد تو پہلے ہی اسے پھانسنے کے داؤ پیچ کھیل رہا تھا۔اور ایک طرح سے گلشن خود اسے راستہ دے رہی تھی۔گلشن نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ آج کچھ بھی ہو جائے وہ جمیل احمد کے منہ سے محبت کے دو خوبصورت بول سن کر رہے گی۔

دوسری طرح جمیل احمد بھی پکا ارادہ کر چکا تھا کہ راستے میں گلشن سے اظہارِ محبت کرے گا اور اگر کوئی گڑبڑ ہوتی دکھائی دی تو وہ کبھی لوٹ کر اس طرف نہیں آئے گا۔بلکہ یہی نہیں اس شہر کو بھی چھوڑ چھاڑ کر بھاگ جائے گا۔اور اگر مچھلی اس کے پھینکے جال میں پھنس گئی تو سونے پہ سہاگا ہو جائے گا۔اس کے وارے نیارے ہو جائیں گے۔سونے کی چڑیا ایک بار ہاتھ آگئی تو ساری زندگی عیاشی میں بیتے گی۔

☆.....☆.....☆

راجہ مہندر ناتھ پرتاب سنگھ انسان سے حیوان کا لبادہ اوڑھ چکا تھا۔بے شک اس کے اس بے نقاب ہوئے چہرے سے کوئی بھی آشنا نہ تھا۔

راجہ مہندر ناتھ کو اپنے سسرال والوں پہ بے حد غصہ تھا۔لیکن وہ بہت عیار انسان تھا۔اس لیے فوراً ہی اس کے عیار دماغ نے ایک ایسا پلان تیار کیا جسے سنتے ساتھ ہی اس کا سسر اپنے خاص لوگوں کے ساتھ بھاگا چلا آئے گا۔اور وہ یکے بعد دیگرے ان سب کو شیطان کے چرنوں میں بھینٹ چڑھا دے گا۔

راجہ مہندر ناتھ پرتاب سنگھ نے پنڈت پروہت کے ساتھ مشورہ کیا اور اسے بتایا کہ اس نے پلان یہ بنایا ہے کہ وہ اپنے سسر تک یہ بات پہنچوائے گا کہ وہ اپنے سسر کو باپ

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

سمان گردانتے ہوئے اپنی سلطنت کا شہنشاہ بھی انہیں بنانا چاہتے ہیں۔اس خبر کو سنتے ساتھ ہی اس کا سسر بھاگتا چلا آئے گا۔

وہ انہیں اپنے محل میں نہیں لے آئے گا۔ بلکہ سلطنت کی سیر کروانے کی غرض سے اس مندر کے تہہ خانے میں لے جائے گا جہاں شیطان دیوتا کا دیو قامت بت رکھا ہوا ہے۔ پھر جادو کے زور سے انہیں بے ہوش کر کے شیطان دیوتا کے چرنوں میں بلی چڑھا دے گا۔ یوں نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔

اس کا سسر آتے سے اپنے ساتھ اپنے سپاہی ضرور لائے گا تاکہ اس کے ساتھ کوئی کسی قسم کا دھوکہ نہ ہو۔ ایسی صورت حال سے نبرد آزما ہونے کے لیے پہلے ہی راجہ مہندر ناتھ پرتاب سنگھ کے چیلے مستعد ہوں گے۔ ان کے مندر میں جاتے ساتھ ہی وہ سب کو گھر لیں گے۔ انہیں بندی بنا کر زندان میں ڈال دیا جائے گا اور پھر وقتاً فوقتاً ان سب کو بھی شیطان دیوتا کے چرنوں میں بھینٹ چڑھا دیا جائے گا۔

الغرض راجہ مہندر ناتھ نے اپنے طور ہر ممکن پلاننگ تیار کر لی تھی۔ وہ ایک مکمل درندہ بن چکا تھا۔ جس کے ہاتھوں جلد ہی اپنی فیملی کے ممبر بھی بھینٹ چڑھنے والے تھے۔ شیطانی راستہ ہے ہی ایسا جس پر چل کر انسان کے اندر قدرو منزلت کا مادہ ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔ وہ انسان سے حیوان بلکہ شیطان بن جاتا ہے۔

☆.....☆.....☆

زریاب غنی بھائی کے حکم پر ایم این اے رانا اقبال سے پیسے وصول کرنے کے لیے روانہ ہو گیا تھا۔ جکسی موہن لال کا پاکستان وزٹ بخیر و عافیت گزر تھا۔ اگر غنی بھائی نے اسے ساری ذمہ داری نہ سونپی ہوتی تو وہ اپنے ہی ہاتھوں سے اس کو ابدی نیند سلا دیتا لیکن یہاں گیم بدل چکی تھی۔

زریاب نے ایک بہروپیہ تیار کر لیا تھا۔ زریاب اسے لے کر ایئر پورٹ پر پہنچ گیا تھا۔ لیکن آگے بازی ہی پلٹ گئی تھی۔ غنی بھائی کو شاید ان کے منصوبے کی بھنک پڑ گئی تھی۔ غنی بھائی نے انہیں فلیٹ کا ٹائم غلط بتایا تھا۔ زریاب، وریام اور وہ بہروپیہ سمیت زریاب کے ساتھ آئے شوٹرز انتظار کرتے رہے لیکن سے بہت جانے کے باوجود جب جکسی موہن لال نہ آیا تو انہوں نے غنی بھائی سے رابطہ کیا لیکن غنی بھائی کی بات نے ان کے پیروں تلے زمین کھینچ لی۔

غنی بھائی نے جب انہیں بتایا کہ جکسی موہن لال ان کے پاس گھر میں براجمان ہیں۔ اور وہ بھی واپس آجائیں۔

غنی بھائی کی بات سن کر جہاں زریاب کو شدید غصہ آیا تھا وہیں اس کا غنی بھائی کی ذہانت پر داد دینے کو بھی من کر رہا تھا۔

جکسی موہن لال کے آنے کا مقصد غنی بھائی اور سکندر ملک کو یکجا کرنا تھا لیکن وہ اپنے اس مشن میں سہل نہ ہو سکا تھا۔ وہ جیسے آیا تھا اسے ویسے ہی منہ کی کھا کر لوٹنا پڑا تھا۔ غنی بھائی نے تو اس کی ہاں میں ہاں ملا دی تھی لیکن سکندر ملک اسی بات پر بضد تھا کہ اگر غنی بھائی زریاب کو اس کے سپرد کر دے تو نہ صرف وہ غنی بھائی کے ساتھ ہاتھ ملانے کو تیار ہے بلکہ ہر طرح کی کدورت کو بھی ختم کرنے کا وعدہ کرتا ہے۔

غنی بھائی کے لیے زریاب ہتھیلی کے آبلے کی مانند تھا۔ بھلا غنی بھائی زریاب کو سکندر ملک کے ہاتھ کیسے دیتا۔ بس اسی بات پر اتفاق نہ ہونے کی بنا پر جکسی موہن لال کو دوسرے روز ہی واپس لوٹنا پڑا تھا۔

جکسی موہن لال کے واپس لوٹتے ساتھ ہی غنی بھائی نے زریاب کو ایم این اے رانا اقبال سے پیسے وصول کرنے کا آرڈر دے دیا تھا۔ زریاب نے ایم این اے رانا اقبال کو کال کی اور اس سے کہا کہ اگر وہ زندگی کی امان چاہتا ہے تو فوراً سے بھی پیشتر مطلوبہ رقم ادا کر دے وگرنہ بصورت دیگر اسے اپنی زندگی سے بھی ہاتھ دھونا ہوں گے اور پیشگی بھی ڈبل کرنا پڑے گی۔

اس کی بات سن کر رانا اقبال نے اسے خوب سنائی تھیں۔ لیکن اس نے صرف ایک ہی بات کی تھی کہ ٹھیک دو دن بعد دن دو پہر بارہ بجے وہ نہ صرف اس کے آفس میں آ کے اس سے رقم وصول کرے گا بلکہ اس کو ابدی نیند سلا کر ہی واپس آئے گا۔

اس وقت دن کے سوا گیارہ بج چکے تھے۔ زریاب نے ایک رپورٹر کا لبادہ اوڑھا۔ ہاتھ میں ایک چھوٹی سی ڈائری پکڑی اور جیب میں اپنی خاص پنسل ڈالی تھی۔

یہ پنسل دیکھنے میں بے شک پنسل تھی لیکن اس کے اندر پسٹل کا پورا سسٹم بنایا گیا تھا۔ اس کے اندر سے نکلنے والی گولی بے آواز نکلتی اور پلک جھپکتے میں مدمقابل کو ابدی نیند سلانے کا کام کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔

زریاب نے خود کو قد آدم آئینے کے سامنے ایستادہ ہو کر دیکھا۔ وہ کسی طور بھی پہچان میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ زریاب ہے۔

دوسری طرف رانا اقبال نے دھمکی ملنے پر حکومت سے مزید سیکورٹی طلب کر لی تھی۔ اس کے آفس کے باہر ایلیٹ کے جوانوں کو کھڑا کر دیا گیا تھا۔ ایم این اے رانا اقبال کے آفس کی طرف آنے والے روڈ کو عوام الناس کے لیے بالکل بند کر دیا گیا تھا۔

بے شک ایم این اے رانا اقبال نے زریاب کو خوب سنائی تھیں لیکن وہ زریاب کے نام سے آشنا تھا اور جانتا تھا کہ اس وقت پاکستان کے اندر غنی بھائی اور سکندر ملک دو آتش کے پرکالے پھڑ پھڑا رہے ہیں۔ اسے اپنی سیکورٹی پر بھی یقین نہیں ہو رہا تھا۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔

عین اس وقت جب اس کے آفس میں لگے وال کلاک نے گیارہ بج کر پچاس منٹ کا ٹائم بتایا اس کے ٹیبل پر رکھے ٹیلی فون نے اسے چونکا دیا۔

غصے سے گالیاں نکالتے ہوئے اس نے کریڈل اٹھا کر کان سے لگایا۔

"سر آپ سے ملنے ڈیلی نیوز کے ایک رپورٹر آئے ہیں۔" ٹیلی فون پر بتانے والے نے اجازت لینے کے انداز کے اسے آنے والے کا مختصر تعارف کروایا تھا۔

"ہاں ہاں بھیج دو لیکن اچھی طرح سے چیکنگ کر کے۔" اس نے تحکمانہ لہجے میں جواب دیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد اس کے آفس کا دروازہ کھلا اور زریاب نے اس سے اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ ایم این اے رانا اقبال نے بغور زریاب کو دیکھا۔ تبھی اس کی حیرت ہویدا رہ گئی کیونکہ زریاب نے آفس کے اندر داخل ہوتے ساتھ ہی اندر سے چٹخنی لگا دی تھی۔

☆.....☆.....☆

"تم نے اچھا نہیں کیا جانتی ہو وہ کتا بڑا خونخوار ہے۔ جینا حرام کر کے رکھ دے گا ہمارا۔" صائمہ نے زریں کی طرف سوالیہ آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

صائمہ کی آنکھوں میں ڈر اور وحشت کی پرچھائیاں مترشح تھیں جبکہ زریں کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ صائمہ کی بات سن کر اس نے اسے کھا جانے والی آنکھوں سے گھورا۔

"تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ بیچ چوراہے اس نے جو حرکت کی تھی میں اس کی حرکت پر خوشی سے نہال ہو کر اسے گلے سے لگا لیتی۔ اور بھری خلقت کے سامنے اظہار محبت کرتی۔" زریں نے کتابیں ایک طرف رکھتے ہوئے پوچھا۔

دونوں اس وقت گھر میں اپنے کمرے میں بیڈ پر براجمان پڑھ رہی تھیں۔ لیکن دونوں کا دماغ پڑھائی سے اچاٹ ہوا بیٹھا تھا۔ آج کے واقعے نے دونوں کو اپنی اپنی جگہ ساکت و صامت کر رکھا تھا۔

"تمہیں تھپڑ مارنے کی کیا ضرورت تھی۔ جو ہو گیا سو ہو گیا۔ ہاتھ چھڑواتی اور چلتی بنتی۔" صائمہ نے چنداں تلخ لہجے میں کہا۔

"میری پیاری بہن! ہماری ماں نے ہماری پرورش بہت اچھی کی ہے۔ ہمیں ہر برائی سے دور رکھا ہے۔ اگر آج اس کے منہ پہ طمانچہ نہ مارتی تو وہ کل پھر ایسی حرکت کرتا اور ایک دن آتا جب یہاں (انگلی کمرے چہار سو گھماتے ہوئے) ہمارے گھر میں آ کر ایسی بے ہودہ حرکت کرتا۔" زریں نے صائمہ کے پاس بیٹھ کر اسے بانہوں کے حصار میں لے کر سمجھاتے ہوئے کہا۔

"سوچا گروہ ایسی ویسی کوئی حرکت یہاں آ کر کر دے تو امی پر کیا گزرے گی؟"

اس کی بات سن کر صائمہ نے اس کی طرف

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

دیکھا لیکن اس کی آنکھوں میں پھیلی وحشت میں چنداں کمی نہ واقع ہوئی تھی۔

”ممکن ہے وہ اس سے بڑی کوئی حرکت اب کرے۔“ صائمہ نے ڈرے سہمے لہجے میں کہا۔

”وہ ایسا کچھ نہیں کرے گا تم خاطر جمع رکھو۔“ زریں نے بہن کا سر سینے سے لگا کر اسے تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

حقیقت تو یہ تھی کہ اس کا جیسے ہی غصہ اترا تھا۔ اسے بھی اپنے کیے پر پچھتاوا سا ہو رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ غنڈہ لوگوں کو اپنی عزت کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔ اسے اب اپنی، اپنی ماں اور بہنوں کی چنتا ہونے لگی تھی۔ اس کی آنکھیں نم آلود ہوگئی تھیں اور نگاہیں اوپر اٹھ گئی تھیں۔

☆......☆......☆

”کیسے ہو ایم این اے صاحب؟“ زریاب نے رانا اقبال کے سامنے نشست پر براجمان ہوتے ہوئے کہا۔

رانا اقبال اس کی بات سن کر تھوک نگل کر رہ گیا۔ اس کا حلق خشک ہوئے جا رہا تھا۔ وہ زریاب کو پہچان چکا تھا۔ جس نے اندر داخل ہوتے ساتھ ہی آفس کی چٹخنی لگادی تھی اور اس سے قبل کہ وہ کسی کو مدد کے لیے پکارتا اس نے دھمکی دے دی تھی کہ اگر اس کے منہ سے آہ بھی نکلی تو وہ اسے یہی مار ڈالے گا۔

رانا اقبال جس جگہ اپنی نشست پر براجمان تھا اس کے عین پیچھے ونڈو تھی جس کے سامنے ایستادہ ہو کر وہ باہر چلتی ٹریفک اور آتے جاتے لوگوں کو دیکھا کرتا تھا۔ یہی نہیں اس کی کھڑکی کے سامنے تھری سٹار ہوٹل تھا۔ جہاں ہمہ وقت گہما گہمی ہوتی تھی۔ اس کی اکثر راتیں بھی اسی ہوٹل میں کسی نہ کسی دوشیزہ کے ساتھ بیتتی تھیں۔ اس کھڑکی کے سامنے ایستادہ ہو کر وہ اکثر تھری سٹار ہوٹل کو دیکھ کر نئے نئے منصوبے بناتا تھا۔

”تت......تم......تم جانتے نہیں کہ......تم یہاں سے......زن......دہ نہیں جا پاؤ گے۔“ رانا اقبال نے بمشکل تمام کہا۔

”یہ تمہاری غلط فہمی ہے رانا اقبال میں یہاں سے جیسے آیا ہوں ویسے ہی زندہ واپس جاؤں گا۔ اب وقت کا ضیاع مت کرو اور فوراً مطلوبہ رقم میرے حوالے کردو۔“ زریاب نے فرنٹ والی پاکٹ کے اندرونی طرف لٹکتی پنسل نکال کر اسے گھماتے ہوئے کہا۔

”میں تمہیں کچھ نہیں دوں گا۔ اب تم یہاں سے زندہ واپس نہیں جاؤ گے۔“ رانا اقبال نے ٹیبل کے دراز سے اپنی پسٹل نکال کر زریاب پر تان کر کہا۔

”تمہاری ان گیدڑ بھبکیوں سے میں ڈرنے والا نہیں ہوں۔ لاسٹ بار کہہ رہا ہوں کہ رقم میرے سپرد کرو۔“ زریاب نے متواتر دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

”تم جانتے ہو کہ تمہاری زندگی میرے ہاتھوں میں ہے۔“ رانا اقبال نے ایک بار پھر زریاب کو دھمکی دیتے ہوئے کہا۔

”تمہاری تو۔“ زریاب نے غصے سے دانت پیستے ہوئے ادھورا فقرہ ادا کیا۔

دوسرے ہی لمحے اس نے پنسل کا بٹن دبا دیا۔ ایک لمحے کی تاخیر بھی نہ ہوئی اور رانا اقبال کا جسم ایک طرف لڑھک گیا۔ مرتے مرتے رانا اقبال کا ہاتھ قدرتی طور پر ٹیبل کے ساتھ لگے ایمرجنسی بٹن پر لگا اور دوسرے ہی لمحے خطرے کا الارم بجنے لگا۔

الارم کیا بجا ایک دم بھاگ دوڑ شروع ہوگئی۔ سوچنے کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ زریاب کو بھاگتے محافظوں کے قدموں کی چاپیں مترشح سنائی دینے لگی تھیں۔ اس نے جلدی سے ٹیبل کے دراز چیک کیے تو جلد ہی اسے ایک ٹیبل کے دراز میں نوٹوں کی کچھ گڈیاں مل گئی۔ جنہیں فوراً سے بھی پیشتر اس نے اپنی جیبوں میں بھرا۔

عین اس وقت جب آفس کا دروازہ پہلی بار کھٹکھٹایا گیا زریاب کھڑکی کے راستے چھلانگ لگا چکا تھا۔ ہر کس و ناکس حیران و ششدر تھا کہ اس نے اتنی بلندی سے چھلانگ لگائی تھی۔ اتفاق ایسا ہوا کہ عین اس وقت جب زریاب کا جسم زمین سے تھوڑی ہی بلندی پر تھا۔

لنڈے کے کپڑوں سے بھرا ایک ٹرک وہاں سے گزر رہا تھا۔ زریاب اس ٹرک میں لدے کپڑوں کے گٹھوں پر جا گرا۔ گرتے ساتھ ہی اس نے اوپر نگاہ دوڑائی۔ ابھی تک کوئی بھی سامنے نہ آیا تھا۔ زریاب ایک

لمبی جست لگا کر ٹرک سے باہر نکلا اور سرعت سے اپنی گاڑی کی طرف لپکا۔

ادھر وہ گاڑی اسٹارٹ کر رہا تھا تو دوسری طرف محافظوں نے مل کر زور لگا کر آفس کا دروازہ کھولا۔ اندر خون میں لت پت رانا اقبال کی لاش دیکھ کر ان کے حواس باختہ ہوگئے۔ کھلی کھڑکی دیکھ کر وہ جلدی سے اس طرف لپکے اور انہوں نے تیزی سے گاڑی بھگا کر جاتے زریاب کو فوراً ہی تاک لیا۔

عین اسی وقت وائرلیس پر انہوں نے نیچے ایستادہ محافظوں سے رابطہ کیا اور انہیں زریاب کا پیچھا کرنے کا کہا۔ زریاب ٹریفک کی وجہ سے پھنستا جا رہا تھا لیکن اس کے باوجود اس نے گاڑی روکی نہیں تھی۔

اسے پولیس کی گاڑیاں پیچھا کرتی دکھائی پڑ گئی تھیں۔ جلد ہی اس نے گاڑی ٹریفک کی جھنجھٹ سے نکالی اور ویرانے کی طرف جاتے روڈ پر ڈال دی۔ اس وقت وہی روڈ تھا جو اسے بچا سکتا تھا۔ گاڑی کی سپیڈ اس نے متواتر بڑھانا شروع کردی تھی۔ دوسری طرف پولیس کی گاڑیوں میں بتدریج اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

زریاب کی گاڑی کی سپیڈ اتنی تیز تھی کہ وہ جلد ہی پولیس کی گاڑیوں کو پیچھے چھوڑتا بہت آگے نکل آیا۔ اتفاق سے اس کی نگاہ روڈ پر لگے ایک بورڈ پر پڑی تو پتہ چلا کہ کراچی سے چند کلومیٹر پیچھے ہے۔

جلد ہی زریاب کی گاڑی پہاڑی علاقے میں پہنچ گئی۔ پہاڑی علاقے کے ساتھ ساتھ گھنا جنگل تھا۔ زریاب نے گاڑی وہیں روکی۔ کیونکہ گاڑی جنگل میں لے جانا خود کو مصیبت میں مبتلا کرنے کے مترادف تھا۔

اس نے چہار سو نگاہ دوڑائی۔ ابھی تک پولیس گاڑیاں اس تک نہ پہنچی تھی۔ وہ کہیں نہ کہیں بھاگ کر خود کو کسی محفوظ مقام پر پہنچا سکتا تھا۔ اس نے گاڑی سے اترتے ساتھ ہی گھنے جنگل کے اندر دوڑنا شروع کردیا تھا۔

نجانے کتنی دیر تک زریاب متواتر دوڑتا رہا تھا۔ اس کی سانسیں پھول رہی تھیں۔ بھوک و پیاس سے اس کا بدن لاغر ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرے کے بادل اکٹھے ہونا شروع ہوگئے تھے۔

اچانک زریاب کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ اس کی نگاہیں سامنے کی طرف جم کر رہ گئی تھیں۔

☆......☆......☆

شمعان نے شنکر کے شریر کے نجانے کتنے ٹکڑے کر ڈالے تھے۔ آنکھوں میں اتھر و بھرے ناگنیا اپنے محبوب کا ہوتا یہ حال دیکھ رہی تھی۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ کرے تو کیا کرے۔

دوسری طرف شمعان نے جادو کے زور پر ایک درمیانے سائز کی دیگچی حاصل کی۔ پھر ہاتھ کو فضا میں لہرا کر کوئی منتر پڑھا تو پانی سے بھرا ایک جگ اس کے ہاتھ میں آگیا تھا۔ اس نے دیگچی کے اندر پانی بھرا اور شنکر کے جسم کے ٹکڑے اٹھا کر اس کے اندر ڈال دیے۔ پھر ایک جگہ معمولی سا گڑھا کھود کر اس کے اوپر دیگچی رکھی اور نیچے چھوٹی چھوٹی لکڑیاں ڈال دیں۔

ایک بار پھر اس نے منہ ہی منہ میں کوئی منتر پڑھا تو دوسرے ہی لمحے لکڑیوں نے آگ پکڑ لی۔ شمعان ابلتے گوشت سے پانی کے اٹھتے بلبلے دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ اس ناگ کا شریر کھا کر زمین کی تہوں میں چھپے خزانوں کا مالک بننے والا تھا۔ لیکن شاید اسے اس بات کا علم نہ تھا کہ تقدیر میں کچھ اور ہی لکھا جا چکا تھا۔

ابلتے گوشت سے اٹھتے بلبلے دیکھ کر شمعان کے منہ میں پانی بھر رہا تھا۔ اچانک شمعان کی سماعت سے کوئی بازگشت ٹکرائی۔ اس نے سرعت سے اس طرف دیکھا جس طرف سرسراہٹ ہوئی تھی۔ اچانک تھوڑے ہی فاصلے پر اسے ناگن سرعت سے دوسری طرف نو دو گیارہ ہوتی دکھائی دی۔

شمعان نے ایک نگاہ ادھر ادھر دوڑائی تاکہ اس بات کا یقین کرلے کہ اس جنگل میں اس کے علاوہ تو کوئی اور نہیں ہے۔ جب اسے اچھی طرح سے یقین ہوگیا تو اس نے جلدی سے اپنی بین اٹھائی اور اس طرف دوڑ لگادی جس طرف ناگن گئی تھی۔

(جاری ہے)

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

قوسِ قزح

قارئین کے بھیجے گئے پسندیدہ اشعار

وفا کی راہ بڑی پرخار سی لگتی ہے
زیست آنسوؤں کی دیوار سی لگتی ہے
زندگی ڈھل گئی پھر سے غم کے سانچے میں
تیری ہر خوشی ہمیں یادگار سی لگتی ہے
(محمد اسلم جاوید۔فیصل آباد)

تمہارے ساتھ رہنا بھی مشکل ہے بہت
اور بن تمہارے بھی ہم رہ نہیں پاتے
کیسے کہہ دوں کہ مجھے چھوڑ دیا ہے اس نے
بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی
(فلک زاہد۔لاہور)

مانا کہ آج ہم اکیلے رہ گئے
جدائی کے آنسو آنکھوں سے بہہ گئے
روتے رہے تو کون چپ کرائے گا ہمیں
جو چپ کراتے تھے وہی رونے کو کہہ گئے
(شرف الدین جیلانی۔ٹنڈوالہ یار)

طلب کریں تو یہ آنکھیں بھی ان کو دے دوں میں
مگر یہ لوگ ان آنکھوں کے خواب مانگتے ہیں
(فرزانہ عابد۔لاہور)

ہم محبت کی قدر محبت سے کیا کرتے ہیں
ہم پہ جو مرے اس کے لئے جیا کرتے ہیں
سوال ہو جو لئے دینے کا
ہم کانٹے لیا کرتے ہیں پھول دیا کرتے ہیں
(نرگس۔کراچی)

میری غربت اڑاتی ہے میرے فن کا مذاق
تیری دولت نے تیرے عیب چھپا رکھے ہیں
(سنبل ماہین طٰہٰ۔سرگودھا)

تنہائیوں کا اک الگ مزا ہے
اس میں ڈر نہیں ہوتا کسی کے چھوڑ جانے کا
(سنبیل ماہین۔سرگودھا)

تو شاید کبھی یہ اشارہ نہیں ہونے والا
کہ اب عشق سے چھٹکارا نہیں ہونے والا
میں تو بس تمہیں ہی یہ دل دے چکا ہوں اویس!
مجھے اب کوئی تم سے پیارا نہیں ہونے والا
(اویس نور گڈانی۔میر پور ماتھیلو)

صبا کی طرح نہ کوئی قرار کو ترسے
تمام عمر چلے لیکن دیار کو چلے
گلوں کے نام پیار بہار جولائے
قدم قدم شجر سایہ دار کو ترسے
(محمد آصف شہزاد الہ آباد۔سرگودھا)

ہے مجھ میں بھی بہت سی غلط فہمیاں
کہ جب بھی کسی کو سمجھا اپنا ہی سمجھا
(محسن عزیز حلیم۔کوٹھا کلاں)

لوگوں کو اکثر کہتے سنا ہے کہ زندہ رہے تو پھر ملیں گے
تم سے مل کے ایسا لگا کہ ملتے رہے تو زندہ رہیں گے
(عبدالحلیم بھٹی اینڈ محسن۔کوٹھا کلاں)

سوجاؤں تو تیرے خواب جگا دیتے ہیں
اندھیری راتوں میں ہم چراغ جلا دیتے ہیں
یہاں کوئی بھی نہیں اپنا یہ دیکھا ہے جاوید
سرد راتوں میں ہم تجھے دعا دیتے ہیں
(انتخاب: کوثر جہاں.....فیصل آباد)

بہت بے کیف لمحے ہیں عجب بوجھل سا جیون ہے
نہ غم سے دل بہلتا ہے، نہ خوشیاں راس آتی ہیں
(انتخاب: تانیہ ملک.....ٹنڈو آدم)

میں کھلونا ہوں مجھے ہاتھ مت لگاؤ تم
کسی شوکیس میں رکھ کر مجھے سجالو تم
میری آنکھوں میں کبھی دیکھو بھی
میرے چہرے پر کبھی پیاری سی نظر ڈالو تم
(انتخاب: شان ملک .....ٹنڈو آدم)

نہ ستاؤ ہمیں ہم ستائے ہوئے ہیں
جدائی کا تیری ہم غم اٹھائے ہوئے ہیں
کھلونا سمجھ کر ہم سے یوں نہ کھیلو دوست
ہم بھی تو اسی خدا کے بنائے ہوئے ہیں
(انتخاب: عامر ملک.....ٹنڈو آدم)

☆☆

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

اپنے دکھ درد کو دنیا سے چھپانے کے لئے
ہنستا رہتا ہوں میں اب یوں ہی زمانے کے لئے
پھر کوئی خواب محبت کا دکھاؤ مجھ کو
خلقت شہر ہے بے تاب فسانے کے لئے
شعر تخلیق میں کرتا ہوں جگر کے خوں سے
خواب غفلت سے زمانے کو جگانے کے لئے
زندگی اس کو شب و روز دعا دیتی ہے
وقف کرتا ہے جو ہر سانس زمانے کے لئے!
اپنی نظروں سے مجھے آپ گرانے کے لئے
مجھ پہ کرتا ہے وہ احسان جتانے کے لئے
ہوگئیں شور میں معدوم صدائیں میری
کوئی آیا نہ مری جان بچانے کے لئے
نیند آنکھو میں شب و روز بھری رہتی ہے
کوئی آتا نہیں اب خواب چرانے کے لئے
عمر بھر جھوٹ کا چھوڑا نہیں دامن اس نے
اپنے ایک جھوٹ کو زمانے سے چھپانے کے لئے
(حکیم خان حکیم۔کامل پور موسیٰ، اٹک)

حصار میں ہے یہ دنیا سنہرے جالوں کے
طیور تک نہیں آزاد اب خیالوں کے
اندھیرے روشنیوں میں نہ ہوسکے تبدیل
سفید ہوگئے ہاں رنگ سر کے بالوں کے
نہ فتح ہوسکے افسوس نفرتوں کے محاذ
جواب دے گئے سب حوصلے جیالوں کے
یہ صورتیں بڑی سوہان روح ہوتی ہیں
زوال دن نہ دکھائے خدا کمالوں کے
جواب دیتی ہے دنیا مگر درست نہیں
جبیں وقت پہ لکھے ہوئے سوالوں کے
دلوں کے آئینے اللہ با صفا کردے
بڑے خلوص و محبت سے ملنے والوں کے
وہ دن گئے کہ معزز تھے نیک اب واجد
سیاہیاں ہیں نصیبوں میں خوش خصالوں کے
(پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی.....کراچی)

آنکھ سے آنسو نمایاں نہیں ہوتے
تیری بے وفائی سے ہم پریشان نہیں ہوتے
تم سلامت رہو ہمیشہ پھولوں کی طرح
گزرے ہوئے لمحے پھر مہرباں نہیں ہوتے
تیری دید میں کیسے زخم پائے ہیں
کسی طرح ہم یوں بھی حیراں نہیں ہوتے
بدلی ہے آسماں نے نگاہ ہم سے آج
اپنی سوچوں سے ہم جواں نہیں ہوتے
سحر ہوئی تو ہمیں نیند آنے لگی پھر
فاصلے وفا کے تیرے، میرے درمیاں نہیں ہوتے
فریب دے گیا کسی کا سایہ بھی ہمیں جاوید
بھولے سے تیری ذات سے ہم بدگماں نہیں ہوتے
(محمد اسلم جاوید۔فیصل آباد)

میری آنکھوں سے تیری یاد کا سایہ نہیں جاتا
میں نے مان لیا تم کو بھلایا نہیں جاتا
اک مدت سے تیرا نام لکھا ہے دل پر
میں کیا کروں وہ مجھ سے مٹایا نہیں جاتا
ہونے والے تو خود ہی اپنے ہوجاتے ہیں
کسی کو کہہ کر اپنا بنایا نہیں جاتا
مدت ہوئی تیرے ہجر میں جلتے ہوئے
آؤ کہ اب ان آنکھوں کو اور رلایا نہیں جاتا
زرد چہرہ، بکھرے بال، خاموش لب اور نم آنکھیں
حالت زار کو اب مزید چھپایا نہیں جاتا
امیر شہر سے کہہ دو اپنی اوقات میں رہے
مجھ سا شخص دولت سے منایا نہیں جاتا
زمانے کے داؤ سیکھنے میں صائم کچھ دیر تو لگے گی
کوئی بچہ ماں کے پیٹ سے سکھایا نہیں جاتا
(ظہور احمد صائم۔لاہور)

بستر کرب پہ جب نیند جلائی میں نے
تب کس خواب کی بنیاد اٹھائی میں نے

زخم ایسے تھے کہ ہر شخص کے آگے رکھے
بات ایسی تھی کہ خود سے بھی چھپائی میں نے
حرمت غم کے لئے خود کو اذیت بخشی
پھر اسی درد سے تسکین بھی پائی میں نے
میں نے زخموں کو کریدا انہیں تازہ رکھا
تب کہیں دشت میں کی نغمہ سرائی میں نے
اپنی کھڑکی سے یونہی خود کو پکارا کل شب
اور پھر خود کو وہ آواز سنائی میں نے
جانے والے سے رگ جان کا بھی رشتہ تھا سمیر
یہ سمجھنے میں بہت دیر لگائی میں نے
(شرف الدین جیلانی۔ٹنڈوالہ یار)

سب سے اونچی ہے تری شان رسولؐ عربی
آپؐ جیسا کوئی نہیں انسان رسولؐ عربی
ہو کرم اس پہ کہ کٹ جائے مصیبت اس کی
آج امت ہے پریشان رسولؐ عربی
مل گئی آپؐ کی امت کو فضیلت کتنی
ہم پہ ہے آپؐ کا احسان رسولؐ عربی
ہو کرم اور ملے اذن حضوری مجھ کو
میں بنوں آپؐ کا مہمان رسولؐ عربی
مجھ سا کم ظرف بھلا کیسے ثنا خوانی کرے
جب خدا خود ہے ثنا خوان رسولؐ عربی
مجھ گناہگار پہ ہو نظر عنایت آقا
مشکلیں ہوں مری آساں رسولؐ عربی
نعت گوئی کی سعادت جو ملی ہے مجھ کو
میری بخشش کا ہے سامان رسولؐ عربی
(ریاض حسین قمر۔منگلاڈیم)

عنا دل کے مضامیں، حیلۂ صیاد رہنے دو
نہیں ہے داد کی خواہش مجھے بے داد رہنے دو
نہ پہنچا آسماں تک جو کبھی وہ نالہ دل ہوں
مرا نغموں سے کیا رشتہ مجھے فریاد رہنے دو
مجھے انسانیت کی قبر پر آنسو بہانے میں
اصول و مذہب و قانون سے آزاد رہنے دو
یہی ہے میرا کعبہ اس کو بے دردی سے مت ڈھاؤ
مرے ٹوٹے ہوئے دل میں کسی کی یاد رہنے دو
نئی تہذیب کے چارہ گرو، میرے مسیحاؤ
مبارک تم کو آبادی، مجھے برباد رہنے دو
امتیاز اردو زباں کے شاعروں میں ہے دھڑے بندی
نہیں موقوف کراچی پر، حیدر آباد رہنے دو
(ایس امتیاز احمد۔کراچی)

ہر شخص میں ہیں جاناں کچھ باتیں کئی قصے
جس کسی سے ملے ہم، سنے عاشقی کے قصے
کبھی شوخیوں نے کرلیا دل میں بسیرا
اور کہیں ہیں لبوں پر سادگی کے قصے
کوئی پہلو یار کو تسکین فردوس کہے
کسی سمت ہیں بس دیوانگی کے قصے
کسی کی نظر میں یار ہے خدا
اور دل میں ہے سمائے عاجزی کے قصے
کوئی بن گیا ہے رانجھا جوگی عشق میں
اور کوئی سناتا پھرے آوارگی کے قصے
کہیں نظر آیا فقط پیار ہی پیار
اور کہیں ہیں دکھے بے رخی کے قصے
بہت کچھ دیکھا ہے طیب اور اتنا ہی بس سمجھا
جن کے لبوں پر رہتی ہیں عشق و وفا کی باتیں ہیں بس دلگی کے قصے
(انتخاب: ندیم عباس میواتی۔پتوکی)

کبھی بخشش کا سامان ہوا پھرتا ہے
شہر سارا پریشان ہوا پھرتا ہے
کل تک جو مشہور تھا زمانے میں رستم بن کر
آج اپنی ہی ذات میں گمنام ہوا پھرتا ہے
ایک بارودی جیکٹ اور نعرہ تکبیر
راستہ جنت کا دیکھو تو آسان ہوا پھرتا ہے
جانے کون کسے مار دے کافر کہہ کر
اسی ڈر سے شہر سارا مسلمان ہوا پھرتا ہے
(محمد ابو ہریرہ بلوچ......بہاولنگر)

عالم عجب ہاں، دشت کا سماں ہے
خوف ہے چہروں پہ، جسم لرزاں ہے

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

بھگدڑ مچی ہے ایسی، ہے سب کو ڈر
نہیں کسی کو خبر، جائے تو جائے کدھر
نہ تھا یقین کہ یہ ساعت آئے گی
آخر انہیں بھی مات ہوجائے گی
دور حاضر کے انسان کیا گل کھلا رہے ہیں
کبھی شیطان خود کو انسان سے چھپا رہے ہیں
کار ابلیس میں لگ گیا حضرت انسان
ہم کریں کیا، شیطان ہیں نوحہ کناں
(ساحل ابڑو......ڈیرہ اللہ یار)

وہ اپنی شاعری بھی کاش میرے نام دے ڈالے
مجھے ایسے کوئی چاہے کہ مجھ پر جان دے ڈالے
میں پھر اس کی محبت کے بھنور میں ڈوبتا جاؤں
کبھی جو اتفاقاً وہ نظر کا جام دے ڈالے
وہ ہستی زندگی کی شب میں اک قندیل جیسی ہو
جلا کر دل کو اپنے روشنی ہر شام دے ڈالے
میری پلکوں سے اس کی یاد میں موتی اگر برسیں
ستارے گنگناتے ہوں، ہوا پیغام دے ڈالے
مجھے وعدہ ہو یاد اپنا اویس وہ بھی بھلائے نہ
کہانی جب سنے کوئی، وفا کا نام دے ڈالے!
(اویس نور گڈانی......میرپور ماتھیلو)

پوچھو تو سماں میں کیا رکھا ہے
ہر وقت ہونٹوں پر تیرا نام سجا رکھا ہے
تم تھوڑی سی حرارت پہ تڑپتے ہو
ہم نے سینے میں بھانبڑ مچا رکھا ہے
تم ایک دو آنسو بہا کر تھک جاتے ہو
ہم نے آنکھوں میں نلکا چلا رکھا ہے
تم اپنی زلفیں شیمپو سے سنوارتے ہو
ہم نے لسی میں تیل ملا رکھا ہے
تم کسی اور کے ہوجاؤ تو کوئی غم نہیں
ہم نے یہ چکر کسی اور سے بھی چلا رکھا ہے
ہم دل تو کسی اور کو دے چکے ہیں
تمہارے لئے گردہ بچا رکھا ہے
(محمد بلال رسول ......لاہور)

وہ وعدہ ایفا عہد وفا نبھا نہ سکے چلے گئے
ہم حسرت دیدار کے تھے طالب مگر وہ چلے گئے
زندگی یوں بھی آسانی سے نہ کٹ رہی تھی
اس پر بھی اک نیا داغ لگا کے وہ چلے گئے
امید وفا بہت تھی مجھ غریب کو ان سے
بیچ رستے میں چھوڑ کے وہ ہاتھ چلے گئے
چھوڑیے کیا کہیے یہ تو دنیا کی ریت ہے پرانی
گرتی ہوئی دیوار کو وہ لگا کر دھکا چلے گئے
جو باقی ہے سانس وہ واپس لے لو
سونپ کے یادوں کے انبار وہ چلے گئے
الٰہی حسن کو وفا میں سمویا ہے بہت کم آپ نے
اب آصف شہزاد کا کر کچھ علاج وہ چلے گئے
(محمد آصف شہزاد الہ آبادی......قصور)

عجب اک بیقراری ہے کرے کوئی تو کیا آخر
پریشاں قوم ساری ہے کرلے کوئی تو کیا آخر
حکومت کی پذیرائی میسر ہے لیٹروں کو
ستم لوگوں پہ جاری ہے کرے کوئی تو کیا آخر
امن لئے کہاں جائیں مساجد تک نہیں چھوڑی
عجب حالت ہماری ہے کرے کوئی تو کیا آخر
یہاں دھرنا وہاں دھرنا مٹاؤ دیس سے غربت
یہی فرمان جاری ہے، کرے کوئی تو کیا آخر
وہی ہے راہنما اپنا جو مخلص نہیں ہے خود سے بھی
مروت سے جو عاری ہے کرے کوئی تو کیا آخر
یہ یہ مہنگا پہلے تھاان پہ ٹیکس بھی ہلکا تھا
ان کی اب تو باری ہے کرے کوئی تو کیا آخر
کوئی تو ان میں ایسا ہو جو بابا قائدؒ جیسا ہو
عباس دعا ہماری ہے، کرے کوئی تو کیا آخر
(سید عباس حیدر بخاری......کامرہ کلاں)

تیری یاد جو سینے سے لگا رکھی ہے
ہم نے دنیا میں الگ دنیا بسا رکھی ہے
ہم کو معلوم نہیں چاہت کے تقاضے لیکن
ہم نے تیری باتوں کے سوا ہر بات بھلا رکھی ہے

سفر مشکل ہے معلوم ہے لیکن
تو ہمارا ہے تو ہر فکر مٹا رکھی ہے
تو بھلا دے تو بھلا دے لیکن ہم نے
تیری خوشبو بھی تعویذ بنا رکھی ہے
تو الگ ہو تو ہر بار یوں لگتا ہے
زندگی موت کے پہلو میں بٹھا رکھی ہے
تیری باتیں تیرا لہجہ تیرا چہرہ ہم دم
تجھ میں خالق نے ہر چیز جدا رکھی ہے
(انتخاب: شان ملک......ٹنڈو آدم)

وقت رخصت میں تیرا مجھ سے لپٹ جانا
لیکن پھر وہ ارادہ سا بدل جانا
میرا کہنا کہ کیسے گزریں گے پل
تیرا کہنا کہ مجھے بھول جانا
وہ میرا پھر سے ملنے کی تمنا کرنا
روتے روتے تیرا اچانک سنبھل جانا
کیسے بھولوں گا میں وہ گزرے ہوئے پل
کبھی لڑنا جھگڑنا محبت سے اور وہ تیرا مجھے منانا
تیری آغوش میں سر رکھ کر سوجانا
اور تیری آنکھوں کے سمندر میں کھوجانا
میں نہ کہتا تھا کہ محبت دکھ دے گی نوری
تیرا کہنا کہ محبت ہی تو ہے جنت جاناں
(انتخاب: عرفان ملک......دیپالپور)

کیوں آنکھ بھری بھری ہے ہوا تو کچھ ضرور ہے؟
نہ لبوں پہ ہنسی ہے ہوا تو کچھ ضرور ہے
کہیں دل پریشاں تو نہیں؟
کہیں لبوں پہ کوئی صدا تو نہیں؟
کہیں بجھا کوئی دیا تو نہیں؟
شامیں لٹی لٹی ہیں ہوا تو کچھ خیر ہے؟
کہیں ہوا کوئی خفا تو نہیں؟
کہیں ادھوری کوئی دعا تو نہیں؟
کہیں پھول کوئی لٹا تو نہیں؟
نہ موسم میں تازگی ہے ہوا تو کچھ خیر ہے؟
کیوں آنکھ بھری بھری ہے ہوا تو کچھ ضرور ہے؟
(انتخاب: سحرش اسلم......ٹنڈو آدم)

وہ حسن مجسم کمال اس کی آنکھیں
سراپا محبت جمال اس کی آنکھیں
جھکائے تو لگتی ہیں زیور حیا کا
اٹھیں تو کریں پھر سوال اس کی آنکھیں
ملیں تو میں دو جہاں دے کے لے لوں
وہ چہرہ وہ آنکھیں وہ زلفیں
اگر کوئی پوچھے کہ دنیا میں کیا ہے
دنیا دیوانہ کہے گا مثال اس کی آنکھیں
(انتخاب: عارفہ عامر......نواب شاہ)

مجھے تلاش ہے اس کی جو صرف میرا ہو
میرا نصیب بنے میرے دل کے پاس رہے
میرے قریب ہو اتنا کہ سانس رک جائے
مجھی کو چاہے ہنسائے ستائے...... پیار کرے
وہ میری مانگ سجائے مجھ ہی کو وہ بہلائے
میں سوچتی ہوں کہ میری وفا کا شہزادہ
کہیں تو ہوگا زمانے کی بھیڑ میں کھویا
کبھی تو میرے لئے اس کا دل تڑپے گا
کبھی تو پیار کا شعلہ لہو میں بھڑکے گا
(انتخاب: سونیا بلال......نوابشاہ)

یہ کیسی ہجرتیں ہیں موسموں میں
پرندے بھی نہیں ہیں گھونسلوں میں
بھڑک اٹھیں گے شعلے جنگلوں میں
اگر جگنوں بھی چمکے جھاڑیوں میں
بہت تنہا ہے وہ اونچی حویلی
میرے گاؤں کے کچے گھروں میں
(انتخاب: شہناز عبدالستار......کراچی)

☆☆

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

مسلوں سے لڑنا ہے
فاصلوں سے لڑنا ہے
شہر والوں نے کہا
پاگلوں سے لڑنا ہے
ہر قدم پر دردوں کے
قافلوں سے لڑنا ہے
مشغلوں سے کھیلے ہیں
مشغلوں سے لڑنا ہے
کشتیاں جلادو سب
حوصلوں سے لڑنا ہے
دوستوں اندھیروں کے
سلسلوں سے لڑنا ہے
اب اٹھو رانا نئے
مرحلوں سے لڑنا ہے
(قدیر رانا-راولپنڈی)

ایک غلطی جناب ہم نے کی
زندگانی خراب ہم نے کی
ایسے لمحے بھی آئے جیون میں
تری صورت نقاب ہم نے کی
اس نے مانگا خراج الفت کا
ذات اپنی نصاب ہم نے کی
پی کر ترے گلابی ڈوروں سے
ہستی اپنی شراب ہم نے کی
جو گزاری تمہاری قربت میں
بس وہ گھڑی ثواب ہم نے کی
کون کہتا ہے آنکھ پرنم ہے
محبت مانند سیلاب ہم نے کی
ساری بنجر زمیں اداسی کی
چشم تر سے سیراب ہم نے کی
ظرف پروانے کو سکھایا ہے
رُت موسم گلاب ہم نے کی
لے کر بے کشی بہاروں سے عامر
اک کہانی کتاب ہم نے کی
(عامر زمان عامر-بورے والا)

کیوں تڑپتی ہو اب؟
میرے ان آنسوؤں کو دیکھ کر
کیا بھول گئی تم؟
یہ تیری ہی تو
دی ہوئی سوغاتیں ہیں
مت روکو مجھے کہنے سے
کہ میں تم سے پیار کرتا ہوں
تیرا انتظار کرتا ہوں
چاندنی راتوں میں کھلے آسمان تلے
میں چاند ستاروں سے
تیرا احوال کرتا ہوں
بے وفا لوگوں کی طرح
تم بھی لوٹ کر نہ آؤ گی
جب میری وفا مجھے یہ کہنے سے روکتی ہے
تو میں خود کو حاضر
دربار دل بے اختیار کرتا ہوں
میری عاشقی کا یہ عالم ہے کہ
میں آنکھیں بند کر کے تیرا دیدار کرتا ہوں!
(رابعہ امانت علی-لاہور)

"تم کہیں نہیں ہو"

دسمبر کی سرد
خنک راتوں میں
تھام کر ہاتھ تمہارا
تارکول کی لمبی سڑک پر
یونہی دور تک چلنا......
تمہاری باتیں
سنتے ہوئے
تمہاری مدھر سرگوشیوں پہ
ہنستے ہوئے
دھند میں لپٹی
گہری تاریکی سے
میرا ڈرنا
اپنے ہی قدموں کی
آہٹ سے سہم کر
تمہیں مضبوطی سے
تھام لینا
سماعت میں رس
گھولتا ہوا تمہارا
وہ دلنشیں قہقہہ اور
مجھے "بزدل" کہہ کر
پکارنا میرا تمہیں تیز نگاہوں
سے گھورنا
مگر اگلے ہی لمحے ہنس کر
تمہاری پناہوں میں آجانا
وہ تمہارا میرے ماتھے پر
نرم گرم سا بوسہ دیا......
سب یاد ہے مجھے
اب بھی وہی دسمبر کی
خنک راتیں ہیں
وہی تارکول کی لمبی
سڑک ہے
اور اس پر میں دور
تک چلتی ہوں
میری نگاہیں تمہیں
ڈھونڈتی ہیں......
مگر
اب تم کہیں نہیں ہو......!!
ہاں کہیں نہیں ہو......!!
(مریم شاہ بخاری-سرگودھا)

پت جھڑ کے موسم میں
بچھڑے تھے نہ ہم دونوں
سنو جاناں
خزاں کی رت گئی ہے اب
اب بہار آئی ہے
ہر طرف گھٹا لہرائی ہے
ہریالی بھی چھائی ہے
تو تم بھی لوٹ آؤ نا
بہاریں لو آئی ہیں
(سید عبادت کاظمی-ڈیرہ اسماعیل خان)

☆☆

کٹھن راستہ

شہزادہ چاند زیب عباسی

اچانک سنسناہٹ کی آواز ابھری اور تیر تین پولیس والوں کے سینے میں پیوست ہوگئے، اس قدر نشانہ کوئی ماہر تیر انداز ہی لے سکتا تھا مگر یہ کیا تیر انداز کی جگہ ایک بن مانس اپنے ہاتھ میں ایرو شوٹر لئے کھڑا تھا یہ کیسے ممکن تھا لیکن.....

دماغ پر سکتہ طاری کرتی اور خوف کے شکنجے میں جکڑتی انسانی عقل میں نہ آنے والی خونی کہانی

موسم ابر آلود تھا۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ اس خوش گوار موسم میں بغیر ہڈ کے بڑے ٹائروں والی جیپ جنگل کی حدود میں داخل ہو چکی تھی۔ جیپ میں انسپکٹر ادریس علی تین پولیس اہلکاروں سمیت موجود تھا۔ شام پانچ بجے کا وقت تھا۔ ابر آلود موسم کے باعث راستہ صاف دکھائی نہ دے رہا تھا۔ اس کے علاوہ راستہ بھی ناہموار تھا اس لئے بھی جیپ کی رفتار خاصی کم تھی وہ اس وقت سیر و سیاحت کی غرض سے جنگل میں نہیں جا رہے تھے بلکہ ایک کیس کی تفتیش کے سلسلے میں اس جنگل میں داخل ہوئے تھے۔

خان نگر نامی یہ سرسبز و شاداب علاقہ بلوچستان میں واقع تھا۔ یہاں کی آبادی غریب اور سادہ لوح افراد پر مشتمل تھی۔ سردار رفیق صوبائی اسمبلی کا ممبر ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت امیر و کبیر شخص تھا۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور نیک انسان تھا۔ خان نگر کے باسی اپنے اس سردار سے بہت خوش تھے۔ شہباز خان اس کا اکلوتا بیٹا تھا جو دو سال قبل ہی جرمن کے ایک اعلیٰ تعلیمی ادارے سے تعلیم حاصل کر کے آیا تھا۔ وہ تعلیم حاصل کرنے گیا تو تنہا تھا لیکن واپس لوٹا تو اس کے ساتھ ایک غیر ملکی دوست کمپالا بھی تھا جس کا تعلق براعظم افریقہ سے تھا۔

شہباز خان کے طور طریقے مغربی طرز کے تھے۔ وہ مغربی تہذیب میں رنگ چکا تھا۔ شراب اور شباب کی لت پڑ چکی تھی یہاں آ کر بھی اس نے اپنے رنگ ڈھنگ نہ بدلے تو سردار رفیق خان نے اسے سختی سے تنبیہ کیا تو وہ سنبھل گیا۔

پھر کمپالا بھی ایک روز کہیں چلا گیا۔ شاید افریقہ لوٹ گیا۔

پچھلے کچھ مہینوں سے خان نگر سے پراسرار طور پر نوجوان لڑکے اور لڑکیاں غائب ہونے لگے۔ جن کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ پھر کچھ روز بعد حویلی سے پراسرار طور پر سردار رفیق خان اور ان کی اہلیہ بھی غائب ہو گئے۔

ان دنوں شہباز خان کسی ضروری کام سے شہر گیا ہوا تھا۔ شہباز خان نے اپنے وسائل اور ذرائع سے ڈھونڈنے کے علاوہ پولیس میں ایف آئی آر بھی درج کروادی لیکن اس کا بھی کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

ان کے غائب ہونے کے کچھ دنوں بعد گاؤں کا ایک رہائشی لکڑیاں کاٹنے جنگل میں گیا لیکن واپس نہیں لوٹا اس کی رپورٹ بھی تھانے میں درج کروادی گئی۔

انسپکٹر اسی سلسلے میں جنگل میں داخل ہوا تھا۔ اس کا اپنا ذاتی خیال یہی تھا کہ ''لکڑہارا کسی درندے کا شکار ہو گیا ہوگا۔ لیکن ایسی صورت میں بھی اس کی لاش کی

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

باقیات ملنی چاہئے تھیں۔" وہ جنگل میں کافی آگے نکل آئے تھے لیکن ہنوز اپنے مقصد میں ناکام تھے۔

سورج بھی غروب ہو چکا تھا۔ اب وہ یہ سرچ لائٹس کی روشنی میں آگے بڑھ رہے تھے۔

اچانک سیٹی سے مشابہ ایک ہوکتی ہوئی آواز سنائی دی۔

انسپکٹر اور لیس چوکنا ہو گیا۔ اور متلاشی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اسی وقت سرسراہٹ کی آواز سنائی دی اور ایک زوردار دھماکہ ہوا اور جیپ بری طرح لہرانے لگی۔

ڈرائیور نے بمشکل لہراتی ہوئی جیپ کو کنٹرول کر کے ایک طرف روکا۔ انسپکٹر جیپ سے نیچے اتر آیا جیپ کا پچھلا ٹائر برسٹ ہو چکا تھا۔ متاثرہ ٹائر کو دیکھتے ہی اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ٹائر میں ایک تیر پیوست تھا۔ تینوں پولیس اہلکار بھی جیپ سے اتر کر الرٹ ہو چکے تھے۔ انسپکٹر حیران تھا کہ اس دور افتادہ گھنے جنگل میں اگلی جیپ کا ٹائر کس نے برسٹ کیا؟ اسے شدید قسم کی گڑبڑ کا احساس ہو رہا تھا۔

ایک بار پھر سیٹی سے مشابہ ہوکتی ہوئی آواز گونجی۔ پولیس اہلکار پہلے ہی رائفلیں فائرنگ پوزیشن میں کر چکے تھے۔

اچانک دائیں سمت واقع جھاڑیوں کے جھنڈ میں ہلچل سی مچی۔ یہ جھاڑیاں ان سے کافی فاصلے پر تھیں۔ پھر انہوں نے سرچ لائٹس کی روشنی میں جھاڑیوں سے درجنوں خونخوار بھیڑیوں کو برآمد ہوتے دیکھا۔ جو غراتے ہوئے ان کی طرف بڑھے۔ ان پولیس والوں کی انگلیاں ٹریگر پر تھیں لیکن اس سے پہلے کہ وہ اپنی انگلیوں کو جنبش دیتے۔

اچانک سنسناہٹ کی آواز ابھری اور یکے بعد دیگرے تین تیر تینوں پولیس اہلکاروں کے سینے میں پیوست ہو گئے۔ یہ تیر سامنے ایک درخت کی آڑ سے چلائے گئے تھے۔ اس اندھیرے میں اتنا درست نشانہ بلاشبہ تیز انداز بہترین نشانہ باز تھا۔

انسپکٹر نے تینوں اہلکاروں کے فوراً بے حس و حرکت ہوتے جسم کو دیکھتے ہی اندازہ لگایا کہ تیر زہر آلود تھے۔ پھر درخت کی آڑ سے برآمد ہوتے وجود کو دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل گئیں یہ چھ فٹ لمبا دیو ہیکل بن مانس تھا۔ جو انسانوں کی طرح تن کر کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایرو شوٹر تھا اب وہ ماہر نشانہ باز کی طرح اس کا نشانہ لئے ساکت کھڑا تھا۔

انسپکٹر کسی مجسمے کی طرح ساکت و جامد ششدر کھڑا تھا۔ گویا ان کی جیپ کا ٹائر اسی بن مانس نے برسٹ کیا تھا۔ اور پھر تینوں اہلکاروں کی موت کا ذمہ دار بھی یہی بن مانس تھا۔

انسپکٹر حیران تھا کہ بن مانس جیسا جانور ایرو شوٹر سے اتنا بہترین نشانہ کیسے لے سکتا ہے۔ اور پھر بھیڑیوں کے غول کا اسی وقت نمودار ہونا، جب بن مانس ان پر حملہ آور ہوا تھا۔ اس بات کا اشارہ کر رہا تھا کہ بھیڑیوں اور بن مانس کا آپس میں کوئی نہ کوئی تعلق ہے۔

لیکن اب سوچنے یا سمجھنے کا وقت نہیں تھا۔ ایک طرف تو وہ بن مانس ایرو شوٹر سے مسلح کھڑا تھا۔ جب کہ دوسری طرف درجنوں خون خوار بھیڑیے غراتے ہوئے اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ان کے تیور جارحانہ تھے اتنا تو وہ جان ہی چکا تھا کہ وہ تنہا ایک پسٹل اور رائفل کے بل بوتے پر ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا پھر بھی اس نے پلٹ کر بھیڑیوں کے غول کی طرف تین چار فائر کئے۔ دو تین بھیڑیے گولی لگنے سے ڈھیر بھی ہوئے مگر رکے بغیر اس کی طرف بڑھتے رہے۔ یہ خلاف فطرت بات تھی بھیڑیے عموماً گولی کی آواز سے بدک جاتے ہیں۔ مگر وہ بھاگنے کے بجائے غراتے ہوئے اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔

ایک بار پھر سیٹی سے مشابہ ہوکتی ہوئی آواز گونجی اور بھیڑیوں کے بھاگنے کی رفتار میں تیزی آ گئی بھیڑیے سر پر پہنچنے والے تھے۔ وہ جان بچانے کے لئے ایک طرف بھاگا۔ جان بچانے کی انسانی جبلت کے تحت اس وقت اس کے دوڑنے کی رفتار بہت زیادہ تھی۔ مگر بھیڑیے اب بھی عفریت کی طرح اس کے پیچھے تھے۔ اس اندھیرے میں گھنے جنگل میں بھاگنا بھی دشوار تھا۔ ڈرتا

کہ کہیں وہ کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر گر نہ جائے مسلسل دوڑنے سے اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا اور جسم پسینے میں شرابور ہو چکا تھا اور سانس پھول رہا تھا۔

پھر وہی ہوا جس کا اسے ڈر تھا۔ دوڑتے ہوئے وہ کسی پتھر سے ٹھوکر لگنے کے باعث گرا اور اٹھ کر دوبارہ بھاگنا چاہا۔ مگر کراہ کر رہ گیا۔ پاؤں میں درد سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں گرنے سے اس کا پاؤں بری طرح مڑا تھا۔ شاید فریکچر ہو گیا تھا رائفل بھی دوڑتے ہوئے راستے میں ہی کہیں گر چکی تھی۔

بھیڑیے اس سے کافی قریب پہنچ چکے تھے اس نے لنگڑاتے ہوئے قریب ہی ایک درخت کی طرف دوڑ لگائی اس کا مقصد اس اونچے درخت پر چڑھ کر جان بچانے کا تھا۔ مگر زخمی پاؤں کے سبب وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا اور بھیڑیوں نے غراتے ہوئے اس پر چھلانگ لگا دی درجنوں بھیڑیے اسے دبوچ چکے تھے اور اسے بھنبھوڑ رہے تھے۔

جنگل اس کی دلدوز چیخوں سے گونجنے لگا۔ ایرو شوٹر ہاتھ میں لئے وہی بن مانس ایک درخت کی آڑ سے یہ لرزہ خیز منظر دیکھ رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

بلو ہنڈا اکارڈ شہر کی مصروف ترین سڑک پر برق رفتاری سے دوڑ رہی تھی۔ وقاص ڈرائیو کرنے کے ساتھ ساتھ گاہے بگاہے فرنٹ سیٹ پر بیٹھی خنسا پر پیار بھری نظر بھی ڈال رہا تھا۔ دونوں ایک ہی یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھے اور کلاس فیلو بھی تھے ان دونوں کا تعلق اپر کلاس فیملی سے تھا، وقاص کے والد شاہد علی ڈسٹری بیوشن کے کاروبار سے منسلک تھے۔ شاہد علی کے والد نے دس سال پہلے معمولی پیمانے پر کاروبار شروع کیا تھا مگر اب وہ ترقی کر کے آج اس مقام پر پہنچ چکے تھے کہ اب بہت بڑی کمپنی کے مالک تھے۔ ان کی کمپنی کے پاس درجنوں کمپنیوں کی ڈسٹری بیوشن تھی۔ اور سالانہ اربوں کا کاروبار تھا۔ اور فیکٹری ورکرز کی تعداد سینکڑوں میں تھی۔ شاہد علی کوئی جدی پشتی بزنس مین نہیں تھا۔ اس کے والد شوکت علی کھٹارا سی بائیک پر اخبار بیچا کرتے تھے اور منگھو پیر میں مقیم تھے۔

جوان ہونے پر شاہد علی نے باپ کا ہاتھ بٹانا شروع کیا انہوں نے خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ منگھو پیر جیسے مڈل کلاس ایریا سے ایک دم ڈیفنس کے شاندار بنگلے تک جا پہنچیں گے یہ سب تقدیر کے کھیل ہیں جو لمحوں میں بادشاہ کو فقیر اور فقیر کو بادشاہ بنا دیتی ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ لمحوں میں دنیا کی بڑی بڑی سلطنتوں کا تختہ الٹا ہے کئی بادشاہ راتوں رات قید خانے جا پہنچے اور ان کے غلام تخت و تاج کے مالک بن بیٹھے۔

قصہ کچھ یوں ہے کہ نیوز ایجنسی سے اخبار لاتے ہوئے شہر کی ایک معروف سڑک پر سگنل کی بتی سرخ ہونے پر شوکت علی نے بائیک روکی۔ قریب ہی نئے ماڈل کی بی ایم ڈبلیو کھڑی تھی جس کی ڈرائیونگ سیٹ پر باوردی ڈرائیور بیٹھا تھا۔ جبکہ پچھلی نشست پر ایک ادھیڑ عمر شخص تھری پیس سوٹ میں موجود تھا۔ اس نے اپنی طرف کا شیشہ نیچے سرکایا اور شوکت علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا آپ کے پاس کوئی انگلش اخبار ہے؟" اس نے یہ جملہ انگلش میں کہا تھا۔

"یہ ہم پاکستانیوں کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ جو اردو بولنے میں شرم محسوس کرتے ہیں اور ہر جگہ انگلش میں بات کرنے کی کوشش کرتے ہیں حتیٰ کہ معمولی پڑھے لکھے افراد بھی اپنی گفتگو میں انگلش کے کچھ الفاظ ضرور استعمال کرتے ہیں ہماری قومی زبان اردو ہے مگر افسوس سرکاری دفاتر میں بھی عموماً انگلش زبان کا استعمال کیا جاتا ہے۔" شوکت علی نے جواب دیا اور انگلش کا ایک کثیر الاشاعت اخبار اس کی طرف بڑھایا۔

اس شخص نے سو کا ایک نوٹ اسے تھمایا، شوکت علی بقایا پیسے اسے دینے لگا تو اس نے عادت کے مطابق انگلش میں کہا۔ "بقایا پیسے ٹپ سمجھ کر رکھ لو۔" اور اخبار کی ورق گردانی کرنے لگا۔

"معذرت چاہتا ہوں سر، میں بخشش یا خیرات نہیں لیتا۔" شوکت علی نے رواں انگلش میں بولتے ہوئے بقایا رقم اسے تھما دی۔ وہ ششدر رہ گیا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk
Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"تم تعلیم یافتہ ہو؟"

"یس سر!"

"پھر بھی اخبار بیچ رہے ہو؟" اس کے لہجے میں حیرت نمایاں تھی۔

"سر ہمارے ملک میں سفارش یا رشوت کے بغیر ملازمت نہیں ملتی۔ معمولی پڑھے لکھے لوگ سفارش یا رشوت کے بل بوتے پر اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز ہیں کئی جگہوں پر CV بھیجنے کے بعد مایوس ہو کر والد کے ساتھ اخبار بیچنے لگا ہوں۔" شوکت علی نے جواب دیا۔ گفتگو کے دوران سگنل کی بتی گرین ہو چکی تھی۔ "یہ وزیٹنگ کارڈ اپنے پاس رکھو اور مجھ سے ضرور ملنا۔" اس نے اپنا کارڈ شوکت علی کو تھمایا اور ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

شوکت علی نے وزیٹنگ کارڈ پر نظر دوڑائی۔ رئیس اعجاز درانی انٹر پرائز آگے فون نمبرز لکھے تھے۔ اس نے کارڈ بے پرواہی سے جیب میں ڈال دیا۔ دوسرے روز تک یہ واقعہ اس کے ذہن سے محو ہو چکا تھا چند روز بعد ان کے ٹھیلے نما بک اسٹال پر جدید ماڈل کی ہنڈا اکارڈ رکی۔

گاڑی میں اعجاز درانی اپنے ڈرائیور کے ساتھ موجود تھا۔ آگے کے مراحل تیزی سے انجام پائے۔ یہ قدرت کا انعام تھا اعجاز درانی نے اس کا ہاتھ تھاما تو وہ آئندہ دس سالوں میں کروڑوں میں کھیلنے لگا۔ اس کا بیٹا شاہد علی جوان ہونے کے بعد کاروبار میں باپ کا ہاتھ بٹانے لگا۔ شوکت علی بوڑھے ہو چکے تھے شاہد علی بھی چالیس کا ہندسہ کراس کر چکا تھا اور اس کی اولاد جوان ہو چکی تھی۔ بڑا بیٹا وقاص یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھا جبکہ اس سے چھوٹا بابو سیکنڈ ایئر میں تھا۔ دو بیٹیاں دیبا اور علیشا میٹرک میں پڑھ رہی تھیں۔ "ذرا گاڑی روکنا۔" خنسا کے کہنے پر اس نے سائیڈ پر گاڑی روکی۔

وہ گاڑی سے اتری اور سڑک پار فٹ پاتھ پر بیٹھے ایک نحیف ونزار بوڑھے شخص کے قریب جا بیٹھی جو بری طرح کھانس رہا تھا، بوڑھے کا لباس جگہ جگہ سے پیوند زدہ اور میلا کچیلا تھا۔ اس کی داڑھی مونچھوں کے بال بے ترتیب اور جھاڑ جھنکار کی طرح تھے۔ کثرت عمر کے باعث اس کے سر اور داڑھی مونچھوں کے بال بالکل سفید ہو چکے تھے۔ وقاص جھنجھلا کر گاڑی سے اترا۔ اور خنسا کے قریب جا پہنچا۔ جو بوڑھے کا ہاتھ تھام کر کہہ رہی تھی۔ "بابا جی آپ میرے ساتھ چلیں میں آپ کو اسپتال لئے چلتی ہوں۔"

اس کی بات سن کر وقاص کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھر آئے وہ خنسا کی اس عادت سے نالاں تھا۔ جہاں کہیں کوئی غریب یا مجبور لاچار دیکھا۔ اس کی مدد کرنے لگ جاتی بعض اوقات تو سڑک کے کنارے کسی نابینا کو کھڑا دیکھ کر گاڑی روکوا کر نیچے اترتی اور اسے سڑک پار کروانے کے بعد دوبارہ گاڑی میں بیٹھتی بلکہ کئی بار تو انہیں گاڑی میں بیٹھا کر خود گھر تک پہنچاتی وہ سیٹھ ذیشان کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اور وقاص کی کلاس فیلو تھی۔

وقاص اسے دیکھتے ہی دل ہار بیٹھا تھا۔ وہ یونیورسٹی میں صرف وقاص سے فری تھی۔ اب تک دونوں کے معاملات صرف دوستی کی حد تک تھے۔ حال دل کہنے کی نوبت ہی نہیں آئی تھی۔ آج وقاص نے ارادہ کیا تھا کہ اسے ساحل سمندر کے کنارے لے جا کر حال دل کہے گا مگر اب وہ یہاں اس مجذوب نما فقیر سے اظہار ہمدردی میں مصروف تھی۔ ادھر وہ بوڑھا کھانستے ہوئے خنسا کی پیشانی پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔

"نہیں بیٹی مجھے دوا کی نہیں دعا کی ضرورت ہے۔ میں تمہارے چہرے پر ایک انوکھا نور کا ہالہ دیکھ رہا ہوں۔ آنے والا وقت....." اتنا کہتے ہی وہ خاموش ہو گیا۔

"آنے والے وقت میں کیا ہوگا بابا جی؟" خنسا نے بے تابی سے پوچھا۔

"چلو یار کیوں فضول میں وقت ضائع کر رہی ہو۔ یہ تمہیں تمہارے بارے میں کیا بتائے گا جو خود بے سروسامانی کی حالت میں فٹ پاتھ پر پڑا ہے۔" وقاص نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

"مجذوب نے وقاص پر نظریں جما دیں۔" جوان تو قسمت کا دھنی تھا پر افسوس تقدیر پر یقین نہیں رکھتا۔ اسی تقدیر نے تجھے جھونپڑی سے محل میں پہنچا دیا۔ مگر آگے کا راستہ بڑا کٹھن اور بڑا دشوار راستہ ہے۔ بہت دکھ سہنے پڑیں

گے، بڑی مصیبتیں اپنے پہاڑ جیسے منہ کھولے تمہاری راہ میں ایستادہ ہوں گی بڑے ستم اٹھاؤ گے۔ روتے روتے آنکھوں سے آنسو خشک ہو جائیں گے۔ بس اتنا جان لو کہ تمہیں زندگی کا فاصلہ مٹانا ہوگا۔ عشق کی آگ میں جل کر کندن بننا ہوگا۔ منزل تک پہنچنے کے لئے زندگی شمع کی صورت بسر کرنا ہوگی۔" مجذوب بولتا جا رہا تھا۔

جبکہ خنسا خوف ودہشت سے خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرز رہی تھی۔ وقاص ہنسا۔ "واہ بابا واہ میں نے تمہاری بے سروپا باتوں پر یقین نہیں کیا تو بددعا دینے لگے۔"

مجذوب اپنے گال پیٹنے لگا۔ "میں بددعا دینے والا کون ہوتا ہوں۔ میں بہت گناہ گار ہوں بہرحال تجھے تیز وتند دریا پار کرنا ہوگا تجھے دوسرا کنارہ ملے گا دوسرے کنارے سے باہر نکلنا ہوگا۔" وہ دیوانوں کی طرح خلاؤں میں گھورنے لگا۔

"خنسا میں گاڑی میں بیٹھ رہا ہوں اگر تمہارا دل اس پاگل کی فضول باتوں سے بھر جائے تو آ جانا۔" وہ پاؤں پٹختا ہوا گاڑی میں جا بیٹھا۔

"بابا جی وقاص کی باتوں کا برا مت ماننا۔ اس وقت نہ جانے کیوں غصے میں آ گیا ویسے وہ دل کا بہت اچھا ہے۔"

"نہیں بیٹا میں ان چھوٹی چھوٹی باتوں کا برا نہیں مناتا۔ ویسے بھی وقت سب سے بڑا استاد ہے۔ وہ خود ہی انسان کو بہت کچھ سکھا دیتا ہے اب تم اس کے پاس جاؤ، کہیں وہ تم سے سچ مچ ناراض نہ ہو جائے۔" مجذوب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ایک شرط پر کل آپ میرے ساتھ ڈاکٹر کے پاس چلیں گے، چلیں گے ناں؟" خنسا نے مجذوب کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھا۔ "اچھا بھئی۔" مجذوب نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ خنسا مجذوب کو خدا حافظ کہہ کر وقاص کے پاس جا پہنچی۔ جس کا منہ پھولا ہوا تھا۔

"منہ کیوں پھلا رکھا ہے؟" وہ ہنسی۔

"تمہیں کیا فرق پڑتا ہے۔" وقاص نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے ناراضگی سے کہا کچھ دیر بعد وہ ساحل سمندر کے کنارے بیٹھے تھے۔ "کہو کیا بات ہے؟ جس کے لئے تم صبح سے مجھے بار بار فون کر رہے تھے اور کچھ بتائے بغیر اب یہاں لے آئے۔" خنسا نے پوچھا۔

وقاص نے اس پر نظریں جما دیں خنسا کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس کی نگاہوں میں چھپا پیام وہ بخوبی سمجھ چکی تھی۔ "اب یونہی دیکھتے رہو گے یا کچھ بولو گے بھی؟"

"خنسا کیا زندگی کی شاہراہ پر میرے سنگ چلو گی؟" وہ اس کا نرم وگداز ہاتھ تھام کر بولا۔

"کیا مطلب؟" وہ بوکھلا گئی۔

"یار نہ تو میں فارسی بول رہا ہوں اور نہ ہی کوئی ایسی زبان جو تمہاری سمجھ میں نہ آئے میں تو سیدھے لفظوں میں تمہیں پرپوز کر رہا ہوں۔" وہ اس کی بوکھلاہٹ سے محظوظ ہوتے ہوئے ہنسا۔

خنسا نے نظریں اٹھائیں اور آہستگی سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑایا اور سنجیدہ لہجے میں بولی۔

"تم میرے بارے میں کیا جانتے ہو۔ کیوں کہ شادی کسی ٹرپ یا پارٹی کی طرح نہیں یہ زندگی بھر کا ساتھ ہے۔ اس رشتے کی پاسداری اسی میں ہے کہ اپنے ہونے والے جیون ساتھی سے کچھ بھی نہ چھپایا جائے۔"

"بھئی تم ذیشان انکل کی بیٹی ہو اور سب سے بڑی بات میں تمہیں چاہتا ہوں اور میرے خیال میں تم بھی مجھے پسند کرتی ہو۔" وقاص نے دھیرے سے اس کا ہاتھ تھاما۔

"وقاص سچ تو یہ ہے کہ میں سیٹھ ذیشان کی سگی بیٹی نہیں ہوں۔ آج سے اٹھارہ سال پہلے ذیشان صاحب ایک تقریب میں شرکت کرنے گئے، رات گئے جب وہ تقریب سے واپس لوٹ رہے تھے تو ایک سنسان سڑک کے کنارے جھاڑیوں کے جھنڈ سے ایک نسوانی وجود کو نکلتے دیکھا تو فطری تجسس کے تحت گاڑی روک دی۔ وہ عورت ان سے کچھ فاصلے سے دوڑتی ہوئی نکل گئی۔ چاند کی روشنی میں وہ اس عورت کا چہرہ دیکھ کر مبہوت رہ گئے وہ بائیس تیئس سالہ انتہائی حسین وجمیل لڑکی تھی وہ گاڑی سے اتر چکے تھے ابھی وہیں کھڑے تھے کہ جھاڑیوں سے کسی نومولود بچے کی رونے کی آواز سنائی دی جھاڑیوں کے جھنڈ میں پہنچے تو ایک نومولود بچی کو زمین پر پڑے پایا۔ جو ایک ماں کی بے حسی پر

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk
Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

نوحہ کناں تھی، عقل وشعور سے محروم جانور بھی اپنے بچے کو اس طرح نہیں پھینکتے جس طرح وہ عورت بچی کو پھینک کر گئی تھی۔ ذیشان صاحب نے بے اختیار اس بچی کو اٹھالیا اور گھر لے آئے وہ بے اولاد تھے انہوں نے اپنی سگی بیٹی کی طرح میری پرورش کی ان کی بیوی راشدہ بھی ان ہی کی طرح نیک خاتون تھیں۔

ابھی میں دس یا گیارہ سال کی تھی کہ راشدہ بی بی فوت ہوگئیں شاید وہ مجھے اصلیت کبھی نہیں بتاتے۔ لیکن اسکول میں میرا ایک کلاس فیلو لڑکی سے جھگڑا ہوگیا رافعہ نامی وہ لڑکی ہمارے پڑوس میں رہتی تھی جھگڑے میں لڑکی نے کہا۔ "ذیشان صاحب میرے پاپا نہیں میں کسی کی ناجائز اولاد ہوں۔"

میں روتی ہوئی گھر آ گئی اور پاپا کو قسم دی تو وہ مجبو رہوگئے اور مجھے بتایا کہ میں انہیں کس طرح اور کہاں سے ملی تھی اگرچہ وہ محلے میں مجھے اپنی بیٹی ہی ظاہر کرتے تھے لیکن برسوں سے اس محلے میں رہتے تھے سب ہی جانتے تھے کہ ان کی اہلیہ بانجھ تھیں، باتوں باتوں میں محلے کی کسی عورت نے راشدہ بیگم سے سچائی اگلوالی اور سب میرے بارے میں جان گئے۔ انہوں نے میری وجہ سے وہ محلہ ہی چھوڑ دیا۔ چند ہی سالوں میں اللہ نے انہیں کاروبار میں اتنی ترقی دی کہ وہ کروڑوں میں کھیلنے لگے۔ اس دوران ان کی اہلیہ کا انتقال ہوگیا۔

حالات اور واقعات سے صاف ظاہر ہے کہ میں کسی کا گناہ ہوں تب ہی میری ماں نے مجھے رات کے اندھیرے میں جھاڑیوں میں مرنے کے لئے پھینکا تھا۔ افسوس ہے اس معاشرے پر کہ یہاں ایسے بچوں کو تو گالی دی جاتی ہے جن کا کوئی دوش نہیں۔ لیکن کوئی ان لوگوں کا گریبان کیوں نہیں پکڑتا انہیں برا بھلا کیوں نہیں کہتا۔ جن کے گناہوں کے باعث ایسے بچے جنم لیتے ہیں۔" وہ جذباتی ہوگئی۔

"سنو خنسا اس میں واقعی تمہارا کوئی قصور نہیں مجھے تمہاری صاف گوئی پسند آئی ہے۔ میں آج ہی پاپا سے بات کروں گا۔" وقاص نے کہا اور خنسا کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ کچھ دیر بعد وہ وہاں سے رخصت ہوگئے۔

خنسا کو اس کے گھر ڈراپ کرنے کے بعد وقاص اپنے گھر پہنچا۔ رات کے کھانے کے بعد جب اس کی مما برتن سمیٹنے لگیں تو وہ ہمت کرکے بولا۔ "پاپا میں آپ سے ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"ایسی کون سی خاص بات ہے جس کے لئے تمہیں یہ وقت اچھا لگا۔ کہیں کسی لڑکی کا چکر تو نہیں۔" شاہد علی ہنسے۔

"پاپا میں ذیشان انکل کی بیٹی خنسا سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" وہ نظریں جھکائے ہوئے بولا۔

"ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔"

شاہد علی کے چہرے کے تاثرات تبدیل ہوگئے۔

"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے مانا ذیشان میرا دوست ہے اور ہمارے درمیان کاروباری تعلقات بھی ہیں مگر خنسا اس کی حقیقی اولاد نہیں۔ اسے کہیں جھاڑیوں میں پڑی ملی تھی ناں اس کے باپ کا پتہ ہے ناں ماں کا، نہ جانے کس کے گناہوں کی پوٹلی ہے اور تم اسے اس گھر کی زینت بنانا چاہتے ہو۔ ذیشان ایک سچا انسان ہے میں اس کی زندگی کے ہر پہلو سے واقف ہوں۔" ان کا لہجہ بتدریج سخت ہوتا جارہا تھا۔

"پاپا اس سب میں اس بے چاری کا کیا قصور ہے۔ میں اسے چاہتا ہوں اور اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔" وقاص جذباتی ہوگیا۔

"تم ایک معمولی لڑکی کے لئے مجھ سے بحث کرتے ہو۔ جو کسی کی ناجائز اولاد ہے۔" شاہد علی چلائے۔

وقاص نگاہیں جھکائے کھڑا تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ فق تھا کرب اور اذیت سے اس کے سینے پر جیسے برچھیاں سی چل رہی تھیں اسے قطعی یہ امید نہ تھی کہ شاہد علی اسے اس طرح ڈانٹیں گے اور پھر خنسا کے بارے میں اس طرح کے ریمارکس سے اس کے دل کو ٹھیس پہنچی تھی۔

وقاص کی والدہ نائلہ بیٹے کے چہرے کے تاثرات سے صورت حال بھانپ گئیں آگے بڑھیں اور وقاص کو سینے سے لگالیا۔ "بچہ ہے بھلا کوئی جوان اولاد کو اس طرح

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

ڈانٹتا ہے۔ اگر اسے خنسا پسند ہے تو آپ کو کیا اعتراض ہے۔ زندگی اس نے گزارنی ہے اس لئے اپنے مستقبل کا فیصلہ بھی اسے خود کرنے دیں۔" وہ شوہر کو آنکھ سے اشارہ کرتے ہوئے بولیں۔

وقاص کے بہن بھائی دیبا، علیشا اور بابو حیرت سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ ان کے لئے حیرت ہی کی بات تھی۔ وہ مڈل کلاس فیملی سے نہیں اپر کلاس فیملی سے تعلق رکھتے تھے اور پھر شاہد علی اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص تھے۔ جوان اولاد سے اس طرح کا رویہ ان کی سمجھ سے باہر تھا۔ شوکت علی ان دنوں جج کرنے گئے ہوئے تھے وہ اگر موجود ہوتے تو اتنی نوبت ہی نہ آتی۔ کیونکہ وہ انسانوں میں تفریق کے قائل نہیں تھے۔ ملازموں تک سے شوکت علی کا رویہ اولاد کی طرح تھا۔ ماں کے اشارے پر وقاص سمیت چاروں بہن بھائی اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

شاہد علی نے بیوی کو سنگین نظروں سے گھورا۔ "تمہیں اس معاملے میں وقاص کی حمایت کرنے کی کیا ضرورت تھی اب تو اس کا مورال مزید بڑھ جائے گا۔"

"اطمینان رکھئے جوان اولاد سے اس طرح پیش نہیں آتے۔ اگر وہ آپ کی باتوں سے ہرٹ ہوکر کوئی غلط قدم اٹھاتا ہے تو پھر آپ کیا کریں گے۔" وہ شوہر کے قریب جا بیٹھیں۔

"تو کیا کروں؟ ابھی جاکر خنسا سے رشتہ طے کردوں۔" شاہد علی سلگ اٹھے۔ "کچھ نہ کریں بس خاموش رہیں اور دیکھتے جائیں میں کیا کرتی ہوں۔ ایسا چکر چلاؤں گی کہ خنسا خود ہی وقاص کو منع کردے گی۔" نائلہ نے معنی خیز لہجے میں کہا تو شاہد علی کے چہرے کے تاثرات تبدیل ہوگئے۔ دوسرے روز انہوں نے خنسا کے نمبر پر کال کی۔ "خنسا میں وقاص کی مما نائلہ بات کررہی ہوں۔"

"السلام علیکم آنٹی۔" خنسا نے مودب لہجے میں سلام کیا۔

"وعلیکم السلام بیٹی، میں تم سے تنہائی میں ملنا چاہتی ہوں۔ لیکن اس بات کی کسی کو خبر نہیں ہونا چاہئے۔ تم وقاص کو بھی نہیں بتاؤ گی۔"

"ٹھیک ہے آنٹی جیسا آپ کہتی ہیں ویسا ہی ہوگا۔" دوسری طرف سے خنسا نے کہا۔

"او کے پھر آج چار بجے تم مجھے KFC میں ملو۔"

وہ چار بجے کے ایف سی میں پہنچیں تو خنسا وہاں پہلے سے ہی موجود تھی۔ انہیں آتا دیکھ کر خنسا احتراماً کھڑی ہوگئی۔ "السلام وعلیکم آنٹی۔"

"وعلیکم السلام بیٹھو۔" نائلہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔

"آنٹی سب سے پہلے تو یہ بتائیں آپ کے لئے کیا منگواؤں۔؟" اس نے مودب لہجے میں پوچھا۔

خنسا ویسے ہی بڑوں کی عزت کرتی تھی اور سامنے بیٹھی عورت وقاص کی ماں تھی پھر بھلا وہ اس کی تعظیم کیوں نہ کرتی۔ نائلہ نے اسے معنی خیز نگاہوں سے دیکھا اور سرد لہجے میں مخاطب کیا۔

"میں تم سے کچھ مانگنا چاہتی ہوں امید ہے مایوس نہیں کروگی۔" خنسا ششدر بیٹھی کچھ دیر انہیں حیرت سے دیکھتی رہی اسے نائلہ کا عجیب وغریب رویہ سمجھ نہیں آرہا تھا۔

"آنٹی آپ حکم کریں۔" وہ الجھے ہوئے لہجے میں بولی۔

"خنسا یہ سچ تو جانتی ہی ہوگی کہ تم ذیشان صاحب کی حقیقی اولاد نہیں، ہمارا معاشرہ بہت ہی سفاک اور بے رحم ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ کل لوگ ہمیں یہ طعنہ دیں کہ ہماری بہو کسی کی ناجائز اولاد ہے۔ اور پھر شاہد علی دل کے مریض ہیں اور وہ بھی نہیں چاہتے کہ تم وقاص کی دلہن بنو ایک بار پہلے بھی انہیں دل کا دورہ پڑچکا ہے۔ اگر ان کی مرضی کے خلاف یہ شادی ہوجاتی ہے تو یہ صدمہ ان کی جان بھی لے سکتا ہے۔ اور ایسی صورت میں اس کی ذمہ داری تم پر ہوگی۔ تم حسین ہو جوان ہو۔ جس طرح وقاص کو اپنی محبت کے جال میں پھنسایا ہے اس طرح کسی دوسری جگہ ٹرائی کرو تو یہ تمہارا ہم پر احسان ہوگا۔"

نائلہ کی بے رحمانہ اور سفاک گفتگو سے خنسا کے ذہن میں آندھیوں کے جھکڑ سے چلنے لگے۔ اور جسم کا سارا

خون سمٹ کر آنکھوں میں اتر آیا۔ اسے نائلہ سے یہ امید ہرگز نہ تھی کہ وہ اسے یہاں بلا کر اس طرح بے عزت کریں گی۔ اسی وقت نائلہ نے ایک اور غیر متوقع حرکت کی اور اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔

شدت غم سے خنسا کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”بس آنٹی آپ بے فکر رہیں میں وقاص کی زندگی سے اتنی دور چلی جاؤں گی کہ وہ مجھے کبھی دیکھ بھی نہ سکے گا۔“

نائلہ کرسی سے اٹھتے ہوئے بولیں۔ ”ایک بات اور وقاص کو معلوم نہیں ہونا چاہئے کہ میں تم سے ملی تھی اور ہمارے درمیان کوئی بات ہوئی تھی۔“ نائلہ گھر پہنچیں وقاص کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ رات کو کھانا کھاتے ہوئے نائلہ نے وقاص سے کہا ”وہ چند روز میں ذیشان صاحب کے گھر جا کر رشتے کی بات کریں گی۔“

وقاص مطمئن ہو گیا لیکن اس کا یہ اطمینان عارضی ثابت ہوا۔ خنسا کچھ دنوں سے یونیورسٹی بھی نہیں آ رہی تھی اور اس کا نمبر بھی مسلسل آف تھا۔ چند روز تو اس نے صبر سے کام لیا پھر اپنی ایک کلاس فیلو شائلہ کو خنسا کے گھر صورت حال کا پتہ کرنے بھیجا اس نے واپس آ کر بتایا کہ خنسا کچھ روز پہلے ذیشان صاحب کے ساتھ ملک سے باہر جا چکی ہے۔ وہیں اس کا کوئی کزن ہے۔ جس کے ساتھ خنسا کی رضامندی سے اس کا رشتہ طے کیا گیا ہے اور جلد ہی شادی ہو جائے گی گویا چٹ منگنی اور پٹ بیاہ والا حساب ہے۔ اور شادی کے بعد وہ وہیں اپنے شوہر کے ساتھ رہے گی۔

وقاص کا تو جیسے سانس رک گیا تھا خنسا کے بنا وہ جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ حیران تھا کہ اچانک خنسا کو کیا ہو گیا تھا آخری ملاقات میں جب اس نے خنسا کو پرپوز کیا تھا تو وہ انتہائی خوش تھی پھر اچانک اسے کیا ہو گیا۔ پھر اچانک اسے کیا ہو گیا، کیا وہ بے وفا تھی۔؟“ یہ خیال ہی اس کے لئے سوہان روح تھا۔

کچھ دنوں بعد ذیشان صاحب پاکستان لوٹ آئے لیکن ان کے ساتھ خنسا نہیں تھی۔ خنسا کا نمبر اب تک آف تھا اس نے دوبارہ شائلہ کو خنسا کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی درخواست کی۔ شائلہ نے واپس آ کر اسے بتایا کہ خنسا کی شادی ہو چکی ہے اور اب وہ وہیں رہے گی۔

وقاص کی دنیا اجڑ چکی تھی وہ خزاں رسیدہ پتے کی طرح مرجھا کر رہ گیا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اچانک خنسا کو کیا ہو گیا۔ اس کا حال دیوانوں جیسا ہو چکا تھا۔ ہر وقت اپنے کمرے میں پڑا رہتا۔ ایک روز نصف شب کے قریب جب کروٹیں بدلتے بدلتے ہوئے تنگ آ گیا تو اکتا کر کمرے سے باہر نکلا۔ شاہد علی کے کمرے کے قریب سے گزرتے ہوئے باتوں کی آواز سنائی دی۔ خنسا کا نام سن کر وہ چونک پڑا۔ دروازہ معمولی سا کھلا ہوا تھا۔ وہ چند قدم آگے بڑھا۔

نائلہ کہہ رہی تھی۔ ”دیکھا میں ناں کہتی تھی کہ سانپ کو اس طرح مارو کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ میں نے ایسا چکر چلایا کہ خنسا خود ہی وقاص کی زندگی سے نکل گئی۔“ پھر وہ بتانے لگی کہ اس نے خنسا سے ملاقات میں کیا کہا۔

وقاص ان کی باتیں سن کر دھک سے رہ گیا۔ اسے ایسا لگا کہ جیسے آسمان ٹوٹ کر اس کے سر پر آ گرا ہو۔ ان کی باتیں سننے کے باوجود اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ جو کچھ وہ سن رہا ہے وہ سچ ہے، وہ دل برداشتہ ہو کر اپنے کمرے میں لوٹ آیا اس کا دل دنیا سے اچاٹ ہو چکا تھا۔ نائلہ نے خنسا کو اس کی زندگی سے دور کر دیا تھا وہ بے چاری پہلے ہی تنہا تھی، امی کی باتوں سے اس کے دل پر کیا گزری ہو گی یہ سوچتے ہی وہ مضطرب ہو گیا کچھ دیر بعد اس نے رسٹ واچ پر نظر ڈالی رات کا ایک بج چکا تھا۔ اس نے اپنے دل میں ایک فیصلہ کیا اور بیڈ روم سے باہر نکلا گیٹ پر موجود چوکیدار اسے رات کے اس پہر گیٹ پر دیکھ کر حیران رہ گیا۔

”صاحب خیریت تو ہے؟“

”ہاں! بس گھٹن سی ہو رہی ہے۔ میں کھلی ہوا میں سانس لینا چاہتا ہوں۔“ اس نے عجیب سے لہجے میں کہا اور دروازہ کھول کر گیٹ سے باہر نکلا اور ایک طرف چل دیا

جبکہ چوکیدار حیران و پریشان سا اسے ایک طرف جاتا دیکھتا رہا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس صورت حال میں کیا کرے۔ وقاص کی ذہنی حالت اسے اس وقت درست نہیں لگی تھی پھر وہ بغیر گاڑی کے عام سے کپڑوں میں رات کے ایک بجے گھر سے باہر نکلا تھا۔ جو خلاف معمول بات تھی وہ ایک ادنیٰ ملازم تھا اسے روکنے یا باز پرست کرنے کی ہمت نہ تھی۔ لہٰذا اس نے مناسب یہی سمجھا کہ شاہد صاحب کو اطلاع کر دے۔

ادھر رات کے اس پہر سڑکیں اور گلیاں سنسان تھیں وہ کسی زومبی کی طرح چلتا ہوا سڑک پر پہنچا، مخالف سمت سے آتی ٹیکسی دیکھ کر اس نے اشارے سے روکا۔ اور ٹیکسی میں بیٹھ کر ڈرائیور سے بولا۔ ”کینٹ اسٹیشن چلو۔“ رات کے اس پہر شہر کی تقریباً تمام سڑکیں ویران تھیں چنانچہ وہ جلد ہی کینٹ اسٹیشن پہنچ گئے ابھی وہ کینٹ اسٹیشن کی حدود میں داخل ہوا ہی تھا کہ ایک نحیف و نزار بوڑھا اچانک اس کے سامنے آ گیا۔ وہ حیران رہ گیا۔ یہ وہی مجذوب تھا جس سے فٹ پاتھ جر خنسا اور اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ ”بابا۔“ وہ اس کی طرف لپکا اور قریب جا کر کہا۔ ”خنسا مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔“ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے۔

”آؤ میرے ساتھ۔“ مجذوب نے اس کا ہاتھ تھاما اور وہ ویٹنگ روم میں داخل ہو گئے وہ مجذوب کے ساتھ ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔ اندر تین چار قلی ایک طرف پڑے سو رہے تھے جبکہ دو قلی ایک طرف بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

”میں خنسا کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔“ وہ سسک پڑا۔

”داتا کے در پر لاہور چلا جا۔ ویسے بھی ابھی تجھے کندن بننا ہے۔“ مجذوب نے درشت لہجے میں کہا۔ جبکہ وہ گھٹنوں میں سر دے کر رونے لگا۔ شدت کرب سے اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے جبکہ آپس میں باتیں کرتے قلی اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ ”بابا جی میرے لئے دعا کرو مجھے قرار مل جائے۔“ اس نے سسکتے ہوئے کہا اور گھٹنوں پر سے سر اٹھایا، تو مجذوب اپنی جگہ سے غائب تھا۔ ”بابا جی کہاں چلے گئے۔“ اس نے ان دونوں قلیوں سے پوچھا۔

”کون بابا جی؟“ ان میں سے ایک ادھیڑ عمر قلی نے حیرت سے پوچھا۔

”وہی جو میرے ساتھ ویٹنگ روم میں داخل ہوئے تھے اور بینچ پر بیٹھے مجھ سے باتیں کر رہے تھے۔“

”بابو جی آپ اکیلے ہی یہاں آئے تھے اور اپنے آپ سے باتیں کئے جا رہے تھے اور رو رہے تھے۔“ اس قلی نے جواب دیا، اب وہ دونوں قلی اسے ایسی نظروں سے دیکھ رہے تھے کہ جیسے انہیں اس کا ذہنی توازن کھو جانے کا یقین ہو۔ ان کا جواب سن کر وقاص سناٹے میں آ گیا گویا بابا ان قلیوں کو نظر نہیں آئے تھے اور نہ ہی یہ ان کی آواز سن سکے تھے۔ بہر حال جاتے جاتے وہ اسے داتا کے دربار جانے کا مشورہ دے چکے تھے۔ پیروں فقیروں اور تقدیر پر یقین نہ رکھنے والا ایک مجذوب جسے وہ دیوانہ سمجھتا تھا۔ اس کے حکم پر داتا کے دربار جانے کو تیار ہو گیا تھا اس نے علی الصبح لاہور جانے والی ٹرین کے ٹکٹ لئے اور ٹرین آتے ہی اس میں سوار ہو گیا۔ فرسٹ کلاس کے اس ڈبے میں مسافر محدود تھے۔ وہ سیٹ پر بیٹھ کر باہر کے نظارے دیکھنے لگا۔ گھر سے نکلتے وقت اس کی جیب میں اچھی خاصی رقم تھی۔ جو اس اکیلی جان کے لئے کئی دنوں تک کافی تھی۔ اسے معاشی فکر نہیں تھی۔ صرف خنسا کی یاد تھی جو اسے بے چین کئے ہوئے تھی۔ اگلے اسٹیشن پر ٹرین چند منٹ کے لئے رکی۔ تو پانچ چھ افراد اس ڈبے میں سوار ہو گئے لیکن وہ تو گویا ٹرین میں ذہنی طور پر موجود ہی نہیں تھا خنسا کے عشق میں وہ کروڑ پتی باپ کا بیٹا ہونے کے باوجود ناداروں کی طرح دربدر کی ٹھوکریں کھا رہا تھا۔

دوسرے روز وہ سہ پہر کو ہی داتا دربار پہنچ گیا۔ اور مزار پر پہنچ کر دعا کرنے کے ساتھ ساتھ رونے لگا۔ وہ مغرب تک مزار پر ہی رہا اور خنسا سے ملنے کی دعائیں مانگتا رہا۔ جب رات کا اندھیرا پھیلنے لگا تو مزار کی حدود سے باہر نکلا قریب ہی ایک ہوٹل میں کمرہ کرائے پر لیا، اسے وہاں

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk
Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

رہتے ہوئے کئی روز گزر چکے تھے سارا دن مزار پر رہتا اور رات کو ہوٹل میں چلا جاتا۔ اب تو مزار کے مجاور اور وہاں رہنے والے ملنگ فقیر بھی اس کی صورت سے آشنا ہو چکے تھے اور کئی بار باری باری اس سے پوچھ چکے تھے کہ اسے ایسا کون سا روگ لگا ہے جو وہ دن رات مزار پر گریہ زاری کرتا رہتا ہے لیکن وہ اپنے عشق کی تشہیر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس روز وہ معمول کے مطابق گڑگڑا کر دعا مانگ رہا تھا کہ ایک ستر سالہ بوڑھا پانچ یا چھ سالہ بچے کے ساتھ مزار میں داخل ہوا بوڑھے شخص نے کارٹن کا سوٹ پہن رکھا تھا اس کے چہرے پر اداسی اور سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ بچہ بھی کھویا کھویا سا تھا ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ نیند میں چل رہا ہو۔ وہ ایک طرف کھڑے ہو کر دعا مانگنے لگے دعا مانگتے ہوئے ان کی نظریں وقاص پر پڑیں۔

بوڑھے کی آنکھوں میں حیرت اور بے یقینی کے تاثرات تھے۔ بوڑھا اپنی آنکھیں اس طرح مل رہا تھا کہ جیسے یقین کرنا چاہ رہا ہو کہ کہیں وہ خواب تو نہیں دیکھ رہا اور وہ خوب صورت سا معصوم بچہ پاپا کہتا ہوا وقاص کی طرف دوڑا اور اس سے لپٹ کر رونے لگا۔ ”پاپا آپ کہاں چلے گئے تھے؟“ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

وقاص حیران و پریشان کھڑا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس صورت حال میں کیا کرے بچے کی آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں نے اسے بہت متاثر کیا تھا۔ خود اس کی آنکھوں کے گوشے بھی بھیگ چکے تھے۔ مزار پر موجود درجنوں خواتین و حضرات بھی یہ ٹریجڈی سین دیکھ رہے تھے اس جذباتی ملن کے منظر نے انہیں بھی متاثر کیا تھا۔ بچے کے انداز سے وقاص اتنا تو سمجھ چکا تھا کہ شاید بچے کا باپ اس سے بچھڑ چکا ہے اور وقاص کی شکل صورت اس کے باپ سے ملتی جلتی ہے، تب ہی وہ تیر کی طرح دوڑ کر اس سے لپٹ گیا ہے۔ اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ بچے کو دھتکارتا خود سے الگ کرتا۔

وہ عشق کی آگ سے واقف نہ تھا یہ عشق و محبت کیا ہے یہ ضروری تو نہیں کہ عشق صرف عورت یا مرد کے بیچ ہو۔ عشق و محبت ہر رشتے میں پایا جاتا ہے ماں کو ہی دیکھ لیں اولاد کو ذرا سی چوٹ لگنے پر تڑپ اٹھتی ہے باپ کو ہی دیکھ لیں اولاد کے لئے اس کے بہتر مستقبل کی خاطر وہ دن رات محنت کرتا ہے اور پھر ایک روز یہی اولاد اسے اولڈ ہوم تک پہنچا کر زندگی کی رنگ رلیوں میں گم ہو جاتی ہے۔

ایک باپ دس بیٹوں کو تو پال سکتا ہے مگر دس بیٹے ایک باپ کو نہیں پال سکتے۔ اور عشق حقیقی خالق کائنات سے کیا جاتا ہے عشق حقیقی میں انسان دنیا سے بے نیاز ہو جاتا ہے اور آخرت میں سرخرو رہتا ہے۔

ایک شخص مسجد کی ٹوٹی ہوئی چٹائی پر مست ہے، محبت سے اخلاص سے اللہ کا نام لے رہا ہے۔ اللہ کہنے میں اسے اتنا لطف آتا ہے کہ گویا ساری کائنات کی لذت اس کے سامنے ہیچ ہے۔

حضرت ابراہیم بن ادھم نے اللہ کی محبت میں سلطنت چھوڑ دی ایسے بہت سے اللہ کے نیک بندے ہیں جنہوں نے اپنی زندگی اللہ کے عشق میں گزار دی۔

وقاص جدائی کے کرب سے آشنا تھا اس کی ہمت ہی نہ ہو سکی کہ بچے کا دل توڑتا، بوڑھا آگے بڑھا اور بچے کو وقاص سے الگ کرنا چاہا۔ ”بیٹا یہ تمہارے پاپا نہیں ہیں۔“ بوڑھے کی آنکھیں نم اور لہجہ گھمبیر تھا۔

”دادو آپ جھوٹ کہتے ہیں۔“ بچہ اس سے مزید لپٹ گیا۔ ”یہ میرے پاپا ہیں، اب میں انہیں کہیں جانے نہیں دوں گا۔“

اب وقاص سے بھی نہ رہا گیا۔ اس نے اشارے سے بوڑھے کو منع کیا کہ بچے کو اس سے زبردستی الگ نہ کریں۔ ”بیٹا میں آپ کا پاپا ہوں اور پرامس کرتا ہوں کہ اب آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔“

”تو پھر میرے ساتھ گھر چلیں۔“ بچے نے معصومانہ ضد کی اور بوڑھے نے بے بسی سے اسے دیکھا۔ ”اچھا چلتا ہوں۔“ بھئی مجبور ہو کر وقاص نے بچے کو اٹھا لیا اور بوڑھے کے ساتھ چلتا ہوا مزار سے باہر پہنچا۔

احاطے میں بلیک ہنڈا اکارڈ کھڑی تھی گاڑی میں باوردی ڈرائیور بھی موجود تھا۔ وقاص کو دیکھ کر اس کا منہ بھی حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ بہرحال وہ بولا کچھ نہیں

اور پچھلی نشست کا دروازہ کھولا اور ان کے بیٹھتے ہی ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔ ان کی رہائش گلبرگ کے پوش علاقے میں تھی محل نما گھر جس کے گیٹ پر مسلح گارڈز الرٹ کھڑے تھے گاڑی میں موجود وقاص کو دیکھ کر وہ بھی حیران رہ گئے ڈرائنگ روم میں چوبیس پچیس سالہ اسمارٹ لڑکی موجود تھی وقاص کو دیکھ کر وہ بے اختیار صوفے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور اس کے منہ سے نکلا۔ ”ادریس؟“ پھر وہ بولی۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھاما اور گرنے کے سے انداز میں دوبارہ صوفے پر بیٹھ کر گہرے گہرے سانس لینے لگی۔

بوڑھا آگے بڑھا اور ایک طرف رکھے فریج سے منرل واٹر کی بوتل نکالی گلاس میں پانی انڈیلا اور لڑکی کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ کچھ ہی دیر میں لڑکی کی طبیعت سنبھل گئی پھر وہ بوڑھے کے اشارے پر بچے کو بہلا پھسلا کر ڈرائنگ روم سے باہر لے گئی۔ لیکن جاتے جاتے بھی بچے نے وقاص سے وعدہ لیا کہ وہ اس کی غیر موجودگی میں غائب نہیں ہوگا۔

وقاص نے بوڑھے کے اصرار پر اپنی روداد سنا ڈالی۔ پھر بولا۔

”لگتا ایسا ہے کہ اس بچے کے باپ کی شکل مجھ سے ملتی جلتی ہے۔“

بوڑھے نے سرد آہ بھری صرف ملتی جلتی ہی نہیں تم ہو بہو ادریس علی کے ہم شکل ہو، وہی قد، وہی لب و لہجہ، وہی آنکھیں یوں لگتا ہے کہ جیسے میرے سامنے میرا بیٹا ادریس علی بیٹھا ہے۔ اگر میں نے اسے اپنے ہاتھوں سے لحد میں نہ اتارا ہوتا تو تم ہمیں ادریس علی ہی سمجھتا۔“ بوڑھے نے خلاء میں دیکھتے ہوئے کہا۔

☆.....☆.....☆

الیاس صاحب بہت بڑے بزنس مین تھے ادریس علی ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور خوبرو نوجوان تھا ادریس علی کے تعلیم مکمل کرتے ہی الیاس صاحب نے سوچا کہ بیٹا بزنس میں ان کا ہاتھ بٹائے گا مگر اس نے پولیس ڈپارٹمنٹ میں جانے کا اعلان کر کے انہیں حیران کر دیا اسے بطور اے ایس آئی اسی کے علاقے میں تعینات کر دیا گیا اپنی بہادری اور فرض شناسی سے وہ ترقی کر کے انسپکٹر کے عہدے پر جا پہنچا۔ اس کی فرض شناسی کی بدولت اس کے آئے دن ٹرانسفر ہوتے رہتے۔ اس کی پوسٹنگ جس تھانے میں ہوتی وہاں رشوت اور ہفتہ سب کچھ بند ہو جاتا یہ بات دوسرے افسران کیسے برداشت کرتے۔

آخر کار اسے ایک دور دراز کے دیہی علاقے خان نگر میں ٹرانسفر کر دیا گیا، الیاس صاحب نے اسے وہاں جانے سے روکا اور کہا۔ ”استعفیٰ دے دو اور اپنا بزنس سنبھالو۔“ مگر وہ ان کے منع کرنے کے باوجود خان نگر چلا گیا۔ چارج لیتے ہی اس نے وہاں کے عملے پر یہ واضح کر دیا کہ اب یہاں کوئی رشوت نہیں لی جائے گی۔ جس نے رشوت لی اس کی خیر نہیں۔

وہیں وہ شائستہ نامی لڑکی کو دل دے بیٹھا جو علم دین مزارع کی بیٹی تھی میں بیٹے کی خوشی میں رکاوٹ نہ بنا اور شائستہ کو اپنی بہو بنا لیا وہ شادی کے بعد خان نگر میں رہنے لگے وہیں شہریار پیدا ہوا۔ شہریار چار سال کا ہو چکا تھا جب یہ مجھ سے ملنے لاہور آئے اور چھٹیاں گزار کر واپس لوٹ گئے ان دنوں خان نگر میں لوگ پراسرار طور پر لاپتہ ہونے لگے۔ ان کی لاشیں بھی نہ ملتیں ادریس علی کوشش کے باوجود اس کیس کو حل نہ کر سکا۔

پھر خان نگر کا سردار رفیق خان بھی غائب ہو گیا تو کہرام مچ گیا اسی کیس کی تفتیش کے سلسلے میں ادریس علی جنگل میں داخل ہوا اس کے ساتھ تین دوسرے اہلکار بھی تھے اسی شام ادریس علی کی خونچکاں لاش جنگل سے ملی جب کہ دیگر اہلکاروں کی تو لاش بھی نہ ملی پوسٹ مارٹم رپورٹ سے یہ ثابت ہو گیا کہ انسپکٹر ادریس علی جنگلی جانوروں کا شکار ہو گیا ہے مگر نہ جانے کیوں مجھے اس پر اعتبار نہیں۔ ”میرا بیٹا ضرور کسی سازش کا شکار ہوا ہے۔“

میں بہو اور پوتے کو یہاں لے آیا اب اس محل نما کوٹھی میں ہم تین افراد رہتے ہیں ادریس علی یہ دنیا چھوڑ کر جا چکا ہے مگر شہریار معصوم ہے۔ اس کا ذہن یہ سچ نہیں مانتا

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

کہ اس کا باپ مر چکا ہے وہ دن رات اور لیس علی کو یاد کرتا رہتا ہے اس کی عمر کھیلنے کودنے کی ہے مگر وہ کھویا کھویا سا رہتا ہے۔

میں شہریار کے دل کے سکون کے لئے ہر ہفتے داتا دربار جا کر دعا کرتا ہوں۔ آج تم ہمیں داتا دربار میں ملے تو شہریار تمہیں دیکھ کر جی اٹھا ہے۔ میں نے اس کے چہرے پر بہت دنوں بعد چمک دیکھی ہے۔ وہ تم سے مل کر گلاب کے پھول کی طرح کھل اٹھا ہے اگر تم چلے گئے تو یہ پھول مرجھا جائے گا تم اگر خود غرضی نہ سمجھو تو کچھ عرصہ اور لیس علی بن کر رہو، جب شہریار کی ذہنی حالت بہتر ہو جائے گی تو کسی علاقے میں پوسٹنگ کے بہانے چلے جانا اور کبھی کبھار جب وقت ملے تو ایک دو دن کے لئے اس سے ملنے چلے آنا، اللہ ضرور تمہاری اس نیکی کا اجر دے گا۔" الیاس صاحب نے آبدیدہ لہجے میں کہا۔

"بابا مجھے شرمندہ نہ کریں ایک انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔ اپنے لئے تو سبھی جیتے ہیں مزہ تو تب ہے کہ انسان دوسروں کے لئے جیئے اور پھر خفا سے بچھڑنے کے بعد یہ زندگی میرے لئے بوجھ تھی شہریار کی صورت میں مجھے جینے کا مقصد مل گیا ہے اور میرا وعدہ ہے کہ میں اسے باپ ہی کی طرح پیار کروں گا اور شفقت سے پیش آؤں گا اور آپ بھی مجھے اپنا بیٹا اور لیس علی ہی سمجھیں۔" وہ الیاس صاحب کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا اور انہوں نے اسے گلے لگا لیا۔

اسی وقت شہریار ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ "پاپا مجھے نیند نہیں آ رہی میں آپ کے ساتھ سوؤں گا۔"

کھانے کے بعد جب وہ شہریار کے ساتھ بیڈ روم میں داخل ہوا تو حیرت زدہ رہ گیا کمرے کی چاروں دیواروں پر انسپکٹر اور لیس علی کی درجنوں تصاویر آویزاں تھیں تصویروں میں اس کی محویت شہریار بھانپ گیا۔ "پاپا جب آپ مجھے چھوڑ کر چلے گئے تو میں نے دادو سے ضد کر کے ہر طرف آپ کی تصویریں سجالیں۔ میں سونے سے پہلے دیر تک آپ کی تصویروں سے باتیں کرتا رہتا تھا۔" وہ بیڈ پر لیٹے وقاص کے شانے پر سر رکھ کر بولا۔

باپ کے لئے معصوم بیٹے کی محبت کی شدت دیکھ کر وقاص کی آنکھیں بھیگ گئیں وقاص نے شہریار کی چند گھنٹوں کی رفاقت سے بھانپ لیا تھا کہ وہ ذہین بچہ ہے۔ "پاپا مما اب تک روم میں کیوں نہیں آئیں پہلے تو ہم اسی بیڈ پر اکٹھے سوتے تھے۔" شہریار نے پوچھا تو وقاص مشکل میں پڑ گیا۔

"بیٹا وہ دادو کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے ناں اس لئے وہ ان کے پاس بیٹھی ہیں۔"

شہریار رات دیر تک اس سے معصومانہ باتیں کرتا رہا پھر بے خبر ہو کر سو گیا۔

وقاص کو وہاں سے رہتے ہوئے کئی ماہ بیت گئے وہ اب اس خاندان کا ہی ایک فرد بن چکا تھا۔ الیاس صاحب اسے اپنے ساتھ آفس بھی لے جا رہے تھے، وقاص تعلیم یافتہ اور ذہین نوجوان تھا کچھ اسے الیاس صاحب بھی گائیڈ کرتے رہتے تھے۔ ان کا منیجر نعمان بھی الیاس صاحب کے حکم پر اسے گائیڈ کرتا رہتا تھا، وہ چند ہی مہینوں میں ان کے کاروبار کے بارے میں بہت کچھ جان گیا۔

شہریار بھی معمول کے مطابق اسکول جا رہا تھا وہ شہر کے ایک مہنگے اور معیاری اسکول میں زیر تعلیم تھا، اس اسکول میں صرف امراء یا اعلیٰ سرکاری عہدیداروں کے بچے زیر تعلیم تھے، شہریار کو اسکول سے لانے اور لے جانے کی ذمہ داری وقاص کی ہی تھی۔

ایک روز الیاس صاحب کو دل کا دورہ پڑا۔ انہیں بروقت اسپتال پہنچا دیا گیا۔ مگر ڈاکٹر ان کی جان نہ بچا سکے۔ انسان چاہے کتنا ہی دولت مند یا اثر رسوخ والا کیوں نہ ہو۔ تقدیر کے سامنے بے بس ہے وقت پورا ہونے پر دولت اور بڑے سے بڑا ڈاکٹر بھی اسے موت سے نہیں بچا سکتا۔ شہریار اور شائستہ کا غم اور صدمے سے برا حال تھا۔ مرنے والے کے ساتھ کوئی نہیں مرتا بالآخر صبر آ ہی جاتا ہے انہیں بھی صبر آ ہی گیا۔

شائستہ بھی اب وقاص سے گھل مل چکی تھی ویسے بھی وہ شریف اور باکردار نوجوان تھا۔ شائستہ سے بات کرتے وقت اس کی نگاہیں جھکی ہی رہتیں۔ الیاس صاب کا

بزنس اب وہ سنبھال رہا تھا۔ شہریار کے ایگزام ہو چکے تھے، اٹھائیس مارچ کو اسکول میں فنکشن تھا اس فنکشن میں اسٹوڈنٹس اور پیرنٹس کو بھی مدعو کیا گیا تھا فنکشن والے روز وقاص اور شائستہ ٹھیک وقت پر اسکول پہنچ گئے۔

اسکول کے وسیع و عریض احاطے میں فنکشن کا اہتمام کیا گیا تھا ایک طرف خوب صورت سا اسٹیج بنایا گیا تھا کچھ فاصلے پر پیرنٹس اور دیگر افراد کے بیٹھنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ فنکشن وقت پر شروع ہوا تقریب کو دلچسپ بنانے کے لئے اسکول کی انتظامیہ نے اسٹیج شو سمیت چند دلچسپ پروگرام بھی رکھے تھے جو واقعی اتنے دلچسپ تھے کہ وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ اس کے بعد پرنسپل نے مائیک ہاتھ میں لے کر اسٹیج پر کھڑے ہوئے۔ "اب بچوں کے رزلٹ اناؤنس کئے جائیں گے پوزیشن لینے والے ذہین بچوں کو ہمارے مہمان خصوصی اپنے مبارک ہاتھوں سے رپورٹ کارڈ اور انعام دیں گے ہمارے مہمان خصوصی ملک کی مشہور و معروف شخصیت ہیں۔ خان نگر کی ترقی کے لئے انہوں نے بہت جدوجہد کی ہے اور ملک کے بہت سے فلاحی اداروں میں ڈونیشن بھی دیتے ہیں بہت سے غریب گھرانوں کے چولہے ان ہی کے دم سے جل رہے ہیں، خدمت انسانیت کے نام سے ان کی اپنی سماجی تنظیم بھی ہے۔ جو غریب لڑکیوں کے جہیز اور لاوارث مریضوں کے علاج و معالجہ کے لئے امداد فراہم کرتی ہے ہمارے اپنے اس اسکول میں کئی ایسے ذہین بچے بھی زیر تعلیم ہیں جو غربت کے باعث اپنے تعلیمی اخراجات پورے نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے ان بچوں کو ہمارے معیاری تعلیمی ادارے میں ایڈمیشن دلوانے کے ساتھ ساتھ ہر قسم کی امداد اسپورٹ کی ان کے تمام تعلیمی اور دیگر اخراجات یہی ادا کر رہے ہیں، آنے والے انتخابات میں یہ الیکشن میں حصہ لینے کا عزم بھی کر چکے ہیں، تشریف لا رہے ہیں سردار شہباز خان۔"

تالیوں کی گونج میں ایک دراز قد شخص ڈائس پر چڑھنے لگا۔ اس کے پیچھے ایک سیاہ فام نیگرو بھی چل رہا تھا جو دراز قد اور قوی ہیکل تھا۔

سب کی نظریں ان دونوں پر جمی ہوئی تھیں پرنسپل صاحب شہباز خان کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا رہے تھے شہباز خان نے چاروں طرف طائرانہ نظر دوڑائی اور پرنسپل سے مائیک لے لیا۔ "پرنسپل صاحب نے میرا تو تعارف کروا دیا مگر میرے دوست کمپالا کا ذکر نہیں کیا جن کے بغیر میں ادھورا ہوں۔ کمپالا کا تعلق افریقہ سے ہے اور یہ بہت بڑے برین سرجن ہیں ان ہی کے تعاون سے میں نے بہت بڑا اسپتال قائم کیا ہے جہاں کمپالا کی زیر نگرانی غریب اور لاچار لوگوں کا مفت علاج کیا جاتا ہے۔ میرا یہ دوست انسانیت کا محسن ہے۔ اب میں پرنسپل صاحب سے درخواست کرتا ہوں کے رزلٹ اناؤنس کریں پوزیشن ہولڈر بچوں کو میں اپنی طرف سے خصوصی انعام دوں گا۔"

پھر پوزیشن ہولڈر بچوں کے نام اناؤنس ہونے لگے جس بچے کا نام اناؤنس ہوتا وہ بچہ اپنے پیرنٹس کے ساتھ ڈائس پر جاتا اور اپنا انعام وصول کر کے شہباز خان اور کمپالا سے ہاتھ ملانے کے بعد اسٹیج سے اتر جاتا۔ اسٹیج سے کچھ فاصلے پر تین چار تنومند افراد ملیشیا کے کپڑوں میں ملبوس آٹومیٹک رائفلیں لئے کھڑے تھے جو غالباً شہباز خان کے گارڈز تھے۔

پھر کلاس تھری کی باری آئی پرنسپل صاحب مائیک میں کہنے لگے۔ "کلاس تھری کے ہونہار طالب علم شہریار علی نے ناں صرف اپنی کلاس میں فرسٹ پوزیشن حاصل کی ہے بلکہ پورے اسکول میں ٹاپ کیا ہے۔ شہریار ہمارے اسکول کا وہ ہونہار بچہ ہے جو تعلیم کے ساتھ ساتھ غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی سب سے آگے رہتا ہے۔ ابھی حال ہی میں اسکول میں ہونے والے تقریری مقابلے میں بھی اس نے پوزیشن حاصل کی تھی۔" شہریار کا نام پکارا گیا۔

وقاص نے شہریار کا ہاتھ تھاما اور اسٹیج پر چڑھنے لگا شہباز خان اور کمپالا کی نظر اسٹیج پر چڑھتے وقاص پر پڑی تو انہیں حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ وہ اپنی آنکھوں سے انسپکٹر اور لیس علی کی خونچکاں لاش دیکھ چکے تھے جسے بھیڑیوں نے ادھیڑ ڈالا تھا، شکل و صورت قد و قامت غرض کہ اس میں

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

اور ادریس علی میں کوئی فرق نہ تھا۔

وقاص ادریس علی کی روداد میں شہباز خان کا ذکر سن چکا تھا۔ وہ اس کی حالت سے دل ہی دل میں سوچتا ہوا اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ شہباز خان نے انعام اور رزلٹ کارڈ شہریار کے ہاتھ میں تھمایا جس نے اپنے ننھے سے ہاتھوں سے اس سے مصافحہ کیا۔

وقاص نے پرنسپل صاحب اور شہباز خان سے ہاتھ ملانے کے بعد کمپالا سے مصافحہ کیا کمپالا نے وقاص کا ہاتھ تھاما اور پوری قوت سے ہاتھ کا دباؤ بڑھا دیا جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ سامنے کھڑا شخص کمزور نہیں اس کے ہاتھ میں بھی فولاد کی سی سختی ہے۔ ”کمپالا صاحب میرا ایک مخلصانہ مشورہ ہے کبھی کسی پاکستانی سے زور آزمائی کی کوشش مت کرنا، ویسے بھی ہم سے پورا ورلڈ ڈرتا ہے۔“ وقاص مسکرایا اور شہریار کا ہاتھ تھام کر اسٹیج سے اترنے لگا۔

کمپالا کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی تھی۔ ایک عام سے نوجوان نے بھری محفل میں اس کا مذاق اڑایا تھا شہباز خان کو بھی غصہ آیا مگر وہ خاموش رہا ویسے بھی غلطی اس کے دوست کمپالا ہی کی تھی اسے کیا ضرورت تھی ایک عام سے نوجوان سے زور آزمائی کرنے کی۔

فنکشن کے اختتام پر سب اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ ایک روز وقاص شہریار کو اسکول چھوڑ کر معمول کے مطابق آفس گیا آفس میں اہم میٹنگ کی وجہ سے وقت کا اندازہ ہی نہیں ہوا میٹنگ ختم ہوئی تو گھڑی پر وقت دیکھا تو بوکھلا گیا شہریار کی چھٹی کا وقت ہو چکا تھا جبکہ آفس سے اسکول کم از کم بھی پندرہ بیس منٹ کی مسافت پر تھا جلدی سے دوڑ کر گاڑی میں بیٹھا گاڑی اسٹارٹ کر کے مین روڈ پر پہنچا اسے اسکول پہنچنے کی جلدی تھی۔

اسی وقت اس کی نظر فٹ پاتھ پر کھڑے ایک شخص پر پڑی جو ادھر ادھر دیکھے بنا سڑک پار کرنے کی کوشش میں اس کی گاڑی کے سامنے آ گیا تھا۔ اس نے بروقت بریک لگائے اس کی قسمت اچھی تھی کہ اس وقت پیچھے کوئی گاڑی نہیں تھی ورنہ اچانک بریک لگانے سے حادثہ بھی ہو سکتا تھا، وہ غصے سے گاڑی سے اترا اس شخص کو قریب سے دیکھتے ہی اسے دھچکا لگا۔ وہ شخص نابینا تھا۔ جو سفید چھڑی پکڑے آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا، اسے خنسا یاد آ گئی جو مشکل میں ہر ایک کے کام آتی تھی۔ ”آؤ دوست تمہیں کہاں جانا ہے؟“ اس نے نابینا شخص کا ہاتھ تھاما۔

”یہ قریب ہی میرا گھر ہے میں چلا جاؤں گا۔“ اس نے جواب دیا لیکن وقاص نے اس کی ایک نہ سنی اور بصد اصرار اسے گاڑی میں بیٹھا دیا اس کا گھر واقعی پانچ منٹ کی مسافت پر تھا۔ وہ اسے اس کے گھر کے دروازے پر اتار کر آگے بڑھ گیا۔

ادھر اسکول کی چھٹی ہو چکی تھی شہریار اسکول کے گیٹ سے باہر کھڑا وقاص کا انتظار کر رہا تھا، اسکول کی چھوٹی ہوئے پندرہ منٹ گزر چکے تھے اور وقاص اب تک نہیں پہنچا تھا یہ خلاف معمول بات تھی اسکول سے باہر کچھ فاصلے پر ایک ہائی روف کھڑی تھی پہلے اس میں کوئی نظر نہیں آ رہا تھا مگر پھر بچوں کا رش کم ہونے کے بعد تین ڈھاٹا پوش افراد دکھائی دیئے ان کے ہاتھوں میں خودکار رائفلیں موجود تھیں وہ کچھ ادھر ادھر کا جائزہ لیتے رہے پھر گاڑی سے اتر کر شہریار کی طرف بڑھنے لگے وہ تھا تو بچہ بہر حال اتنا سمجھ دار ضرور تھا کہ ان کے چہرے پر ڈھاٹے اور ہاتھوں میں رائفلیں دیکھ کر سمجھ گیا کہ اس کی طرف آنے والے دوست نہیں دشمن ہیں۔ یہ اندازہ ہوتے ہی وہ چیختے ہوئے ایک طرف بھاگنے لگا۔ مسلح افراد بھی اس کے پیچھے دوڑے۔ یہ تو صاف ظاہر تھا کہ وہ شہریار کو اغوا کرنا چاہتے تھے کیونکہ اگر اسے مارنا مقصود ہوتا تو اس کے پیچھے دوڑنے کے بجائے وہیں سے گولی چلاتے اور نو دو گیارہ ہو جاتے۔

شہریار دوڑ میں ان غنڈوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اس تک پہنچنے ہی والے تھے کہ ہائی روف کا انجن غرایا اور ہائی روف اسٹارٹ ہو کر ان غنڈوں کے پیچھے دوڑی اسکول کے باہر موجود کچھ افراد مسلح افراد کو دیکھ کر پہلے ہی خوف زدہ ہو چکے تھے بغیر کسی ڈرائیور کے خالی گاڑی کو ان کے پیچھے جاتا دیکھ کر ان کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے تینوں بدمعاش اپنی پشت پر گاڑی کی آواز سن کر مڑے تو ڈر

اور خوف سے ان کا برا حال ہو گیا ان کی اپنی ہی گاڑی بغیر ڈرائیور کے ان کے پیچھے تھی، گاڑی کی زوردار ٹکر سے ان میں سے دو اچھل کر ایک طرف گرے اور دوبارہ اٹھنے کے قابل نہ رہے۔ جبکہ تیسرا بچے کو بھول کر دوسری طرف بھاگا گاڑی خود بخود دریوس ہوئی اور اس کے پیچھے آئی۔ آگے راستہ بند تھا۔ اس کی حالت خوف سے غیر ہو چکی تھی اور ٹانگیں لرز رہی تھیں وہ بندگلی کی دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ اور لرزتے ہاتھوں سے اپنے سامنے رکنے والی ہائی روف پر گن تان لی۔

پھر گاڑی کا دروازہ کھلا ایسے لگ رہا تھا کہ جیسے کوئی باہر نکلا ہو وہ دیدے پھاڑے یہ حیرت انگیز اور خوف ناک منظر دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ جان بچانے کے لئے گولی کس پر چلاؤں پھر گاڑی کا دروازہ بند ہوا اور ایک ہیولہ سا نمودار ہوا جس نے انسانی روپ دھار لیا، وہ پولیس کی وردی میں ملبوس انسپکٹر ادریس علی تھا۔

اس نے لرزتی انگلی سے ٹریگر دبا دیا تڑتڑاہٹ کی گونج دار آواز کے ساتھ گولیاں چلیں اور سامنے موجود ادریس علی کے جسم سے اس طرح گزر گئیں جیسے اس نے ہوائی گولیاں چلائی ہوں۔ ڈر اور خوف سے رائفل اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر نیچے گر گئی اور وہ لرزتا ہوا زمین بوس ہو گیا۔

ادریس علی مسکراتا ہوا ہائی روف میں بیٹھا، ہائی روف ریورس ہوئی اور دوبارہ اسکول کے سامنے جا پہنچی، شہریار اب تک وہیں کھڑا تھا باپ کو دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی۔ ”آپ کہاں رہ گئے تھے پاپا؟“ وہ اس کے برابر جا بیٹھا۔ شہریار بہادر بچے ڈرتے نہیں میں ہوں ناں۔“ وہ مسکرایا گاڑی دوبارہ اسٹارٹ کی اس نے شہریار کے کھلی کو گیٹ پر اتارا اور کہا۔ ”تم اندر جاؤ میں آتا ہوں۔“

شہریار کے اترتے ہی ہائی روف ریورس ہوئی اور تیز رفتاری سے ایک طرف بڑھ گئی، شہریار کے بیل بجانے پر دروازہ چوکیدار نے کھولا۔ ”شہریار بابا آپ کس کے ساتھ آئے ہیں؟“

”میں پاپا کے ساتھ آیا ہوں۔“ اس نے جواب دیا تو چوکیدار حیرت سے اس کا منہ دیکھنے لگا وہ اسے نظر انداز کر کے گھر میں داخل ہوا اندر صوفے پر بیٹھے وقاص اور شائستہ کو دیکھ کر حیران رہ گیا، وہ اس وقت کرتا شلوار میں ملبوس تھا۔ وقاص نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے پاس بیٹھایا اور بولا۔ ”تم کہاں چلے گئے تھے میں اسکول پہنچا تو تم وہاں نہیں تھے۔“

”آپ ہی تو مجھے وہاں سے ہائی روف میں لائے ہیں، اسکول میں بھی ان تینوں غنڈوں سے آپ نے ہی تو مجھے بچایا تھا لیکن ابھی تو آپ پولیس یونیفارم میں ملبوس تھے، اب اندر آیا ہوں تو آپ نے کرتا شلوار پہن رکھا ہے۔ لیکن آپ ایک سے دو کیسے ہو گئے۔“ شہریار الجھ گیا۔

اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا چکر ہے ادریس علی تو اسے گیٹ پر چھوڑ کر واپس چلا گیا تھا اور پھر جب شہریار اندر آیا تو وہ صوفے پر بیٹھا تھا اور کپڑے بھی دوسرے پہن رکھے تھے اس کی باتوں سے شائستہ اور وقاص بھی چونک گئے تھے، وقاص کے استفسار پر شہریار نے اسے بتایا کہ اسکول کے باہر اس پر کیا گزری۔ شائستہ اور وقاص گھر سے باہر نکلے وہاں کوئی نہیں تھا چوکیدار نے ان کے پوچھنے پر بتایا کہ اس نے کسی گاڑی کی آواز تو ضرور سنی تھی مگر جب دروازہ کھولا تو اکیلا شہریار ہی کھڑا تھا۔ وہ دونوں الجھ گئے کہ وہ کون تھا؟ جس نے شہریار کی جان بچائی اور پھر گھر تک پہنچایا گیا۔ بقول شہریار کے وہ ادریس علی تھا لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے بھلا کسی مرے ہوئے شخص کی بھی اس دنیا میں واپسی ہوئی ہے، مرنے کے بعد آج تک نہ کوئی واپس لوٹا ہے اور نہ ہی کوئی واپس لوٹے گا۔

☆.....☆.....☆

شہریار اب کلاس فور کا اسٹوڈنٹ تھا۔ اس روز ان کے گھر میں شہریار کی برتھ ڈے کی تقریب تھی۔ تمام مہمان آ چکے تھے لیکن شہریار کیک کاٹنے کو تیار نہ تھا اس کا کہنا تھا کہ جب تک اس کی کلاس ٹیچر نہیں آئیں گی وہ کیک نہیں کاٹے گا اس کی یہ کلاس ٹیچر کچھ ہفتہ پہلے ہی ان کے اسکول میں آئی تھی وہ بچوں سے بہت ہی محبت اور شفقت سے پیش آتی تھی شہریار تو اسے دیوانوں کی طرح چاہنے لگا

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk
Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

تھا آج کی تقریب کے لئے شہریار نے ضد کر کے خاص طور پر اسے انوائٹ کیا تھا۔ اور وہ اب تک نہیں آئی تھی مہمان بھی بے جا انتظار سے کوفت کا شکار ہونے لگے تھے۔ ”چلو بھئی شہریار کیک کاٹ بھی لو۔ سب انتظار کر رہے ہیں ہوسکتا ہے تمہاری ٹیچر کسی مجبوری کے باعث نہ آسکی ہوں۔“ شائستہ نے مصنوعی خفگی سے اسے گھورا۔

”وہ دیکھیں مس آ گئیں۔“ شہریار چہکا تو شائستہ کے ساتھ ساتھ وقاص نے بھی کمرے کے دروازے پر کھڑی لڑکی کو دیکھا۔ اسے زمین و آسمان چکراتے ہوئے محسوس ہوئے اس نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے حقیقت تو یہ تھی کہ اسے اس کمرے کے در و دیوار گھومتے ہوئے محسوس ہوئے دل سینے میں ایسے دھڑک رہا تھا کہ جیسے ابھی پسلیاں توڑ کر باہر آجائے گا وہ بھی اسے دیکھ کر دروازے پر جم سی گئی تھی اس کے ساتھ تین چار سالہ خوب صورت سی بچی بھی تھی۔ اس کی شکل وشباہت اس سے ملتی جلتی تھی۔ ”کہیں یہ خنسا کی بیٹی تو نہیں۔“ یہ سوچتے ہی وقاص کا دل ڈوبنے لگا اور جسم سے جان نکلتی محسوس ہوئی قریب تھا کہ وہ لڑکھڑا کر گر جاتا۔

شائستہ نے اس کا زرد پڑتا چہرہ دیکھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”مس آئیں ناں دروازے میں کیوں کھڑی ہیں۔“ شہریار پکارتے خنسا کے قریب گیا اور اس کا ہاتھ تھام کر آگے لے آیا۔ ”مس یہ میرے پیارے پاپا ہیں اور پاپا یہ میری فیورٹ مس خنسا اور ان کی کیوٹ سی بیٹی فاریہ ہے۔“ وہ معصومانہ انداز میں ان کا آپس میں تعارف کروانے لگا۔

خنسا کے چہرے پر پرمژدہ سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ جبکہ وقاص دل ہی دل میں کراہ کر رہ گیا۔ اس کے خوابوں کا تاج محل ٹوٹ کر بکھر چکا تھا۔ کیک کٹ چکا تھا تقریب کے اختتام پر مہمان رخصت ہونے لگے جبکہ شہریار نے ضد کر کے خنساء کو روک رکھا تھا۔ مہمانوں کے جانے کے بعد وہ ڈرائنگ روم میں آبیٹھے۔ شہریار کے ساتھ اس کے خنسا سامنے ہی صوفے پر بیٹھی تھی۔ اسے سامنے دیکھ کر اور اس کے بارے میں سوچ سوچ کر وقاص کا دل ڈوبتا جا رہا تھا۔ اور آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھانے لگا تھا۔

”کیا ہوا خیریت تو ہے۔؟“ شائستہ نے وقاص کی بدلتی کیفیت نوٹ کر لی تھی۔

”میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اپنے کمرے میں جا رہا ہوں پلیز ڈونٹ ڈسٹرب۔“ اس کے جانے کے کچھ دیر بعد خنسا بھی فاریہ کے ساتھ رخصت ہوگئی۔

شائستہ سمجھ دار عورت تھی اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ خنسا اور وقاص میں کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے، شاید دل کا معاملہ ہے اور یہ بھی سمجھ چکی تھی کہ وقاص کو خنسا کے شادی شدہ ہونے کا سن کر دکھ پہنچا ہے۔

اس رات شائستہ نے شہریار کو بہلا پھسلا کر اپنے کمرے میں سلا لیا۔ وقاص کچھ دیر کمرہ بند کر کے لیٹا رہا۔ چین نہ آیا تو کمرے سے باہر نکلا اور گاڑی میں بیٹھ کر سڑکوں پر مٹرگشت کرنے لگا اس کے سینے میں ان دیکھی آگ لگی ہوئی تھی۔ وہ اس آگ کو بجھانا چاہتا تھا اسے یہاں رہتے ہوئے کافی وقت بیت چکا تھا اس لئے وہ اس شہر کے چپے چپے سے واقف ہو چکا تھا۔ اس نے ایک اسٹور سے وہسکی لی اور گھر آ کر کمرہ اندر سے لاک کر کے گلاس اور بوتل لے کر بیٹھ گیا وہ اپنے اندر کی آگ، آتشین، سیال سے بجھانا چاہتا تھا اس نے شراب گلاس میں انڈیلی اور گلاس منہ کے قریب لے جانے لگا تھا کہ اسے کسی کی استہزائیہ ہنسی سنائی دی۔ آواز کی سمت دیکھا تو کھڑا رہ گیا گلاس ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گیا کچھ فاصلے پر ایک ہیولہ سا دکھائی دے رہا تھا۔

اچانک اس کی سماعت سے ایک آواز ٹکرائی یہ آواز اسی مجذوب کی تھی۔ ”اپنے عہد سے پھر گئے ناں۔ تم نے تو گناہوں سے توبہ کر لی تھی اور وعدہ کیا تھا کہ غریبوں کے کام آؤ گے۔ بوڑھوں اور معذوروں کی مدد کرو گے۔“

وقاص سناٹے میں آ گیا۔ جو عہد اس نے خود سے دل میں کیا تھا وہ مجذوب نے دہرا دیا تھا۔ وہ حیران تھا کہ مجذوب اس کے دل کی بات کیسے جان گیا۔ پھر اس نے سوچا شراب ام الخباثت ہے۔ اگر ایک بار منہ سے لگا لی تو کہیں کا ناں رہوں گا نہ دین کا اور ناں دنیا کا۔

اور زندگی اندھیروں میں ڈوب جائے گی۔ وہ اٹھا اور شراب سنک میں بہا دی۔

مجذوب کا ہیولہ غائب ہو چکا تھا۔ شاید وہ اسے بھٹکتا دیکھ کر راہ راست پر لانے کے لئے آیا تھا وہ ساری رات جاگتا رہا۔ ہفتہ اتوار کی شہریار کی چھٹی تھی۔ پیر کے روز جب وہ اسے اسکول چھوڑنے گیا تو اسنے خنسا سے ملنے کا ارادہ کیا۔ وہ اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اس نے بے وفائی کرنا ہی تھی تو اس سے کیوں عشق و محبت کے پیمان باندھے۔ کیوں عمر بھر ساتھ نبھانے کی قسم کھائی۔ شہریار کے کلاس روم میں جاتے ہی وہ پرنسپل کے آفس کی طرف بڑھا۔ اندر پرنسپل کی کرسی پر ایک اسمارٹ سی خاتون بیٹھی تھی جو لگ بھگ اٹھائیس انتیس کی عمر کی تھی۔

”جی میں خنسا سے ملنا چاہتا ہوں۔“ خاتون کے اشارے پر وہ ایک طرف رکھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”آئی ایم سوری وہ پچھلے روز ہی ریزائن دے کر جا چکی ہیں۔“ وہ مسکرائی۔

”لیکن ہفتہ اتوار کو تو اسکول کی چھٹی ہوتی ہے۔“ وقاص نے مضطرب لہجے میں کہا۔

”آپ درست کہہ رہے ہیں۔ دراصل خنسا میری فرینڈز ہونے کے ساتھ ساتھ اسکول میں میری کلاس فیلو بھی تھی۔ ہم ایک ہی علاقے میں رہتے تھے پھر میری شادی ہوگئی اور میں یہاں آبسی۔ میرے شوہر پرنسپل ہونے کے ساتھ ساتھ اس اسکول کے مالک بھی ہیں خنسا کے بارے میں سننے میں آیا تھا کہ وہ اچانک ملک سے باہر چلی گئی ہے اور اس نے شادی کر لی ہے۔ پھر وہ اچانک یہاں آ گئی اس کے ساتھ کیوٹ سی بچی بھی تھی۔ جو اس کی بیٹی ہے۔ اسکول کا ماحول اسے اتنا پسند آیا کہ وہ یہیں پڑھانے لگی خنسا میرے ساتھ ہی رہتی تھی۔

پھر اچانک ہی استعفیٰ بھی دے دیا کیوں دیا یہ اس نے مجھے بھی نہیں بتایا اور اسی روز چلی گئی۔ میں خود حیران ہوں اسے یہاں آئے مہینہ بھی نہیں ہوا تھا اور ہاں جانے سے پہلے وہ ایک لیٹر آپ کے نام دے گئی تھی کہ یہ میرے جانے کے بعد شہریار کے پاپا کو دینا۔“ اس نے دراز میں سے لفافہ نکال کر اسے دیا۔ وقاص نے وہیں بیٹھے بیٹھے لفافہ چاک کیا لکھا تھا۔

وقاص

انسان سوچتا بہت کچھ ہے مگر ہوتا وہی ہے جو اس کے مقدر میں لکھا ہوتا ہے تقدیر کو ہمارا ملن منظور نہیں تھا پھر بھلا ہم ایک کیسے ہوسکتے تھے جب تمہیں یہ لیٹر ملے گا تو میں یہاں سے جا چکی ہوں گی۔ تم نے اچھا کیا جو شادی کر لی شائستہ بہت اچھی لڑکی ہے اور تمہارا بیٹا شہریار بہت پیارا بچہ ہے اس کا خیال رکھنا اور ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔

خنسا۔

”کیا آپ مجھے بتا سکتی ہیں کہ وہ کہاں گئی ہے۔؟ پلیز! مجھ سے کچھ مت چھپائیں یہ میری زندگی کا سوال ہے۔“ وہ سک پڑا۔

”مگر آپ شادی شدہ انسان ہیں آپ کی بیوی بچوں کو آپ کی زیادہ ضرورت ہے۔“ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

وقاص نے خاموشی سے اسے وہ لیٹر دیا جسے اس نے پڑھنے کے بعد واپس لوٹا دیا اور پھر وقاص نے اسے اپنی سرگزشت سنا ڈالی اور کہا۔ ”سچ تو یہ ہے کہ میں نے اسے اپنی زندگی سے بڑھ کر چاہا ہے مگر نہ جانے کیوں اس نے کسی دوسرے کا ہاتھ تھام لیا۔“

”دیکھئے مسٹر وقاص اس بارے میں تو میں کچھ نہیں جانتی کہ وہ کہاں گئی ہے۔ لیکن آپ کے لئے بہتر یہی ہے کہ اسے بھول جائیں کیوں کہ اب وہ شادی شدہ ہے اور ایک بچی کی ماں ہے۔“

وقاص کھوئے کھوئے انداز میں پرنسپل کے آفس سے باہر نکلا۔ دن گزرتے رہے ایک روز وہ آفس سے واپس لوٹا ہی تھا کہ شائستہ نے کہا۔

”کل اد یس علی کی برسی ہے۔ میں ان کی قبر پر جانا چاہتی ہوں۔“

”اپنے والدین سے بھی مل لو گی آپ اپنے ماں باپ کو یہیں اپنے پاس کیوں نہیں بلوا لیتیں۔“

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

”وہ سیدھے سادھے دیہاتی لوگ ہیں گاؤں چھوڑ کر شہر میں رہنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔“ شائستہ بولی۔

وہ دوسرے روز خان پور پہنچے تو دن ڈھلنے والا تھا شہر خموشاں میں مہیب سناٹا چھایا ہوا تھا شائستہ ادریس علی کی قبر سے لپٹ کر سسک سسک کر روئی اندھیرا چھانے والا تھا اس لئے فاتحہ پڑھنے کے بعد وہ وہاں سے رخصت ہو گئے۔

علم دین کا گھر گاؤں کے آخری سرے پر تھا دیہاتی طرز کے اس مکان میں ادھیڑ عمر جوڑا دو نوعمر بچوں کے ساتھ رہائش پذیر تھا۔ وقاص کو دیکھتے ہی ان کے چہروں پر خوف وہراس چھا گیا۔ ان کا خوف زدہ ہونا بھی بجا تھا وہ ادریس علی کا ہم شکل تھا اور انہوں نے اپنے سامنے ادریس علی کی میت کو لحد میں اترتے دیکھا تھا ان کا خوف دور کرنے کے لئے خنسا نے انہیں بتایا کہ ”وقاص ادریس علی کا ہم شکل ہے۔“

80 گز کے اس مکان میں دو کمرے اور چھوٹا سا صحن تھا۔ ایک کمرے میں میاں بیوی بچوں کے ساتھ سو گئے۔ جبکہ دوسرے کمرے میں شائستہ اور شہری چلے گئے۔ وقاص نے صحن میں چارپائی ڈال لی۔

رات کا نجانے کون سا پہر تھا کسی کی چیخ سے وقاص کی آنکھ کھل گئی وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا یہ نسوانی چیخیں تھیں۔ اس کے ضمیر نے گوارہ نہ کیا کہ چادر اوڑھ کر بے حسوں کی طرح سویا رہے۔

وہ گھر سے باہر نکلا ایک بار پھر چیخ کی آواز سنائی دی وہ آواز کی سمت دوڑا کچھ فاصلے پر چار پانچ مسلح افراد ایک نوجوان لڑکی کو گھسیٹ کر جیپ میں ڈالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وقاص کا گاؤں کے لوگوں پر حیرت ہو رہی لڑکی کی چیخیں نہ سنی ہو، یہ بے حسی کی انتہا تھی وہ انجام سے بے پرواہ ان کے قریب جا پہنچا اور ان کے سنبھلنے سے پہلے ایک کو کالر سے پکڑ کر پیچھے پھینکا اور جبڑے پر گھونسہ رسید کر دیا۔

دوسرے نے وقاص کو پیچھے سے قابو کرنا چاہا اس نے زوردار بیک کک اس کے سینے پر رسید کر دی وہ الٹ کر پیچھے گرا۔ تیسرے کے چہرے پر زوردار ٹکر نے اس کے جبڑے ہلا دیئے۔ وہ سمجھ گئے کہ اس طرح وقاص پر قابو پانا آسان نہیں۔ وہ جسے آسان حریف سمجھ رہے تھے وہ ان کے لئے لوہے کا چنا ثابت ہو رہا تھا۔ چنانچہ وہ لڑکی کو بھول کر وقاص پر پل پڑے۔ لڑکی انہیں وقاص سے برسرپیکار دیکھ کر خاموشی سے کھسک گئی اس دوران ان میں سے ایک نے رائفل کا بٹ وقاص کے سر پر رسید کر دیا تو اس کی نگاہوں کے سامنے سورج سا طلوع ہوا اور وہ ہوش وحواس سے عاری ہو گیا۔

اسے ہوش آیا تو وہ کسی تاریک جگہ میں تھا گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کے باوجود کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ سب سے اچھی بات یہ تھی کہ نامعلوم حملہ آوروں نے اس کے ہاتھ پاؤں نہیں باندھے تھے۔ شاید وہ یہاں کے حفاظتی انتظام سے مطمئن تھے۔ ویسے بھی وہ اس ویران کمرے میں قید تھا۔ تن تنہا خالی ہاتھ بھلا ان مسلح افراد کا کیا بگاڑ سکتا تھا۔ عام حالات میں وہ لڑائی بھڑائی سے پرہیز کرتا تھا۔ مگر ایک لاچار لڑکی کو بے بس دیکھ کر خود پر قابو نہ پا سکا اور اب اس قید خانے میں پڑا تھا۔

اس نے اندھیرے میں ہی کمرے میں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے دیواروں کو ٹٹولنا شروع کیا۔ اندازاً یہ بارہ بائی 18 کا ہال نما کمرہ تھا۔ جس کے تین طرف مضبوط دیواریں تھیں جبکہ چوتھی طرف کی دیوار میں نصب مضبوط پلائی کی دیوار تھی۔ اس پلائی کی نصف دیوار میں تین بائی چھ کا دروازہ بھی تھا۔ جس میں تالا لگا ہوا تھا۔ اس نے ٹٹول کر اندازہ لگا لیا کہ یہ کوئی ہال نما تہہ خانہ ہے جسے پلائی کی مدد سے دو پارٹیشن میں تبدیل کر دیا گیا ہے کچھ دیر بعد اس کے اس اندازے کی تصدیق ہو گئی پلائی کی دیوار کے دوسری سائیڈ کسی کے باتیں کرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

وہ کوئی عورت اور مرد تھے جو آپس میں محو گفتگو تھے اس نے دیوار سے کان لگا دیئے مرد کہہ رہا تھا۔ ”سائرہ یوں لگتا ہے یہ ہمارے کسی گناہ کی سزا ہے جو ہم اتنے سالوں سے بھگت رہے ہیں۔ اس قید سے تو بہتر تھا کہ وہ ہمیں

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

جان سے مار ڈالتا۔“ مرد کے لہجے میں مایوسی اور کرب تھا۔

”رفیق تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ یہ ہمارے گناہوں کی سزا ہے۔ جس کی معافی، میں ہر وقت اللہ سے مانگتی رہتی ہوں۔ اگرچہ گناہ بہت بڑا ہے لیکن اللہ کی ذات بڑی غفور الرحیم ہے ہوسکتا ہے ہمیں معاف کر دے۔“ سائرہ نامی عورت کی آواز مرتعش تھی۔

ان کے لب ولہجے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ دونوں ادھیڑ عمر یا بوڑھے ہیں وہ سوچنے لگا گویا اس تہہ خانے میں اس کے علاوہ یہ بوڑھا جوڑا بھی مقید ہے اور باتوں سے ظاہر ہے یہاں برسوں سے قید ہے۔ اگر ایسا ہے تو وہ یہاں کے محل وقوع سے بخوبی آگاہ ہوں گے۔ اگر وہ ان تک پہنچ جائے تو ان سے حاصل ہونے والی معلومات سے کوئی نہ کوئی فائدہ اٹھا سکتا ہے اس نے پلائی کی اس دیوار پر کندھے سے زوردار ضرب لگائی پلائی کی دیوار بلاشبہ کافی مضبوط تھی اس لئے دیوار کا تو کچھ نہیں بگڑا البتہ اس کے نتیجے میں کندھے پر لگنے والی چوٹ سے اس کے پورے بدن میں درد کی کٹیلی لہر سرایت کر گئی۔

پلائی کی دیوار پر ضرب لگانے سے آواز بھی کافی گونجی تھی۔ لیکن اس کے نتیجے میں کوئی ردعمل ظاہر نہ ہوا ورنہ اسے تو ڈر تھا کہ اغوا کاروں میں سے کسی نے آواز سن لی تو اس کی شامت آ جائے گی شاید وہ لوگ اس جگہ سے کافی دور تھے۔ پارٹیشن کی دوسری طرف سے خوف زدہ مردانہ آواز سنائی دی۔ ”کون ہے؟“

”تمہاری طرح اس زندان کا ایک اسیر۔“ وقاص نے جواب دیا۔

”دیوار کے ساتھ کیا کر رہے تھے؟“ دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

”کندھے سے توڑنے کی کوشش۔“ اس نے جواب دیا۔

”وہ شخص ہنسا۔ ”میں پچھلے تین چار سال سے یہاں قید ہوں تم سے پہلے میں نے بھی اسے توڑنے کی بہت کوشش کی مگر ناکام رہا۔ ہمت مرداں مدد خدا میں کوشش کرتا ہوں آپ صرف اتنا بتائیں اس قید خانے کے اردگرد ان غنڈوں کا کوئی ساتھی تو نہیں ہوگا؟“ وقاص نے پوچھا۔

”نہیں یہ زندان رہائشی عمارت سے کافی فاصلے پر ہے۔“ دوسری طرف سے جواب دیا گیا۔

وقاص سوچنے لگا پلائی کی دیوار تو بہت مضبوط تھی۔ اب رہ گیا وہ دروازہ جس پر تالا لگا ہوا تھا شاید یہ دروازہ آمدورفت کے لئے لگایا گیا تھا۔ لیکن اس تالے کو توڑنے کے لئے بھی کسی چیز کی ضرورت تھی۔ اور پھر اسے یہ چیز میسر آ گئی یہ لکڑی کی ایک کرسی تھی اس نے کرسی زور سے فرش پر پٹخ کر توڑی اور اس کا پایا۔ تالے پر برسانے لگا۔ کافی دیر کی جدوجہد کے بعد تالا ٹوٹ گیا۔ وہ دروازہ کھول کر ساتھ والے ہال نما کمرے میں داخل ہو گیا۔ یہ بھی اسی طرز کا ایک زندان تھا۔ جس میں ایک انرجی سیور روشن تھا۔ اس زندان میں بان کی دو چارپائیاں رکھی تھیں۔ ایک چارپائی پر دبلی پتلی پچاس سالہ عورت بیٹھی تھی بلاشبہ اس عمر میں بھی وہ کافی حسین تھی۔ اسی کا ہم عمر ایک ناتواں بوڑھا تجسس آمیز نگاہوں سے وقاص کو گھور رہا تھا۔ اس کے سر کے بال اور داڑھی مونچھیں بے ترتیبی سے بڑھی ہوئی تھیں۔ حد یہ کہ ہاتھوں اور پاؤں کے ناخن بھی بہت لمبے اور میلے کچیلے تھے دونوں کا لباس میلا کچیلا اور پھٹا پرانا تھا۔ گویا وہ واقعی یہاں طویل عرصے سے قید تھے۔

”کون ہو تم؟ اور یہاں کیسے آن پہنچے؟“ بوڑھے نے پوچھا تو وقاص نے اسے اپنی کہانی سنا ڈالی۔

اس دوران وہ بوڑھے کے ساتھ دوسری چارپائی پر جا بیٹھا تھا۔

”آپ کون ہیں؟ اور کب سے اور کیوں اس جگہ قید ہیں؟“ وقاص نے پوچھا تو بوڑھے نے ایک سرد آہ بھری۔ ”میرا نام سردار رفیق خان ہے۔ میں خان نگر کا سردار ہوں۔ یہاں کی تقریباً تمام زرعی زمین میری ملکیت ہے اور یہ میری بیوی سائرہ ہے میں پچھلے تین یا چار برسوں سے قید ہوں۔ کیوں کہ یہاں نہ ہی کوئی کیلنڈر ہے اور نہ ہی کوئی گھڑی کہ قید کی مدت کا تعین کیا جا سکے صرف اس بلب سے وقت کا اندازہ ہوتا ہے جو دن بھر آف رہتا ہے، اور رات کو روشن کر دیا جاتا ہے

یہاں قید ہونے کے بعد سے میں مسلسل یہی سوچتا رہتا تھا کہ میں یہاں کیوں پابند سلاسل ہوں۔

کافی سوچنے کے بعد سمجھ میں آیا کہ یہ برسوں پہلے کئے گئے ایک گناہ کبیرہ کی سزا ہے۔ جو آج میں بھگت رہا ہوں۔'' اس کی کہانی تحریر انگیز اور عبرت ناک تھی۔

☆.....☆.....☆

رفیق احمد خان سردار کامران احمد خان کی اکلوتی اولاد تھا۔ کامران احمد خان سینکڑوں مربع کی اراضی کا مالک ہونے کے ساتھ ساتھ وہ اس علاقے کا سردار بھی تھا وہ عام جاگیرداروں اور سرداروں کی طرح ظالم اور بے رحم تھا۔ جو غریبوں کو کیڑے مکوڑے سے بھی بدتر سمجھتا تھا۔ لڑکپن میں ہی اس کی والدہ فوت ہو چکی تھی۔ اس کے بعد کامران احمد نے شادی نہ کی البتہ اس کے ظلم وستم کا سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا جس خوب صورت لڑکی پر اس کا دل آتا اس کے کارندے ایک اشارے پر اسے اٹھالاتے ان دنوں رفیق احمد خان تعلیم کے سلسلے میں شہر گیا ہوا تھا۔ لاہور میں ان کی ذاتی کوٹھی بھی تھی۔ جس میں رفیق احمد اپنے ملازموں کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کے کالج میں سائرہ بھی پڑھتی تھی۔ جو پہلی نظر پڑتے ہی اس کے دل میں اتر گئی۔

رفیق خان دولت اور اثر ورسوخ کے ساتھ ساتھ خوش شکل اور اسمارٹ بھی تھا۔ چند ہی ملاقاتوں میں سائرہ بھی اسے دل دے بیٹھی۔ ان کی ملاقاتیں زیادہ تر کالج یا پبلک مقامات پر ہوتی تھیں۔ رفیق خان اپنے باپ کے برعکس رحم دل غریب پرور اور شریف انسان تھا۔ ایک روز اس نے اپنی برتھ ڈے والے دن اپنی کوٹھی پر آنے کی دعوت دی۔ پورا گھر دکھاتے دکھاتے وہ اسے اپنے بیڈ روم میں لے گیا۔ جہاں اس نے چھوٹا سا سالگرہ کیک بھی کاٹا اس طرح ان دونوں نے تنہا ہی سالگرہ منائی۔

دین اسلام میں نامحرم مرد اور عورت کو تنہائی میں بیٹھنے سے منع کیا گیا ہے کہ جہاں نامحرم مرد اور عورت تنہا ہوں وہاں تیسرا شیطان بھی موجود ہوتا ہے جو اس موقع سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ ویسے بھی پیٹرول اور آگ کو ایک ہی جگہ رکھنا دانشمندی نہیں۔

دسمبر کا یخ بستہ مہینہ تھا۔ اور شام کا وقت تھا۔ وہ دونوں بیڈ پر بیٹھے تھے سامنے ٹی وی پر انگلش موویز چل رہی تھی۔ انگلش فلم میں دلچسپی اور سنسنی خیزی تو ہوتی ہے لیکن اس میں بعض اوقات ایسے مناظر بھی فلم بند کئے جاتے ہیں جنہیں معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اس وقت بھی ایک ایسا جذباتی منظر اسکرین پر دکھائی دے رہا تھا۔ ہیروئن اپنی خواب گاہ میں قد آور آئینے کے سامنے کھڑی ہے اس نے شب خوابی کا لباس پہن رکھا ہے۔ جو اس کے جسمانی نشیب وفراز کو چھپانے کے بجائے نمایاں کر رہا ہوتا ہے۔ پھر شب خوابی کا لباس اس کے قدموں میں آ گرتا ہے۔ کیمرہ اس کے چہرے پر فوکس ہوتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ نیچے آتے ہوئے اس کے سینے کے مخروطی ابھاروں پر فوکس ہو گیا کیمرہ جیسے جیسے نیچے آتا جا رہا تھا رفیق خان کے جسم پر چیونٹیاں سی رینگتی جا رہی تھیں۔ سائرہ اس سے کچھ فاصلے پر سمٹ کر بیٹھی تھی۔ اس LOVE سین میں ہیروں کی اچانک انٹری نے اس طلسماتی منظر کو اور سنسنی خیز کر دیا۔

فلم نے سائرہ کے جذبات میں بھی آگ لگا دی تھی۔ رفیق احمد خان نے اسے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا تو وہ اس کی آغوش میں پکے ہوئے پھل کی طرح آ گری۔ رفیق خان نے اپنے دہکتے ہوئے لب اس کے گداز ہونٹوں پر رکھے تو وہ بے خود ہونے لگی اور اس کی جھیل جیسی آنکھیں رفتہ رفتہ بند ہونے لگیں۔ وہ جذبات سے بوجھل آواز میں بولی۔ ''کک کوئی آ جائے گا۔'' یہ گویا رضامندی کا اقرار تھا کہ جلد از جلد موقع سے فائدہ اٹھالو۔ رفیق خان کی ہمت بڑھی تو سرکش ہاتھ گردن سے ہوتے ہوئے نیچے جانے لگے وہ لب جان تک پہنچ چکا تھا۔

سائرہ کی کیفیت کچھ اس طرح ہو چکی تھی کہ جیسے میلوں دوڑنے کے بعد تھک ہار کر لیٹی ہو۔ اس کے جسم سے تو گویا جان ہی نکل چکی تھی۔ اور جھیل جیسی آنکھیں بند ہو چکی تھیں ان بند آنکھوں میں رنگین وسنگین انوکھے خواب تھے۔ دونوں جذبات کے سمندر میں غوطہ زن تھے کمرے میں ان کے تیز سانسوں کی آواز گونج رہی تھی سائرہ کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ بپھرے ہوئے

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

سرکش دریا کی تیز وتند لہروں میں تنکے کی مانند ڈوب رہی ہو اور ابھر رہی ہو۔

جب جذبات کا طوفان تھما تو دونوں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا لیکن دونوں نے یہ سوچ کر دل کو تسلی دی کہ آخر شادی تو کرنی ہی ہے۔

شیطان اسی طرح ایک بار گناہ کے بعد دوبارہ گناہ کی راہیں ہموار کرنے کے لئے تاویلیں پیش کر کے انسان کا دل بہلاتا ہے پھر اکثر ان کی تنہائی میں ملاقاتیں ہونے لگیں۔ ان ملاقاتوں کا جب نتیجہ نکلا تو سائرہ کے اوسان خطا ہو گئے۔

رفیق خان اسے ایک لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے گیا اور بھاری رقم دے کر مطلوبہ مقصد حل کروانا چاہا مگر لیڈی ڈاکٹر نے مختلف ٹیسٹوں کے بعد بتایا کہ اب دیر ہو چکی ہے اور اگر اب ایسا کیا تو سائرہ کی جان کو خطرہ ہے۔ ان کے پاس اس مسئلے کا ایک ہی حل تھا کہ شادی کر لیں۔

سائرہ کا تعلق مڈل کلاس فیملی سے تھا وہ اس کے باپ سے ملا اور سائرہ کا ہاتھ طلب کیا مگر وہ غیر برادری میں رشتہ دینے کے خلاف تھے اور ان دونوں میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اپنی غلطی ظاہر کرتے اب دونوں مشکل میں پھنس چکے تھے سائرہ کے باپ نے بھی انکار کر دیا تھا رفیق خان کے پاس اتنا وقت بھی نہ تھا کہ اپنے باپ کو مناتا۔

اب تک تو ان کا گناہ ظاہر نہیں ہوا تھا۔ دو تین ماہ بعد جب ظاہر ہوتا تو ساری دنیا دیکھ لیتی۔ دونوں اسی روز بھاگ نکلے اور کورٹ میرج کر لی اور ایک دوسرے علاقے میں جا بسے شادی کے صرف پانچ ماہ بعد سائرہ ماں بنی تو سردار کامران احمد کو فون کر کے اپنی غلطی کا اعتراف کیا کہ اس نے پسند سے شادی کر لی ہے وہ بھڑک اٹھا اور برا بھلا کہنے کے بعد گاؤں آنے کو کہا۔

اب خود رفیق خان بھی پچھتا رہا تھا اگر بیوی اور بچی دونوں کے ساتھ گاؤں جاتا تو باپ جو پہلے ہی غصے میں تھا آگ بگولا ہو جاتا۔

اس کا باپ کا سب سے پہلا سوال یہی ہوتا کہ شادی کے فوراً بعد بیٹی کیسے پیدا ہوئی۔ قصوروار صرف سائرہ کو ٹھہرایا جاتا اس نے دل پر پتھر رکھ کر فیصلہ کیا کہ اس بچی سے جان چھڑائی جائے پہلے تو سائرہ نہ مانی مگر اس کے مجبور کرنے پر حامی بھر لی۔

اس روز رات کے اندھیرے میں ایک ویران سڑک پر اس نے کار روکی سائرہ بچی کو لے کر گاڑی سے اتری اور کچھ فاصلے پر جھاڑیوں کے جھنڈ میں بچی رکھ کر جانے لگی تب ہی سڑک کنارے ایک دوسری گاڑی پر نظر پڑی۔ گاڑی میں سوار شخص اسی کی طرف دیکھ رہا تھا اس سے پہلے کہ وہ اسے روکتا وہ بھاگ کر رفیق خان کے پاس جا پہنچی دونوں گاؤں چلے گئے۔

کامران خان کی بد اعمالیاں جاری تھیں خدا کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں تقدیر کی لاٹھی حرکت میں آئی اور سردار کامران کے پورے جسم پر فالج گر گیا جس سے وہاں کے لوگ نام سن کر ہی ڈرتے تھے اب وہ ہلنے جلنے سے بھی قاصر تھا ایک روز اسی حالت میں چل بسا۔ تو گاؤں کے لوگوں نے خدا کا شکر ادا کیا۔

سردار رفیق خان باپ کے برعکس رحم دل تھا سال بعد سائرہ کی گود دوبارہ ہری ہوئی۔ اس بار بیٹا پیدا ہوا تھا جس کا نام شہباز خان رکھا گیا۔ کہتے ہیں پوت کے پاؤں پالنے میں ہی نظر آ جاتے ہیں۔ وہ دادا سے بھی دو ہاتھ آگے نکلا پڑھنے لکھنے سے تو کوئی دلچسپی نہیں تھی قد کاٹھ خوب نکالا تھا لڑائی بھڑائی اور آتشیں ہتھیاروں سے کھیلنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔

پندرہ سال کی عمر میں اپنے ملازم کو محض اس لئے گولی مار دی کہ اس نے جس کپ میں چائے دی تھی اس کا کنارہ معمولی سا ٹوٹا ہوا تھا۔ سردار رفیق احمد خان کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی بیٹے کو ڈانٹا ڈپٹا اور بے جا لاڈ پیار سے توبہ کر لی۔

ملازم کے ورثا غریب لوگ تھے رو دھو کر چپ ہو گئے تلافی کے طور پر رفیق خان نے کچھ رقم دے دی باپ کی سختی سے شہباز خان سدھرنے لگا۔

پھر اسے تعلیم کے لئے دوسرے ملک بھجوا دیا۔ شہباز خان کئی برسوں بعد تعلیم مکمل کر کے لوٹا تو اس کے

ساتھ اس کا ایک غیر ملکی دوست بھی تھا۔ ساڑھے چھ فٹ سے زائد نکلتے ہوئے قد کا مالک کمالا افریقیوں کی طرح سیاہ روتھا۔ یہ تو بعد میں پتہ چلا کہ اس کا تعلق افریقہ سے تھا۔

ان ہی دنوں شہباز خان نے اپنے دادا کی طرح گاؤں کی ایک لڑکی پر ہاتھ ڈال دیا، رفیق خان نے بیٹے کو خوب سنائیں اور کہا کہ اب اگر اس نے کوئی ایسی حرکت کی تو وہ نہ صرف اسے عاق کردے گا بلکہ خود پولیس کے حوالے کردے گا شہباز خان سدھر گیا۔

کمالا ایک روز اچانک اپنے وطن جانے کا کہہ کر لوٹ گیا۔ ان ہی دنوں گاؤں سے پراسرار طور پر نوجوان لڑکے اور لڑکیاں غائب ہونے لگے۔ شہباز خان اور رفیق خان نے بہت کوشش کی مگر کھوج نہ لگا سکے۔ پولیس بھی ناکام رہی اور ہر مہینے گاؤں سے کوئی نہ کوئی غائب ہوتا رہا۔ عجیب بات تھی کہ غائب ہونے والے کی لاش بھی نہ ملتی، خاص طور پر جو جنگل میں جاتا واپس لوٹ کر نہ آتا۔

ان ہی دنوں کمالا بھی افریقہ سے واپس لوٹ آیا۔ شہباز خان کے مطابق وہ یہاں اسپتال بنانا چاہتا تھا۔ یہ تو نیک کام تھا اور پھر بیٹا بھی سدھر چکا تھا۔

ایک روز جب کہ رات کو ہم معمول کے مطابق خواب گاہ میں سوئے، صبح آنکھ کھلی تو اس قید خانے میں تھے۔ میں آج تک یہ نہیں جان سکا کہ یہ لوگ کون ہیں اور مجھے کیوں قید کر رکھا ہے؟ تین چار سالوں سے تینوں وقت ایک ملازم کھانا پہنچا جاتا ہے جو اجنبی صورت ہے۔"

وقاص ششدر بیٹھا تھا ان کی داستان سے اتنا اندازہ تو ہو چکا تھا کہ ہوسکتا ہے وہ دونوں خنسا کے حقیقی ماں باپ ہوں، خاص کر کہانی کے اس قصے کو سننے کے بعد کہ سائرہ نے بچی جھاڑیوں میں پھینکی اور بھاگتے ہوئے گاڑی میں سوار ایک شخص سے سامنا ہوا کسی شک وشبے کی گنجائش ہی نہ تھی قسمت اسے حیرت انگیز طور پر خنسا کے حقیقی والدین تک لے آئی تھی اس نے بہتر یہی سمجھا کہ انہیں خنسا کے بارے میں بتادے اس سے اس کا مقصد یہ تھا کہ یہ جان کر کہ جو بچی وہ جھاڑیوں میں پھینک آئے تھے زندہ ہے ان کے ضمیر کا بوجھ کم ہوجائے گا۔

خنسا کے بارے میں جانتے ہی وہ واقعی حیرت سے اچھل پڑے۔ اور کرید کرید کر بیٹی کے بارے میں جاننے لگے۔ "آپ کا تو بچپن اس گاؤں میں گزرا ہے کچھ اندازہ ہے یہ کون سی جگہ ہے اور کبھی اس ملازم کے علاوہ کسی دوسرے کو دیکھا؟" وقاص نے پوچھا۔

"دو یا تین بار ایک نقاب پوش کو دیکھا ہے اور اکثر کبھی کبھار بہت سے بھیڑیوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔" سردار رفیق احمد خان نے جواب دیا۔

ان تینوں کے پاس گھڑی یا اس قسم کی کوئی دوسری شے تو نہیں تھی کہ گزرتے وقت کا اندازہ لگا پاتے۔ ہاں البتہ آہستہ آہستہ اس زندان میں دور سے آنے والی روشنی سے اندازہ ہوتا کہ سورج طلوع ہو رہا ہے۔

"بیٹا تم کہیں چھپ جاؤ ابھی وہ ناشتہ لے کر آتا ہی ہوگا۔ اگر اس نے تمہیں یہاں دیکھ لیا تو ہم تینوں مشکل میں پڑ جائیں گے۔" رفیق خان نے مضطرب لہجے میں کہا اور وہ دوبارہ دوسرے ہال نما کمرے میں چلا گیا۔ اور دروازہ اس طرح بھیڑ دیا کہ کوئی سمجھ نہ سکے کہ دروازہ کھولا گیا ہے پھر وہ معمولی سی جھری سے اس کمرے میں جھانکنے لگا۔

کچھ دیر بعد دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ اور ایک تنومند شخص ٹرے اٹھائے سیڑھیاں اتر کر اس کمرے میں داخل ہوا اس کے کندے پر رائفل موجود تھی وہ شاید اس لئے بھی بے فکر تھا کہ اسے رفیق خان جیسے بوڑھے سے کسی بھی قسم کی مزاحمت کی توقع نہ تھی۔ ویسے بھی یہ سچ ہی تھا کہ نحیف ونزار رفیق خان سے کسی بھی قسم کا خطرہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

وقاص کے لئے بساط کا رخ پلٹنے کا یہ نادر موقع تھا۔ تنومند شخص ٹرے رکھنے کے لئے جیسے ہی جھکا وقاص نے دروازہ کھول کر کسی چیتے کی طرح جست لگائی ٹرے اس شخص کے ہاتھوں سے گری اور وہ خود ٹرے پر گرا جب کہ وقاص نے گرتے ہی اس کے چہرے پر گھونسوں کی بارش کردی۔ ایک تو اس کا یہ حملہ تنومند شخص کے لئے غیر متوقع تھا اور پھر وہ ٹرے کے اوپر گرنے سے گرم گرم

چائے سے جلنے کے باعث ویسے بھی حواس باختہ تھا۔ رہی سہی کسر وقاص کے گھونسوں نے پوری کردی۔ اس کی ناک خون آلود ہو چکی تھی۔ ایک دو دانت بھی ٹوٹ چکے تھے پھر کنپٹی پر لگنے والے ایک گھونسے سے وہ شخص آنا فانا غنیل ہوگیا۔

سردار رفیق احمد خان اور سائرہ حیرت سے یہ منظر دیکھ رہے تھے ان کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ وقاص تن تنہا اس مسلح شخص کو اتنی آسانی سے زیر کرسکتا ہے پھر اس نے بجلی کی سی سرعت سے ایک چارپائی کی بان سے کچھ رسی کھولی اور اس کے ہاتھ پاؤں مضبوطی سے باندھنے کے بعد اس کی قمیض اتار کر اس کے منہ پر باندھ دی۔ اس دوران وہ اس کی رائفل بھی اٹھا چکا تھا۔

پندرہ بیس سیڑھیاں چڑھ کر وہ اوپر پہنچے یہاں ایک کمرہ تھا کمرے کا دروازہ کھولا تو راہداری نظر آئی یہ کوئی عمارت تھی جس کے بیشتر کمروں کے دروازے بند تھے وہ محتاط انداز سے چلتے ہوئے عمارت سے باہر نکل آئے۔ چاروں طرف ہریالی تھی اور درخت ہی درخت دکھائی دے رہے تھے۔ یہ خان نگر کا جنگل تھا سورج طلوع ہو رہا تھا مختلف اقسام کے چرند پرند اور جانوروں کی آوازوں سے جنگل گونج رہا تھا۔ ایک طرف لکڑی کے پھٹوں سے تین بڑی بڑی کھولیاں سی بنی ہوئی تھیں جن سے بھیڑیوں کے غرانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں شاید وہ انسانی بو سے بے چین ہو چکے تھے۔

"حیرت ہے اس جنگل میں یہ عمارت کہاں سے آ گئی اور پھر اس عمارت کے مکین کہاں گئے؟" رفیق خان نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

"یہ وقت ان باتوں کا نہیں، ہوسکتا ہے دشمن اس جنگل میں اردگرد کہیں ہو، ہمیں یہاں سے نکل کر جانا چاہئے، ویسے بھی ہم نہیں جانتے کہ ان کی تعداد کتنی ہے اور پھر وہ ضرور مسلح بھی ہوں گے ایک بار ہم یہ حفاظت یہاں سے نکل گئے تو ان کے خلاف بہت کچھ کرسکتے ہیں۔" وقاص نے کہا اور رفیق خان نے اثبات میں گردن ہلادی۔

رفیق خان مقامی تھے۔ نوجوانی کے آغاز سے ہی جنگل میں شکار کے غرض سے جایا کرتے تھے، بوڑھا ہونے کے بعد انہوں نے اپنا یہ معمول ترک کردیا تھا اسی لئے وہ جنگل کے تقریباً تمام راستوں سے آگاہ تھے۔ اس جگہ جنگل بہت گھنا تھا اور راستہ دشوار اور ناہموار تھا۔ چلتے چلتے رفیق خان نے بتایا کہ "وہ اس راستے سے اس لئے لے جارہے ہیں کہ اگر دشمن کو ان کے فرار کی خبر مل بھی گئی تو اس راستے پر جیپ یا کسی دوسری گاڑی کا آنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن بھی ہے۔" البتہ راستہ آسان تھا۔ لیکن وہاں دشمن کا خطرہ بھی موجود تھا۔ چلتے چلتے وہ تھک گئے مگر رکے نہیں بالآخر کئی گھنٹوں بعد جنگل کی حدود سے باہر نکلنے میں کامیاب ہوگئے۔ "جوان اب تمہارے کیا ارادے ہیں؟"

"کیا مطلب؟" وقاص نے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ برسوں بعد مجھے آزادی ملی ہے سب سے پہلے حویلی جاکر اپنے بیٹے شہباز خان سے ملوں گا اسے دیکھنے کو میری آنکھیں ترس گئی ہیں وہ بھی مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوگا۔ پھر پولیس کو اطلاع دوں گا تاکہ پتہ تو چلے کہ یہ کون لوگ ہیں اور یہ لوگوں کو اغوا کرنے کے بعد انکا کیا کرتے ہیں۔"

"لیکن انکل آپ نے ایک بات پر غور نہیں کیا۔"

"وہ کیا؟" رفیق خان نے پوچھا۔

"وہ یہ کہ آپ تین یا چار سال قید رہے لیکن آپ کو قید کے دوران سوائے قید کے کوئی دوسری تکلیف نہیں دی گئی اور نہ ہی اغوا کرنے والے آپ کے سامنے آئے؟ کیوں اور پھر اس دوران جو بہت سے دوسرے لوگ اغوا ہوئے وہ کہاں گئے؟"

یہ سوال واقعی جواب طلب تھے لیکن ان سوالوں کا جواب ان میں سے کسی کے پاس نہیں تھا۔ "میرا تو خیال ہے تم بھی میرے ساتھ ہی حویلی چلو۔" رفیق خان اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

"نہیں انکل پھر کبھی سہی فی الحال تو مجھے علم دین کے گھر جانا ہے میں اچانک وہاں سے غائب ہوا تھا۔ سب پریشان ہوں گے خاص طور پر شہریار بہت پریشان ہوگا،

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

کیوں کہ وہ مجھے اپنا باپ سمجھتا ہے۔" وہ دونوں آپس میں گلے ملے سائرہ نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور ان کے راستے الگ ہوگئے۔ علم دین کا گھر جنگل سے کچھ ہی فاصلے پر تھا۔ جب کہ رفیق خان کی حویلی بہت دور تھی۔ وہ ایک دوسرے سے الگ ہوگئے وہ علم دین کے گھر پہنچا تو شہریار اسے دیکھتے ہی دوڑ کر اس سے لپٹ گیا۔

"پاپا آپ کہاں رہ گئے تھے؟"

"یار ایک ضروری کام سے جانا پڑ گیا لیکن دیکھ لو تمہاری خاطر لوٹ آیا ہوں۔" وہ اس کا گال چومتے ہوئے بولا۔

کچھ دیر بعد جب وہ نہا دھو کر سکون سے بیٹھا تو شائستہ نے کہا۔ "آپ کو غائب دیکھ کر ہم بہت پریشان ہوگئے تھے ادھر ادھر کافی دیر ڈھونڈنے کے بعد سردار شہباز خان کی مدد سے پولیس کو بھی اطلاع دی شکر ہے آپ آگئے۔ پر ہوا کیا تھا؟"

وقاص نے اسے تمام واقعات بتا کر کہا کہ "وہ پولیس اسٹیشن جا رہا ہے تاکہ جنگل میں موجود جرائم پیشہ افراد کے خلاف کارروائی کی جاسکے۔"

"آپ ابا جان کو بھی ساتھ لے جائیں یہ یہاں کے راستوں سے آگاہ ہیں۔" شائستہ نے کہا اور وقاص نے اثبات میں گردن ہلادی کچھ دیر بعد وقاص اور علم دین گھر سے نکلے اور تھانے کی سمت چل دیئے شام کا وقت تھا وہ اندھیرا پھیلنے سے پہلے پولیس اسٹیشن پہنچنا چاہتے تھے۔ اس لئے تیزی سے چل رہے تھے۔

اچانک سرسراہٹ کی آواز پر وقاص چونکا اور مڑ کر دیکھنا چاہا اسی وقت اسے ایسا لگا کہ اس کے دائیں بازو میں دہکتی ہوئی سلاخ پیوست ہوگئی ہو اس نے مڑ کر دیکھا کچھ فاصلے پر تین نقاب پوش کھڑے تھے ان میں سے ایک کے ہاتھ میں ایروشوٹر تھا اس نے غصے سے ایروشوٹر والے کی طرف بڑھنا چاہا مگر قدموں نے ساتھ دینے سے انکار کردیا۔ اور وہ لہراتا ہوا گرا اور بے ہوش ہوگیا یہی حال علم دین کا بھی ہوا۔

اسے ہوش آیا تو خود کو عجیب ساخت کے ٹیبل پر پایا اس کے ہاتھ پاؤں مضبوطی سے بندھے ہوئے تھے یہ ہال نما کمرہ تھا جس کی دیواروں پر انرجی سیور روشن تھے کچھ فاصلے پر اسی قسم کا ایک اور ٹیبل تھا جس پر ایک شخص بے حس و حرکت پڑا تھا۔ اس کے قریب دو افراد ڈاکٹرز والا گاؤن پہنے کھڑے تھے۔ دونوں کے چہروں پر ڈھاٹے موجود تھے جب کہ ٹیبل کے اوپر چھت سے سرچ لائٹس طرز کی تیز روشنی والے بلب روشن تھے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ کسی آپریشن تھیٹر میں موجود ہو۔ ان میں سے ایک قریب رکھی ٹرالی سے سرجیکل نائف اٹھانے لگا تو اس کی نظر وقاص پر پڑی، اسے ہوش میں دیکھ کر وہ مسکرایا تو اس کے سفید دانت چمکنے لگے۔

وہ دراز قد اور قوی ہیکل تھا۔ "اوہ تو تم ہوش میں آگئے اب ذرا میں ایک سائیڈ پر ہو کر آپریشن کروں گا تاکہ تم بھی دیکھ کر انجوائے کرسکو۔" وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔

وقاص کو اس کی آواز جانی پہچانی محسوس ہو رہی تھی لیکن سمجھ نہیں آرہا تھا کہ یہ آواز اس نے کب اور کہاں سنی ہے اب وہ قدرے ہٹ کر کھڑا تھا۔

پھر جو منظر وقاص کو دکھائی دیا وہ بڑا ہی خوف ناک تھا۔ ٹیبل پر پڑا وجود علم دین کا تھا اس کی کھوپڑی کا اوپری حصہ پھٹے ہوئے تربوز کی طرح کھلا ہوا تھا۔

دراز قد اور قوی ہیکل ڈاکٹر سرجیکل نائف اور نشتر نما آلہ لئے اس کے دماغ کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔ قریب ہی ایک عجیب ساخت کی مشین نصب تھی جس سے منسلک کچھ تاریں علم دین کے جسم میں پیوست تھیں۔

وقاص کی کنپٹیاں سائیں سائیں کر رہی تھیں اور رونگٹے کھڑے ہوگئے تھے حقیقت تو یہ تھی کہ اس کا خوف و دہشت سے برا حال تھا اور ہوش و حواس ساتھ چھوڑنے لگے تھے۔ وہ سوچنے لگا گویا وہ کسی پاگل ڈاکٹر کے ہتھے چڑھا ہے۔ جو جنون میں انسانی زندگیوں سے کھیل رہا ہے یہ بھیانک کھیل وہ وقاص کو نظر کے سامنے رچا رہا تھا پھر بھلا وہ چشم دید گواہ کو کہاں زندہ رہنے دیتا۔ ہوسکتا تھا یہ ڈاکٹر اس پر بھی اپنا وحشیانہ تجربہ آزما سکتا تھا یہ سوچتے ہی اس کا خون کھولنے لگا۔

وہ چلا اٹھا۔ "اسے چھوڑ دو پاگل ڈاکٹر۔"

ڈاکٹر لمحہ بھر کے لئے اس کی طرف مڑا اس کی انگاروں کی مانند دہکتی آنکھیں غصے سے لال سرخ ہو رہی تھیں۔ "دوبارہ چیخنے یا چلانے کی کوشش مت کرنا آرام سے پڑے رہو۔ یہ تجربہ گاہ ساؤنڈ پروف ہے مگر تمہارے چیخنے چلانے سے میرے کام میں خلل پڑتا ہے اب اگر تم نے منہ سے کوئی آواز نکالی تو میں اسے چھوڑ کر تمہاری طرف آجاؤں گا پھر وقت سے پہلے تمہیں میرے تجربہ کا شکار ہونا پڑے گا۔" اس نے سفاک لہجے میں کہا اور وقاص سہم کر خاموش ہوگیا اس کی پھٹی پھٹی نگاہیں ڈاکٹر پر مرکوز تھیں جس کی آنکھوں میں درندگی تھی اور پھر وہ ڈاکٹر کے خلاف کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا اسے اس مضبوطی سے باندھا گیا تھا کہ وہ اپنے بدن کو معمولی سی جنبش بھی نہیں دے سکتا تھا۔

ڈاکٹر بارستور اپنے وحشیانہ تجربے میں مصروف تھا کچھ ہی دیر میں یہ خوف ناک ڈرامہ ختم ہوگیا اور لائٹس آف ہوگئیں معاون نے علم دین کے چہرے پر سفید چادر ڈالی۔

"اس کی لاش لے جاؤ اور اپنے ساتھیوں کی دعوت کرو۔" اس نے سفاک لہجے میں کہا اور چہرے سے نقاب اتار دیا۔

وقاص کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا وہ کپکپا اٹھا شہباز خان کا افریقی دوست برین سرجن۔ "لگتا ہے جھٹکا! اب مزید بھی جھٹکے لگیں گے۔" وہ ہذیانی انداز میں ہنسا۔

"یہ سب کیا ہے تم کیوں انسانی زندگیوں سے کھیل رہے ہو۔ کیا شہباز خان یہ سب جانتا ہے؟" حیرت کے ابتدائی جھٹکے سے سنبھلتے ہی اس نے پوچھا۔ "اور میرے خیال میں شہباز خان کے باپ کو بھی تم نے ہی اغوا کیا تھا؟"

"تم نے اندازے درست لگائے ہیں ویسے بھی تم نے مرنا ہی ہے تو چلو حقیقت بھی جان ہی لو تاکہ مرنے کے بعد تمہارے ذہن میں کوئی خلش باقی نہ رہ جائے۔

شہباز خان سے میری دوستی جرمنی میں ہوئی تھی پھر یہ دوستی اتنی بڑھی کہ میں اس کے اصرار پر پاکستان آگیا مگر اس شرط پر کہ شہباز میری ہر بات مانے گا جب میں نے اپنا پلان اس کے سامنے رکھا تو وہ بلا جھجک راضی ہوگیا اور اس میں اس کا بہت بڑا فائدہ بھی تھا وہ باپ کے برعکس عیاش اور سفاک انسان تھا۔ جب سردار رفیق احمد خان نے شہباز خان کو سرزنش کی تو میں نے اسے سمجھایا کہ مطلب کے وقت گدھے کو بھی باپ بنانا پڑتا ہے یہ تو پھر بھی تمہارا سگا باپ ہے۔

میری بات اس کی سمجھ میں آگئی بظاہر وہ باپ کا فرمانبردار اور شریف بیٹا بن گیا ان ہی دنوں میں افریقہ جانے کا کہہ کر اس جنگل میں آگیا یہاں ہم نے چھوٹی سی عمارت بنائی جس کے نیچے تہہ خانہ تھا یہ وہی جگہ ہے جہاں تم اور رفیق خان قید رہ چکے ہو۔ اس عمارت میں ہمارا صرف ایک کارندہ تھا جسے زیر کر کے تم لوگ بھاگ نکلے تھے۔

پھر اس سے خاصے فاصلے پر مشینوں کے ذریعے گہری کھدائی کروائی گئی پھر ماہر تعمیرات کے ذریعے یہاں وسیع و عریض جدید ترین سہولتوں سے آراستہ عمارت تعمیر کروائی۔ اس عمارت میں آٹو میٹک ہیوی جنریٹر اور جدید ترین سائنسی آلات نصب کئے گئے اور عمارت پر سینکڑوں من مٹی ڈال کر اس کو زیر زمین دفن کردیا گیا اور بڑی مہارت سے ایسا انتظام کیا گیا کہ اس زیر زمین عمارت میں آکسیجن کی کمی نہ ہو۔ اس جنگل میں زیر زمین عمارت میں کام کرنے والے تمام افراد کو قید کردیا گیا جو بعد میں ہمارے تجربات میں کام آئے ان کے جسم میرے ٹرینڈ بھوکے بھیڑیوں کی بھوک مٹانے کے کام آئے۔

دراصل انسانی دماغ کی انٹرنیشنل مارکیٹ میں بہت مانگ ہے، ہم انسانی دماغ نکال کر محفوظ کرلیتے ہیں اور بعد ازاں منہ مانگی قیمت پر بین الاقوامی مارکیٹ میں فروخت کردیتے ہیں۔

اسی جنگل میں میں نے ایک Zoo بھی قائم کر رکھا ہے جس میں میرے تربیت یافتہ بھیڑیے اور ایک بن مانس ہے میں نے ایک تجرباتی آپریشن کے ذریعے بن مانس کا دماغ نکال کر اس کے سر میں انسانی دماغ منتقل کردیا تھا اس لئے وہ بن مانس میرا بہترین فرمانبردار ہے وہ انسانوں کی طرح سوچتا اور سمجھتا ہے اور احکامات پر بہترین عمل کرتا ہے ویسے بھی بندر اور انسان کے جسمانی اعضا کی

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

بناوٹ ایک ہی جیسی ہے بعض سائنسی تحقیقات کے مطابق بندر انسان کی ابتدائی شکل ہے۔

جب کہ تم مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ زمانہ قدیم میں نافرمان لوگوں کو خدا نے بطور سزا بندر بنا دیا تھا۔ ویسے بھی جانور انسان کے برعکس بہترین فرمانبردار ہے انسان کو اگر کوئی حکم دیا جائے تو ہوسکتا ہے وہ سوچے اور پوچھے کیوں؟ جب کہ تربیت یافتہ جانور ہر حال میں حکم کی تعمیل کرتا ہے۔

میں اپنے تجربات سے اس بن مانس کی طرح دیگر بہت سے بن مانسوں کو انسانی دماغ منتقل کرنے کے بعد اپنا تربیت یافتہ بنانا چاہتا ہوں۔

ادریس علی ہماری راہ پر لگ گیا تھا اس لئے اسے بھیڑیوں کے ذریعے ختم کروا دیا گیا۔

رہا رفیق خان کا سوال تو اسے خود شہباز خان نے سوتے میں سائرہ سمیت کلوروفارم سونگھا کر جنگل میں منتقل کیا تھا مگر وہ بے وقوف ان کی موت پر آمادہ نہ ہوسکا اور ہمیں ان بوڑھے ہنسوں کے جوڑے کو زندہ رکھنا پڑا۔

لاہور کے اسکول میں تقریب تقسیم انعامات میں تمہیں دیکھ کر شہباز خان اور میں چونک پڑے۔ ان ہی دنوں شہریار کی ذہانت دیکھ کر میں نے اسے اغوا کا پلان بنایا کیوں کہ مجھے خاص طور پر ذہین انسانوں کے دماغ کی تلاش رہتی ہے۔ مگر شہریار کو اغوا کرنے میں میرے کارندے ناکام رہے ان کا کہنا تھا کہ "شہریار کو ادریس علی نے بچایا ہے جس پر رائفل کی گولیاں بے اثر رہیں۔"

یہ بات ناقابل یقین تھی تمہارے بارے میں معلوم ہوا کہ تم وقاص ہو اور ادریس علی کے ہم شکل۔ اسی دوران تم خان نگر آئے، ہمارے کارندوں کی راہ میں روڑے اٹکاتے ہوئے پکڑ لے گئے مگر پھر جنگل سے تم رفیق خان اور سائرہ کے ساتھ فرار ہوگئے لیکن میں نے تمہیں فوراً ہی گھیر کر یہاں پہنچا دیا۔

ادھر رفیق خان اور سائرہ حویلی کی طرف گئے ہیں وہ شہباز خان کی اصلیت سے آگاہ نہیں، وہاں جاتے ہی پکڑے جائیں گے اور اس بار شہباز خان انہیں زندہ چھوڑنے کی حماقت نہیں کرے گا۔ اب کچھ دیر آرام کرو پھر تمہاری باری ہے۔" کمپالا تجربہ گاہ سے باہر نکل گیا۔

جبکہ وقاص بے بس پڑا سوچ رہا تھا کہ اب کیا ہوگا یہ دو گھنٹے اس کے لئے اذیت ناک تھے موت سے زیادہ موت کا تصور خطرناک ہوتا ہے۔ موت کے خوف کے بارے میں جاننا ہو تو سزائے موت کے اس قیدی سے پوچھئے جسے کچھ گھنٹوں کے بعد پھانسی دی جانی ہے اسی طرح کینسر کا مریض ہے وہ مرنے سے پہلے سوچ سوچ کر موت کے خوف سے مرنے کے قریب ہوجاتے ہیں، وہ خوف سے لرزتا جا رہا تھا کہ کمپالا کا معاون نمودار ہوا اور آتے ہی اسے انجکشن لگا دیا۔

وقاص کا جسم سن ہونے لگا کچھ ہی دیر میں اس کے جسمانی اعضاء نے حرکت کرنا چھوڑ دیا تو اس نے وقاص کے گرد بندھی رسیاں کھول کر ایک طرف پھینک دیں اور اس کے جسم پر سفید چادر ڈال دی۔ وقاص ڈوبتے ہوئے ذہن سے سوچنے لگا۔ "کیا وہ بھی شیطان ڈاکٹر کے بھیانک تجربے کا شکار ہوجائے گا؟"

وقت مقرر پر کمپالا کا مکروہ سیاہ چہرہ مسکراتا ہوا نمودار ہوا۔ "ہاں تو مسٹر وقاص تم انوکھے تجربے کا شکار ہونے جا رہے ہو۔ گھبراؤ مت یہ صرف تمہارے جسم کی موت ہوگی تمہارا ذہن زندہ رہے گا۔ تم بہادر اور ذہین نوجوان ہو۔ تمہارے دماغ کے لئے ایک نوجوان بن مانس کا انتخاب کرلیا گیا ہے تمہیں تو میرا احسان مند ہونا چاہئے کہ اس تجربے کے لئے تمہارا انتخاب کرلیا گیا ہے۔" وہ بکواس کئے جا رہا تھا۔

وقاص بول تو سکتا نہیں تھا دل ہی دل میں جیسے چیخا۔ "تو مجھے جان سے مار رہا ہے اور بکواس کئے جا رہا ہے۔"

"اسے ایک ڈوز مزید دے دو تاکہ آپریشن کے دوران کوئی رکاوٹ نہ ہو۔" کمپالا نے کہا اور سرجیکل نائف اور دیگر آلات رکھ کر اس کے سرہانے لگی مشین سے مصروف ہوگیا۔

اس کے معاون نے سرنج اٹھائی اور قریب آکر سرنج والا ہاتھ وقاص کی طرف بڑھانے لگا، وقاص ایک

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

بھیانک موت کو اپنی طرف بڑھتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ ایک اذیت ناک موت اس کی منتظر تھی۔

☆.....☆.....☆

رفیق خان اور سائرہ حویلی کے قریب پہنچ چکے تھے، سائرہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "شہباز ہمیں دیکھ کر کتنا خوش ہوگا کیوں نہ ہم اسے سرپرائز دیں۔"

رفیق خان اس کا ہاتھ پکڑ کر حویلی کی عقبی سمت جانے لگا۔ "کیا مطلب؟" سائرہ نے حیرت سے پوچھا۔

"بھئی ہم عقبی سمت سے جا کر اسے حیران کردیں گے۔" یہ حویلی ان کی آبائی حویلی تھی اس لئے تمام راستے دیکھے بھالے تھے عقبی سمت خفیہ راستہ تھا وہ با آسانی کسی کی نظر میں آئے بغیر حویلی میں داخل ہوگئے اور چھپتے چھپاتے ہوئے مختلف راہداریوں سے ہوتے ہوئے شہباز خان کے کمرے کے دروازے پر جا پہنچے، اندر سے باتوں کی آواز آرہی تھی وہ کسی سے فون پر بات کر رہا تھا۔

"ہاں کمپالا تم فکر مت کرو، اچھا ہوا تم نے ان تینوں کے فرار کی خبر مجھے دے دی۔ میں نے اپنے سارے کارندے انہیں تلاش کرنے کے لئے بھیج دیئے ہیں اور اگر یہاں آئے تو بچ کر نہیں جائیں گے۔ اچھا اچھا تم نے وقاص کو پکڑ لیا ہے فوراً اسے ختم کردو وہ بہت چالاک ہے۔ نہیں یار میں تمہارا سبق نہیں بھولا تم نے ہی تو کہا تھا کہ مطلب کے وقت گدھے کو بھی باپ بنانا پڑتا ہے اور رفیق خان تو میرا سگا باپ ہے اور میرا اور تمہارا فلسفہ پھر ایک ہے۔ اپنی بقاء کے لئے ہر ایک کی جان لینا جائز ہے۔"

دونوں میاں بیوی اس کی گفتگو سن رہے تھے اور سمجھ رہے تھے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان کا بیٹا اتنا بے رحم ہوسکتا ہے یہ وہی بیٹا تھا جس کی پیدائش کے لئے وہ دن رات دعائیں مانگا کرتے تھے اور اگر اسے کانٹا بھی چبھتا تو ماں باپ تڑپ اٹھتے۔ اس وقت بیٹے کے سامنے آنے کا مطلب موت تھا۔ اگر وہ پکڑے جاتے تو پھر وقاص کی جان بچنے کا بھی کوئی چانس نہ تھا وہ بھی مارا جاتا۔

وہ فون پر کمپالا اور شہباز خان کی گفتگو سے جان چکے تھے کہ وقاص دوبارہ پکڑا جا چکا ہے اور اس کی جان خطرے میں ہے۔ وہ جس خاموشی سے حویلی میں داخل ہوئے تھے اسی طرح خاموشی سے باہر نکل گئے۔

ملک بشیر پولیس ڈپارٹمنٹ کا بہادر اور ذہین ترین ایس پی رین کا آفیسر تھا۔ اس کے والد رفیق خان کے گہرے دوست تھے وہ دونوں میاں بیوی قریبی قصبے بلوچ نگر میں ملک بشیر تک جا پہنچے اور اسے تمام صورت حال سے آگاہ کیا دونوں میاں بیوی کو ملک بشیر نے اپنے گھر میں ٹھہرایا اور اعلیٰ افسران سے رابطہ کرکے پولیس کی بھاری نفری کے ساتھ خان نگر کے جنگل میں داخل ہوئے۔ رات کے اندھیرے میں سفر کافی مشکل تھا۔

اچانک انہیں سیٹی سے مشابہ ہوکتی ہوئی آواز سنائی دی۔

ادھر وقاص کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا، اسے معلوم تھا کہ موت اس سے چند قدم کے فاصلے پر ہے اگر وہ اسی طرح پڑا رہا تو اس جنونی ڈاکٹر کے خوف ناک تجربے کا شکار ہوجائے گا۔ گویا ایک بھیانک اور اذیت ناک موت اس کی منتظر تھی۔ وہ میڈیکل کا طالب علم رہ چکا تھا۔ اتنا ضرور جانتا تھا کہ انسانی جسم دماغ کے تابع ہوتا ہے۔ وہ اپنی قوت ارادی سے اسے شکست دینا چاہتا تھا۔ خواب آور دوا کی وہ ڈوز جو اسے دی جا چکی تھی اس نے اس کا جسمانی نظام معطل کرکے رکھا تھا۔

سب سے پہلے اس نے دائیں پاؤں کے انگوٹھے کو حرکت دینے کی کوشش کی یہ دیکھ کر اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی کہ اس کا پاؤں حرکت کر رہا تھا گویا دوا کا اثر کم ہو رہا تھا، اسے جو کچھ کرنا تھا انجکشن لگنے سے پہلے کرنا تھا۔

اب اس نے دائیں ہاتھ کو جنبش دینے کی کوشش کی کمپالا کا معاون آڑے لیٹے وقاص کو کولہے پر انجکشن لگانے ہی والا تھا کہ وقاص نے محسوس کیا کہ اس کا ہاتھ حرکت کر رہا ہے کمپالا کی پشت اس کی طرف تھی وہ آپریشن کے دیگر انتظامات کر رہا تھا۔

اسی لمحے وقاص کی نظر قریب پڑی ٹرے پر پڑی جس میں سرجیکل نائف رکھا تھا، اس نے تیزی سے ہاتھ کو جنبش دی اور سرجیکل نائف پر اپنے ہاتھ کی گرفت

مضبوط کرلی۔

ادھر کمپالا کے معاون کی نظر اس پر پڑی تو حیرت سے اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی کارروائی کرتا وقاص کا ہاتھ تیزی سے حرکت میں آیا سرجیکل نائف پاس کھڑے معاون کے پیٹ میں لگا تو وہ کریہہ انداز میں چیختا ہوا نیچے گرا اور وقاص تڑپ کر ٹیبل سے گر گیا۔

کمپالا اس کی چیخیں سن کر بوکھلا کر مڑا نیچے پڑے وقاص کی لات حرکت میں آئی اور کمپالا کی ٹانگوں سے ٹکرائی وہ دھڑام سے نیچے گرا اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا وقاص نے اسے دبوچ لیا اب اس کا جسم فعال ہو چکا تھا خواب آور دوا کے اثرات زائل ہو چکے تھے پھر بھی کمزوری تھی۔

ادھر کمپالا نے پلٹا کھایا اب وقاص نیچے تھا اور کمپالا کے دونوں ہاتھ وقاص کے گلے پر تھے اس کے ہاتھوں کا دائرہ لحہ بہ لحہ کم ہوتا جا رہا تھا اور وقاص کے ذہن پر دھند سی چھائی جا رہی تھی۔ یہ بقاء کی جنگ تھی کہ اگر بلی بھی لڑنے پر آئے تو شیرنی بن جاتی ہے۔

اچانک وقاص کی نظر قریب پڑی سرنج پر پڑی اس نے اپنے دائیں ہاتھ کو جنبش دی اور سرنج اٹھا کر کمپالا کے گلے میں گھونپ دی، کمپالا اذیت سے چیخا سرنج میں موجود خواب آور دوا کی ڈوز کمپالا کے جسم میں سرایت کر چکی تھی۔

وقاص نے اس کے بے حس ہوتے وجود کو اپنے اوپر سے دھکیلا اور گلا مسلتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور گہرے گہرے سانس لینے لگا ادھر کمپالا کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ چکے تھے دوا اپنا اثر دکھا چکی تھی۔

اتنی زبردست کشمکش اور چیخ و پکار کے باوجود کسی کی مداخلت نہیں ہوئی تھی۔ گویا تجربہ گاہ واقعی ساؤنڈ پروف تھی وقاص نے نیچے پڑا سرجیکل نائف اٹھالیا اور تجربہ گاہ کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

ایک راہ داری مڑتے ہوئے اچانک ایک رائفل بردار سامنے آ گیا وقاص کو دیکھتے ہی اس نے شانے سے لٹکی رائفل اتارنا چاہی مگر اب اسے دیر ہو چکی تھی وقاص نے بجلی کی سی سرعت سے سرجیکل نائف عین اس کے دل کے مقام میں اتار دیا اور اس کے ڈھیر ہوتے ہی رائفل پر قبضہ جما لیا اچانک راہ داری کے کونے سے دو رائفل بردار نمودار ہوئے وقاص نے ٹریگر دبا دیا تڑتڑاہٹ کی زوردار آواز راہداری میں گونجی رائفل برسٹ موڈ پر تھی وہ دونوں گولیوں کی تال پر رقص کرتے ہوئے گرے ایک دوسری راہ داری میں ایک اور شخص سامنے آیا تو وقاص نے بلا جھجک اسے بھی گولیوں سے چھلنی کر دیا اب اسے اس زیر زمین تجربہ گاہ سے نکلنے کا راستہ ڈھونڈنا تھا اور وقت کم تھا۔

کمپالا کسی بھی وقت ہوش میں آ سکتا تھا اور پھر یہاں نہ جانے اس کے کتنے کارندے تھے ایک رائفل کے بل بوتے پر یہاں سے نکلنا بہت مشکل تھا ایک جگہ زینہ دکھائی دیا وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچا یہاں چھ بائی چھ کا کمرہ تھا جس کا عجیب ساخت کا دروازہ تھا جس کے باہر کرسی پر ایک شخص بیٹھا موبائل فون پر گیم کھیل رہا تھا۔ وہ بلی کی سی چال چلتا ہوا اس کے سر پر جا پہنچا۔

آہٹ سن کر اس نے سر اٹھایا ہی تھا کہ وقاص نے رائفل کی نال اس کی کنپٹی سے لگا دی۔ اپنے سامنے رائفل بدست وقاص کو کھڑے دیکھ کر وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ ”کمپالا اپنے حواریوں سمیت جہنم رسید ہو چکا ہے سلامتی چاہتے ہو تو مجھے یہاں سے خاموشی سے نکال دو ورنہ جان سے جاؤ گے۔“ وقاص نے سرد لہجے میں کہا۔

اس شخص نے کرسی سے اٹھتے ہوئے ہولسٹر کی طرف ہاتھ بڑھایا وقاص نے زوردار اسٹریٹ کک اس کی ٹانگوں کے بیچ رسید کی وہ شخص اٹھتے اٹھتے دوبارہ کرسی پر جا گرا۔ اس کے سنبھلنے سے پہلے ہی وقاص نے رائفل کا بٹ اس کے دائیں گھٹنے پر رسید کر دیا اس کی چیخوں سے راہ داری گونج اٹھی۔ ”اب مزید کوئی حرکت مت کرنا ورنہ جان سے جاؤ گے۔“ وہ رائفل کی نال اس کی کنپٹی سے لگاتے ہوئے بولا۔

”یہاں سے باہر نکلنے کا راستہ کہاں ہے؟“

اس شخص نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔ ”یہ لفٹ ہے جو سیدھی تمہیں باہر لے جائے گی۔“ وہ چھوٹا سا کمرہ لفٹ ثابت ہوا جس کے کنٹرول پینل پر مختلف نمبروں

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

کے بٹن تھے اس شخص نے ایک بٹن دبایا تو لفٹ نما کمرہ اوپر جانے لگا۔ اور پھر لفٹ کے رکتے ہی دوسرا بٹن دبایا تو لفٹ کا دروازہ کھل گیا۔

گھنا جنگل سامنے ہی دکھائی دے رہا تھا باہر آتے ہی وقاص نے رائفل کا بٹ اس شخص کے سر پر رسید کر دیا اور وہ لہراتا ہوا گرا۔ وقاص اس جنگل سے واقف نہ تھا ایک بار پہلے رفیق خان کے ساتھ جنگل سے فرار ہو چکا تھا جو کہ مقامی شخص اور جنگل کے راستے سے آگاہ تھا مگر وقاص راستہ ذہن نشین نہ کر سکا تھا یہ جنگل بھول بھلیاں تھا وہ راستہ ذہن نشین نہ کر سکا اور اس وقت تو پھر بھی رات کا وقت تھا گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا وہ ناک کی سیدھ میں اندازے سے چلنے لگا۔

اچانک سیٹی کی مشابہ ایک ہوکتی ہوئی آواز گونجی وہ ٹھٹھک کر رک گیا سامنے جھاڑیوں میں ہلچل مچ گئی تھی پھر جھاڑیوں سے بھیڑیوں کا ایک غول غراتا ہوا نمودار ہوا ایک بار پھر سیٹی سے مشابہ ہوکتی آواز گونجی، اس بار آواز دائیں طرف سے آئی تھی۔ وہاں ایک قوی ہیکل بن مانس ہاتھوں میں ایرو شوٹر لئے کھڑا تھا وقاص اس کے نشانے پر تھا۔ ایک طرف درجنوں خونخوار بھیڑیے اور دوسری طرف ایرو شوٹر سے مسلح بن مانس دونوں طرف موت تھی۔ وقاص جان چکا تھا کہ وہ اندھیرے میں بھاگ کر ان بھیڑیوں اور بن مانس سے جان نہیں بچا سکتا۔ اس نے اس آفت کے مقابلے میں ڈٹ جانے کا فیصلہ کر لیا اور قلابازی کھا کر رول کرتا ہوا ایک درخت کی آڑ میں چلا گیا بن مانس نے ایرو شوٹر کا ٹریگر دبا دیا۔ تیر اس درخت کے تنے پر لگا جس کی آڑ میں وقاص موجود تھا رائفل برسٹ موڈ پر ہی تھی اندھیرے میں بن مانس کی انگاروں کی مانند دہکتی آنکھیں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔

وقاص نے نشانہ لیا اور اللہ کا نام لے کر ٹریگر دبا دیا تڑتڑاہٹ کی زوردار آواز گونجی اور بن مانس کا جسم گولیوں سے چھلنی ہو گیا وہ کریہہ انداز میں چیختے ہوئے زمین بوس ہو گیا۔

ادھر بھیڑیے غراتے ہوئے اس کی طرف دوڑ پڑے تھے اس بار اس نے بھیڑیوں کی طرف رائفل کی نال کی اور ٹریگر دبا دیا ٹرچ کی آواز ابھری گویا گولیاں ختم ہو چکی تھیں اب بھاگنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا وہ جان بچانے کے لئے اندھیرے میں سرپٹ دوڑا، درجنوں بھیڑیوں کا غول کسی عفریت کی طرح اس کے پیچھے تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ان بھیڑیوں سے بھاگ کر جان نہیں بچا سکتا۔

اچانک سیٹی سے مشابہ ہوکتی ہوئی آواز فضا میں گونجی یہ آواز پہلے سے ذرا مختلف تھی بھیڑیے لحہ بھر کے لئے رک گئے سامنے سے کمپالا لڑکھڑاتا ہوا نمودار ہوا اس نے ایرو شوٹر اٹھا رکھا تھا۔

وقاص رک کر بے بسی سے اسے دیکھنے لگا اس کے دونوں طرف موت تھی۔

کمپالا نے پھر سیٹی سے مشابہ ہوکتی آواز حلق سے نکالی بھیڑیے غراتے ہوئے اس کی طرف دوڑے۔

یہ وہی وقت تھا جب ملک بشیر پولیس کی بھاری نفری کے ہمراہ سیٹی کی آواز سن کر وہاں پہنچ چکا تھا اور اس کی نظروں کے سامنے عجیب منظر تھا۔

ایک طرف کمپالا ایرو شوٹر لئے کھڑا تھا جبکہ ششدر کھڑے وقاص پر بھیڑیے چھلانگ لگانے ہی والے تھے بشیر کے حکم پر پولیس اہلکاروں نے بھیڑیوں پر فائر کھول دیا درجنوں گولیاں بھیڑیوں کے جسم میں پیوست ہونے لگیں بہت سے بھیڑیے مارے گئے اور بچ جانے والے بھیڑیوں نے راہ فرار اختیار کی۔

ادھر کمپالا ایرو شوٹر کا ٹریگر دبانا ہی چاہتا تھا کہ ایس پی بشیر نے گولی چلا دی جو کمپالا کے سینے میں لگی جنگل میں آپریشن کامیاب رہا لیبارٹری پولیس کی تحویل میں تھی، کمپالا کا انجام عبرت ناک ہوا۔

حویلی پر چھاپہ مارا گیا مگر شہباز خان فرار ہو چکا تھا، رفیق خان سائرہ کے ساتھ حویلی میں مقیم ہو گیا، گاؤں کے لوگوں نے سکھ کا سانس لیا ان کی شیطانوں سے جان چھوٹ چکی تھی۔

وقاص، شائستہ اور شہریار لاہور واپس لوٹ گئے، ایک روز اخبار پڑھتے ہوئے وقاص کی نظر ایک خبر پر پڑی

اشتہار کے ساتھ وقاص کی تصویر بھی تھی یہ اشتہار شاہد علی کی طرف سے تھا۔ جو کچھ اس طرح تھا۔

"بیٹا وقاص میں اور تمہاری مما تم سے سخت شرمندہ ہیں بیٹا ہمیں معاف کردو اور گھر لوٹ آؤ تمہارے دادو حج سے لوٹ آئے ہیں تمہاری گمشدگی کے بارے میں جانتے ہی ان کی حالت خراب ہوگئی ہے وہ فلاں اسپتال کے آئی سی یو میں زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہیں اور تمہیں پکار رہے ہیں، بیٹا پلیز! واپس لوٹ آؤ ہوسکتا ہے تمہارے آنے سے تمہارے دادو کی جان بچ جائے۔" وقاص تڑپ اٹھا شوکت علی اپنے پوتے کو بہت چاہتے تھے اور لمحہ بھر کے لئے اسے نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے تھے۔

وہ شائستہ اور شہریار کے ہمراہ پہلی فلائٹ سے کراچی پہنچا اور پھر اسپتال جانے کے لئے تیار ہوا۔ شہریار دوڑ کر اس کے پاؤں سے لپٹ گیا۔ "پاپا میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔"

وقاص بولا۔ "شائستہ تم اسے سنبھالو۔" اور پھر بولا۔ "بیٹا تم تھوڑی دیر میرا انتظار کرو، میں فوراً واپس آؤں گا اور ہاں تمہارے لئے آئس کریم بھی لیتا آؤں گا۔"

جب وہ شہر کے مشہور اسپتال کے آئی سی یو میں پہنچا تو شاہد علی، نائلہ بیگم، چھوٹا بھائی بابو اور بہنیں علیشا اور دیبا آئی سی یو کے باہر موجود تھے وہ سب باری باری اس سے لپٹ گئے۔

"بیٹا مجھے معاف کردو خنسا کو میں نے ہی تم سے جدا کیا تھا۔" نائلہ روتے ہوئے بولی۔

"نہیں مما ایسا نہیں کہتے بڑے چھوٹوں سے معافی نہیں مانگتے یہ میرے نصیب میں لکھا تھا معافی تو مجھے مانگنی چاہئے غلطی میری تھی کسی بھی حال میں والدین سے ناراض نہیں ہونا چاہئے۔" وہ شرمندہ تھا۔

وقاص نے آئی سی یو میں داخل ہوا تو شوکت علی بے ہوش پڑے تھے ڈاکٹرز ان کی جان بچانے کی کوشش کررہے تھے وہ بے ہوشی میں بھی پوتے کا نام بڑبڑا رہے تھے جہاں محبت ہو چاہت ہو وہاں معجزے ضرور رونما ہوتے ہیں۔

"دادو! میں آ گیا۔"

وقاص نے آواز لگائی تو شوکت علی کے جسم میں تحریک پیدا ہوئی اور انہوں نے آنکھیں کھول دیں تو وہ "دادا جی۔" کہتا ہوا ان سے لپٹ گیا دونوں دادا پوتا رو رہے تھے۔

اس جذباتی منظر کو دیکھ کر ڈاکٹرز سمیت سب کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ شوکت علی کے صحت یاب ہوتے ہی انہیں اسپتال سے ڈسچارج کردیا گیا وہ گھر لوٹ آئے۔

شائستہ اور شہریار بھی ان کے ساتھ تھے، شہریار کی وجہ سے ان کے گھر میں رونق تھی ایک روز جب وہ سب جمع تھے دادا جی بولے۔ "بیٹا میں نے منت مانی تھی کہ تمہارے ملتے ہی ہم سب سخی سلطان کے مزار پر چلیں گے اور چادر چڑھائیں گے۔" دادا جی کا حکم تھا وہ کیسے انکار کرسکتا تھا۔

سخی سلطان بابا منگھوپیر کا مزار منگھوپیر کے پہاڑی علاقے میں تھا۔ وہ سب ہائی لکس میں منگھوپیر پہنچے نیچے ٹھیلوں اور خوانچوں پر پھولوں اور چادروں کی دکانیں تھیں انہوں نے پھول اور چادر خریدی اندر ایک طرف بہت بڑا احاطہ بنا ہوا تھا۔ جس میں تالاب تھا اس تالاب میں درجنوں کی تعداد میں مگرمچھ تھے ان میں سے کچھ پانی میں تیر رہے تھے بہت سے خشکی پر منہ کھولے لیٹے تھے۔

مگرمچھوں کا رکھوالا لکڑی کی لمبی سی ڈنڈی سے انہیں گوشت کھلا رہا تھا۔ وہ کچھ دیر اس دلفریب نظارے کو دیکھتے رہے پھر مزار کی سیڑھیوں پر چپل اتار کر چڑھنے لگے۔

اچانک وقاص ٹھٹھک کر رک گیا۔ ایک چبوترے پر مجذوب بیٹھا تھا، یہ وہی مجذوب تھا جو خنسا اور وقاص سے ملا تھا اور اس کی زندگی بدل گئی تھی۔

وقاص نے اس کے سامنے سر جھکایا تو اس نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کے بولا۔ "تو عشق کے دریا میں تیر کر بابا تک آ ہی گیا تجھے تیری چاہت کا پہلا کنارہ نہیں ملے گا۔ دوسرے کنارے سے باہر نکل کر اپنی زندگی گزارے گا، کہیں ایسا نہ ہو کہ تجھ سے معصوم کا دل ٹوٹ جائے ضبط کا دامن تھامے رکھنا حالات

تیرے طابع رہیں گے۔ جا بابا کو سلام کر۔" مجذوب مسکرایا اور حق اللہ کا نعرہ مستانہ بلند کیا۔

وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچے۔ جمعرات کا دن تھا ایک طرف ہال میں قوالی کی آواز آرہی تھی۔ "بھر دو جھولی میری یا محمد اب نہ جاؤں گا خالی۔" دادو قوالی کے شوقین تھے۔ "ہم سب کچھ دیر قوالی سنتے ہیں تم جب تک بابا جی کو سلام کر آؤ۔" دادا جی نے حکم دیا تو وہ مزار میں داخل ہوا صاحب مزار کی قبر کے اطراف بہت سے لوگ دعائیں مانگ رہے تھے وہ بھی دعا مانگ کر باہر نکلا یہاں ایک طرف گونگا مجاور لوگوں کے سروں پر مور کے پر پھیر رہا تھا اور کھانے کے لئے نقتی دانے اور چھوارے دے رہا تھا وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا اسے دادا جی کا انتظار تھا جو قوالی سننے بیٹھ گئے تھے۔

"کسے ڈھونڈ رہے ہو؟" ایک مترنم جانی پہچانی آواز سنائی دی وہ حیرت سے مڑا تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا اس کے سامنے خنسا کھڑی تھی۔ "تم۔" اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"ہاں میں! تم حیران کیوں ہورہے ہو؟" وہ مسکرائی۔ تو وہ کھل اٹھا اور پھر یہ سوچتے ہی اداس ہوگیا کہ وہ شادی شدہ ہے۔ "تمہاری بیٹی کہاں ہے؟" وقاص نے پوچھا۔

"یہیں ہے ملو گے؟" اس نے شوخ لہجے میں جواب دیا۔ اور پھر کچھ دیر بعد تمہیں اپنے ان سے بھی ملواؤں گی۔"

"اچھا۔" وہ بجھ سا گیا۔

"اکیلے میں کیا باتیں ہورہی ہیں؟" یہ دادا جی، شاہد علی نائلہ، دیبا، علیشا اور بابو تھے ساتھ میں شائستہ اور شہریار بھی تھے۔ سیٹھ ذیشان ایک طرف کھڑے مسکرا رہے تھے گویا پورا خاندان موجود تھا وہ یہ کہہ رہی تھی۔ "میں تمہیں اپنے ان سے ملواؤں گی۔" وہ گڑبڑا گیا۔ "کیوں میرے پوتے کو ستا رہی ہو۔" دادو مسکرائے۔

"بیٹا اصل بات یہ ہے کہ خنسا نے شادی کی ہی نہیں تھی یہ دبئی چلی گئی جہاں سیٹھ ذیشان کا بھتیجا انور اپنی اہلیہ اور تین سالہ بیٹی فاریہ کے ستاہ رہتے تھے، یہ ان کے ساتھ رہنے لگی اور سیٹھ ذیشان واپس پاکستان لوٹ آئے پھر ایک حادثے میں انور اور اس کی اہلیہ جاں بحق ہوگئے تو خنسا ننھی فاریہ کو لے کر پاکستان آگئی اور اسی اسکول میں پڑھانے لگی جہاں شہریار زیر تعلیم تھا یہاں اس نے فاریہ کو اپنی بیٹی بتایا جب تم اس سے ملے تو یہ شہریار اور شائستہ کو دیکھ کر غلط فہمی کا شکار ہوگئی اور سمجھی تم نے شادی کرلی ہے یہ وہاں سے دوبارہ کراچی لوٹ آئی حج سے واپس ہوتے ہی تمام صورتحال کا علم جیسے ہی ہوا، میں نے شاہد علی اور نائلہ کو بہت ڈانٹا اور ذیشان صاحب سے ملا اور تمام صورت حال سے آگاہ کیا اس کے بعد لاہور گیا تو تم نہیں ملے۔

تم ان دنوں خان نگر گئے ہوئے تھے تب میں تمہاری یاد میں اس حد تک بیمار ہوا کہ ہوش کھو بیٹھا پھر جب تم آئے تو تو طبیعت سنبھلتے ہی ذیشان سے ملا اور یہ پلان ترتیب دیا۔ میں نے ویسے بھی مزار پر حاضری دینا تھی اس لئے تمہیں اور خنسا کو یہاں ملوانے کا منصوبہ بنایا۔" شوکت علی نے تفصیلات بتائیں تو وقاص کا رکا ہوا سانس بحال ہوا۔

پھر ایک روز وقاص نے شوکت علی کو رفیق خان اور سائرہ کی داستان سنائی انہوں نے ذیشان صاحب کو ان واقعات سے آگاہ کیا۔

ذیشان صاحب یہ جان کر خوش ہوئے کہ خنسا کے حقیقی والدین حیات ہیں خنسا ان تمام حالات سے لاعلم تھی پھر ایک روز ذیشان صاحب اسے ایک روز کے لئے کسی ضروری کام کا کہہ کر خان نگر چلے گئے۔

دوسرے روز واپس لوٹے تو ان کے ساتھ رفیق احمد خان اور سائرہ تھے جو خنسا کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے ان کی آنکھوں میں آنسو تھے خنسا حیران تھی کہ یہ دونوں کون ہیں۔

سیٹھ ذیشان آگے بڑھے اور تمہید باندھی۔ "بیٹی غلطی انسان سے ہوجاتی ہے لیکن اعلیٰ ظرف ہے جو اس غلطی کو معاف کردے۔" وہ حیرت سے ان کا منہ دیکھنے لگی کہ یہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"یہ تمہارے حقیقی ماں باپ ہیں۔" ان کے اگلے الفاظ سے اس کے ذہن کو جھٹکا سا لگا، وہ بت بنی ان سگندل ماں باپ کو دیکھ رہی تھی۔ جنہوں نے اسے برسوں پہلے گھر کے کچرے کی طرح رات کے اندھیرے میں جھاڑیوں میں پھینک دیا تھا۔

"یہ مجھے جنم دینے کی حد تک ماں باپ ہیں، ذرا پوچھئے ان سے انہوں نے مجھے کیوں جھاڑیوں میں پھینکا، گناہ ان کا تھا سزا مجھے ملی، معاشرہ نے مجھے ہی لفظ ناجائز کی گالی دی کسی نے ان کو کچھ نہیں کہا۔

حالانکہ گالیوں کے مستحق تو وہ لوگ ہوتے ہیں جو کمزور لمحات میں لغزش کا شکار ہو جاتے ہیں انہیں کوئی برا بھلا کیوں نہیں کہتا۔ معصوم بچوں کا کیا قصور ہے۔" خنسا بولتی چلی گئی وہ قصوروار تھے اس کے مجرم تھے سر جھکائے سنتے رہے۔

ذیشان صاحب کے تمام حالات بتانے اور سمجھانے پر اس نے انہیں معاف کیا۔

وقاص اور خنسا کا رشتہ طے ہو چکا تھا فیصلہ یہ ہوا کہ ذیشان صاحب اور خنسا سردار رفیق احمد خان کے ساتھ خان نگر ان کی حویلی میں جائیں گے جہاں سے خنسا کی ڈولی اٹھے گی وہ دوسرے روز ہی خان نگر پہنچ گئے۔

اسی رات جب سب سوئے ہوئے تھے خنسا اپنی ماں سائرہ کے کمرے میں تھی کہ سائرہ اور خنسا کے چیخنے کی آواز پر ذیشان صاحب اور سردار رفیق احمد خان جاگ گئے رفیق خان نے اپنا پسٹل اٹھایا اور سائرہ کے کمرے میں پہنچے۔

شہباز خان ایک ہاتھ میں رائفل اٹھائے کھڑا تھا۔ خنسا اس کے کندھے پر مچل رہی تھی جبکہ سائرہ فرش پر بے ہوش پڑی تھی اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا شہباز خان نے مزاحمت پر اس کے سر پر رائفل کا بٹ رسید کیا تھا۔

سردار رفیق احمد خان نے بیٹے پر پسٹل تان لیا۔

"شہباز خان خنسا کو چھوڑ دو یہ تمہاری بہن ہے میرا خون ہے۔" وہ دانت پیستے ہوئے غرائے۔

"نہیں یہ جھوٹ ہے بکواس ہے، یہ اسی کمینے وقاص کی معشوقہ ہے۔ جس نے میرا سب کچھ برباد کیا، میرا گھر بار چھوٹ گیا۔ میں اسے بھی تباہ برباد کردوں گا۔" شہباز خان چلایا۔

"یہ سچ ہے کہ خنسا تمہاری سگی بہن ہے یہ گھر یہ حویلی اب بھی تمہاری ہے، تم غلط راستے پر چل نکلے تھے، خود کو قانون کے حوالے کردو اور اللہ سے معافی مانگو توبہ کرلو میں تمہارے لئے بڑا سے بڑا وکیل کروں گا۔"

سیٹھ ذیشان آگے بڑھے۔" تو خاموش رہ بڈھے یہ سب تم دونوں کی چال ہے۔ میری کوئی بہن نہیں ہم دونوں مجھے پھانسی کے پھندے پر پہنچانا چاہتے ہو ہٹ جاؤ میرے راستے سے، وہ دروازے کی طرف بڑھا جبکہ خنسا مچل رہی تھی چیخ اور چلا رہی تھی۔ کہ اچانک شہباز خان نے خنسا کو نیچے فرش پر پٹخ دیا اور چشم زدن میں فائر کیا تو گولی خنسا کے سینے میں پیوست ہوگئی، خنسا کا جسم کپکپایا اور پھر ٹھنڈا ہو گیا۔ شہباز خان بولا۔ خس کم جہاں پاک، نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔" پھر اس نے قدم آگے بڑھائے۔

سردار رفیق احمد خان نے دانت بھینچتے ہوئے ٹریگر دبا دیا، لگاتار تین فائر ہوئے گولیاں شہباز خان کی گردن اور سینے میں لگیں، وہ چیختا ہوا گرا اور چند لمحے تڑپنے کے بعد ساکت ہو گیا، برائی کا مکمل خاتمہ ہو چکا تھا۔

سردار رفیق احمد خان اور سائرہ کچھ دن اداس رہے، پھر سنبھل گئے۔ ویسے دونوں میاں بیوی اور دیگر تمام لوگ خنسا کی موت پر اشکبار تھے، مگر کیا ہو سکتا ہے جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا تقدیر کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے۔ دونوں میاں بیوی اللہ کی رضا میں خوش رہنے لگے اپنی بقیہ زندگی صوم وصلوٰۃ میں گزارنے لگے۔ سردار رفیق خان نے اپنی پوری جائیداد وقاص کے نام کردی اور پھر تمام بڑے یکجا ہوئے تو رفیق خان نے مشورہ دیا کہ "میری خوشی ہے کہ وقاص اور شائستہ کا نکاح پڑھا دیا جائے، اس تجویز کو سب نے پسند کیا اور پھر وقاص اور شائستہ کی شادی ہوگئی۔ ننھا شہریار بھی بہت خوش تھا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk